روح ادب

بہترین شرح

گنج ادب

پروفیسر ساجدہ ملک ایم۔اے (گولڈ میڈلسٹ)

علمی کتاب خانہ

کبیر سٹریٹ ○ اردو بازار ○ لاہور

Rs. 18/-

روحِ ادب

بہترین شرح

گنجِ ادب

برائے سالِ دوم

پروفیسر ساجدہ ملک
(ایم اے گولڈ میڈلسٹ)

کتاب خانہ کبیر سٹریٹ اردو بازار لاہور

قیمت : 18 روپے

جی ایف پرنٹنگ پریس لاہور

مندرجات

حصّۂ نثر

مصنف و مضمون

۱- نظام الملک ۵
انتخاب از سیاست نامه
۲- ابوبکر الراوندی
انتخاب از راحت الصدور و آیۃ السرور ۲۹
۳- عبید زاکانی ۳۶
انتخاب از اخلاق الاشراف
۵- مولانا جلال الدین دوانی ۴۹
انتخاب از اخلاق جلالی
۶- ابوالفضل ۶۰
انتخاب از عیاردانش
انتخاب از آئین اکبری
انتخاب از مکاتبات
۷- انتخاب از مجلّہ مہر
خدمات سینما در رادیو در پیشرفت معارف ۷۷
۸- سید محمد علی جمال زاده ۸۷
ثواب یا گناہ؟ (افسانہ)

حصہ نظم
شاعر و کلام

۹۔ باباطاہر عریاں ۱۴۴
رباعیات
۱۰۔ مولانا جلال الدین رُومی ۱۸۲
انتخاب از مثنوی معنوی
۱۱۔ افضل الدین بدیل خاقانی ۲۹۴
قصائد
۱۲۔ محمد حافظ شیرازی ۳۱۹
غزلیات
۱۳۔ محمد حسین نظیری ۴۰۹
غزلیات
ملک الشعراء محمد تقی بہار ۴۷۳
غزل و قصیدہ
مرزا اسد اللہ خان غالبؔ ۴۹۹
غزلیات
۱۷۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال ۵۷۹
انتخاب از اسرار خودی
انتخاب از پیامِ مشرق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظام الملک

نظام الملک علم و حکمت اور تدبر و فراست کے تابندہ ستاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کا نام حسن۔ اور کنیت ابو علی تھی۔ اپنے لقب نظام الملک کی وجہ سے ہی دنیائے عظیم میں یاد کئے جاتے ہیں۔ سلطان ملک شاہ کی طرف سے اُن کو اتابک کا خطاب ملا تھا۔ خلیفہ عباسی قائم بامر اللہ نے آپ کو قوام الدین اور رضی الدین کے خطابات دیئے تھے۔ نظام الملک آبائی لحاظ سے خوش گذران تھے۔ اُن کے والد کا نام ابوالحسن علی تھا جو کہ غزنویوں کی طرف سے طوس میں مالیات کے عامل تھے۔ قیاساً تاریخ پیدائش ۴۰۸ھ بتلائی جاتی ہے۔

نظام الملک کی پیدائش طوس کے قریب قریہ راد کان میں ہوئی۔ تاریخ پیدائش کے متعلق تاریخ خاموش ہے البتہ اُن کی تعلیم و تربیت سے پوری واقفیت ہے بچپن کا زمانہ تحصیل علم کے لئے طوس میں گزرا۔ گیارہ سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا۔ پھر مرو میں فقہ شافعی اور حدیث کی تعلیم سے شرفیاب ہوئے۔ انہیں دنوں سلجوقوں نے خراسان کو فتح کر لیا تو نظام الملک کے والد محترم خراسان سے غزنہ چلے گئے اس طرح انھوں نے کوئی تین، چار سال تک غزنویوں کی ملازمت کی۔ پھر حاکم بلخ ابو علی شاذان نے ان کو دبیری کا منصب عطا کیا ابو علی کے بعد جب چغری بیگ داؤد نے بلخ کی عنانِ حکومت سنبھالی تو نظام الملک بھی اُس کے ملازم ہو گئے۔ وہ کچھ عرصہ مرو میں قیام پذیر رہے۔ پھر الپ ارسلان حاکم خراسان کی ملازمت قبول کر لی۔ اپنی خداداد ذہانت اور فطانت کی وجہ سے نظام الملک ۴۵۵ھ تک خراسان کا نظم و نسق سنبھالے رہے۔ جب الپ ارسلان نے عمید الملک وزیر کو معزول کیا تو نظام الملک کو گوہر درخشان سمجھتے ہوئے وزارت کا عہدہ مستقل طور پر ان کے سپرد کر دیا گیا۔

خداوندکریم نے نظام الملک کو تدبر۔ قابلیت اور انتظامی صلاحیت اور عسکری قابلیت سے نوازا تھا۔ نظام الملک کی تنظیم کی بدولت ہی الپ ارسلان کو پے در پے فتوحات ہوئیں۔ تمام صوبوں میں مختلف گورنر مقرر کئے گئے۔ ملک شاہ ولیعہد نامزد ہوا۔ اِن دنوں میں نظام الملک نے اپنی ذہنی فطانت کا بھی ثبوت دیا جبکہ عباسی خلیفہ قائم بامراللہ سے دوستانہ تعلقات قائم کئے گئے۔ جو مقامی حکمران تھے وہ بادشاہ کے منصبدار قائم کئے گئے۔

الپ ارسلان (۴۶۰ھ) میں قتل کردیا گیا۔ اُس کے بعد ۲۰ سال (۴۸۰ھ) تک سلطان ملک شاہ کے وزیر خود مختار رہے۔ سلجوقی سلطنت کی بنیاد کو پختہ کرنے والے دراصل نظام الملک تھے۔ اُنھوں نے تقریباً تیس سال وزارت کے منصب کو سنبھالے رکھا۔ اور اس دورانِ فرمانروائی میں اپنے تدبر اور لیاقت کا ثبوت دیتے ہوئے حلب سے لے کر کاشغر تک کی وسیع سلطنت کو زیرِ اقتدار رکھا۔ الپ ارسلان اور ملک شاہ کو جو شہرت نصیب ہوئی وہ اُن ہی کی کاردانی اور خردمندی کی وجہ سے تھی۔ اُس وقت کے شعراء نے بھی نظام الملک کی مدح میں بہت کچھ لکھا ہے۔ جس سے اُن کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔

امیر معزی لکھتا ہے ؎

تو آن خجستہ وزیری کہ از کفایت تو
کشید دولت سلجوق سر بعلیین
تو آن ستودہ تری کہ در فتوح وظفر
شدہ است کلکِ تو با تیغ شہریار

یہ اشعار بجلیہٗ نظام الملک کی شخصیت پر دال ہیں۔ ملک شاہ کے عہد حکومت کے اخیر میں نظام الملک بوڑھے ہو گئے تھے۔ امورِ مملکت کا نظام اُن کے بیٹوں اور مقرب عہدہ داروں کے ہاتھ میں تھا۔ اس لئے نظامِ حکومت اس مستعدی سے نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اُن عہدہ داروں کے نسق میں تحکم اور استبداد رونما ہو جاتا تھا۔ ملک شاہ

میں اس قدر ہمت نہ تھی کہ وہ نظام الملک کو معزول کرسکے۔ کیونکہ اُن کی سیاست دانی اور بلند اخلاقی نے لوگوں کے دلوں میں اس قدر گھر کرلیا تھا کہ ایک خاص جماعت "غلامانِ نظامیہ" کے نام سے اپنا الگ مقام پیدا کرچکی تھی۔ اس لئے ملک شاہ ہمیشہ فوج کی بغاوت کی طرف سے خائف رہتا تھا۔ اور اسی بنا پر نظام الملک کے ہر مشورہ کو تسلیم کرلیتا تھا۔ روایت ہے کہ نظام الملک کے مشورہ سے سلطان ملک شاہ نے ۴۷۹ھ میں بادشاہ کے منظور نظر مصاحب ابن بہمیار اور سید لرُوسا کو اندھا کردیا گیا۔ اور جعفرک مسخرے کو قتل کردیا گیا۔ نظام الملک کے اثر و رسوخ کو دیکھتے ہوئے بادشاہ میں کبھی جرأت نہ ہوئی کہ وہ نظام الملک کو معزول کردے۔ شاید یہ کہانی ٹھیک ہو یا نہ ہو۔ بہرحال قیاس تسلیم نہیں کرتا۔

اب کئی اور واقعات رونما ہونے لگے تھے جن کی وجہ سے بادشاہ اور وزیر کے درمیان کشمکش رہنے لگی۔ بادشاہ کے حواری اس بات سے ناراض تھے کہ نظام الملک اور اُن کے بیٹوں کا اثر و رسوخ اُن کی نگاہ میں کھٹکتا تھا۔ بادشاہ کی چہیتی بیوی ترکان خاتون اپنے بیٹے محمود کو ولیعہد بنانا چاہتی تھی۔ لیکن وزیر برکیارق کے حق میں تھا۔ چنانچہ ترکان خاتون کی سازش کی وجہ سے نظام الملک کے مقابل ملک شاہ نے تاج الملک کی تربیت شروع کردی۔ جو کہ اُن کے زوال کے درپے تھا۔

انہیں ایام میں ایک اور واقعہ پیش آیا جس کی بدولت نظام الملک کے بیٹے شمس الملک کے جور و استبداد کے خلاف بادشاہ کے پاس آکر شکایت کی۔ بادشاہ نے نظام الملک کے پاس دو نائب وزیروں کو بھیجا اور پیغام دیا۔ "اگر تو میرا تابع ہے۔ تو اپنے بیٹوں کو ادب کیوں نہیں سکھاتا۔ تاکہ وہ اپنی حد سے نہ بڑھیں۔ کیوں نہ میں حکم دوں کہ قلمدانِ وزارت تم سے چھین لیا جائے" نظام الملک خوددار اور غیور تھے۔ انھوں نے جواب دیا "ہرگاہ این دوات برداری، آن تاج بردارند یعنی کہ میری دوات کے ساتھ تمہارا تاج وابستہ ہے" اس جواب پر ملک شاہ اور بھی برہم ہوا۔ وہ تو بہانہ کی تلاش میں تھا۔ چنانچہ اُس نے قلمدانِ وزارت تاج الملک کو پیش کیا۔ اِسی دوران میں نظام الملک

بغداد جا رہے تھے کہ راستہ میں کرمنشاہ کے قریب ایک شخص نے صوفیانہ لباس میں عرضِ حال کرنے کے بعد نظام الملک کے قریب آکر اُن کے پیٹ میں چھرا پیوست کر دیا اور وہ اسی زخم سے دس رمضان المبارک ۴۸۵ھ کو وفات پا گئے۔ نظام الملک کا قتل ملک شاہ کی سازش سے ہی ہوا تھا۔ اِن کی نعش اصفہان لے جا کر بڑے احترام سے دفن کر دی گئی۔ قدرت کا انتقام دیکھو کہ ایک ماہ بعد ہی ملک شاہ کو بغداد میں زہر دے دیا گیا اور وہ بھی ہلاک ہو گیا۔" غلامانِ نظامیہ" نے چار ماہ کے اندر اندر تاج الملک کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔

نظام الملک ایران کے اولوالعزم وزراء میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ علماء۔ فقہا اور عرفاء کے مربی تھے۔ انھوں نے تعلیم عام کرنے اور طلبہ کو سہولتیں مہیا کرنے کے لئے مدرسے قائم کئے۔ بغداد۔ اصفہان۔ نیشاپور۔ اور مرو میں مدرسہ نظامیہ کی شہرت عام تھی۔ انھوں نے حاجیوں کے لئے راستوں کو محفوظ کیا اور اپنے خرچ پر سفر میں سہولت مہیا کی۔

مذہبی لحاظ سے وہ ایک کٹر سُنی تھے۔ شیعوں اور اسماعیلیوں کے خلاف اُن کے دل میں گہری نفرت تھی۔ اہلِ ادب کے حق میں وہ نہایت فیاض انسان تھے۔ حکیم عمر خیام نظام الملک کے ہمدرس تھے۔ یہ صاحبِ کمال بھی نظام الملک کے فیض سے مستفید ہوئے۔ رفاہِ عامہ۔ اشاعتِ مذہب اور تعلیم عوام کے سلسلے میں نظام الملک کی دلی کوششیں بے حد قابلِ تعریف ہیں۔ نظامیہ کالج بغداد جس کو حجت الاسلام ابو حامد محمد الغزالی کے سے شہرہ آفاق اہلِ کمال کو اپنے پروفیسروں کے زمرے میں رکھنے کا فخر اور شرف حاصل تھا۔ اس کی بنیاد نظام الملک نے ہی رکھی تھی۔ نیشاپور اور بلخ وغیرہ کے مدارس نظامیہ میں بھی طالبانِ علم و فن کی تربیت کا کما حقہٗ انتظام کیا۔ نظام الملک کے ۱۲ بیٹے تھے اور تقریباً تمام کے تمام اعلےٰ عہدوں پر فائز تھے۔ گویا برامکہ خاندان سے نظام الملک کا بلند مرتبہ خاندان اپنے کمال اور فنی کامیابیوں کے اعتبار سے ٹکر لیتا تھا۔ جس خاندان کو اس قدر عظمت حاصل ہو آخر کار وہ تباہ ہو کر رہتی ہے۔ برامکہ کی

طرح اس خاندان نے بھی عظمت کی بلندیوں کو چھوا۔ اور آخر یہ بھی [illegible] کے گرداب میں گم ہوگیا۔

سیاست نامہ

نظام الملک کے ادبی مذاق اور غیر معمولی ذہانت نے اُن کو مجبور کیا کہ وہ اپنے گوناگوں فرائض کی ادائیگی کے باوجود کسی ادبی خدمت کے لئے وقت نکالیں چنانچہ اس نے فن حکومت کے موضوع پر سیاست نامہ کے نام سے ایک قابلِ رشک کتاب لکھی۔ اس کتاب میں حکمرانی کے جو اصول اور نظریات درج ہیں ان کی بنیاد مصنف نے اپنی تاریخی معلومات اور وسیع تجربات پر رکھی ہے۔ اس کتاب میں نظام الملک نے اپنے عہد وزارت کے طویل عرصے میں امور مملکت کے متعلق جو مشاہدات و تجربات کئے تھے ان کو کتاب کی صورت میں مرتب کرنے کے بعد اس کا نام سیاست نامہ یا سیر الملوک یا پنجاہ فصل رکھا۔

سیاست نامہ کے پچاس ابواب ہیں۔ ان ابواب میں ہر قسم کے شاہی فرائض اور حقوق امتیازی کی تفصیل درج کی ہے۔ حکومت کے ہر محکمہ کے متعلق پر از معلومات بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کے متعلق مشہور ہے کہ ملک شاہ نے اپنے قابل وزیروں اور مشیروں کو سیاستِ علمی اور عملی کے متعلق ایک مستند ترین کتاب لکھنے کے لئے کہا تھا۔ اسی فرمائش کی تعمیل میں نظام الملک نے یہ معرکتہ الآرا شاہکار ۱۰۹۱-۹۲ء میں یعنی اپنی ہلاکت کے تھوڑا ہی عرصہ پہلے پیش کیا ہے۔

نظام الملک اس کے دیباچہ میں یوں رقمطراز ہیں

"بندہ را فرمود کہ بعض از سیر نیکو، از آنچہ بادشاہان را از آن چارہ نباشد، بنویس و ہر چیز یکہ بادشاہان را بکار داشتہ اند و اکنون فرمان بجائی آرند، چہ پسندیدہ و چہ ناپسندیدہ آنچہ بندہ را از دیدہ و دانستہ

شنیدہ و خواندہ فراز آمد، بر حکم فرمانِ عالی این چند فصل یاد کردہ شد،
نظام الملک نے جب یہ کتاب بادشاہ کے حضور پیش کی تو اُس وقت اُس کی صرف اُنتالیس فصلیں تھیں۔ بادشاہ نے اس کو پسند کیا۔ بعد میں انھوں نے ہر فصل میں مناسب نکات کا اضافہ کیا۔ جب نظام الملک آخری سفر پر روانہ ہوئے تو انھوں نے یہ مسودہ شاہی کتاب خانہ کے مخصوص کاتب محمد مغربی کو دیا کہ وہ اس کو صاف لکھے۔ نظام الملک کی وفات کے بعد محمد بن ملک شاہ کے دورانِ سلطنت میں ہی کتاب مرتب ہوئی۔ چونکہ حجۃ الاسلام، امام غزالی نے اپنی کتاب "نصیحۃ الملوک" لکھتے وقت سیاست نامہ کو زیر نظر رکھا ہے۔ اس لئے یقیناً یہ کتاب ۵۰۰ھ سے پہلے مدوّن ہو چکی تھی۔

سیاست نامہ میں امور مملکت داری کے متعلق سیاسی، دینی اور تاریخی نقطہ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ بادشاہ کی رعایا پروری اور عدالت گستری۔ حکام و عمال۔ قاضی و محتسب۔ شحنہ و مشرف اور دوسرے منصبداروں کے فرائض بیان کئے ہیں۔ نظام الملک نے اپنی فطانت اور ذہانت خداداد کی بدولت مجالس شاہی کے آداب و مراسم کی تفصیل لکھی ہے۔ اسلاف سے جو رسوم و رواج چلے آرہے ہیں۔ اُن کے نظام کے متعلق خرابیاں اور اچھائیاں بتلا کر محاسن پر کاربند ہونے کی تلقین کی ہے۔

پروفیسر براؤن سیاست نامہ کو فارسی نثر کی مفید ترین اور دلچسپ ترین کتابوں میں شمار کرتے ہیں اس لئے کہ اس میں دلچسپ تاریخی مواد ہے اور کہ ایک ایسے عظیم المرتبت وزیر اعظم کے سیاسی خیالات ہمیں معلوم ہوتے ہیں۔ جس پر مشرق کو بجا طور پہ ناز ہو سکتا ہے۔،،

چار فصلوں میں مزدک، سنباد گبر، بابک و خرم دین، قرمطیوں اور باطنیوں کی تاریخ و عقاید بیان کر کے بادشاہ کو ان سے محترز رہنے کی تلقین کی ہے۔ مصنف نفسیاتی بصیرت کے حامل ہیں۔ انھوں نے حقائق کا مطالعہ بڑی ژرف نگاہی سے کیا ہے۔ اپنے بیانات کو مفید اور دلچسپ بنانے کے لئے انھوں نے تاریخی اور غیر تاریخی حکایات لکھی ہیں۔ جو بڑی دلچسپ اور اثر انگیز ہیں۔ کبھی کبھی اپنے دلائل کو پختہ بنانے کے لئے

قرآنی آیات اور احادیث کا بھی سہارا لیا ہے۔ مصنف نے اپنی کتاب کے متعلق خود بیان کیا ہے۔ جس سے اُن کے افکار کا پورا ثبوت مل جاتا ہے "ہم پنداست و ہم حکمت و ہم مثل و تفسیر قرآن و اخبار پیغمبر و قصص انبیاء و سیر و حکایات پادشاہان عادل۔ از گذشتگان خبراست و از ماندگان سمراست و با این ہمہ و رازی مختصراست و شایستہ پادشاہ دادگر۔"

نظام الملک شافعی فقہ کے شائق تھے۔ اور شافعی مذہب کے پیرو تھے۔ اور ہمیشہ اسی کی ترویج میں کوشاں رہتے تھے۔ اسی تعصبانہ فرقہ داری کی وجہ سے دیگر مذاہب کے بارے میں اُن کے قلم سے ناسزا باتیں بھی نکل گئی ہیں۔ انھوں نے واقعات اور حادثات کے بارہ میں بہت سی غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یادداشت پر بھروسہ کیا ہے۔ اور تحقیق سے سنین کی صحت کا بھی خیال نہیں رکھا۔ بہرحال سیاستنامہ ایک اہم کتاب ہے۔

اسلوب بیان :۔ سیاست نامہ کا انداز تحریر سادہ۔ صنائع وبدائع سے پاک اور حقیقتِ حال کا پورا پورا ترجمان ہے "یہ کتاب سیر الملوک معروف بہ نثری سیح وسلیس دارد وخوانندگان را باگاہی از رسوم جہان داری پیشینیاں بہرہ مندمی گردانند۔"

بعض اوقات تو نظام الملک تصنع سے بچتے بچتے قدیم انداز بیان کی الجھن میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ مترادفات بالکل کم ہیں۔ سجع و مقفیٰ جملے بھی صرف ایک دو جگہ آئے ہیں نظام الملک نے بعض عربی الفاظ اور عربی و فارسی مرکبات وافعال کو نئے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ عبارت میں تاریخ بلعمی کی سادگی کی مشابہ ہے۔ اور تاریخ بیہقی جیسی جملہ بندی اور محاورات و کنایات کا استعمال پایا جاتا ہے۔ واقعات کی حدبندی اور ان کے سمجھانے کے لئے تفصیلات اور تمثیلی انداز تاریخ بیہقی جیسا ہے۔ یہ کتاب زبان و بیان کے لحاظ سے مقبول ترین کتاب شمار ہونے کے لائق ہے۔

سیاست نامہ نہ صرف گزشتہ تاریخ کی ترجمانی کرتا ہے۔ بلکہ آج بھی سیاست نامہ طرز حکومت کے لئے بہترین لائحہ عمل ہے۔ اس سے ایک جہانبان طرز جہانبانی سے

با حسن طریقہ آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔ اور ملک میں نظم و نسق قائم کرنے کے لئے یہ کتاب بہت اہم ہے۔

سیاست نامہ نہایت اہتمام کے ساتھ چھپ چکا ہے۔ پیرس ۹۱-۱۸۹۶ء کے درمیان بہت سے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ بعد میں اس کے کئی ایڈیشن ایران میں بھی اشاعت کا جامہ پہن چکے ہیں۔ اور آج سیاست نامہ اپنے مفاہیم اور انداز بیان کی وجہ سے اس قدر اہم ہو چکا ہے کہ اس کے مختلف ایڈیشن زبانوں میں طبع کئے گئے ہیں۔

سیاست نامہ

ترجمہ۔ صفحہ ۷

جاسوس بھیجنے اور رعایا و ملک کی بہبودی کے لئے تدبیر کرنے کے بارے میں۔

فرہنگ

اطراف :- جمع طرف، کنارے۔

بازرگاناں۔ جمع بازرگان، تاجر۔

می شنوند۔ جمع غائب فعل حال از شنیدن

ہیچگونہ :- کسی قسم کا۔

تدارک :- روک تھام کرنا۔

مقطّعان :- مختلف علاقوں کے منتظم، جاگیردار۔

سر :- خیال، فکر، قوت، طاقت۔

بدسگالیدن :- برا چاہنا۔

تاختن بردن :- حملہ کرنا۔

فروشدہ :- نازل ہوا۔

باطل :- جھوٹ، دروغ۔

خیر :- نیکی، بھلائی۔

تیمار :- دیکھ بھال، نگہبانی، خبرگیری۔

سبیل :- روش، راستہ، طور طریقہ۔

دارو فروشان :- دوائی بیچنے والے مراد طبیب DRUGIST

احوال :- جمع حال۔

حادث :- قدیم کی ضد، نیا وجود میں آنے والا، ظہور میں آنے والا۔

والیان :- جمع والی : حاکم ، مالک ، صوبیدار ۔ گورنر

گماشتگان :- جمع گماشتہ : مقرر کیا ہوا کارندے ۔

عصیان :- نافرمانی ، سرکشی ۔

فاجا :- ناگہاں ، اچانک ، وقتاً ۔

عزم :- ارادہ ۔

ار خویش ساختن :- سامان درست کرنا

شر :- برائی ۔

ہشیار :- زیرک ۔ دانا ۔ عقلمند ۔

عضدالدولہ :- آلِ بُویہ میں سے فارس کے حکمرانوں میں دو کا لقب عضدالدولہ تھا ۔ ایک عضدالدولہ ابوالحسن علی ۳۳۸ھ ۳۲۰ (۹۳۲-۹۸۰م)

دوسرا عضدالدولہ ابو شجاع خسرو (۳۳۸-۳۷۲ھ) (۹۸۲-۹۸۹م)

دُیلم :- موجودہ گیلان کا قدیم حصّہ ۔

بیدار تر :- زیادہ آگاہ ۔

پیش بین :- واقعات کو پہلے سے بھانپنے والا ، دُور اندیش ۔

عمارت :- تعمیرات ۔

فاضل :- قابل ، لائق ۔

مُنہی :- مُخبر ، خبر پہنچانے والا ۔

زیرک :- فہیم ۔ ذہین ۔

بزرگ ہمت :- بلند ہمت ۔

با سیاست :- بااصول ، قانون دان سیاست دان ، مدبر ۔

بنشست :- نوشت ، لکھا ۔

رجمہ) یہ لازمی ہے کہ ملک کے تمام گوشوں میں جاسوس رہیں ، تاجروں ، سیاحوں ،
فیوں ، طبیبوں اور درویشوں کے بھیس میں جائیں اور جو کچھ سنیں ، اس کی اطلاع پہنچا
یں تاکہ حالات میں سے کوئی بھی امر مخفی نہ رہے ۔ اگر کوئی واقعہ ظہور میں آئے اور وجود پذیر
جائے تو مناسب وقت پر اُس کی روک تھام کی جائے ۔ کیونکہ بار ہا ایسا ہوا کہ صوبیداروں
یرداروں ، کارندوں اور امیروں نے مخالفت اور بغاوت کا خیال کیا ہے اور بادشاہ
ے حق میں بُرا چاہا لیکن جب جاسوس نے پہنچ کر بادشاہ کو معاملات سے آگاہ کیا تو بادشاہ
لفور گھوڑے پر سوار ہو کر حملہ آور ہوا اور اچانک اُن کے سروں پر نازل ہو گیا (پہنچ گیا)
، باغیوں کو گرفتار کر کے اُن کے ارادوں کو باطل کر دیا ۔ اور اگر کسی بادشاہ نے کسی
جی لشکر کے ساتھ ملک پر چڑھائی کا ارادہ کیا تو اُس بادشاہ نے اپنے انتظامات مکمل

کر لے اور اُس کی (دشمن) مدافعت کی رعایا کے حالات سے بھی اچھی بُری اطلاعات اسی طرح دی گئی ہیں۔ اور بادشاہوں نے اُس کی مناسب دیکھ بھال کی ہے۔ جیسا کہ ایک بار عضدالدولہ نے بھی ایسا کیا ہے دیلم کے بادشاہوں اور دوسرے فرمانرواؤں میں سے کوئی بھی عضدالدولہ سے زیادہ ہوشیار، سمجھ دار اور دُور اندیش نہیں ہوا ہے وہ تعمیرات کا دلدادہ، بلند ہمت لائق اور سیاست دان تھا۔ ایک دن مخبر (جاسوس) نے اُسے (عضدالدولہ کو) لکھا کہ

صفحہ ۲۰

مہم :- اہم کام۔
کنارہ :- طرف۔
باز دادن :- لوٹانا، واپس دینا۔
ملک :- بادشاہ۔
دویست :- دو سو۔
اثر :- نشان۔
ہمراہی :- ساتھی۔
عادل :- عدل کرنے والا۔
منصف :- انصاف کرنے والا۔
غافلی :- غفلت۔
کری :- بہرا پن۔
حدیث :- بات چیت۔
شناسد :- جانتا ہے۔
تماشای دل :- خوش گزرانی، مراد من مانی۔
بریدم :- میں نے قطع کی۔
غزو :- جہاد، غزوہ۔

ضیاع :- جمع ضیعہ۔ زرخیز زمین۔
مُستَغَل :- غلّہ حاصل کرنے کی جگہ، کھیت۔
در پیش دارم :- سامنے رکھتا ہوں۔
بدان کہ :- جان لو کہ۔
راست رو :- راستکار، سیدھی راہ پر چلنے والا۔
کوتاہ :- چھوٹا۔
سرای :- گھر، مقام، منزل۔
مایۂ :- دولت۔
شراب خوارگی :- مے نوشی۔
عزّ و جل :- عزت والا اور جلال والا۔
درست کردن :- ٹھیک کرنا۔
نامزد کردن :- منگنی۔
اندیشہ :- فکر۔
صواب :- خطا کی ضد، ٹھیک، درست۔

(ترجمہ) اس مہم میں، جس پر آپ نے خاکسار کو بھیجا جب میں شہر کے دروازے سے باہر آیا، کوئی دو سو قدم ہی چلا تھا کہ ایک جوان کو دیکھا جو راستے کے کنارے پر کھڑا تھا (اس کا) چہرہ زرد تھا اور اس کے منہ اور گردن پر زخموں کے نشان تھے۔ جوان نے مجھے دیکھ کر سلام کیا، میں نے بھی جواباً سلام کیا اور پوچھا کس لئے کھڑے ہو؟ کہنے لگا ساتھی کی تلاش ہے تاکہ (اس کے ساتھ) ایسے شہر میں جاؤں جس کا حاکم عادل اور قاضی منصف ہو۔ میں نے کہا جانتے ہو کیا کہہ رہے ہو؟ کہ عضدالدولہ سے زیادہ عادل بادشاہ اور قاضی شہر سے زیادہ عالم۔ قاضی کی جستجو کرتے ہو؟ (متلاشی ہو)۔ اس نے جواب دیا، اگر بادشاہ عدل کرنے والا ہوتا اور (ملک کے) معاملات میں ہوشیار ہوتا تو حاکم درستکار ہوتا، جب حاکم راست باز نہیں تو بادشاہ عادل کیسے ہو، بلکہ غافل ہے۔ میں نے پوچھا کہ بادشاہ کی غفلت اور قاضی کی بے علمی کے بارے میں تم نے کیا دیکھا، اس نے کہا، کہانی تو بڑی طویل ہے، (لیکن) جب اس شہر سے نکل گیا (تو) چھوٹی ہو گئی۔ میں نے کہا، مجھ سے تو ضرور کہنی چاہیئے چنانچہ اس نے کہا، چلئے تاکہ بات چیت میں راستہ طے کر لیں۔ جب راستے میں کھڑے ہوتے (تو) اس نے کہا۔ کہ میں فلاں سوداگر کا بیٹا ہوں اور میرا آبائی گھر اس شہر کے فلاں محلے میں ہے۔ ہر شخص میرے باپ کے متعلق جانتا ہے کہ (وہ) کس قسم کا آدمی تھا اور کتنا سرمایہ رکھتا تھا۔ جب میرے باپ نے زمانِ الٰہی پایا (یعنی اس کا انتقال ہو گیا) تو میں کچھ عرصے تک من مانی، عیش و عشرت اور شراب خوری میں مشغول ہو گیا، اس کے بعد مجھے بہت سخت بیماری کا سامنا کرنا پڑا، حتیٰ کہ زندگی سے بھی مایوس ہو گیا اور اس حالت میں خدائے بزرگ و برتر کے سامنے منت مانی تھی کہ اگر اس بیماری سے جانبر ہوا، تو حج اور جہاد کروں گا، خدائے ذوالجلال نے مجھے صحت عطا کی، تندرست ہوا اور میں نے اپنا ارادہ پکا کیا کہ حج کو جاؤں، اور پھر جہاد کو روانہ ہوں، جتنی کنیزیں اور غلام میرے پاس تھے، آزاد کر دیے۔ سب کو مال و دولت، کھیت اور گھر دیے، اور آپس میں شادیاں کر دیں۔ میرا جو کچھ ساز و سامان اور کاشتکاری کی زمین تھی ایک

فروخت کر کے پچاس ہزار دینار نقد حاصل کئے۔ بعد ازاں مجھے خیال ہوا کہ یہ دو سفر جو مجھے کرنے ہیں، خطرناک ہیں، اتنی دولت اپنے ہمراہ لے جانا میرے لئے مناسب نہیں ہے۔

صفحہ نمبر ۸، ۹

دل بر چیزی نہادن :- کسی چیز سے دل لگانا۔	قرار گرفتن :- مطمئن ہونا۔
آفتابہ :- لوٹا۔	نرمک :- نرمی سے۔
مسّین :- تانبے کا۔	خرم :- خوش، شادمان۔
قاضی القضاۃ :- چیف جسٹس، منصب اعلیٰ	شبگیری :- آدھی رات کے بعد کا وقت، پچھلی رات، قریب صبح کا وقت۔
سپردن :- سونپنا، کسی کے پاس امانت رکھنا۔ حوالے کرنا۔	ودیعت :- امانت۔
غازیان :- جمع غازی۔	مصاف :- میدان کارزار، جنگ۔
جراحت :- زخم۔	قیصر :- شاہان روم کا لقب۔
خلاص :- نجات۔	ناوکیان :- ناخدا۔
نفقات :- جمع نفقہ۔ خرچ اور کھانا کپڑا جو بیوی اور اولاد وغیرہ کو دیا جائے۔	خلق :- پھٹے پرانے۔ گدڑی
	بد داشتی :- مصائب۔
	نزار :- کمزور۔
	حبّہ :- دانہ، رتی۔

(ترجمہ) چنانچہ میں نے یہ طے کیا کہ تیس ہزار دینار لیجاؤں اور باقی چھوڑ جاؤں۔ پس میں گیا اور تانبے کے دو لوٹے خریدے اور ہر ایک میں دس ہزار دینار ڈالے اور (اپنے تئیں) کہا کہ اب کسی کے پاس رکھوانے چاہئیں۔ تمام شہر میں سے میرا دل قاضی القضاۃ پر مطمئن ہو گیا۔ میں نے سوچا وہ صاحب اقتدار و صاحب علم ہے اور بادشاہ نے مسلمانوں کی جان و مال کو اس کے حوالے کیا ہے اور اس پر اعتماد کیا ہے۔ وہ کسی حالت میں خیانت نہ کرے گا۔ (چنانچہ) میں گیا اور یہ صورت حال نرمی سے اس سے

بھی، اس نے قبول کر لیا، میں خوش ہو گیا، پچھلی رات کو اٹھا اور اس کے گھر گیا، امانت اس کی سپرد کی اور سفر کو روانہ ہو گیا۔ فریضۂ حج ادا کیا اور مکۂ معظمہ سے مدینۂ منورہ گیا، وہاں سے ملک روم کا رُخ کیا اور غازیانِ اسلام میں شامل ہو گیا۔ چند سال جہاد کیا اور ایک لڑائی میں کافروں کے نرغے میں پھنس گیا۔ جسم اور چہرے پر کئی زخم آئے اور رومیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ چار سال قیدِ بند میں کاٹے حتیٰ کہ قیصرِ روم بیمار ہوا اور تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا گیا۔ میں نے بھی رہائی پائی۔ پھر کشتی بانوں کے پاس آیا اور ان کی خدمت کر کے روزی پیدا کی۔ دل کو یہ اطمینان تھا کہ بیس ہزار دینار قاضی بغداد کے پاس رکھے ہوئے ہیں۔ اسی امید پہ چلا، دس سال بعد، ہاتھ خالی، کپڑے پھٹے ہوئے، جسم تکلیف اور مصیبت سے کمزور ہو گیا، قاضی کی خدمت میں پہنچا، سلام کیا اور بیٹھ گیا۔ ایک لمحہ کے بعد اٹھ کر چلا آیا۔ دو دن تک یونہی اس کے پاس گیا۔ چونکہ مجھ سے (قاضی) کچھ نہیں کہتا تھا (اس لیے) تیسرے دن کے پاس جا کر ادب سے عرض کیا کہ میں فلاں ابنِ فلاں ہوں، حج اور جہاد سے فارغ ہو چکا ہوں۔ مجھے بہت تکلیفیں پہنچیں، اور جو کچھ اپنے ساتھ لے گیا تھا، ہاتھ سے جاتا رہا۔ اور اس حال کو پہنچا کہ ایک دمڑی بھی نہ رہی۔ اب اس امانت کی، جو آپ کے پاس رکھی تھی۔ ضرورت ہے۔ قاضی نے میری تھوڑی بہت قیل و قال کا کوئی جواب نہ دیا، اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی کہ تو کیا کہتا ہے اٹھا اور کمرے میں چلا گیا۔ میں مایوس ہو کر لوٹ آیا۔ بری حالت اور

صفحہ ۹، ۱۰

برھنگی :۔ عریانی۔	خویشاں :۔ خویشاوندان۔ رشتہ دار۔
مالیخولیا :۔ سودا، خلل دماغ، پاگل پن۔	ہذیان :۔ فضول باتیں۔ بکواس۔
نیکو روی :۔ خوبرو، خوش شکل۔	آباداں :۔ بارونق، خوشحال۔
ملبّس :۔ لباس پہنے ہوئے، ملبوس۔	زشت :۔ بدنما۔
عقاب :۔ ثواب کی ضد، عذاب۔	ابرا کردن :۔ بری ہونا، اپنے حق سے دستبردار ہونا۔
حلالاً طیباً :۔ پاک، حلال۔	

صداع؛ دردِ سر۔
عدول؛ راست گو، عادل۔
بیمارستان؛ ہسپتال۔

گرد آن میگردی؛ اس کے گرد گھومتا ہے، اس کے درپے ہو گیا۔
گندہ ناپاک، بدبودار۔

(ترجمہ) مربی سے شرم کی بناء پر نہ اپنے گھر جا سکتا تھا اور نہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے گھر۔ رات کو کسی مسجد میں سو جاتا اور دن کو کسی کونے کھدرے میں جا بیٹھ مختصر یہ کہ دو تین مرتبہ اس (قاضی) سے اسی موضوع پر بات کی مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ساتویں دن میں سختی سے پیش آیا تو کہنے لگا، تجھے مالیخولیا کی تکلیف ہے اور تیرا بھیجا پریشانی، تکلیف اور راستے کے گرد و غبار سے خشک ہو چکا ہے، تو فضول باتیں بنا رہا ہے۔ میں نہ تجھے جانتا ہوں اور نہ اس چیز سے واقف ہوں جس کے بارے میں تو کہہ رہا ہے۔ لیکن جس شخص کا تو نام لے رہا ہے وہ ایک خوبصورت خوشحال اور خوش پوش نوجوان تھا۔ میں نے کہا، اے قاضی میں وہی ہوں، زخموں کی تکلیف سے نڈھال ہو گیا ہوں اور میرا چہرہ بدنما ہو گیا ہے۔ اس نے کہا، اٹھ، میرا سر نہ کھا، اور سلامتی سے چلا جا۔ میں نے کہا، ایسا نہ کر اور خدا سے ڈر کہ اس دنیا کے بعد ایک اور جہان ہے اور ہر کام کے لئے ثواب یا عذاب ہے، اُن بیس ہزار دینار میں پانچ ہزار تمہارے (یعنی تمھیں دیتا ہوں لیکن) اس نے کوئی جواب نہ دیا، میں نے کہا ان دو لوٹوں میں سے ایک تجھے حلال (کرتا ہوں) اور ایک مجھے دے دے؛ کہ بہت عاجز ہو گیا ہوں۔ اور اس کے باوجود اپنے عادلِ حقیقی کو گواہ کر کے اپنے اقرار سے تجھے بالکل بری کرتا ہوں کہ مجھے تجھ سے کوئی اور دعویٰ نہ ہوگا۔ اس نے کہا تجھے جنون تکلیف دے رہا ہے اور تو اس بات پر تل گیا ہے کہ تیری دیوانگی کا فرمان صادر کر دوں اور (یہ) حکم دوں کہ تجھے پاگل خانے میں لیجائیں اور زنجیروں میں جکڑ دیں، اور جب تک تو زندہ رہے وہاں سے نجات نہ پائے، میں ڈرا اور سمجھ گیا کہ اس نے دل میں ٹھان لی ہے کہ مجھے کچھ نہ دیگا اور جیسا وہ حکم کرے گا ویسا ہی کریں گے۔ سو دوبارہ اس کے سامنے سے اٹھ کر باہر آ گیا اور اپنے آپ سے کہا: کہ (عقلمندوں نے) کہا ہے کہ (اگر) گوشت خراب ہو جائے تو اس پر نمک لگاتے ہیں

لیکن اگر نمک ہی خراب ہو جائے تو کیا تدبیر ہو۔

صفحہ نمبر ۱۱

داد رسیدہا : جمع دادرسی، انصاف، عدل۔
بیدادی :- ستمگری، ظلم۔
منہی :- مخبر، جاسوس۔
گرسنہ :- بھوکا۔
مہمانی :- دعوت۔
ماحضر :- وہ کھانا جو حاضر ہو۔
انگشت بدندان گرفتن :- متحیر ہونا۔
روستائی :- دیہاتی، گنوار۔
سمع :- سننا، کان، سماعت۔

دادگر :- انصاف کرنے والا منصف، عادل۔
دِیہ (واحد) دیہات یا دِھات (جمع) گاؤں۔
مساعدت کردن :- مدد کرنا۔ یاری کرنا۔ ساتھ دینا۔
طمع بریدن :- امید منقطع کرنا۔
ماجرای :- قصہ، معاملہ۔

صفحہ ۱۱- ترجمہ :- تمام انصاف قاضی ہے (ہر قسم کی فریاد رسی کے لیے قاضی ہے) مگر جب قاضی ہی ظلم کرے تو کون ہے جو قاضی سے داد خواہی کرے، اگر عضدالدولہ انصاف کرنے والا ہوتا تو میرے بیس ہزار دینار قاضی کے ہاتھ میں نہ ہوتے اور میں یوں بھوکا عاجز اور لاچار (نہ ہوتا) اور اپنے مال، ملک، شہر اور وطن سے قطع تعلق نہ کرتا۔ اسی وجہ سے میں (وہاں سے) چلا آیا۔

جب جاسوس نے آپ بیتی سنی تو اس کا دل پسیجنے لگا۔ اس (جاسوس) نے کہا اے معزز انسان تمام امیدیں ناامیدی کے بعد ہی ہوتی ہیں۔ (یعنی تکلیف کے بعد راحت ہے) خدا سے لو لگا کہ خداوند بزرگ و برتر بندوں کے (بگڑے) کام سنوارتا ہے۔ اس کے بعد مخبر نے آدمی سے کہا : اس گاؤں میں میرا ایک دوست ہے۔ نہایت نیک اور مہمان نواز میں اس کی دعوت پہ جا رہا ہوں، مجھے تجھ سے مل کر بڑی خوشی حاصل ہوئی ہے۔ ہمت کر (یعنی میرے ساتھ چل) کہ آج رات (ہم دونوں) اس دوست کے گھر رہیں۔ کل دیکھو کیا ظاہر ہوتا ہے۔ وہ (جاسوس) اسے اپنے دوست کے ہاں لے گیا۔ اور جو کھانا تیار تھا

لایا گیا، کھانا کھا کر وہیں لیٹ رہے۔

مخبر نے یہ کیفیت ایک کاغذ پر لکھی (دیر کا غذ) ایک دیہاتی کو دے کر کہا کہ عضدالدولہ کے محل کے دروازے پر جا اور فلاں ملازم کو بلا کر یہ تحریر ملازم کو دے دے جو فوراً عضدالدولہ کو پہنچا دے، جب عضدالدولہ نے (تحریر) پڑھی تو ہکا بکا رہ گیا۔ اسی وقت کسی کو بھیجا اور جاسوس سے کہا کہ آج رات اس آدمی کو میرے پاس لا، جب جاسوس کو معلوم ہوا تو اس نے آدمی سے کہا: اٹھ شہر چلیں عضدالدولہ مجھے اور تجھے بلاتا ہے۔ اور یہ قاصد بھیجا ہے۔ اس آدمی نے کہا، خیریت تو ہے، کہا خیریت ہی ہوگی۔ جو باتیں تو مجھ سے راستے میں کر رہا تھا شاید عضدالدولہ کے کان تک پہنچ گئیں مجھے ایسا لگتا ہے تو اپنی مراد پالے گا اور اس کوفت سے آزاد ہو جائے گا۔ اٹھا اور آدمی کو عضدالدولہ کے پاس لے گیا۔ عضدالدولہ نے تخلیے کا حکم دیا اور آدمی کا حال پوچھا۔ اس نے شروع سے آخر تک (اپنا حال) جیسا، پھر سے بیان کیا، عضدالدولہ کا دل اس پر پسیجا۔ کہا تو خوش رہ کہ یہ ایسا کام ہے۔

صفحہ ۱۱

آفریدن :- پیدا کرنا۔
محابا :- طرفداری۔
کفاف :- روزینہ۔
عفار :- سازو سامان۔
تجمل :- شان و شوکت۔
معترف :- اعتراف کرنے والا۔
ملامت :- لعن طعن کرنا۔
پراگند :- وہ پھیلائیں
خداوند زر :- مال کا مالک۔
تہلکہ :- ہلاکت یعنی تباہی و بربادی۔

اجرہ :- اجرۃ۔
مشاھرہ :- ماھانہ آمدنی۔
مشہور :- جوشیلا Emotional
ضیاع :- کھیت۔
مستغل :- کاشتکاری کی زمین۔
گسیل کردن :- اعزام کردن، روانہ کرنا۔
زشت :- برائی۔
نگاہ دارم :- حفاظت کردن۔
اصفہان :- ایران کا مشہور شہر صفوی عہد میں دارالحکومت تھا، اور اسے بڑی شان و شوکت حاصل ہو گئی تھی

ترجمہ:۔ جو مجھے آن پڑا ہے نہ کہ تجھے اور وہ (قاضی) میرا کارندہ ہے۔ اس کام کی چارہ جوئی مجھے کرنی چاہیئے، خدائے تعالیٰ نے مجھے اس لئے پیدا کیا ہے کہ لوگوں کی حفاظت کروں اور کسی کو دکھ نہ پہنچنے دوں، اور وہ بھی قاضی کے ہاتھوں جسے میں نے مسلمانوں کی دولت اور جائداد کی حفاظت کے لیے مقرر کیا ہے (اس کام کی) اجرت اور تنخواہ دیتا ہوں تاکہ وہ مسلمانوں کے فرائض نیک نیتی سے انجام دے، شریعت کے۔ احکام میں جانبداری سے کام نہ لے اور رشوت نہ لے اور اگر میرے دارالخلافے میں ایک بزرگ اور عالم انسان ایسے (کرتوت) کرے تو پھر جو شیلے نوجوان قاضیوں سے کیا امید کی جا سکتی ہے پہلے یہ قاضی درویش اور بال بچوں والا تھا۔ جتنی تنخواہ اس کے لئے مقرر کی تھی وہ صرف اتنی ہے کہ اس کی روزمرہ کی ضروریات پوری ہو جائیں آج بغداد اور اس کے گردونواح میں اس کے پاس اتنی مزروعہ زمینیں، جائداد، باغ، پھلواڑی مال و دولت سازوسامان اور شان و شوکت ہے جس کی کوئی حد نہیں ہے۔ اور یہ تمام جائداد اتنی تنخواہ سے نہیں بنائی جا سکتی۔ پس یہ سچ ہے کہ (یہ تمام چیزیں) مسلمانوں کے مال سے ہیں؛ پھر اس شخص کی طرف متوجہ ہو کر کہا: جب تک تجھے تیرا حق نہ دلا دوں میں نہ اچھی طرح کھاؤں گا اور نہ چین سے سوؤں گا۔ کچھ رقم مجھ سے لے، اور اس شہر سے باہر نکل کر اصفہان چلا جا۔ فلاں آدمی کے پاس (اس وقت تک) رہنا۔ جب تک ہم کچھ لکھ دیں، وہ تجھے اچھی طرح رکھے گا حتیٰ کہ ہم بلالیں، پس دو سو اشرفیاں (سونے کے دینار) اور پانچ جوڑے اُسے دیئے اور راتوں رات اسے اصفہان کی طرف بھیج دیا۔ پھر ساری رات صبح ہونے تک عضدالدولہ سوچتا رہا کہ کس تدبیر سے یہ مال قاضی سے برآمد کیا جائے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا اگر طاقت اور بادشاہت کے بل بوتے پر قاضی کو پکڑوں اور اس پر سختی کروں (تو) کسی صورت میں (جرم کا) اعتراف نہ کرے گا، اور اپنی خیانت کا اظہار نہیں کرے گا اور یہ مال برباد ہو گا، لوگ مجھے لعن طعن کریں گے کہ عضدالدولہ نے ایک بزرگ اور عالم آدمی کو ستایا، مال کی

ہوس میں یہ بدنامی تمام علاقوں میں پھیلائی (یعنی عضد الدولہ مال کے لالچ میں بدنام ہوا) مجھے کچھ ایسی تدبیر کرنی چاہیئے کہ قاضی کی خیانت ثابت کردوں اور مال اس شخص کو مل جائے۔ جب اس بات کو ایک دو مہینے بیت گئے اور قاضی کو صاحب مال کا پتہ نہ چلا (تو) اس حال میں

صفحہ ۱۱، ۱۲

مرگ :- موت۔

خلوت :- تنہائی، تخلیہ۔

عاقبت اندیش :- دور اندیش انجام کو دیکھنے والا۔

معوّلی معتمد۔

از دست ما بیرون کند :- ہمارے ہاتھ سے چھین لے۔

خشنود :- خوش، راضی۔

رستگاری :- نجات۔

مشتی :- کچھ۔

فرازرسد :- پہنچ جائے۔

قیلولہ :- دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرنا۔

ایھا القاضی :- اے قاضی۔

رمیدہ است :- بھاگ گیا ہے۔

ملک جو :- ملک کا متلاشی، ملک گیر، حملہ آور۔

فرمان حق دررسد :- خدا کا حکم آپہنچے، موت آجائے۔

ماخوذ :- پکڑا ہوا، گرفتار کیا ہوا۔

اقلیم :- ملک۔

پوشیدگان :- جمع پوشیدہ: چھپا ہوا، پردہ دار۔ مستورات۔

(ترجمہ) اپنے تئیں کہا: میرے پاس بیس ہزار دینار ہیں، مگر ایک سال انتظار کرتا ہوں شاید کہیں سے اس کے مرنے کی خبر سنوں، کیونکہ جس حالت میں میں نے اُسے دیکھا ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ جلد ہی مرجائے گا۔ جب اس طرح دو مہینے گزر گئے (تو) ایک دن دوپہر کو آرام کے وقت عضد الدولہ نے قاصد کو بھیج کر قاضی کو طلب کیا اور اس سے تخلیے میں کہا۔ اے قاضی: جانتے ہو کہ میں نے کیوں تکلیف دی ہے؟ کہنے لگا، حضور ہی بہتر جانتے ہیں (بادشاہ نے) کہا: میں دور اندیش ہوگیا ہوں اور اس فکر سے میری نیند حرام ہوگئی ہے کہ اس دنیا اور سلطنت کا اعتبار نہیں اور زندگی کا

کچھ بھروسہ نہیں ہے، دو صورتیں ہیں یا تو کوئی حملہ آور کسی جانب سے اٹھ کھڑا ہوگا اور یہ ملک ہمارے ہاتھ سے چھین لے گا، جیسا کہ ہم نے دوسروں سے لیا ہے، غور کرو کتنی مشکلات جھیل کر ہیں اطمینان سے بیٹھ سکا، یا پھر فرمانِ الٰہی آ پہنچے اور ہمیں اس سلطنت سے نامراد ہی جدا کرے۔ موت سے تو کسی کو بھی نجات نہیں اور اب تو اتنی سی عمر باقی رہ گئی ہے، اگر ہم نیک ہوں، اور خدا کے بندوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں تاکہ دنیا اور دنیا والے خوش ہوں تو ہمارے مرنے کے بعد وہ ہمیں نیکی سے یاد کریں گے۔ قیامت کے دن ہمیں نجات بھی مل جائے گی اور (ہم سیدھے) بہشت میں جائیں گے۔ اگر ہم برے ہوں اور مخلوق خدا کے ساتھ برائی سے پیش آئیں (تو) قیامت تک ہمارا نام برائی سے لیں گے، اور جب کبھی ہمیں یاد کریں گے ہم پر لعنت بھیجیں گے۔ قیامت کے دن ہماری گرفت ہوگی اور ہمارا ٹھکانہ دوزخ ہوگا۔ پس جہاں تک ممکن ہے نیکی کی کوشش کریں، لوگوں کے ساتھ انصاف کریں اور ان کے ساتھ مہربانی سے پیش آئیں۔ لیکن آپ سے میری اس گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ محل میں کچھ عورتیں اور بچے ہیں، لڑکوں کا معاملہ تو آسان ہے وہ اڑتے ہوئے پرندوں کی شکل ہیں کہ ایک شہر سے دوسرے شہر تک جا سکتے ہیں (مگر) بیچاری مستورات کا حال بدتر ہے کہ کمزور اور لاچار ہیں اور ان کی بابت میں آج کچھ سوچ سکتا ہوں کل یہ موقع نہ ملے گا کیونکہ (ہو سکتا ہے) یا موت آ جائے اور یا نصیب پھر جائے۔ میں ان کے ساتھ نیکی کرنی چاہتا ہوں، اور آج یہ سوچتا ہوں کہ تمام ملک میں

صفحہ ۱۲، ۱۳

پارسا :- پرہیز گار۔	باورع :- پرہیز گار۔
ود امانت۔	قُوت :- روزی۔
پردہ دریدہ نگردد :- بے حرمتی نہ ہو۔	قسمت کردن :- تقسیم کرنا۔
خشت :- اینٹ۔	نان خوارہ :- دست نگر۔
خونی :- قاتل۔	بنامی :- عمارت۔

بستد :- پکڑ لے
مہمات :- جمع مہم، اہم کام۔
پیرانہ سر :- بڑھاپا۔
نشاید :- مناسب نہیں۔
شادمان :- خوش

دینار مغربی :- خالص سونے کے دینار، مغرب کی کان سے نکلے ہوئے۔

سرداب :- تہہ خانہ، سرد خانہ۔

(ترجمہ) تجھ سے زیادہ متقی، پرہیزگار، حرص و آز سے مبرا، دیانت دار اور ایماندار کوئی شخص نہیں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ دو دفعہ ہزار ہزار طلائی دینار، نقدی اور جواہرات بطور امانت تیرے پاس رکھ دوں، اس طرح کہ صرف تو، میں اور خدای تعالیٰ کی ذات (اس امانت سے) واقف ہو۔ اگر کبھی مجھے کوئی حادثہ پیش آجائے اور ان عورتوں اور بچوں) کی حالت یہاں تک پہنچ جائے، روزانہ کے کھانے پینے کو محتاج ہو جائیں، تو ان کو (اپنے) گھر بلانا، اس طور پر کہ کسی کو علم نہ ہو اور یہ رقم ان میں تقسیم کر دینا، ہر عورت کی شادی کر دینا تاکہ ان کی پردہ دری (بے عزتی) نہ ہو، اور وہ روٹی کے لیے لوگوں کی دست نگر نہ ہوں۔ یہ کام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے گھر میں اندر کے کمرے استعمال کر اور وہاں زمین کے نیچے پکی اینٹوں سے مضبوط عمارت بنوا، جب مکمل ہو جائے تو (مجھے) اطلاع دے تاکہ میں حکم دوں کہ ایک رات بیس خونیوں کو جن کا قتل واجب ہے، قید خانے سے لائیں اور یہ مال ان کی پشت پر لدوا کر تیرے گھر پہنچا دیں۔ زمین کے نیچے تہ خانے میں لے آئیں اور (وہاں سے) لوٹ آئیں، تو پھر میں سب کو قتل کروا دوں تاکہ یہ معاملہ مخفی رہے۔ قاضی نے کہا، تابعدار ہوں، جو کچھ ممکن ہو گا خدمت بجا لاؤں گا، اس کے بعد بادشاہ نے پیش خدمت سے کہا، چپکے سے جا اور خزانے میں سے دو سو خالص طلائی دینار لے آ اور تھیلی میں بند کر دے۔ پیش خدمت گیا اور رقم لے آیا۔ عضد الدولہ نے اس سے رقم لے کر قاضی کے سامنے رکھی اور کہا یہ دو سو دینار اس تہ خانے کو بنوانے کے لئے استعمال کر، اگر (اس رقم سے تہ خانہ) مکمل نہ ہوا تو اور دینار دے دوں گا۔ قاضی نے کہا، واہ (اس کی کیا ضرورت ہے) یہ خدمت تو میں، اپنے پیسوں سے انجام دوں گا۔

عضدالدولہ نے کہا، یہ انصاف نہ ہوگا کہ میرے اہم کاموں پر تو اپنی جیب سے رقم خرچ کرے، تیری رقم حلال کی ہے، اس کام کے لئے مناسب نہیں۔ کوشش یہ کر کہ تجھ پر جو اعتماد کیا ہے اسے بجا لا بعینہٖ جیسے اور خدمات سرانجام دیتا رہا ہے۔ قاضی نے کہا آپ کا فرمانا بجا ہے، وہ دو سو دینار آستین (یعنی جیب) میں رکھے، اور ہشاش بشاش باہر آیا اور اپنے آپ سے بکنے لگا: بڑھاپے میں۔

صفحہ ۱۳، ۱۴

بخت :- نصیبہ۔
بُختی :- کوئی ویل۔
تعجیل کردن :- عجلت کرنا۔ جلدی کرنا۔
بجد :- محنت سے، کوشش سے۔
ظن :- گمان۔
مُعد :- آمادہ، تیار۔
وجہ :- قیمت۔
در وقت :- اسی لمحہ، فی الفور۔

قبالہ :- معاملات کی سند۔
دانگی :- چھ رتی وزن۔
نماز خفتن :- نماز عشاء
الحمدللہ :- خدا کا شکر ہے۔
خطا :- غلط۔
بیّاعان :- سوداگر، دلال۔
گسیل کرد :- روانہ کر دیا، بھیج دیا۔

(ترجمہ) خوش نصیبی اور دولت میری رفیق ہو گئی۔ (اب) میرا گھر سونے سے بھر جائے گا۔ اگر بادشاہ کو کچھ ہو گیا تو نہ کوئی ثبوت ہوگا اور نہ کوئی گواہ۔ سب کچھ میرے بچوں کے پاس رہے گا۔ اس دولت اور لوٹوں کا مالک جو (ابھی) زندہ ہے پھوٹی کوڑی بھی مجھ سے نہیں لے سکتا (تو) بادشاہ جو مر جائے گا۔ کون (رقم) کیسے لے سکے گا۔ گھر گیا اور تہ خانہ کی تعمیر میں عجلت سے کام لیا۔ ایک ہی مہینے میں نہایت مضبوط سردابہ (تہ خانہ، حمام) بنوا لیا۔ (پھر خبر لے کر) عضدالدولہ کی خدمت میں پہنچا۔ نماز عشاء کے وقت عضدالدولہ نے اسے تخلیے میں طلب کیا اور کہا، اس وقت کس کام سے آئے ہو، اس نے کہا کہ حضور کو یہ اطلاع دینی چاہتا ہوں کہ حسب الحکم تہ خانہ مکمل ہو گیا۔ عضدالدولہ نے کہا بہت خوب، مجھے معلوم تھا کہ تو امور (کی انجام دہی) میں محنت کرے گا۔ خدا کا

شکر ہے کہ تیری بابت میرا گمان غلط نہیں ہے (تو نے) میرے دل کو اس تشویش سے نجات دی۔ میں نے جیسا کہ تجھ سے کہا تھا ہزار ہزار اور پانچ سو بار ہزار سونے چاندی کے دینار تیار کر لئے، پانچ سو مزید (دینار) شامل کر لینے چاہئیں (علاوہ ازیں) بے شمار (قیمتی) کپڑے، عود، عنبر، مشک، کافور (وغیرہ) اس مقصد کے لیے رکھ چکا ہوں اور اس میں ہوں کہ وقتاً فوقتاً سوداگر آئیں اور انھیں بیچ دیں یہ کام اس ہفتہ میں ختم ہو جائے گا، پھر یکمشت وہاں (تہ خانے میں) لے آئیں گے۔ میں کل رات تیرے گھر آؤں گا تاکہ ایک نظر دیکھوں کہ تہ خانہ کیسا بنا ہے، میں نہیں چاہتا کہ تو کسی قسم کا تکلف کرے کیونکہ میں فوراً ہی لوٹ آؤں گا۔ قاضی کو رخصت کیا اور فوراً ایک قاصد صاحب مال کو بلانے کے لئے اصفہان بھیجا۔ دوسری رات قاضی کے گھر گیا، وہ تہ خانہ دیکھا، پسند کیا اور قاضی سے کہا کہ منگل کے دن آنا تاکہ جو کچھ تیار ہوا ہے، دیکھ لو۔ (قاضی نے) کہا: اطاعت گزار ہوں۔ جب قاضی کے گھر سے (بادشاہ) واپس ہوا تو خزانچی کو حکم دیا کہ سونے سے بھرے ہوئے ۲۰۰ لوٹے خزانے میں رکھوا دے۔

صفحہ ۱۷۱

قرابہ:۔ بوتل، صراحی۔
زرین:۔ سونے کے۔
پرداخت:۔ مشغول ہوا۔
احتمال کردن:۔ برداشت کرنا، تحمل کرنا۔
تظلم:۔ فریاد کرنا۔
جہانیان:۔ جہان والے۔
والا:۔ دگرنہ۔
شناعت:۔ بدی، برائی۔

مروارید:۔ موتی۔
خیرہ ماند:۔ حیران رہ گیا۔ آنکھیں چندھیا گئیں۔
فیھا:۔ یعنی پس اس میں، یا اس کے ساتھ، مراد اچھا، بہتری اسی میں ہے۔
صواب:۔ بہتری۔
عہدہ:۔ فرض، ذمہ داری۔

(ترجمہ) (خزانچی نے) تین بوتلیں موتیوں کی، کچھ سرخ یاقوت سے بھرے ہوئے اور تین جام اصلی یاقوت، لعل اور پیروزے سے بھرے ہوئے لوٹوں کے پاس رکھوا دیے جب

خزانچی اس کام سے فارغ ہو گیا اور منگل کا دن آ پہنچا (تو) عضدالدولہ نے قاضی کو بلوایا، اور اس کا ہاتھ پکڑ کر، اس مقام پر لے گیا جہاں وہ دولت رکھی تھی۔ قاضی دولت کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ (بادشاہ نے) کہا: سن اس ہفتے آدھی رات کو یہ مال لے جانا۔

(پھر) اس جگہ سے باہر آ گئے، اور قاضی لوٹ گیا، خوشی کے مارے اس کا دل بلیّوں اچھل رہا تھا۔ اتفاق سے دوسرے دن صاحب مال بھی آ پہنچا، عضدالدولہ نے اس سے کہا، میں چاہتا ہوں کہ ابھی قاضی کے پاس جائے، اور اس سے یہ کہے کہ میں نے کافی عرصہ صبر کیا اور تیری عزت کا پاس رکھا۔ اس سے زیادہ اب میں تحمل نہیں کروں گا۔ تمام اہل شہر (اچھی طرح) جانتے ہیں کہ میرے اور میرے والد کے پاس کتنی دولت تھی۔ (سب) میری بات کی تائید کریں گے۔ اگر تو میری رقم واپس کر دے تو بہتر ہے ورنہ ابھی عضدالدولہ کے پاس جا کر (تیرے خلاف) فریاد کروں گا اور تجھے اب ذلیل کروں گا کہ لوگ عبرت پکڑیں گے (اور) دیکھ کہ قاضی کیا جواب دیتا ہے۔ اگر تیرا مال تجھے واپس دے دے تو بہت ہی اچھا ہے ورنہ جو کچھ وہاں پیش آئے مجھ سے (آکر) بیان کر۔ وہ شخص قاضی کے پاس گیا اور اس کے پہلو میں بیٹھ کر وہی کچھ کہا۔ قاضی ڈرا کہ اگر یہ میری شکایت کرے اور عضدالدولہ کے پاس جائے اور اسے میرے بارے میں شبہ ہو جائے (تو) وہ مال میرے گھر نہیں بھیجے گا (چنانچہ) مصلحت اسی میں ہے کہ اس کا مال واپس کر دوں، سونے کے ایک سو پچاس لوٹے اور بے شمار جواہرات (اس شخص کے) دو لوٹوں سے (بدرجہا) بہتر ہیں (پس قاضی نے) اس شخص سے کہا، ذرا ٹھہر (میں تو خود) تجھے سارے جہان میں ڈھونڈ تا رہا ہوں (یعنی میں نے تو تیرے لئے جہان کی خاک چھان ماری ہے) (یہ کہہ کر) اٹھا اور کمرے میں جا کر اُسے (بھی) وہیں بلا لیا اور اس سے بغلگیر ہو کر کہا، تو (تو) میرا دوست ہے اور میں تجھے اپنا بیٹا سمجھتا ہوں۔ میں نے وہ ساری کارروائی محض احتیاط کے طور پر کی تھی۔ اس دن کے بعد تجھے آج پھر دیکھا تو اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوا، اٹھا اور

دونوں لوٹے
صفحہ نمبر ۱۵

برگیر :- پکڑے۔
بلب گور رسیدہ ای :- تو مرنے کے قریب ہے، قریب المرگ ہے۔
مکافات :- بدلہ۔
حاجب :- چوکیدار، دربان۔

حمّال :- بوجھ اٹھانے والا، مزدور۔
خیانت درزیدن :- خیانت کرنا، کسی کا مال بطور امانت اپنے پاس رکھ کر مکر جانا۔
زنہار خوردن :- عہد و پیمان توڑنا قول سے پھرنا۔

(ترجمہ) اس شخص کے سامنے لاکر کہا، یہ تیرا مال ہے، اب سنبھال لے اور جہاں جی چاہے چلا جا۔ آدمی باہر نکلا اور دو مزدور لے کر قاضی کے گھر آیا، لوٹے ان کی گردن پر رکھ کر، انھیں عضدالدولہ کے محل لے گیا، جب (عضدالدولہ نے) سونے کے لوٹے دیکھے تو ہنسا اور کہا خدا کا شکر ہے کہ تو نے اپنا حق پالیا اور قاضی کی بددیانتی ظاہر ہو گئی (کیا) تو جانتا ہے کہ تیرا مال تجھے دلوانے کے لئے میں نے کیا تدبیر کی، بزرگوں نے پوچھا معاملہ کیا ہے؟ عضدالدولہ نے، جو گزری تھی کہہ سنائی، سب حیران ہوئے۔ پھر بڑے دربان کو حکم دیا کہ جاؤ اور قاضی کو ننگے سر، ننگے پاؤں، پگڑی کا پھندا گلے میں باندھ کر میرے پاس لے آؤ۔ دربان گیا اور قاضی کو اسی طرح لے آیا جس طرح بادشاہ نے حکم دیا تھا۔ جب قاضی کو لایا گیا (تو اس نے) اس آدمی کو دونوں لوٹے ہاتھ میں پکڑے وہاں کھڑے دیکھا (اس پر قاضی نے دل میں) کہا، افسوس میں تباہ ہو گیا، اور سمجھ گیا کہ (عضدالدولہ نے) جو کچھ اس سے کہا اور دکھایا تھا، انہی دو لوٹوں کی خاطر تھا۔ پس عضدالدولہ نے جوش میں آکر (قاضی) سے کہا کہ تو عمر رسیدہ، عالم فاضل، اور صاحب علم اور صاحب اقتدار شخص ہے اور قریب المرگ ہے لیکن امانت میں خیانت کرتا ہے۔ اور عہد و پیمان توڑتا ہے۔ (تو) دوسروں سے کیا توقع کرنی چاہیئے، معلوم ہوا جو جائداد (وغیرہ) تو نے بنوائی ہے مسلمانوں کے مال اور رشوت سے ہے۔ اس جہان میں تجھے

کیفر کردار کو پہنچاتا ہوں اور اس جہاں میں تو خود سزا پالے گا۔ اس بنا پر کہ تو بوڑھا اور عالم شخص ہے، تیری جان تو بخشتا ہوں، لیکن تیری دولت اور جائداد خزانے کے لئے (ضبط) ہے۔ جو جائداد اور دولت اس (قاضی) کے پاس تھی اس سے چھین لی اور اسکے بعد اسے کبھی عہدہ عطا نہ کیا۔ اور وہ دونوں لوٹے اس آزاد شخص کے حوالے کر دیے۔

ابوبکر نجم الدین محمد

راحت الصدور کے مصنف کے حالات معلوم کرنے کے لئے اُس کے آثار ہی بہترین ذریعہ ہیں۔ اُس کی طبع لطیف کے شہ پاروں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا نام ابو بکر نجم الدین محمد بن علی بن سلیمان بن محمد بن احمد بن الحسین حمات الراوندی ہے۔ خاندانی لحاظ سے راوند کے مشہور و معروف علماء و فضلاء سے تعلق پذیر تھا۔ مصنف کی تاریخ پیدائش کے متعلق اُس کی تخلیقات خاموش ہیں۔ مگر اتنا معلوم ہوتا ہے کہ بچپن ہی میں اس کے باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ علم کا شوق تھا۔ ہونہار فرزند دیکھتے ہوئے اس کے ماموں تاج الدین بن محمد بن علی راوندی نے اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا۔ جو کہ اس وقت ہمدان کے کالج میں پروفیسر تھا، اور بہت عالم و فاضل تھا۔ فقہہ و شرح قرآن میں اسے خاص دسترس حاصل تھی، فن خطاطی میں ماہر ہونے کی وجہ سے بہترین کاتب تھا۔ فارسی و عربی ادب کا دلدادہ تھا جس میں اس نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ ابو بکر نجم الدین محمد دس سال تک اپنے ماموں کے علم سے فیض یاب ہوتا رہا۔ بمطابق ۵۸۰ھ و ۱۱۸۴ء اپنے ماموں کے ساتھ عراق اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں کی سیاحت کی۔ اب ابو بکر کا ذہن جلا پا چکا تھا۔ اور مضامین کے ساتھ ساتھ فن خطاطی۔ کتابت۔ جلد سازی اور ملمع سازی میں بھی مہارت حاصل کر لی۔ سائنس سے دلی لگاؤ تھا۔ چنانچہ اپنے عہد کے مشہور ڈاکٹروں سے اس چیز کی احتیاج بھی جاتی رہی۔ یہیں اُس کی استعداد ذہن کو دیکھتے ہوئے اسکو

پھر ہمدان کے کالج میں ہی پروفیسر بنا دیا گیا۔ تجربہ کے ساتھ ادب سے لگاؤ بڑھتا گیا۔ اس نے نظمیں لکھنی شروع کیں۔ ان اشعار کے پیرایہ میں اس نے اپنے علم و فضل کا اظہار کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زاہد تھا۔ کئی سال فقہ اور قرآنی مسائل کی تشریح پر صرف کئے صحافت اور کتابت میں ماہر روزگار تھا۔

اُن دنوں سلطان طغرل کو فن خطاطی و کتابت سیکھنے کا شوق چرایا۔ ابو بکر نجم الدین محمد اپنے چچا کے ساتھ اُس کے دربار میں آیا۔ چنانچہ چچا نے اُس کا تعارف بحیثیت ایک آرٹسٹ کے کروایا۔ طغرل نے اسے گوہر تابندہ دیکھتے ہوئے جاگیر عطا کی۔ چونکہ اُن کے سب چچا شاہی بچوں کے اتالیق تھے اس وجہ سے مصنف پر نظر عنایت ہوتی رہی۔ اپنے چچا کے ساتھ مازندران آیا۔ مگر چچا بیماری کی وجہ سے واپس چلا گیا۔ اور ابو بکر نے سوچا کہ سکونت کسی اور ہی شہر میں کرنی چاہیئے۔ علوی خاندان نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور یہ اُس کے بیٹوں کا اتالیق مقرر ہوا۔ چھ سال تک وہیں رہا اس کے بعد اپنے شاگرد رشید کے ہاں دو سال تک اقامت گزیں رہا۔ یہی وہ زمانہ تھا جبکہ مصنف نے سب سے پہلے اپنے خیالات و افکار کو کاغذی پیراہن میں ملبوس کرنا چاہا۔ ہر یہ الائی کرنے سے پیشتر ابو بکر نے سوچا کہ جدید شعراء کا کلام ماضی کا ترجمان ہونے کی وجہ سے زیادہ مناسب ہے اس لئے ابوالفرج رونی۔ انوری۔ عمادی کے کلام کا تجزیہ کرنے کو سنائی منوچہری رودکی اور عنصری کے کلام سے بہتر پایا۔ یہ ہی آراء اس وقت کے دیگر محققین کی تھیں۔ چنانچہ اس ہم آہنگی کی بدولت راحت الصدور جیسی کتاب معرض وجود میں آئی جو کہ دنیائے تاریخ کے بڑے شاہکاروں میں تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے تاریخ کے ساتھ ساتھ شعراء کا بہترین کلام بھی چاشنی کے لئے شامل کیا ہے۔

جن دنوں مصنف راحت الصدور کے لئے مواد فراہم کر رہا تھا یہ عجیب خلفشار کا زمانہ تھا۔ خوارزم شاہیوں کی یلغار نے عجیب انتشار پیدا کر دیا تھا۔ اسی چپقلش کے دوران میں علم و فضل کا بہترین ذخیرہ تباہ ہو گیا۔ اخلاقی و کرداری قدروں کی شمع بجھ چلی تھی۔ علماء و فضلاء کا کوئی قدردان نہ تھا۔ چنانچہ ان تلخ اوقات سے ابو بکر نے بہترین مطالع

کام لیا۔ اور اس مطالعہ کے بعد اس نے اپنے اشہبِ قلم کو راحت الصدور کے موضوع پر جولان کیا۔ ۵۹۹ھ میں یہ کتاب شروع کی۔ اور دو یا تین برس کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

جب راحت الصدور ختم ہو چکی تو چونکہ یہ سلجوقی خاندان کی تاریخ و داستان تھی اسی لیے ابو بکر اس کو سلجوقی فرمانرواؤں کے نام منسوب کرنا چاہتا تھا۔ پہلے اُس نے رکن الدین سلیمان شاہ کے نام سے معنون کی۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ رکن الدین نے غاصبانہ عنانِ حکومت سنبھالی ہے۔ حالانکہ اس کا بھائی کیخسرو تخت کا حقدار تھا چنانچہ اس اعتراف کے بعد مصنف نے اس کو دوبارہ تدوین کیا۔ تاکہ کیخسرو سے واقعات منسوب کر سکے۔ تاہم اس کتاب سے مصنف کی کوشش کے باوجود دونوں فرمانرواؤں سے تطابق کا علم ہوتا ہے۔ راحت الصدور سے اچھی کتاب سلجوق خاندان کی زندگی کی نقاب کشا نظر نہیں آتی۔ اس گراں مایہ آثار کے علاوہ بعض کا خیال ہے کہ (Rafila) اندیپہ کتاب لکھی۔ اور فن خطاطی پر بھی۔ دو اور کتابوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ ایک سلطان طغرل کے حالات زندگی سے متعلق اور دوسری حضرت آدم سے لے کر مصنف کے وقت تک۔ مگر ان آثار میں سے کوئی بھی موجود نہیں۔ تنہا راحت الصدور اُس کے حالات کی ترجمان ہے۔ اور اس کو شہرت عام و بقائے دوام بخشتی ہے۔

راحت الصدور کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ سلجوقی خاندان کی تاریخ کا مرقع ہے۔ اس سلطنت کی ابتدا پانچ صدی ہجری سے لے کر چھٹی ہجری کے آغاز تک رہی۔ اس کتاب کے دو حصے ہو سکتے ہیں۔ پہلے میں بارہ فرمانرواؤں کے حالات قلمبند ہیں۔ اور دوسرے حصہ میں آخری دو تاجوروں کے سوانح ہیں۔ طرز ادا کی بے ساختگی، فصاحت و بلاغت۔ سادگی اور روانی نے اس کو نہایت مقبول بنا دیا ہے۔ یہ کتاب مصنف کی عربی و فارسی دانی کا بہترین اعتراف ہے۔ مثالوں کے لیے مصنف نے شعری جواز بھی ڈھونڈے ہیں۔ جنہوں نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔

ابو بکر نجم الدین محمد کی تخلیق کا ماخذ سلجوق نامہ ظہیر نیشاپوری ہے۔ جو کہ سلطان طغرل کے عہد حکومت میں لکھی گئی۔ راحت الصدور اپنے ماخذ و مواد کے لحاظ سے

ایک مشعلِ راہ ثابت ہوئی اور بعدازاں دو سرو‌ں نے بھی اس سے مدد لی۔ روضۃ الصفا۔ حبیب السیر۔ تاریخ الفی کے مصنف بھی راحت الصدور کے مواد کو پیش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ واقعات کے ساتھ ساتھ الفاظ بھی وہی ہیں۔ سب سے آخر میں تاریخ جہانگشائی کتابت میں آئی۔ یہ کتاب سلجوقی دور کی بہترین ترجمان ہے۔ مگر اس کا ماخذ بھی راحت الصدور ہے۔ کیونکہ بہت سے مطالب و معنی میں یکسانیت ہے۔

تاریخ پیدائش کی طرح تاریخ وفات بھی پردہ اخفا میں ہے۔ مگر جب تک راحت الصدور زندہ ہے اس وقت تک مصنف کی علمی ذہنی استعداد قابل پرستش رہیں گی۔

راحۃ الصدور و آیۃ السرور سے

صفحہ ۲۳

سائیس :۔ نگہبان، کوتوال، گھوڑے کا محافظ، سیاستدان۔

آگندہ :۔ بھرا ہوا، لتھڑا ہوا (آگندن مصدر سے)

دونی :۔ کمینہ پن۔

سعایت :۔ بدگوئی، چغلی کھانا۔

اساس :۔ بنیاد۔

خرہ :۔ بھتلی۔

سرور :۔ خوشی۔

اذخار :۔ ذخیرہ کرنا۔

سمر :۔ کہانی، مشہور۔

سخن چینی :۔ عیب جوئی۔

رائس :۔ سرجرٹ۔

مجھول :۔ غیر واضح، غیر مشہور، نامعلوم۔

میل :۔ میلان، رجحان، رغبت۔

مغرور :۔ فریفتہ، دھوکا کھانا۔

سلطان محمد :۔ سلطان غیاث الدین ابو شجاع محمد سلاجقہ بزرگ میں سے ساتواں بادشاہ (۴۹۸ھ - ۵۱۱ھ) (۱۱۰۴ء - ۱۱۱۷ء)

ھمذان :۔ ہمدان، ایران کے ایک مشہور شہر کا نام۔

(ترجمہ) سلطان محمد ایک خدا ترس، عادل، سیاستدان اور علم دوست بادشاہ تھا لیکن مال جمع کرنے کا بہت ہی شائق تھا۔

(شعر) جو کوئی اس جہان پر فریفتہ ہو جاتا ہے وہ آرزوؤں اور خوشی سے پھول جاتا ہے۔ یعنی جو کوئی اس دنیا کا متوالا ہے، اس کا تمام تر مقصد دنیوی مسرتوں کا حصول ہے، اس کی خوشیوں اور امیدوں میں مست رہتا ہے۔

۲ : اگر تو کسی کام کے درپے ہو جائے تو پھر اسی کے لئے دنیا میں مشہور ہو جاتا ہے۔ کوئی کام خواہ اچھا ہو یا برا، اگر انسان اُسے شدت سے اختیار کرتا ہے تو اسی کی بناء پر وہ لوگوں میں شہرت پالیتا ہے۔

خواجہ احمد بن نظام الملک، اس زمانہ میں جب اس کے وزیر تھے۔ سید ابو ہاشم ہمدان کے حاکم اور علاء الدولہ کے دادا، کے درپے ہو گئے۔ اور سلطان سے یہ طے کیا کہ سید کو اس کی (نظام الملک) تحویل میں دینے پر پانچ لاکھ دینار حاصل کریں گے۔

حکمت : عیب جوئی کمینہ پن کی بناء سے ہوتی ہے اور چغلخوری سفلہ پن کا نتیجہ ہے اور یہ دونوں برائیوں کی اصل اور بے وفائی کی جڑ ہیں۔ ان دونوں راستوں پر نہ جاؤ اور جو کچھ یہ دونوں (عیب جو اور چغلخور) کریں اس سے بچو۔

(شعر) ہنرمندوں میں عیب نہیں ہوتا، (لہذا) تو ان کے عیب مت ڈھونڈ۔ نیک لوگوں کے متعلق جو برائی تیرے دل میں ہے، بیان مت کر۔

اس سے پیشتر کہ کوئی شخص سید کو پکڑنے ہمدان جاتا، اُسے (سید کو) خبر ہو گئی۔ فی الفور اپنے تین بیٹوں کے ساتھ سوار ہوا ایک غیر معروف راستے سے ایک ہی ہفتہ میں اصفہان پہنچ گیا، سلطان کے خاص آدمیوں میں سے ایک خادم کو بلایا کہ اُسے رات کو سلطان کے حضور لے جائے۔ لالہ قراتگین کو مقرر کیا گیا، اُسے بلایا اور دس ہزار دینار دس تھیلوں میں پیش کئے اور کہا کہ یہ تیرا نذرانہ ہے۔ آج رات مجھے تخلیے میں

صفحہ ۲۴

کمر بست : آمادہ ہو گیا۔	متحیر شد : حیران ہو گیا۔
عار : ذلت۔	دُرِ یتیم : نادر موتی۔
زیر آرد : قبضہ میں لائے۔	کریم : سخی، جوانمرد۔

تندی : تیزی، جلدی۔
بہا : قیمت۔
وزان : وزن کرنے والا، بڑا تولنے والا۔
آمال : جمع آمل، امید، آرزو۔
علیہ السلام : ان پر سلامتی ہو اور درود ہو۔
ضد : مخالف، اختلاف۔
شحنہ : کوتوال۔
باضافت : علاوہ ازیں۔
نفقات : جمع نفقہ، کھانے پینے کا خرچ۔
خداوند عالم : دنیا کا مالک۔
مرکب : سواری۔

(ترجمہ) سلطان کی خدمت میں لے جانا، خواجہ لالا نے کبھی اتنا مال نہیں دیکھا تھا حیران رہ گیا اور کہا، یہ مال سلطان کو پہنچانا ہے، سید نے کہا، نہیں یہ صرف تیرے لئے ہے۔ خواجہ اس کی خدمت کے لئے تیار ہو گیا، اور اسی رات اسے سلطان کے حضور لے گیا، سید عمر رسیدہ، نابینا اور نورانی تھا۔ سلطان کی بیگم قتلغ خاتون بھی موجود تھیں۔ سید ابو ہاشم نے سلطان کو دعائیں دیں اور ایک ایسا نایاب موتی لایا (پیش کیا) کہ سلطان کے پاس ویسا نہ تھا، سید نے رو کر کہا، خواجہ احمد ایک عرصے سے خاکسار کے دوپلے آزار ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اس نے غلام کو (مجھے) پانچ لاکھ دینار میں خرید لیا ہے (مگر) حضور کے لئے یہ مناسب نہیں کہ پیغمبر علیہ السلام کی اولاد کو بیچیں ایسا کام نہ کیجئے جس سے کہ دنیا میں ندامت ہو اور عقبیٰ میں نقصان، فدوی پانچ لاکھ دینار کو آٹھ لاکھ میں اس شرط پر بدلتا ہے کہ آپ (احمد بن نظام کو) میرے حوالے کر دیں۔ جوانمرد وہ ہے جو اپنی تکلیف کو دُور رکھے اور بہادر وہ ہے جو خود کو قابو میں کرے۔ سلطان کے دل میں مال کی محبت، وزیر کی حفاظت پر غالب آ گئی، وہ مان گیا، سید ہاشم واپس گیا، خزانہ کا پاسبان اس کے ساتھ آیا تا کہ مال لے جب ہمدان پہنچے تو جس منزل و مقام پر فرد کش ہوتا تھا، سید نے کہا کہ کاروانسرائے اور کھانے پینے کا خرچ اپنی جیب سے کرنا ہوگا کہ تمہیں یہاں چند دن قیام کرنا پڑے گا اس مال کو تولنا اور شمار کرنا ہے۔ غلام نے عجلت کی، سید نے کہا اگر تو نے اطاعت نہ کی تو میں حکم دوں گا کہ تجھے اس سرائے کے دروازے پر لٹکا دیں۔ اور اس

مال کے ساتھ ایک لاکھ دینار مزید لیجاؤں گا کہ تجھ جیسے ہزار غلاموں کی قیمت ہے۔
ایک ہفتے سے زیادہ عرصہ نہ ہوا کہ تمام دولت نقد ہی کی گئی نہ قرض لیا اور نہ ہی کوئی جائداد فروخت کی، جو کوئی مال کی حفاظت کرتا ہے مقاصد کو پالیتا ہے اور جو کوئی محنت کو اپنا شعار بناتا ہے، مخالف کو روند ڈالتا ہے۔ پھر حکم دیا تو (لوگ) درخت لائے اور ہر ٹکڑا تین تین حصوں میں ہاتھوں سے قطع کیا، اور فراغت پائی۔ اسی ٹکڑے۔

صفحہ ۳۴، ۳۵

استر: خچر۔	کمر: پیٹی۔
تعبیہ کردن: چھپانا، آراستہ کرنا۔ معما کہنا۔	تعجیل کردن: عجلت کرنا۔

(ترجمہ) لکڑی اور تھیلیوں کے بنائے اور ہر تھیلی میں دس ہزار دینار چھپائے اور ان لکڑیوں سے ان تھیلیوں کے منہ پر ڈھکنے لگائے، اور لوہے کی پٹیاں چڑھادیں اور دونوں لکڑیاں ایک خچر پر رکھیں (اس طرح) چالیس خچروں پر آٹھ لاکھ دینار کا بوجھ (لدوا کر) غلام کی معیت میں روانہ کیا اور ایک دینار غلام کو (بطور انعام) دیا۔
غلام اس سازوسامان کے ساتھ ایک مہینے میں سلطان کی خدمت میں پہنچا (بادشاہ نے) غلام سے پوچھا کہ یہ دولت اتنی جلدی کہاں سے حاصل کی؟ جواب دیا، تمام خزانے سے نکالی، اتنا عرصہ بھی (صرف) وزن کرنے، گننے اور چھپانے میں صرف ہوا ورنہ اسی روز غلام کو واپس بھیج دیتا۔ سلطان کو اس کیفیت اور دولت سے بڑا تعجب ہوا سلطان محمد نے خواجہ احمد کو سید کے حوالے کو دیا تاکہ اس (خواجہ احمد) سے بدلہ لے لے۔
(شعر) جو کوئی اپنے بھائیوں کے لئے راستے میں کنواں کھودتا ہے، خود ہی اس میں گر پڑتا ہے (یعنی چاہ کن راچاہ درپیش)
خواجہ احمد نے جو کچھ امیر سید کے بارے میں سوچا تھا خود اس میں پھنس گیا۔

جو کچھ تو اپنے لئے پسند نہیں کرتا، دوسروں کے لئے بھی پسند نہ کر۔ (یعنی انسان کو نیک نیتی سے زندگی بسر کرنی چاہیئے، دوسروں کی برائی چاہنے سے قبل یہ سوچ لینا چاہئے کہ اگر وہ معاملہ اپنے ساتھ پیش آجائے تو کیا گزرے گی۔ اسی حقیقت کے مدِ نظر رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے: کہ کوئی مسلمان اس وقت تک مومن کہلانے کا مستحق نہیں، جب تک وہ دوسروں کے لئے وہی کچھ نہ چاہے جو اپنی ذات کے لئے پسند کرتا ہے)۔

عبید زاکانی

تاریخ ادبیات میں عبید زاکانی کے سوانح حیات اور حالات کی اس قدر مفصل اطلاع نہیں ملتی۔ ہماری معلومات کا ذریعہ یا تو خود عبید زاکانی کے آثار و تالیفات ہیں اور یا ادبار کے تذکرے۔ مگر زیادہ مستند حمداللہ مستوفی کی تاریخ گزیدہ ہے۔ چونکہ یہ عبید کے ہمعصر ہیں اس لئے اس میں انھوں نے درست معلومات کا ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ دولت شاہ نے بھی عبید زاکانی کے متعلق کافی کچھ لکھا ہے۔

اِن سب چیزوں سے یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اُن کا پورا نام عبیداللہ، نظام الدین لقب اور تخلص عبید تھا۔ زاکانی انھوں نے محض عرب قبیلے زاکانیاں کی مناسبت سے رکھا۔ اس چیز کا اظہار خود اُن کے اشعار سے بھی ہوتا ہے۔

گر کنی بادیگران جور و جفا　　　با عبید اللہ زاکانی مکن

زاکانیاں قبیلہ بنی خفاجہ کی شاخ میں سے تھا۔ کچھ حوادث کی بدولت اس قبیلہ کے کچھ لوگ اکثر قزدین آباد ہو گئے۔ اُن میں عبید کا خاندان بھی تھا۔ یہ خاندان عالم فاضل تھا اس خاندان میں دو قسم کے عالم تھے۔ پہلے شعبہ میں تو اہل علم و حدیث اور منقول و معقول

کے ماہر آتے ہیں۔ اور دوسرے ارباب صدور۔ حمداللہ مستوفی عبداللہ کو ارباب صدور کی صف میں گردانتے ہیں۔

"از ایشاں صاحب معظم نظام الدین عبید اللہ زاکانی اشعار خوب دارد و رسائل بے نظیر"

تاریخ گزیدہ ۷۳۰ھ میں تالیف ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک عبید زاکانی نے اپنے رسائل اور شعر و فن کی بدولت خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ عبید کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ وزارت کے عہدہ پر بھی مامور تھے۔ مگر تاریخ گزیدہ اس واقعہ کے متعلق خاموش ہے۔ بہر حال اگر وزارت ملی بھی ہوگی تو تاریخ گزیدہ کی تالیف سے بہت عرصہ پیشتر ممکن ہے۔

عبید زاکانی کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی وقتاً فوقتاً زمانہ کے ساتھ ساتھ بہت سے حاکموں کی مدح کرتے رہے۔ ان کی کتاب نوادر الامثال خواجہ علاءالدین محمد کے نام معنون ہے۔ جو کہ ۷۲۰ھ میں سلطان ابو سعید کے حکم سے وزیر بنائے گئے۔ لیکن صرف چھ ماہ منصب وزارت پر فائز رہے۔ اس سے یہ بات اور بھی یقینی ہو جاتی ہے کہ عبید زاکانی واقعی ۷۳۰ھ سے پیشتر ہی اپنے افکار و مطالب کی وجہ سے مشہور تھے۔ ان دنوں عبید زاکانی شیراز میں تھے۔ اور اس عالی مرتبت شاعروں کی سرزمین میں کافی مقبولیت حاصل کرنے کی وجہ صرف ان کے کلام کی پختگی ہو سکتی ہے۔ گو عبید سعدی کی ہمعصری حاصل کرنے سے قاصر رہے لیکن حافظ کے بہترین شاعری کے ایام میں عبید نے وہاں کے برگزیدہ لوگوں سے راہ رسم پیدا کر رکھی تھی۔ اور حافظ کی طرح ابو اسحاق اور شاہ شجاع کی مدح میں شعر بھی کہے۔ حافظ کی ہمعصری کے باوجود عبید کے اپنے کلام میں حافظ کے متعلق کوئی شعر نہیں ہے۔ البتہ وزن اور قافیہ کے لحاظ سے عبید کی چند غزلوں پر حافظ کا شائبہ ہو سکتا ہے۔

شاہ شیخ جمال الدین ابو اسحاق اینجو حافظ کے ممدوح تھے مگر عبید کے کلام

میں بھی اکثر اشعار میں اسی شاہ کی مدح ہے۔ مگر ان سے کوئی تاریخی واقعہ معلوم نہیں ہو سکتا جس سے عبید کی زندگانی آشکار ہو سکے۔ عبید نے اپنی مثنوی عشاق نامہ بھی اسی بادشاہ سے منتسب کی یہ مثنوی ۷۵۱ھ میں تالیف کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبید اس مدت تک شیراز میں موجود تھے۔

رکن الدین عمید الملک بھی عبید اللہ کے ممدوح خاص تھے۔ ان کو ابو اسحاق انہوں نے وزارت کا عہدہ دے رکھا تھا۔ اس وزیر کی مدح میں عبید یوں رقمطراز ہیں۔

کشیدہ اختر سعدم بدرگاہِ تو زمام | کنون دواز دہ سالست ناز ملک عراق
کہ باد تا بہ ابد قبلۂ کبار و کرام | ہنوز منزل من غیر آستانہ تو

رکن الدین عمید الملک خود بھی مرد فاضل اور بلند ہمت تھے۔ شاعر دوست ہونے کی وجہ سے عبید کو خاصا مقام حاصل رہا۔ اُن ہی دنوں عراق میں ابو سعید کے مرنے کے بعد خلفشار شروع ہوئی تو عبید زاکانی فارس چلے آئے۔ یہاں سلطان اویس جلائری کی مدح بھی کی۔ اویس شعری ذوق رکھتا تھا۔ سلمان ساوجی خاص شعراء میں سے تھے۔ یہاں عبید زاکانی کی سلمان ساوجی سے ملاقات ہوئی۔ انہی ایام میں شاہ شجاع مظفری امیر مبارز الدین کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ ۷۶۰ھ سے لے کر اپنی عمر کے آخری ایام تک عبید زاکانی اسی دربار سے متعلق رہے۔ جب شاہ شجاع نے اصفہان فتح کیا تو اس فتح پر عبید نے قصیدہ لکھا جو کہ بڑا اہم ہے۔

کشید تیغ و براطراف شرق گشت روان | سپیدہ دم کہ شہنشاہ گنبد گردان
مرا بجانب کرمان کشید نجبت عنان | یمن دولت و اقبال شاہ بندہ نواز

عبید نے ۷۷۱ھ اور ۷۷۲ھ کے درمیان وفات پائی۔

عبید نے مختلف بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ ان تمام تاریخی واقعات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عبید نے کافی لمبی عمر پائی۔ مگر اتنی عمر کے باوجود ان کے آثار و تالیفات و اشعار کی تعداد کوئی زیادہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ صرف حوادث زمانہ اور بے ثباتی دوران ہے۔ جس کی بدولت انھوں نے کبھی اپنی زندگی میں دلچسپی نہ لی۔

عبید کے اشعار محض تفریح طبع کے خلاق ہیں۔ اُن سے کوئی روزینہ اور معاش کی تلاش مقصود نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے حوادثات زمانہ کو اپنے شعر میں بڑے مزاحیہ انداز میں پیش کیا۔ وہ بذلہ سنج اور بذلہ گو تھے۔ کلام کا مجموعہ ۳۰۰۰ اشعار ہیں۔ رسائل بھی گلستان سعدی کی ضخامت سے کم ہیں۔

(نظم) ۱۔ اُن کا سنجیدہ کلام جس میں تمام اصناف سخن شامل ہیں کل تین ہزار اشعار کا حامل ہے۔

۲۔ اشعار ہزلیہ اور تضمینات۔

۳۔ مثنوی عشاق نامہ :۔ یہ مثنوی ۷۵۱ھ میں تالیف ہوئی اور شاہ ابواسحاق اینجو کے نام معنون ہے۔

۴۔ موش و گربہ :۔ اس میں اُن انسانیت سوز مظالم کا تجزیہ کیا ہے جن کا سامنا عبید زاکانی نے کیا مگر زبان موش و گربہ کی بطور تمثیل بیان کرکے عبرت ناک بنایا ہے۔

۵۔ فالنامہ وحوش وطیور :۔ یہ ساٹھ رباعیوں پر مشتمل کتاب ہے۔ اور پرندوں کی زبان سے اشعار کہلوا کر عبرت کا سامان مہیا کیا ہے۔ مگر یہ طبع نہیں ہو سکی۔

نظم کی طرح عبید زاکانی نے نثر کو بھی موضوع سخن بنایا۔ اور اپنا بیش وقت سرمایہ کلام نثر میں پیش کیا۔ اُن کی نثر صاف۔ رواں اور سادہ ہے۔ پرکاری اور تصنع کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔

۱۔ نوادرالامثال :۔ یہ عبید زاکانی کی عربی زبان میں تالیف ہے۔ اس میں عبید نے پند و نصائح۔ اشعار۔ اقوال جو کہ حکماء سے متعلق تھے جمع کر دیئے ہیں یہ کتاب ۷۴۰ھ میں طبع تالیف کرکے مصنف نے علاء الدین محمد کے نام معنون کی۔

۲۔ ریش نامہ :۔ یہ ریش کی مذمت میں ایک چھوٹا سا رسالہ ہے۔ اس میں

اس کے جور و ستم کا ذکر کیا ہے جس سے حسین لوگ تنگ آ جاتے تھے۔

۳- اخلاق الاشراف:۔ یہ بہت دلچسپ اور شیریں موضوع رکھتی ہے۔ اس کتاب میں علمائے اخلاق اور بزرگانِ ملت کے اعمال کی رو سے ان کے اخلاق پر تنقید کی گئی ہے۔ اس کی زبان نہایت سادہ۔ سلیس اور رواں ہے۔ اور سعدی کی روانی اور سلاست کو یاد دلاتی ہے۔ اس میں اخلاقیات۔ حکمت، عفت، شجاعت، سخاوت اور علم وفا پر بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب ۷۳۰ھ میں طبع ہوئی۔ اس میں اسلاف اور اخلاف کے کردار کو نہایت ہی دلکشی کے ساتھ مختلف موضوعات کے تحت بیان کیا ہے اور سعدی کی گلستان اور بوستان کی طرح اس کتاب کے بھی باب ہیں۔

۱۔ حکمت - ۲- شجاعت - ۳- عفت - ۴- عدالت - ۵- سخاوت و حلم و وفا - ۶- حیا و وفا - ۷- صدق و رحمت و شفقت وغیرہ۔

۴- صد پند:۔ اس میں لطائف اور طنزیہ حکیمانہ استدلالی ہیں۔ یہ کتاب ۷۵۰ھ میں تالیف ہوئی۔

۵- مکتوباتِ قلندران:۔ اس میں دو قلندروں کے خطوط ہیں۔ جس میں ان کی خاص زبان اور محاورہ کو بیان کیا گیا ہے۔ عبید زاکانی کا اس سے مقصد صرف ان کے طرز انشا کی تنقید و تمسخر ہے۔

۶- رسالہ تعریفات:۔ اس کو دہ فصل بھی کہتے ہیں۔ زندگی کے آئین سے وابستہ تمام علمی۔ ادارتی اور فنی اصطلاحات کی ہزل آمیز طرز کے ساتھ تعریف کی دلیل ہیں۔

۷- رسالہ دلگشا:۔ اس رسالہ میں فارسی اور عربی زبان کی چھوٹی چھوٹی حکایات یا دفعات اور لطائف وغیرہ مندرج ہیں۔ بعض لطائف فحش ہیں۔ جنسی بے راہ روی اور اخلاقی پستی کی دلیل ہیں۔

۸- فالنامہ بروج:۔ ایک مختصر سا رسالہ ہے جس میں بروج کے ذریعے فال سے

نکالنے اور قسمت کا سیارہ متعین کرنے کے متعلق لکھا گیا ہے۔ ہر فال کے آخر میں ایک رباعی ہے۔ ہر رسالہ میں فال گیروں اور فالناموں کی تنقیص اور استہزا ہے
۹ مقامات :۔ مقامات حمیدی کی طرح یہ مقامات فارسی زبان میں ہیں، ابھی تک اس کتاب کا نسخہ نہیں ملا۔

فالنامہ مذکورہ کے علاوہ عبید زاکانی کی تمام نثری تالیفات مجموعہ لطائف کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔

اپنے معاصرین سلیمان ساوجی اور حافظ کے مقابل شاعر ہونے کی حیثیت سے عبید زاکانی کو شہرت نصیب نہ ہو سکی۔ عبید کا دیوان بھی مختصر ہے اور نثری تالیفات بھی اتنی طویل نہیں ہیں، لیکن وہ علم و فضل کے ساتھ ساتھ بڑے زیرک و دانا تھے۔ انہوں نے اپنے عصری اخلاق اور اقدار پر مطایبات کے رنگ میں بڑی بامزہ تنقید کی ہے، جو فارسی ادب میں اپنی مثال آپ ہے۔ ہجو ہزل اور مطایبہ کا رواج تو پہلے سے ہی تھا۔ انوری اور خاقانی اور سعدی جیسے پرہیز گار بھی اس سے دامن نہ بچا سکے۔ لیکن عبید زاکانی نے انوکھے انداز سے ہجو اور ہزل سے کام لیا ہے۔ مثلاً عبید نے اس قسم کی باتوں کو کہانی کے لبادہ میں بیان کیا ہے۔

سلطان ابو سعید ۷۱۶ھ سے ۷۳۶ھ تک مغلوق کے آخری تاجدار کے عہد میں اخلاقی انحطاط شروع ہو چکا تھا۔ اس کی ایک مثال یوں عبید زاکانی پیش کرتے ہیں۔ ایک دن سلطان ابو سعید نے مستی کے عالم میں علامہ بزرگ قاضی عضدالدین کو بھی رقص کرنے کا حکم دیا۔ قاضی حکم ماننے پر مجبور تھے۔ ایک شخص نے قاضی صاحب سے پوچھا مولانا تو رقص با صول میکنی ؟ مولانا نے کہا من رقص بیرلیغ یعنی حسب الامر می کنم بہ صول۔ بادشاہ نے مجلس میں پوچھا مولانا تو در یونان را چہ باشی ؟ مولانا بولے " متکا "۔ سلطان ابو سعید کے بعد طوائف الملوکی رائج تھی۔ تخت حاصل کرنے کے لیے باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو قتل کر رہا تھا۔ امراء عیش و عشرت میں

غرق تھے۔ صوفی و قاضی و ملا سب ریاکار تھے۔ اور سلاطین وزراء کے محتاج و محکوم عوام کی پستی اخلاق کا تو ذکر ہی کیا اس پر یورشِ تیمور نے اخلاقی اقدار پر رہے سہے کے اعتماد کو سخت صدمہ پہنچایا۔

اس قسم کے سیاسی و سماجی انقلابات نے عبید زاکانی تو کیا حافظ جیسے شاعر کو بھی معاشرے کی خرابیوں کو آشکار کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ اور وہ پکار اٹھے۔ ع

این چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم   ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم

ایسے ہی حادثات نے عبید زاکانی جیسے عالم و فاضل شخص کو ہزل و مطایبہ و ہجو پر مجبور کیا۔ اور انھوں نے رسالہ دلگشا میں یوں لکھا۔

" لولئ با پسر خود ماجرا میکرد کہ تو ہیچ کاری نمیکنی و عمر در بطالت بسر می بری۔ چند باتو گویم کہ معلق زدن بیاموز۔ سگ از چنبر جہانیدن و رسنبازی تعلیم کن تا از عمر برخوردار شوی۔ اگر از من نہ شنوی بخدا ترا در مدرسہ اندازم تا آن علم مردہ ریگ ایشان بیاموزی و دانشمند شوی و تا زندہ باشی در مذلت و فلاکت و ادبار بمانی و یکجو از ہیچ جا حاصل نتوانی کرد۔"

نیز ان کا یہ قطعہ بھی اسی موضوع کا حامل ہے۔

ای خواجہ مکن تا بتوانی طلب علم
کاندر طلب راتبت ہر روزہ بمانی
رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز
تاداد خود از مہتر و کہتر بستانی

عبید زاکانی نے جن حالات کا سامنا کیا اور جو نشیب فراز دیکھے اس کی وجہ سے وہ مسخرگی کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اور انھوں نے لطائف اور چٹکلوں کو لکھ کر سب کو ہنسایا۔ اور عبرت کا سامان مہیا کیا۔

عبید کے نثری ادب میں تعریفات۔ اخلاق الاشراف۔ دلگشا اور صد پند طنز و تعریض کے لحاظ سے ادب میں نئی چیزیں ہیں۔ اور آٹھویں صدی کے ادب کی بجائے تیرھویں اور

چودھویں صدی کا ادب معلوم ہوتی ہیں۔ اخلاق الاشراف پڑھ کر کیا دل سیاست کا نقشہ ذہن میں آتا ہے۔

سلیمان ساوجی نے عبید زاکانی کو "جہنمی ہجاگو" لکھا ہے۔ مگر اس کے کلام میں ہجو کم البتہ ہزل و فحش زیادہ ہے۔ مگر عباس اقبال اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ عبید نے ہجو۔ ہزل اور مطایبات ضرور لکھے مگر کلام فحاشی سے مبرا ہے۔ بلکہ ان کا مقصد عالی تھا اور ہمت بلند تھی۔ بلند پرواز نظر عطا ہوئی تھی۔ اور کچھ حالات کی تلخی نے اُن کو ایسا بنا دیا کہ کوتاہ بین نظر آن کی رفعت کو نہ چھو سکے۔ انہیں ہر خوشی عارضی نظر آئی اور اسی لئے وہ عارضی خوشی کے پس پردہ کوتاہ بین لوگ غلطی پر مسکراتے ہیں۔

بہر حال اس چیز کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ عبید زاکانی کی طرز نگارش محکم۔ فصیح اور رواں ہے۔ ذرہ بھر تکلف اور تصنع نہیں ہے۔ بیان میں شگفتگی ہے۔ طریقِ تکلم و تخاطب ہر جگہ ہے۔

اخلاق الاشراف

(شریفوں) بزرگوں کے اخلاق و کردار

صفحہ نمبر ۴۳

منسوخ : مٹایا گیا۔	اکابر : جمع اکبر، بزرگ۔
سیر : جمع سیرت۔	ازمنہ : جمع زمانہ۔
سلف : گزرے ہوئے۔	اربعہ : چار۔
عفت : پاکدامنی	عفیف : پرہیزگار، پارسا۔
حد : تعریف۔	تصرّف : خرچ کرنا۔
نامحرم : بیگانہ۔	مصدّق : تصدیق کرنے والا۔

ناشالیست :- نامناسب

منصور حلاج :- حسین بن منصور جسے ۳۰۹ ھجری میں "انا الحق" کہنے پر سولی پر چڑھایا گیا اور اس کی لاش کو جلا کر دریائے دجلہ کی نذر کر دیا۔

کفارہ :- عوض گناہ۔

قدما :- جمع قدیم۔

شنیع :- برا، بد، زشت۔

اطلاق :- کسی چیز کو کسی چیز سے نسبت دینا۔

بیت :- شعر۔

کوتاہ :- دست۔

شارع :- راستہ، کھلی راہ۔

اصحابنا :- ہمارے دوست۔

مختار :- چنا ہوا۔

ضلالت : گمراہی۔

قدماء : جمع قدیم۔ بزرگ۔

بہرہ : حصہ۔

(ترجمہ) بزرگوں کی سوانح حیات میں پڑھا گیا ہے کہ گزشتہ زمانوں میں عفت کو چار خصلتوں میں شمار کیا گیا ہے اور اس کی تعریف (یوں) کی گئی ہے۔

عفت پاکدامنی سے عبارت ہے اور لفظ "عفیف" کا اطلاق اس شخص پر کیا جاتا تھا جو آنکھ کو نامحرم کے دیکھنے سے، کان کو کسی کی برائی سننے سے، ہاتھ کو دوسروں کے مال پر قبضہ کرنے سے، زبان کو بدکلامی سے اور نفس کو نازیبا وکالت سے محفوظ رکھتا تھا۔ ایسے شخص کو پسند کیا جاتا اور اس کی تعریف کی جاتی۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔

(شعر) جو کوئی سرو کی طرح پاکدامن، سچا اور کوتاہ دست ہوتا ہے، تمام لوگوں سے افضل اور برتر ہوتا ہے۔

انہی معنوں کی تصدیق کرتا ہے۔ منصور حلاج کو جب پھانسی پر لٹکایا گیا (تو) اس نے کہا، میں بچپن میں ایک کوچے سے گزر رہا تھا کہ کوٹھے سے ایک عورت کی آواز سنی، اُسے دیکھنے کے لئے اوپر نگاہ ڈالی، اب پھانسی کے تختے سے نیچے دیکھنے کو (اس دن کے) اوپر دیکھنے کا کفارہ سمجھتا ہوں۔

پسندیدہ مذہب

ہمارے دوست فرماتے ہیں کہ بزرگان نے اس بارے میں سخت غلطی کی ہے اور اپنی قیمتی عمر گمراہی اور لاعلمی میں صرف کی۔ جو کوئی ایسی سیرت اختیار کرتا ہے اُسے زندگی سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، فرماتے ہیں دنیا میں زندگی کا مقصد

صفحہ ۴۳، ۴۴

لعب ولہو :۔ عیش و عشرت۔
فسق :۔ بدکاری۔
ممنع است :۔ ناممکن ہے۔
بطلان :۔ جھٹلانا۔
منوط :۔ وابستہ، مربوط۔
عشوہ :۔ ناز، فریب۔
خاطر :۔ دل۔
معاش :۔ زندگی بسر کرنے کا ذریعہ۔
مشارکات :۔ شرکت۔
عدالت :۔ انصاف۔

تفاخر :۔ فخر۔
مناهی :۔ نہ کرنے کے کام، جمع منہی برے کام۔
مضرت :۔ نقصان۔
مصالح :۔ بہتری۔
خبث :۔ بدمعاشی۔
دشنام :۔ گالی گلوچ۔
معاد :۔ جائے بازگشت، آخرت۔
معدلت :۔ عدالت۔
عرض :۔ عزت، آبرو۔

(ترجمہ) عیش و عشرت، زیب و زینت، فخر و ناز، دولت جمع کرنا اور اولاد بڑھانا ہے، عیش و عشرت، بدکاری، اور ممنوعہ کاموں کو کئے بغیر ناممکن ہے اور دولت کا جمع کرنا، لوگوں کو ستانے، ان پہ ظلم کرنے، تہمتیں تراشنے اور دوسروں کی عزت آبرو پر زبان درازی کرنے کے بغیر محال ہے پس جو کوئی عفت اختیار کرے گا ان چیزوں سے محروم ہو جائے گا۔ اُسے زندوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس کی زندگی بیکار ہوگی (پھر) فرماتے ہیں کہ آنکھ، کان، زبان اور دوسرے اعضائے جسمانی نفع کے حصول اور نقصان کی مدافعت کے لئے پیدا کئے گئے

—— اور کسی عضو کو اِس خصوصیت سے جو اِس کی ایجاد کا باعث ہے محروم رکھنا اِس کو باطل قرار دینا ہے۔ پس چونکہ جسمانی اعضاء کا بیکار کرنا جائز نہیں۔ اِس لئے ہر شخص کو چاہیے کہ جو سامنے آئے اُسے دیکھے، جو کانوں کو بھلا لگے وہ سُنے اور بد معاشی تکلیف دہی، الزام تراشی، دھوکے بازی، گالی گلوچ اور جھوٹی گواہی میں سے جس کے ساتھ اس کے فائدے وابستہ ہوں، زبان سے ادا کرے۔ اگر کسی کو اس سے نقصان پہنچے یا اس کا گھر برباد ہو، اس کی پرواہ نہ کرے (اس سے اپنی خاطر جمع رکھو) دل کو اس طریقے سے خوش رکھنا چاہیئے: جو کچھ تجھے پسند آئے وہ کرتا اور کہتا رہ

منسوخ مذہب

پہلے وقت کے بزرگوں نے "عدالت" کو چار فضیلتوں میں سے ایک گردانا ہے، اور دنیا و آخرت (دونوں) کے معاملات کا انحصار اسی پر کرکے ان کے معتقد تھے۔ اسی وجہ سے بادشاہ، امیر وکبیر، اور وزیر سب فوج اور رعایا کے معاملات میں عدل وانصاف سے کام لینے کی کوشش کرتے۔ اور عدل وانصاف کو خوشحالی اور نیک نامی کا باعث سمجھتے۔ اس طریق کار کے اتنے معتقد تھے کہ عوام بھی ذاتی معاملوں اور باہمی شرکتوں میں عدالت کے راستے پر عمل کرتے

صفحہ ۳۴، ۳۵

مروجہ مذہب

اُسوء : سب سے بُری۔
مستلزم : جو لازمی ہو۔
فرماندھی : حکومت۔
گسستہ : ٹوٹا ہوا۔

خلل : خرابی، بگاڑ۔
کدخدائی : حاکمیت، حکمرانی۔
حاشا : خدا نہ کرے۔
زیردست : ماتحت۔

عربدہ : جھگڑا، سختی۔
متلاشی : پراگندہ، منتشر۔
محترفہ : کاریگر، پیشہ ور۔
بازرگانی : تجارت۔
جزیہ : وہ رقم جو اسلام میں ان غیر مسلم سے ان کی نگہبانی کے طور پر لی جاتی جو فوج میں بھرتی نہ ہوتے تھے، عورتیں، بچے، بوڑھے اس سے مستثنیٰ تھے۔
نود : نوّے۔
بلاد : جمع بلد، شہر۔
مخدوم : جس کی خدمت کی جائے۔ آقا

مسخر :- تسخیر ہونا۔
رخصت داد : اجازت دی۔
جہود : یہودی۔
قانع : قناعت کرنے والا۔
مخنث : ہیجڑا۔
قضاہ : جمع قاضی۔
آفرینش : تخلیق، پیدائش۔
شط : دریا۔
لاجرم : یقیناً۔
تزاید : ترقی، اضافہ۔
عباد : جمع عبد۔ بندہ۔

(ترجمہ) لیکن ہمارے ساتھیوں کے مسلک میں یہ سیرت سب سے بری ہے۔ (ان کے نزدیک) عدالت بہت سی خرابیوں کا موجب ہے۔ انھوں نے یہ دعوےٰ دس دلیلوں سے واضح کردیا ہے (وہ) کہتے ہیں کہ سلطنت، فرمانروائی اور رعیت کے کاروبار کی بنیاد سختی پر ہے۔ (لوگ) کسی سے نہیں ڈریں گے، اس کی فرمانبرداری نہیں کریں گے۔ سب ایک ہو جائیں گے، معاملات میں خلل پڑ جائے گا اور حکومت کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اگر کوئی شخص خدانخواستہ عدل اختیار کرے، کسی کو نہ مارے، جرمانہ نہ کرے، اپنے آپ کو مست نہ رکھے، ماتحتوں پر سختی نہ غصے کا اظہار نہ کرے (تو) لوگ اس سے نہیں ڈریں گے اور رعایا بادشاہوں کی اطاعت نہیں کرے گی۔ بیٹے اور غلام، باپوں اور آقاؤں کی بات نہیں سنیں گے۔ لوگوں اور شہروں کے مصلحتی امور میں خلل آجائے گا۔ اسی حقیقت کے پیش نظر کہا ہے:

بادشاہ ایک بھلائی کے لئے سو خون کرتے ہیں۔

منگولوں کی تاریخ میں درج ہے کہ جب ہلاکو خان نے بغداد فتح کیا تو ان لوگوں کو جو تلوار (کی زد) سے بچ گئے تھے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ ہر ایک کا حال پوچھا۔ جب سب کی حالت سے آگاہ ہو گیا تو کہا پیشہ ور معاشرے کا لازمی جزو ہیں۔ انہیں اپنے اپنے کاموں پر جانے کی اجازت دے دی۔ تاجروں کو سرمایہ دینے کا حکم دیا تاکہ اس (ہلاکو) کے لئے تجارت کریں یہودی کے بارے میں کہا کہ یہ مظلوم لوگ ہیں۔ ان سے جزیہ لینے پر مطمئن ہو گیا، ہیجڑوں کو اپنے حرم میں بھیج دیا۔ قاضیوں عالموں صوفیوں، حاجیوں، واعظوں، فقیروں، قلندروں، پہلوانوں، شاعروں اور داستان گویوں کو علیحدہ کر دیا اور کہا یہ پیدائش میں زیادہ ہیں (یعنی ان کی تعداد بکثرت ہے) اور خدا کی نعمت کو بیکار صرف کرتے ہیں (پھر) حکم دے کر سب کو دریا میں غرق کروا دیا اور سطح زمین کو ان کی خباثت سے پاک کر دیا اس میں شک نہیں کہ اس کے خاندان میں حکومت تقریباً نوے سال رہی (لیکن) ہر روز ان کی خوشحالی اور ترقی میں اضافہ ہوتا گیا۔

اخلاق جلالی

مصنفؒ کا حال

علامہ جلال الدین محمد دوانی بن سعد الدین اسعد کازرون کے نواحی (صوبہ فارس) میں فرید دواں میں ۸۳۰ھ میں پیدا ہوئے اور غالباً اسی وجہ سے علامہ دوانی کے لقب سے مشہور ہیں۔ ۹۰۸ھ (مطابق ۱۵۰۲ء) آپ نے اسی جگہ رحلت فرمائی اور اپنے وطن مالوف میں پیوند خاک ہوئے۔ مذہبی اور ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ بعد ازاں شیراز میں آگئے۔ جہاں انھوں نے مذہبی علوم اس زمانے کے مشہور و معروف علماء اور فضلاء محی الدین انصاری اور علامہ ہمام الدین سے پڑھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں آپ کے علم و فضل کا شہرہ تمام اکناف ملک میں پھیل گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تشنگان علم دور دراز مقامات سے آپ کے چشمۂ فیض سے اپنی تشنگی بجھانے لگے اور آپ کے فیوضات علمی سے پوری طرح بہرہ ور ہونے لگے۔

بقول ملک الشعراء بہار وہ ایک بہت بڑے متکلم۔ حکیم۔ عالم فاضل فلسفی۔ محقق اور ادیب تھے۔ آپ کی مشہور و معروف تالیفات زیادہ تر عربی زبان میں ہیں اور اُن کی سب سے مشہور کتاب (۱) علامہ محقق طوسی کی "تجرید" کے حواشی و تفسیر ہے علم کلام میں یہ کتاب سند کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ آپ کی ایک دوسری (۲) کتاب "حواشی تہذیب المنطق" ہے۔ (۳) "ھیاکل النور" کی تفسیر جو سہروردی کی تالیف ہے ایک اور کتاب (۴) "رسالہ اثبات واجب قدیم" اور (۵) "رسالہ اثبات واجب جدید" ہے۔ دوسری مولفات (۶) رسالہ "العلوم" اور (۷) "نور الہدیٰ" ہے۔

بقول بہار پہلے آپ مذہب اشاعرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد ازاں مذہب شیعہ اثنا عشری کی طرف مائل ہوئے ملا جلال الدین شاعر بھی تھے اور فانی تخلص کرتے تھے۔

اخلاق جلالی کی وجہ سے آپ کو عراق و عجم کے حکمران ترکمان خاندان کے شاہی

دربار میں عالی منصب عطا ہوا۔ اور آپ صوبہ فارس میں قاضی القضاۃ کے بلند منصب پر فائز تھے اس کے بعد جلال الدین آدھا وقت درس وتدریس میں صرف کرتے اور آدھا دن مقدمات کے فیصلے کرنے میں بسر کرتے تھے۔ جلال الدین کے علم وفضل کا شہرہ اکناف عالم میں پھیلا۔ چنانچہ ۸۰۳ھ میں موید الدین عبدالرحمٰن چلیبی نے آپ کے سامنے زانوی تلمذ تہ کیا۔ اور پورے سات سال آپ کے فیوضات علمی اور کمالات علوم دینی، منطق وکلام سے استفادہ کیا۔ اور بعد میں مملکت عثمانیہ میں ایک معروف بلندپایہ عہدے پر سرفراز ہوئے۔ سلطان بایزید دوم جو اس زمانے میں مملکت عثمانی کے مشہور ومعروف بادشاہوں میں شمار ہوتے تھے۔ علامہ دوانی کو خطوط لکھتے تھے اور تحفے تحائف بھی بھیجتے تھے۔

آق قویونلو خاندان کا ایک جلیل القدر نمائندہ سلطان حسن بیگ بہادر تھا اور اس کے خلف شہزادہ خلیل کے نام پر "اخلاق جلالی" معنون کی گئی۔ اس خاندان کے فرمانرواؤں کی سرپرستی حاصل ہونے سے آپ مختلف بلند درجات پر فائز تھے۔ ایک جید اور متبحر عالم کی حیثیت سے علمی اور ادبی دنیا میں آپ غالباً اس کتاب کی بدولت شہرہ آفاق ہوئے اور یہ کتاب "لوامع الاشراق فی مکارم اخلاق" کے نام سے مشہور ہے۔

اخلاق جلالی

اس کتاب کا موضوع حکمت عملی ہے جو تہذیب اخلاق، تدبیر منزل اور سیاست مدن سے عبارت ہے۔ خود مؤلف کے اپنے بیان کے مطابق اس کتاب کی بنیاد اخلاق ناصری اور بعض دوسری کتابوں پر رکھی گئی ہے۔

"حکیم محقق وفیلسوف مدحق نصیر الملۃ والدین محمد طوسی کہ اکثر این لوامع از پسر تو اشراف انوار فواید اوست۔ ختم کتاب۔ اخلاق ناصری را بوصایای افلاطون نمودہ"

دوانی نے اخلاق ناصری کو اور نصیر الدین محقق طوسی نے ابن مسکویہ کی کتاب الطہارۃ (الطہارۃ الاعراق فی تہذیب الاخلاق) کو اپنے لئے سرمشق بنایا ہے۔ نصیر الدین نے حکم

کوہستان کی فرمائش پر تہذیب الاخلاق کا ترجمہ کیا اور پھر اس میں حذف و اضافے کے ساتھ فلسفۂ اخلاق کو سمو دیا۔ اور حاکم کوہستان کے نام پر اخلاق ناصری کو معنون کیا۔
(کتاب الطہارۃ۔ اخلاق ناصری)

اخلاق جلالی فلسفۂ اخلاق کی دو بڑی کتابوں میں شمار ہوتی ہے اور اخلاق محسنی۔ انوار سہیلی۔ اور گلستان سعدی اور بہارستان جامی موضوع اخلاق سے بحث کرتی ہیں مگر اخلاق جلالی اور اخلاق ناصری فلسفۂ اخلاق سے عبارت ہیں۔ یعنی اخلاق و کردار انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی پر روشنی ڈالتی ہیں کتاب الطہارت اور اخلاق ناصری میں وہی تعلیم ہے جو ارسطو نے دی۔ اس فلسفے کو تفصیل کے ساتھ ابن سینا نے پیش کیا۔ مسلمانوں نے اسے بہت آگے بڑھایا اور اس میں تحقیق تجربے اور مشاہدے کا رنگ بھرا۔ نصیر الدین یونانی فلسفے سے زیادہ متاثر تھے مسلمانوں نے منطق اور مذہب کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے۔ اور اخلاق جلالی میں اس ہم آہنگی کی کوشش زیادہ نمایاں ہے۔

چونکہ دوانی نے اشراقی فلسفے کو پیش کیا ہے اخلاق جلالی میں اور پھر قرآن و حدیث کے مطالب سے اس میں ایک ایسا حسین امتزاج پیدا کیا ہے جو واقعی قابل ستائش ہے۔ اس لئے اس نے اپنی کتاب کا نام "لوامع الاشراق فی مکارم اخلاق" رکھا جو اس کے موضوع کی پوری پوری نمائندگی کرتا ہے۔ فلسفے کو مسلمان حکمانے دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اس مناسبت سے مقدمہ کتاب کو مطلع۔ باب کو لامع اور فصل کو لامعہ کہا گیا ہے۔

۱۔ حکمت فطری۔ ریاضی۔ طبعیات۔ مابعد الطبیعات وغیرہ۔

۲۔ حکمت عملی۔ تہذیب اخلاق۔ تدبیر منزل۔ سیاست مدن۔

ترتیب اخلاق جلالی میں سب سے پہلے دعا۔ اس کے بعد تمہید۔ پھر مطلع تنویر اور پھر تبصرہ۔ پھر کشف غطا۔

لامع اول۔ تہذیب اخلاق سے عبارت ہے جس میں دس لمعے ہیں۔

لامع دوم۔ تدبیر منزل کے متعلق ہے جس میں چھ لمعے ہیں۔

لامع سوم۔ دربارۂ سیاستِ مدن۔ کہ شامل بر ہفت لمعہ است و در آں اصول و موازینِ جہانبانی و مملکت داری را شرح دادہ است۔

اخلاق جلالی و اخلاق ناصری

اخلاق جلالی کے اکثر و بیشتر مطالب و مفاہیم اخلاق ناصری سے ماخوذ ہیں۔ چنانچہ ابواب کی تقسیم بھی تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ اسی کے مطابق کی گئی ہے۔

۱۔ اخلاق ناصری کا پہلا مقالہ تہذیب اخلاق سے متعلق ہے جو سترہ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور علامہ جلال الدین نے لامع اول کو دس حصوں میں منقسم کیا ہے اور بعض دلائل و براہین کو یا مختصر کر دیا ہے یا پھر بالکل صرف نظر کر دیا ہے۔

۲۔ اخلاق ناصری کا دوسرا مقالہ جو تدبیر منزل سے متعلق ہے اس میں پانچ فصلیں ہیں اور اخلاق جلالی کا لامع دوم (جو تدبیر منزل سے مربوط ہے) اس میں چھ لمعے ہیں جن میں سے چار لمعات اخلاق ناصری کے ساڑھے چار فصلوں میں سے ہی لیے گئے ہیں اور دوسرا لمعہ جو پدر و مادر کے حقوق سے متعلق ہے اخلاق ناصری کی چوتھی فصل سے لیا گیا ہے اور پھر دوانی نے ایک الگ لمعہ کی صورت میں لکھا ہے۔

۳۔ اسی طرح اخلاق ناصری کا تیسرا باب جو سیاست مدن سے متعلق ہے اس میں آٹھ فصلیں ہیں۔ اور اخلاق جلالی کے لامع سوم (جو سیاست مدن سے مربوط ہے) میں سات لمعے ہیں اور اخلاق ناصری کی پہلی سات فصلیں ان سات لمعوں سے بہت مطابقت اور مناسبت رکھتی ہیں اور اخلاق ناصری کی آٹھویں فصل کو جو اخلاق کی پند و نصائح پر مشتمل ہے ان کو اخلاق جلالی میں لواحق کے ضمن میں دیا گیا ہے۔ اب ان شواہد کی روشنی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اخلاق جلالی۔ اخلاق ناصری کی تلخیص ہے۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اخلاق جلالی۔ اخلاق ناصری کا ہی چربہ ہے یا اس کا نعم البدل ہے۔ جو قرن نہم کے ایک بلند پایہ ادیب کے رشحاتِ قلم سے وجود پذیر ہوا۔

اختلاف

لیکن ان ظاہری مشابہتوں اور مناسبتوں سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ واقعی علامہ دوانی نے محقق طوسی کی کورانہ تقلید کی ہے کیونکہ علامہ دوانی ایک مبصر فلسفی اور متبحر عالم اور ایک معروف متکلم تھے۔ انھوں نے اخلاق ناصری سے استفادہ ضرور کیا ہے اور بیشتر استفادہ لیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف اسلوب کے لحاظ سے اخلاق جلالی کو منفرد مقام بخشا ہے بلکہ موضوع اور مفاہیم کے لحاظ سے بھی اس میں کافی اضافہ کیا ہے اور بعض اسلامی مسائل کا اضافہ کیا ہے اور جو بحث اخلاق ناصری میں سے مفقود ہے۔ یونانی فلسفہ کے علاوہ جو محقق طوسی کے لئے بھی اخلاق ناصری ہے دوانی نے دو نمایاں چیزوں کا اضافہ کیا ہے۔ ایک تو اسلامی اور دینی اصطلاحات کا اضافہ کیا ہے جو قرآن و احادیث اور عربی امثال و حکم سے مستفاد ہیں جیسے بار امانت۔ مکارم اخلاق۔ اوسط الامور۔ صراط المستقیم۔ شجاعت۔ عفت وغیرہ۔ پھر ان عربی اصطلاحات کو دوانی نے اپنے مخصوص انداز میں اظہار کیا ہے اسی فلسفۂ اخلاق کا دوانی نے شجاعت اور عفت کا جو مفہوم لیا ہے وہ اس علوم عربی کے مفہوم سے مختلف ہے۔ جو قرآن یا حدیث میں لیا گیا ہے۔ مثلاً شجاع کے معنی برتری اور کارہائے نمایاں نہیں بلکہ یہ فلسفۂ اخلاق کی خاص اصطلاح ہے جس کے تحت شرم و حیا آجاتے ہیں۔ گویا دوانی نے ان عربی اصطلاحات کو اپنے مخصوص اور مختص مفاہیم کے لئے استعمال کیا ہے اور "آموزش و پرورش دختران" کے متعلق دوانی کا اپنا خاص نظریہ ہے جو محقق طوسی کے فلسفے سے بالکل مختلف ہے۔ اسلوب کے لحاظ سے بھی دونوں کتابوں میں بڑا فرق ہے کیونکہ محقق طوسی فلسفے اور حکمت یونانی کی طرف زیادہ مائل ہے اس لیے اس کے ہاں فلسفیانہ موشگافیاں زیادہ ہیں اور اگر قارئین مبادیات فلسفہ و حکمت سے واقف نہیں ہیں تو اس کا سمجھنا از حد دشوار بلکہ محال ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس علامہ دوانی نے عربی اصطلاحات و تعبیرات و محاورات و آیات کا بھرپور استعمال کیا ہے اور اگر بات کسی اعداد کی زبان میں کی جائے تو اخلاق جلالی میں نوّے (۹۰) فیصدی عربی کلمات و محاورات ہیں اور فقرات بھی لمبے لمبے ہیں جو عام اور اوسط قسم کا قاری پڑھنے

سے قاصر اور پھر پوری طرح اس کو سمجھنے سے عاجز ہے۔ اگرچہ علامہ نے عربی جملات وکلمات کے فراوان استعمال سے فضل فروشی اور ہنرنمائی ضرور کی ہے جو اس زمانے کا خاص شیوہ تھا تاہم بعض جگہ عربی کلمات کا استعمال بھی ناگزیر تھا جس سے علامہ دوانی بخوبی عہدہ برآ ہوئے۔

اخلاق جلالی کا اسلوب رنگین اور عالمانہ ہے اور نثر مصنوع میں لکھی گئی ہے۔ اور جملے لمبے ہیں۔ اخلاق جلالی کے اکثر وبیشتر مقامات میں لفاظی سے کام لیا گیا ہے۔ عبارت پیچیدہ اور جملوں کی ترتیب وبندش ایسی نہیں جو آسانی سے سمجھ میں آسکے۔

بہار سبک شناسی صفحہ ۲۶۲ پر اپنی وقیع رائے کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

"شیوۂ دوانی در مسایل علمی همان شیوۂ عصر قدیم است وبا نثر علمی دیگران از مقتدیان تفاوتی ندارد۔"

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا یوں رقمطراز ہیں۔

"اخلاق جلالی بتصدیق خود مولف از اخلاق ناصری اقتباس شده است ومولف آن جلال الدین از قریۂ دوان در حوالی کازرون شخصی حکیم وعارف بوده واین کتاب را بخواهش سلطان خلیل پسر حسن در نصف ثانیۂ قرن نهم ہجری تالیف نموده۔ عمده مطالب این کتاب که موسوم به لوامع الاشراق فی مکارم اخلاق است در تہذیب اخلاق۔ تدبیر منزل وسیاست مدن میباشد۔"

ایک اور معاصر ایرانی دانشمند آقای رضازاده شفق بہار اور صفا کی رائے سے متفق ہیں۔

اخلاق جلالی اور اخلاق ناصری برصغیر پاک وہند میں ایم۔ اے اور بی۔ اے آنرز کے امتحان کے نصاب میں سالہا سال تک شامل رہی ہیں یہ ان کی اہمیت اور افادیت کی روشن دلیل ہے۔ اور نہ صرف پاک وہند میں بلکہ خود ایران اور افغانستان میں بھی یہ کتاب مقبول خاص وعام ہے اور ہر باہوش اور بابصیرت انسان اس سے پوری طرح استفادہ کرتا ہے اور اس کے گرانقدر اور بیش بہا مطالب سے متمتع ہوتا ہے۔

اخلاق جلالی

"بات کرنے کے آداب"

صفحہ نمبر آٹھ

خفت : کم ظرفی۔

سقوط : از سقط، گرنا، زوال۔

وقع : وقعت، اقتدار

متمادی : دراز، بعید، لمبا۔

ابوذر جمہر : بزرجمہر، بزرگمہر، نوشیرواں کا وزیر باتدبیر۔

مکرر : دوبارہ، بار بار۔

طعن : طعنہ۔

اشتغال : مصروف ہونا۔

دخل : سابقہ، تعلق۔

رضی اللہ عنہا : خدا اس سے (دعوت سے) راضی ہو۔ یہ کلمہ صحابیات کے لیے مخصوص ہے۔

سخافت : سبکی، نادانی، ہلکاپن۔

مہابت : ہیبت، ڈر۔

اعتدال : نہ کم نہ زیادہ، افراط و تفریط سے بری، توازن۔

سبقت کردن : آگے بڑھنا، پیش قدمی کرنا۔

متقدم : پہلا

محاورہ : بات چیت۔

استراق سمع کردن : چوری، چوری کسی کی بات سننا۔

کنایت : رمز و اشارہ۔

صلی اللہ علیہ وسلم : آپ پر درود اور سلامتی ہو۔

(ترجمہ) زیادہ نہیں بولنا چاہیئے کہ زیادہ بولنا کم ظرفی اور بے وقوفی کی نشانی ہے اور اقتدار ختم ہونے اور وقار کے کم ہونے کا باعث ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اعتدال سے گفتگو کرتے تھے۔ یہانتک کہ جس محفل میں آپ دیر تک تشریف فرماتے تو جو الفاظ آپ کی حقیقتوں کا اظہار کرنے والی زبان مبارک پر جاری ہوتے، گنے جا سکتے تھے۔

ابوذرجمہر نے کہا ہے کہ جب تو کسی ایسے شخص کو دیکھے جو بلا ضرورت زیادہ بولتا ہے

تو سمجھ لے کہ (وہ) دیوانہ ہے، اور جو کچھ وہ کہے گا۔ دل میں اس کا جائزہ نہیں لے گا تلفظ کی پرواہ نہیں کرے گا (یعنی اپنی بات کو تولے گا نہیں)

داناؤں نے کہا ہے کہ جب تک ضرورت نہ ہو، بات نہ دہراؤ اور اس وقت دہرانے سے نہ کتراؤ اور اگر کسی کے سامنے کوئی بات بیان کی جائے۔ چاہے (سننے والا) اس کو جانتا ہو پھر بھی اسے چاہئے کہ اپنی آگاہی کا اظہار نہ کرے تاکہ جب تک وہ شخص (بات کرنے والا) اپنی بات ختم کرے، اور اگر اس کے علاوہ کسی دوسرے سے بات پوچھی جائے (تو) جواب نہ دے، اگر کسی ایسی جماعت سے پوچھی جائے جس میں وہ (بھی) شامل ہو تو دوسروں پر پیش قدمی نہ کرے۔ اگر کوئی جواب میں مصروف ہو جائے، وہ اس سے بہتر جواب دے سکتا ہو تو صبر کرے تاکہ وہ شخص بات کرے پھر اپنا جواب پیش کرے مگر اس طرح کہ پہلے شخص پر طعنہ نہ ہو، اور جب حکمت کہنے والے اس سے اپنی بات پوری نہ کہہ دیں جواب میں مصروف نہ ہو، اس بات چیت اور بحث مباحثے میں جو اس کے سامنے ہو رہا ہو، جب اس کے ساتھ سروکار نہ رکھتا ہو دخل نہ دے اور اگر بات اس سے چھپائیں، تو اس کی ٹوہ نہ لے (یعنی چوری چوری سننے کی کوشش نہ کرے) محفل میں (شریک) بزرگوں سے اشارہ کنایے میں بات نہ کرے۔ اور

صفحہ نمبر ۱۴۱، ۱۴۲

پست: گھٹیا، چھوٹا۔
اطناب سخن: طول کلام۔
غریبہ: عجیب وغریب۔
شتم: گالی گلوچ۔
اکتفا کردن: قناعت کرنا، کافی سمجھنا۔
استہانت: ذلیل وخوار سمجھنا۔
حقد: دشمنی۔
ملاطفت: نرمی۔

تمثیل: مثال۔
ایجاز: اختصار۔
فحش: بدکاری، بری بات۔
تعریض: اشارہ وکنایہ۔
شنیع: برا، بد، زشت۔
وفق: موافق ہونا۔
مقتضا: تقاضا کرنا۔
مرعی: پیش نظر رکھنا، ملحوظ رکھنا۔

محاکات : کسی منظر یا کیفیت کی ہوبہو نقل اتارنا۔	شنفتن : سننا۔
نمامی : چغلی۔	تأنی : آہستگی۔
	تعجیل کردن : جلدی کرنا۔

(ترجمہ) آواز درمیانی ہونی چاہیئے نہ بہت نیچی اور نہ بہت اونچی، اگر مشکل مسئلہ درپیش ہو تو مثال سے واضح کردے، اور مصلحت کے بغیر طول کلام کی کوشش نہ کرے۔ بلکہ اختصار کا راستہ طے کرے، عجیب و غریب الفاظ اور دور از فہم کنائے استعمال نہ کرے اور (دوسروں کو) گالی گلوچ، برا بھلا کہنے سے پرہیز کرے، اگر کسی کڑی بات کی وضاحت کرنے کی ضرورت آپڑے، تو اشارے اور کنائے ہی کو کافی سمجھے، اور بری عادت سے، جو عزت کے زوال، ذلت کی آمد اور کینہ و دشمنی کے وجود کا باعث ہے اپنے تئیں روکے۔ ہر مقام پر موقع کی مناسبت سے بات کرے۔ بات چیت میں ہاتھ آنکھ اور بھوں وغیرہ سے اشارے نہ کرے۔ سوائے ان ہلکے پھلکے اشاروں کے جو اس جگہ ضروری ہوں، مناظرہ میں انصاف کو مدنظر رکھے۔ ہر شخص سے اس کی سوجھ بوجھ کے مطابق بات کرے۔ پیچیدہ اور گہری باتیں اس شخص سے نہ کریں جو انھیں سمجھ نہ سکے اور گفتگو میں نرمی کے انداز کو پیش نظر رکھے۔ اور کسی کی حرکتوں، کاموں اور بات چیت کی نقل نہ اتارے، کسی کی برائی کرنے، چغلی کھانے، تہمتیں لگانے اور جھوٹ بولنے اور سننے سے مکمل طور پر پرہیز کرنے کو ضروری سمجھے۔

اس کا سننا بولنے سے زیادہ ہونا چاہیئے (کم گو) کسی دانا سے پوچھا کہ تیرا سننا بولنے سے زیادہ کیوں ہے اس نے کہا اس لئے کہ مجھے دو کان دیے گئے ہیں اور ایک زبان ہے[1] یعنی "دو سنو اور ایک سے زیادہ مت کہو"۔

[1] کہ حق نے زبان ایک دی کان دو — کہ اک جب سن لے انسان دو

چلنے اور ٹھہرنے کے آداب

دانسان چلنے میں عجلت نہ کرے، کہ غضب کی علامت ہے اور حد سے زیادہ آہستگی نہ کرے کہ سستی کی نشانی ہے، نہ تو مغروروں کی طرح چلے اور نہ ہیجڑوں کی طرح (بلکہ) اعتدال کی روش کو مدّنظر رکھے۔ بار بار پیچھے نہ دیکھے کہ

صفحہ نمبر ۴۲، ۴۳

ابلہان: جمع ابلہ۔ بے وقوف۔
رکوب: سواری۔
کج: ٹیڑھا۔
مفاصل: جوڑ۔
تمطی: انگڑائی لینا۔
اضطراب: بے قراری۔
خلأ: تنہائی، خلوت، تخلیہ۔
عندالاحتیاج: ضرورت کے وقت۔

حزن: غم۔
کسالت: سستی۔
عبث: بے کار، فضول۔
تثاوب: جماہی لینا۔
فروتر: ادنیٰ، کم تر۔
کراہت: نفرت۔
ملأ: مجلس، جلوت۔
غطیط کردن: خراٹے لینا، سوتے میں خرخر کرنا۔

یہ بے وقوفوں کا انداز ہے۔ اور ہمیشہ سر آگے کو نہ رکھے کہ غم اور فکر کے غلبے کی دلیل ہے۔ سواری میں بھی اعتدال کو ملحوظ رکھے، بیٹھنے میں پاؤں نہ پھیلائے، ایک پاؤں پر دوسرا پاؤں نہ رکھے۔ سر، زانو اور ہاتھ پر نہ رکھے کہ غم اور سستی کی نشانی ہے، گردن ٹیڑھی نہ کرے، فضول حرکتوں مثلاً اعضائے جسمانی سے کھیلنا وغیرہ سے اجتناب کرے اور ناک یا منہ میں انگلی نہ ڈالے، انگلیوں کے جوڑ وغیرہ سے آواز نہ نکالے اور جمائی اور انگڑائی لینے سے پرہیز کرے، ناک یا تھوک اس طرح نہ گرائے کہ حاضرین دیکھ لیں یا اس کی آواز سن لیں۔ ہاتھ اور سر آستین اور دامن سے صاف نہ کرے۔ اور جب کسی مجلس میں جائے (تو) اپنے مقام سے بلند تر یا کم تر جگہ پر نہ بیٹھے اور اگر مجلس کا بڑا آدمی ہے

تو جہاں بھی بیٹھے، جائز ہے۔ کیونکہ اُونچی جگہ تو وہی ہے جہاں وہ بیٹھے گا۔
اور اگر لاعلمی سے اپنی جگہ پر نہ بیٹھے، لیکن علم ہو جائے تو اپنی جگہ پر آ جائے۔
اور اگر (اتفاق سے) اپنی جگہ خالی نہ پائے تو غم و غصے کو دل میں جگہ دیے بغیر لوٹ جائے، گھر والوں اور غلاموں کے علاوہ چہرے اور ہاتھ کے سوا جسم کا کوئی حصہ کسی کے سامنے برہنہ نہ کرے، زانو سے ناف تک (جسم کے حصے) کو کسی صورت بھی ننگا نہ کرے۔ نہ خلوت میں اور نہ جلوت میں۔ سوائے ضرورت کے وقت مثلاً رفع حاجت یا غسل کرتے وقت لوگوں کے سامنے نہ سوئے اور قطعاً اوندھا نہ لیٹے۔ خاص طور پر اس وقت جبکہ نیند میں خراٹے لینے کی عادت ہو کیونکہ اس طرح (یعنی اوندھا لیٹنے سے خراٹوں میں زیادتی ہو جاتی ہے اور اگر لوگوں کی موجودگی میں نیند غالب آ جائے (تو) اگر اٹھ سکے تو اٹھ جائے ورنہ نیند کو کسی کہانی، فکر یا کسی اور طریقے سے دُور کرنے کی کوشش کرے اور اگر وہ لوگوں کے ساتھ ہو اور لوگ سو جائیں تو یا تو وہ خود بھی سو جائے یا (وہاں سے) باہر آ جائے۔ مختصر یہ کہ (وہ) اس طرح سے پیش آئے کہ لوگوں کو اس سے نفرت اور تکلیف نہ ہو۔

ابوالفضل

ابوالفضل نے ۱۵ سال کی عمر میں تمام علوم و فنون کی تعلیم پاکر فراغت حاصل کر لی تھی۔ ۱۷ سال کی عمر میں آیتہ الکرسی کی تفسیر لکھ کر اکبر کی خدمت میں گذرانی۔ فیضی شاہی بارگاہ سے منسلک ہو چکا تھا۔ اس کے ذریعے ابوالفضل کی لیاقت اور ذہانت اکبر کے کانوں تک پہنچ چکی تھی چنانچہ تخت نشینی کے نویں سال ابوالفضل شاہی ملازمت میں داخل ہو گیا۔ پھر تو شاہی جود و کرم کی بارش اتنی ہوئی کہ وہ چار ہزاری منصب پر فائز ہوا اور وزارتِ عظمیٰ پر مامور کیا گیا۔ وہ ایک کامیاب سیاست دان۔ بیدار مغز مدبر اور ہوشیار سپاہ سالار ہونے کے علاوہ ایک بے مثل ادیب، مورخ اور شاعر تھا اور علامی کے ممتاز لقب سے ہمیشہ یاد کیا جاتا تھا۔ اس کی قابلیت اور لیاقت ہر جگہ اور ہر زمانہ میں تسلیم کی گئی۔ مولف مآثر الامراء لکھتا ہے کہ :۔

"بجودت طبع و رسائی فہم و علو فطرت و طلاقت لسان در کمتر زمانے یگانہ و بے ہمتائی وقت گردید" (مآثر الامراء، حصہ دوم، ص ۶۰۸) اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز جو فارسی کا بھی مسلم الثبوت تھا لکھتا ہے کہ

"شیخ کی انشاپردازی اور مطلب نگاری کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ یہ عظمت خداداد ہے کہ خدا کے ہاں سے اپنے ساتھ لایا تھا ہر ایک مطلب کو اس خوبصورتی سے ادا کرتا ہے کہ سمجھنے والا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ بڑے سے بڑے انشا پردازوں کو دیکھو جہاں عبادت میں لطف اور کلام میں زور پیدا کرنا چاہتے ہیں تو بہار سے رنگ

لیتے ہیں اور حسن و جمال سے خوبی مانگ کر کلام کو رنگین و نمکین کرتے ہیں۔ یہ قادر الکلام اپنے پاک خیالات اور سادہ الفاظ میں اصلی مطلب کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ ہزار رنگینیاں ان پہ قربان ہوتی ہیں۔ اس کے سادگی کے باغ میں رنگ آمیزی کا مصور قلم لگائے تو ہاتھ قلم ہو جائیں۔ وہ انشاء پردازی کا خدا ہے۔ اپنے لطیف خیالات سے جیسی مخلوق چاہتا ہے الفاظ کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ جس عالم میں نکلتا ہے نیا ڈھنگ ہے اور جتنا لکھا جاتا ہے عبارت کا زور بڑھتا اور چڑھتا چلا جاتا ہے۔ ممکن نہیں کہ طبیعت میں تھکن معلوم ہو (دربار اکبری ص ۲۹۲)

ایک انگریز مورخ اس کے انشاء کے متعلق اپنی رائے یوں ظاہر کرتا ہے :۔

ابو الفضل کے طرز انشا پر کسی قسم کی رائے پیش کرنا بے سُود ہے عبد اللہ خاں بخارا کہا کرتا تھا کہ "وہ اکبر کے تیروں سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا کہ ابو الفضل کے قلم سے ڈرتا ہے۔ ہندوستان میں ہر جگہ وہ ایک زبردست منشی تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے مکتوبات تمام مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اگرچہ ایک مبتدی ان کو پڑھنے میں مشکلوں اور پیچیدگیوں سے گھبرا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ انشاء کے مکمل نمونے ہیں۔ ابو الفضل کی کتابوں سے لطف اٹھانے کے لئے نہ صرف زبان فارسی پر کافی عبور بلکہ خود ابو الفضل کے طرز انشا پر کافی مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کا طرز بے مثل ہے اور گو اس کی تحریر ہر جگہ پڑھی جاتی ہے لیکن اس کا اتباع نہ کیا گیا ہے اور نہ کیا جا سکتا ہے۔ (بلاخمن تمہید آئین اکبری)

ابو الفضل کے مختلف تراجم اور تاریخی شاہکار اکبر نامہ اور آئین اکبری کا ذکر آ چکا ہے۔ اس کے علاوہ انشائے ابو الفضل، کشکول اور جامع اللغات

بھی اس کی علمی یادگاریں ہیں۔ انشائے ابوالفضل اس کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ اب تک مختلف مدرسوں میں فارسی کے درس میں شامل ہے۔ کشکول میں ابوالفضل کے انتخاب کردہ نثر و نظم کے وہ نمونے ہیں جو اس نے یادداشت کے طور پر وقتاً فوقتاً لکھ لئے تھے۔ جامع اللغات میں وہ الفاظ مع معانی کے درج ہیں جو ابوالفضل نے شاید طالب علمی کے زمانہ میں لکھے تھے۔

ابوالفضل شہزادہ سلیم کے اشارے سے بندھیل کھنڈ کے ایک زمیندار بیر سنگھ کے ہاتھوں ۱۰۱۰ھ میں قتل ہوا۔ جب اس حادثہ کی خبر شاہی دربار میں پہنچی تو کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ اس سانحہ کی خبر اکبر تک پہنچائے آخرکار ابوالفضل کا وکیل سیاہ لباس پہن کر دست بستہ اکبر کے حضور میں آیا۔ چغتائی خاندان کے جب کسی شہزادہ کے انتقال کی خبر آتی تو اس کا وکیل باپ تک اسی طرح خبر پہنچاتا۔ ابوالفضل کے وکیل کو جب اکبر نے دیکھا تو متحیر ہو گیا۔ خبر جانکاہ سن کر فرط غم سے نڈھال ہو گیا اور بولا

"اگر شاہزادہ را داعیہ پادشاہی بودے مرا کشتے و شیخ را نگاہ داشتے۔"

اور پھر یہ شعر پڑھا۔

شیخ ما از شوق بے حد چون سوے ما آمدہ
ز اشتیاق پاے بوسی بے سر و پا آمدہ

(مآثر الامرا، جلد دوم، ص، ۶۱)

ابوالفضل نے آغاز کتاب میں ایک مقدمہ لکھا (آئین اکبری ص ،،) اس تالیف کی خوبی کو ایک انگریز مورخ اس طرح بیان کرتا ہے :-

" مولفین اس تالیف کی تیاری میں تمام بہترین ذرائع تصرف میں لائے ہیں کیونکہ عربی اور فارسی کی اب تمام مشہور اور مستند تاریخوں کے حوالے جس سے آج موجودہ یورپین اہلِ علم فیض حاصل کر رہے

ہیں اس تالیف میں مذکور ہیں انھوں نے بڑی دقت نظر کے ساتھ مستند مواد کا انتخاب کیا ہے اور ان خرافات کو جو اکثر کتابوں میں پائے جاتے ہیں نظر انداز کر دیا ہے (الیٹ ج ۵ ص ۱۵۶)

اکبر نامہ :- تیموریوں کے دربار میں تاریخ نویسی اور واقعہ نگاری کا ایک باضابطہ محکمہ قائم تھا۔ اکبر نامہ، اور آئین اکبری اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہیں۔ اکبر نامہ ابوالفضل کی محنت و کاوش اور انشار کا شاہکار ہے۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں بابر و ہمایوں کے حالات ہیں۔ دوسری جلد میں اکبری حکومت کے مفصل واقعات ہیں۔ آئین اکبری کو اس کی تیسری جلد سمجھنا چاہیئے۔ اکبر نامہ کے استناد کو بعض مورخین اس لئے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں کہ یہ اکبر کے ایک درباری مورخ کی نگارش و تحریر ہے۔ جس میں حد سے زیادہ خوشامد کا پہلو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

الفنسٹن لکھتا ہے کہ :-

"اکبر نامہ کی سند یورپ میں وقعت کی نظر سے نہیں دیکھی جاتی۔ کیونکہ ابوالفضل گو وہ ایک وسیع النظر اور غیر معمولی ذہن کا آدمی ہے پھر بھی وہ ایک وفادار درباری ہے جو اپنے آقا کی نیکیوں کو ہمیشہ اچھالتا ہے۔ اس کی برائیوں سے چشم پوشی کرتا ہے اور اس کے اور اس کے ہوا خواہوں کے رتبہ کو ہمیشہ بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے سنہ و تاریخ اور واقعات کے عمومی بیانات قابل قدر ہیں لیکن اس کتاب کو پڑھتے وقت اس کی علانیہ طرفداری سے اپنے کو اتنا محفوظ رکھنا نہیں پڑتا جتنا کہ وہ اپنے ممدوحین کی مدح سرائی کر کے ناظرین کی ہمدردی خواہ مخواہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور پھر بعض موقع پر بے جا اور غیر ایماندارانہ طریقہ پر ایک قصہ کہہ کر کسی سے بدظن کر دیتا ہے۔ حالانکہ وہ شخص

بالکل معصوم اور قابل معافی ہوتا ہے۔ اس کے بیانات گنجلک غیر موثر علمیانہ خیالات اور دعائیہ فقیروں سے لبریز اور عموماً اپنے ممدوح کی مدح سرائی پر ختم ہوتے ہیں۔ وہ اکثر واقعات کو نظر انداز کر دیتا ہے، یا اپنے مخصوص انداز سے غلط پیرایہ میں بیان کر جاتا ہے اور تعریف و توصیف کی فتح و کامرانی کے واقعات کا تذکرہ اس غلو سے کرتا ہے کہ ناظرین نہ صرف کتاب سے بلکہ ممدوح سے بھی مکدّر خاطر ہو جاتے ہیں۔ اس بے معنی تعریف و توصیف کے ڈھیر میں اکبر کے حقیقی اوصاف گم ہو جاتے ہیں۔" اور پھر دوسرے مورخوں سے اس کے افعال کی نوعیت کا، اس کی مشکلات اور ان ذرائع کا جن سے وہ ان مشکلات کو حل کرتا ہے، اصلی حال معلوم ہوتا ہے۔ کتاب کا خوشامدانہ انداز جسے ایسے آدمی نے لکھا جو اکبر کی طبیعت سے خوب اچھی طرح واقف تھا اور پھر اس کے معائنہ کے لئے پیش کیا، اس سے اکبر کی نخوت و کبریائی کا پتہ دیتا ہے جو حقیقتاً "اس کی پسندیدہ سیرت کا تنہا داغ ہے" مگر اس کا جواب ایک دوسرا یورپین مورخ اس طرح دیتا ہے۔

"ابوالفضل پر یورپین مصنفین خوشامد پرستی کا الزام عائد کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہ اس نے قصداً بعض واقعات کو چھپایا ہے جس سے اس کے آقا کی شہرت کو کافی نقصان پہنچا ہے، مگر اکبرنامہ کا مطالعہ کیا جائے تو الزام بالکل بے بنیاد معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس کی تصنیف کا ہم مشرق کی دوسری تاریخوں سے مقابلہ کریں تو پتہ چلے گا کہ وہ تعریف کرتا ہے۔ لیکن کم اور خاص انداز کمال سے کہ جو کوئی دوسرا ہندوستانی مورخ نہیں کر سکتا۔ بلکہ مورخین میں سے کوئی اس پر خوشامد کا الزام عائد نہیں کرتا اور اگر ہم یہ ذہن نشین

کہ یس کہ مشرق کی تمام کتابیں حکمران کی رائے سے متفق اور متبع ہونا ضروری قرار دیتی ہیں خواہ وہ اچھی ہوں یا بری تو پھر ابوالفضل قابل معافی ہے۔ وہ اس لیے تعریف کرتا ہے کہ اس نے حقیقتاً ایک سچا ہیرو پا لیا ہے (بلاخ من تمہید آئین اکبری)

اس بات کو محمد حسین آزاد اپنے مخصوص انداز میں اس طرح لکھتے ہیں:۔

"جن لوگوں کے دماغوں میں نئی روشنی سے اجالا ہو گیا ہے وہ اس کی تصنیفات پڑھ کر یہ لکھتے ہیں کہ ابوالفضل ایشیائی انشاپردازوں میں سب سے بڑا مبالغہ پرداز مصنف تھا۔ اس نے اکبرنامہ اور آئین اکبری کے لکھنے میں فارسی کی پرانی لیاقت کو تازہ کیا ہے۔ اس نے خوش بیانی اور یا وہ سرائی کے پردہ میں اکبر کی خوبیاں دکھائی ہیں اور عیب اس طرح چھپائے ہیں کہ جس کے پڑھنے سے ممدوح اور مداح دونوں سے نفرت ہوتی ہے اور دونوں کی ذات و صفات پر بڑا لگتا ہے البتہ بڑا علامہ۔ عاقل، دانا، مدبر تھا۔ دنیا کے کاموں کے لیے جیسی عقل کی ضرورت ہے وہ اس میں ضرور تھی۔ آزاد کہتا ہے کہ جو کچھ الفاظ و عبارت کے پڑھنے والوں نے کہا یہ بھی ہے لیکن وہ مجبور تھا کیونکہ فارسی کا ڈھنگ چھ سو برسوں سے یہی چلا آتا تھا۔ اس کی ایجادوں نے بہت اصلاح کی ہے اور خرابیوں کو سنبھالا ہے باوجود اس کے جو زبان کے ماہر ہیں اور امور سخن کے تاڑنے والے ہیں اور کلام کے انداز اور اداؤں کو جانتے اور پہچانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو کچھ کہا اور جس پیرایہ میں کہا کوئی بات اٹھا نہیں رکھی اصل حقیقت کو لکھ دیا ہے اور انشاء پردازی کا آئینہ اوپر رکھ دیا ہے کہ اس کا کام تھا یہ بھی اس کا کام تھا کہ سب کچھ کہہ دیا اور جن سے نہ کہنا

تھا وہ کچھ بھی نہ سمجھے اور اب تک بھی نہیں سمجھتے۔ خوشامد کی بات ہم نہیں مانتے۔ ہر زبان کی تاریخیں موجود ہیں۔ کونسا مورخ ہے کہ خوشامد شاہ اور حمایت قوم سے پاک ہوا اور وہ اپنے آقا کا ایک نمک حلال و فادار نوکر تھا۔ اس کے انصاف سے اس کے خاندان کی عزت و آبرو بھی۔ اس کی قدردانی سے رکنِ سلطنت ہو گیا۔ اس کی پرورش سے تصنیفات ہیں۔ اور انھوں نے بلکہ خود اس نے صلے ہا سال عمر پائی۔ خوشامد کیا چیز ہے؟ اس کا دل تو عبادت کرتا ہوگا اور جان لوٹ مار کر خاک راہ ہوئی جاتی ہوگی۔ اس نے بہت سا ادب ظاہر کیا شکریہ ادا کیا۔ لوگوں نے خوشامد کا نام رکھا (دربارِ اکبری مطبع رفاہ عام لاہور ص ۱۵۰)

مولف مآثر الامرا ابوالفضل کے انشاء اور اکبر نامہ کے متعلق لکھتا ہے :۔

"تمام چیزوں سے قطع نظر کر کے شیخ نے فن انشاء میں عجیب سحر نگاری سے کام لیا ہے باوجودیکہ وہ انشاء پردازی کے تمام مصنوعی تکلفات سے پاک ہے۔ با اینہمہ مفرد الفاظ کی نشست ان کی متانت حسن ترکیب وغیرہ کا ایک ایسا حصہ اس میں آ گیا ہے کہ دوسرے لوگ بہ مشکل اس کی تقلید کر سکتے ہیں۔ اور تاریخ اکبری سے اس کی شہادت مل سکتی ہے چونکہ اس نے یہ التزام کر لیا ہے کہ (اس میں زیادہ تر فارسی کے الفاظ آئیں) اس لئے لوگوں کا بیان ہے کہ شیخ نے خمسہ نظامی کی نثر کر دی ہے۔ اس فن میں اس کی مہارت کا کمال یہ ہے کہ تہمت سے مطالب کو جو ابدیتہ باطل تھے۔ بادشاہ کی مداحی کے لئے ہر چند ایسی تمہیدوں کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جب تک غور نہ کیا جائے اصل مقصد معلوم نہیں ہو سکتا۔

آئینِ اکبری:- اکبر نامہ ہی کے مختلف حصّے ہیں۔ اس کی خوبیاں جتنی بھی زیادہ بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی پھر بھی قلم قاصر رہے گا۔ ابوالفضل نے اس کو جس محنت۔ کاوش۔ امعانِ نظر اور دیانت داری سے لکھا ہے وہ ہر زبان کے لیے ایک قابلِ فخر علمی کارنامہ ہو سکتا ہے۔ اس کو تیموری دور کے ملکی حربی، صنعتی، زراعتی، اقتصادی، معاشرتی، تمدنی، خانگی، علمی اور مذہبی حالات و واقعات کا آئینہ سمجھنا چاہیے۔ اگر یہ کتاب نہ لکھی جاتی تو شاہان مغلیہ کے عہدِ زرّیں کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں اتنی واضح اور روشن نظر نہ آتیں جتنی کہ آج نظر آ رہی ہیں۔ اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہندوستان میں جب برطانوی نظامِ حکومت قائم ہوا تو اس سلسلہ میں یہ کتاب بے حد معاون ہوئی۔

عیارِ دانش

وصیّت نامہ

صفحہ ۱۵

گریز: تدبیر، چارہ۔

دولت مند: صاحبِ اقبال۔

بنا: بنیاد۔

اُستوار: مضبوط۔ مستحکم۔

اساس: بنیاد۔

سرفرازی: سربلندی۔

وصیّت: وہ ہدایت نامہ جو وقتِ مرگ پسماندگان کے لئے چھوڑا جاتا ہے۔

دستورالعمل: کسی خاص کام کے لئے طریقِ عمل کی تفصیل، پروگرام۔

منصب: عہدہ۔

شکست: زوال

مقرب : جسے قربت دی گئی ہو۔ جسے قربت حاصل ہو۔

دولت خواہی : اقبال مندی چاہنا۔

سخن چین : عیب جو۔ نکتہ چیں چغلخور۔

آتش فرونشاندن : آگ بجھانا۔

عرصہ : میدان۔ فضا۔

مغرور نشود : دھوکا نہ کھا جائے۔

تملق : خوشامد۔

تیرہ نسازد : تاریک نہ کرے۔

ملایمت : نرمی۔

گرائیدن : مائل ہونا۔

مضرت : نقصان۔ ضرر۔

منفعت : فائدہ۔ نفع۔

ہر آینہ : البتہ، بالضرور، یقیناً۔

متغیر گردد : بدل جائے۔ بگڑ جائے۔

مقصود : مقصد۔ مدعا۔ مطلب۔

سخن ساز : باتیں بنانے والا۔

عاقبت : انجام۔ نتیجہ۔

دُود : دھواں۔

یکجہتی : اتفاق۔ اتحاد۔

چاپلوسی : خوشامد۔

شتاب زدگی : جلدبازی۔

التفات : توجہ۔

تامل : غور و فکر۔

گراید : مائل ہو۔

شتاب : جلد بازی۔ عجلت۔

از دست گذاشتن : چھوڑ دینا۔

(ترجمہ) یہ وصیت نامہ ایک ایسا دستور العمل ہے جس کے بغیر بادشاہوں کے لئے اور کوئی چارہ کار نہیں۔ اس لئے خوش نصیب بادشاہ کو چاہیئے کہ ان وصیتوں پر عمل پیرا ہو۔ اور یقین رکھے کہ جو بادشاہ ان چودہ اصولوں پر جو کہ میں بیان کر رہا ہوں کام میں لائے گا اُس کی حکومت کی بنیاد مضبوط اور سلطنت کی جڑ پائدار رہے گی۔ پہلا اصول یہ ہے کہ اپنے ملازموں میں سے جس شخص کو اپنے قریب رہنے کا شرف اور سربلندی عطا کرے اُس کے زوال یا معزولی کے بارے میں کسی اور کی بات نہ سُنے کیونکہ جو شخص ہر کسی بادشاہ کے نزدیک مقرب بن چکا ہو یقیناً دوسرے لوگ اُس کے حاسد بن جائیں گے اور اُس کے قرب کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے اور بدخواہی

اور نصیحت کے طور پر فریب دینے والی باتیں کہیں گے حتیٰ کہ بادشاہ کا مزاج اُس پر بگڑ جائے گا اُس وقت یہ لوگ اپنا مقصد حاصل کریں گے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ چغلخور اور من گھڑت باتیں بنانے والے کو اپنی محفلوں میں آنے کی اجازت نہ دے کہ فتنہ انگیزی اور جنگجوئی کا سبب ہے۔ اور اس کا نتیجہ بھی بُرا ہے بلکہ جب یہ چیز کسی میں دیکھے تو بہت جلد اُس کے فتنے کی آگ تلوار کے پانی سے بجھا دے تاکہ اس کا دھؤاں دنیا کی فضا کو تاریک نہ بنا ڈالے۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ سلطنت کے بڑے بڑے امیروں اور ممبروں کی طرف پوری پوری توجہ دے کیوں کہ اتفاق اور اتحاد سے کام آسان ہو جاتے ہیں۔

چوتھا اصول یہ ہے کہ دشمن کی نرمی و ملایمت اور چاپلوسی پر اترانے نہ لگے (فریب میں نہ آجائے) خواہ وہ کتنی ہی خوشامد کیوں نہ کرے۔ دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے اُس پر اعتماد نہ کرے۔

پانچواں اصول یہ ہے کہ جب مقصد کا موتی ہاتھ آجائے تو پھر اُس کی حفاظت میں غفلت سے کام نہ لے۔

چھٹا یہ کہ کاموں میں جلد بازی نہ کرے۔ بلکہ سوچ بچار اور میانہ روی کی طرف میلان دکھائے۔ کیوں کہ جلد بازی میں نقصان زیادہ ہے اور میانہ روی میں بےشمار فائدے ہیں۔ اور

ساتواں اصول یہ ہے کہ تدبیر کی باگ کسی صورت بھی ہاتھ سے نہ دے۔

صفحہ ۵۱، ۵۲

قصد کردن: (حملہ کرنے) کا ارادہ کرنا۔

خلاصی: چھٹکارا۔ نجات۔ رہائی۔

صلاح: بہتری، بھلائی۔

کینہ دار: دشمنی رکھنے والا۔ عداوت رکھنے والا۔

ورطہ : بھنور ۔ گرداب

احتراز نماید : پرہیز کرے ۔ بچے ۔

درمقام خطاب و عتاب آوردن : قہر و غضب کا نشانہ بنا ۔

جریمہ : قصور ۔ گناہ ۔ جرم

مکافات : بدلہ ۔

ثبات : ثابت قدمی ۔ استقلال ۔

خائن : خیانت کرنے والا ۔ بددیانت ۔

شاداب : سیراب ۔

فرود آیند : نیچے آجائیں ۔

از کار باز ماندن : کام سے رہ جانا ۔

عفو : معافی ۔ درگذر ۔

چرب زبانی : چکنی چپڑی باتیں ۔ شیریں بیانی ۔

خطاب : بازپرس ۔ جواب طلبی ۔

عتاب : غصّہ ۔

پشت قوی : دلیر ۔ بے باک ۔

حلم : بردباری ۔ تحمل ۔

اسرار : سر کی جمع ۔ بھید ۔ راز ۔

روزگار : زمانہ ۔

امین : امانت دار ۔

حیرانی : مایوسی و پریشانی ۔

طور : طریقہ ۔

حال : حالت ۔

معتمد : قابل اعتماد ۔

(ترجمہ) اگر دشمنوں کا کوئی گروہ اس پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کرے اور بادشاہ اس میں بہتری دیکھے کہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ دوستانہ التفات کی ضرورت ہے جس کی وجہ سے اُس مصیبت کے بھنور سے نجات کی صورت دکھائی دیتی ہو تو چاہیئے کہ مناسب حیلے بہانے سے اُن کے فریب کی بنیاد کو تہ و بالا کر ڈالے ۔

آٹھواں اصول یہ ہے کہ کینہ و دشمنی رکھنے والے لوگوں سے پرہیز کرے اور اُن کی چرب زبانی کے فریب میں نہ آجائے ۔

نواں اصول یہ ہے کہ معافی و درگذر کرنے کو اپنا طرز عمل بنالے اور ملازموں کو کسی ایک معمولی گناہ پر قہر و غضب کا نشانہ نہ بنائے جب شاہی

دربار کے مقربین میں سے کسی ایک سے کوئی گناہ سرزد ہو تو وہ بادشاہ کے عفو و درگذر سے دلیر ہو جاتے ہیں۔ دوسری مرتبہ اُن کو اپنے لطف و عنایت کے چشمے سے شاداب کرے تاکہ وہ مایوسی و پریشانی سے محفوظ ہو جائیں۔

دسواں اصول یہ ہے کہ کسی کی دل آزاری نہ کرے تاکہ بدلے کے طور پر خود اُس کو بھی کوئی آزار نہ پہنچے۔

گیارھواں اصول یہ ہے کہ لوگوں کو کسی ایسے کام کے کرنے کا حکم نہ دے جو اُن کے طور و طریق اور حالت کے مطابق نہ ہو۔ کیونکہ اکثر لوگ اپنا کام چھوڑ کر دوسرے کام میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ وہ کام بھی نہیں بنتا بلکہ اپنے کام سے بھی رہ جاتے ہیں۔

بارھواں اصول یہ ہے کہ اپنے آپ کو علم اور ثابت قدمی کے زیور سے آراستہ کرے۔

تیرھواں اصول یہ ہے کہ امانت دار اور قابل اعتماد ملازم حاصل کرکے خائن اور بددیانت لوگوں سے الگ ہو جائے کیونکہ جب سلطنت کی درگاہ کے ملازم امانت دار ہوں گے تو بادشاہ کے راز بھی محفوظ رہیں گے اور لوگ بھی اُن کی ضرر رسانی سے بے خوف اور محفوظ رہ کر زندگی گزاریں گے اور اگر بادشاہ کے نزدیک خیانت کرنے والے لوگوں کی بات قابلِ اعتبار ہو گی تو اکثر ایسا ہو گا کہ وہ بے گناہ لوگوں کو ہلاکت کے گرداب میں ڈال دیں گے اور اس کے بُرے نتیجے برآمد ہوں گے۔

چودھویں یہ کہ زمانے کے رنج و الم اور زمانہ کے انقلابات کی وجہ سے رنج و ملال کے غبار کو اپنی ہمت کے دامن پر بیٹھنے نہ دے۔

صوبہ لاہور

صفحہ ۵۳

اقلیم: ولایت۔ ملک۔ جمع (اقالیم) قدیم جغرافیہ والوں نے دنیا کو سات حصوں میں تقسیم کیا۔ ہر حصے کو اقلیم کہتے تھے۔ ہفت اقلیم ہی سے لاہور تیسری اقلیم میں آتا ہے۔

خاور: مشرق۔

باختر: مغرب۔

گزین: عمدہ۔ پسندیدہ۔ منتخب۔

بیاہ: دریائے بیاس

منقوط: نقطہ دار۔ نقطہ والا۔ جس پر نقطے ہوں۔

فوقانی: بالائی۔

زبان زد: مشہور۔

برآمدن: نکلنا۔

مشدد: باتشدید۔

پیشین: پہلا، اگلا، پرانا۔

دارالملک: دارالحکومت۔ پایہ تخت۔

درازا: طول، لمبائی۔

کروہ: کوس۔

پہنا: عرض۔ چوڑائی۔ وسعت۔

مضافات: نواحی علاقے۔ نواحی بستیاں۔

آب: پانی، دریا۔

خاور رُویہ: مشرق کی طرف۔

باختر سُو: مغرب کی طرف۔

بس گزین: بہت بڑے۔ بہت مشہور۔

فتح: زبر۔

سرآغاز: سرچشمہ۔ منبع

دریابار: بڑا دریا۔

تحتانی: زیریں۔

گذارہ کند: گزرتا ہے۔

باستانی: قدیم۔

پیشینیاں: پیشین کی جمع۔ اگلے وقتوں کے لوگ۔

سرچشمہ منبع۔

گذر : راستہ۔ پل۔
متصل : ملا ہوا۔
برجوشیدن : اُبلنا۔
برزدن : پھوٹنا۔ نکلنا۔
پرگنہ : ضلع کا حصہ۔
حوض : جھیل۔

پیوند : جوڑ۔
کسر : زیر۔
فراز : بلندی۔
سرآغاز : سرچشمہ۔ منبع۔
گذشتہ : گزر کر۔

(ترجمہ) صوبہ لاہور تیسری اقلیم میں سے ہے۔ اس کی لمبائی دریائے ستلج سے دریائے سندھ تک ۱۸۰ کوس ہے چوڑائی بھمبھر سے لے کر چوکھنڈی تک جو ستگڑہ کے مضافات میں سے ہے چھیالیس کوس ہے۔ مشرق کی طرف سرہند ہے۔ شمال میں کشمیر جنوب میں بیکانیر اجمیر اور مغرب میں ملتان ہے۔ چھ بڑے مفید دریا ہیں۔ سب کے سب شمالی پہاڑوں سے نکلتے ہیں۔ دریائے ستلج جس کا قدیم نام شتدرؔ ہے (نقطے والی شین کی زبر اور اوپر کے نقطوں والی ت کی پیش اور شد کے ساتھ جس میں دال اور (ر) ساکن ہیں) اس کا منبع کا دھلور کا پہاڑ ہے روپڑ۔ ماچھیواڑہ اور لدھیانہ اس کے کنارے پر آباد ہیں اور راستے میں یہ دریا بیاس سے مل جاتا ہے اور بیاس کا قدیم نام بیا شا ہے (ب کی زیر، پ، الف اور ش نقطہ دال اور الف سے۔ اس کے سرچشمہ کو بیاس کنڈ کے نام سے موسوم کرتے ہیں جو گلو پہاڑ کے قریب ہے۔ سلطان پور اس بڑے دریا کے پاس ہی آباد ہے۔ دریائے راوی جس کا قدیم نام ایراوتی ہے جو الف کی زیر نیچے نقطوں والی (ی) ساکن، (ر)، الف، واؤ کی زیر اور ت کی زیر اور ی ساکن سے لکھا جاتا ہے) یہ دریا بھدرال پہاڑ سے نکلتا ہے۔ لاہور کا دارالخلافہ اس کے کنارے پر واقع ہے۔

دریائے چناب کا پرانا نام چندر بھاگا ہے جو۔ ح پر زبر ن خفی دال پر

پھر زبر۔ ر ساکن اور با کو (ہ) ملاکر (بھا) نیز گ اور الف سے لکھا جاتا ہے) کوہ کھتوار میں سے دو خوشگوار پانی کے چشمے نکلتے ہیں ایک کو چندر اور دوسرے کو بھاگا کہتے ہیں اور کھتوار کے نزدیک دونوں آپس مل جاتے ہیں اور اس چندر بھاگا نام سے پکارے جاتے ہیں۔ یہ دریا بہلول پور، سودھرہ اور ہزارہ میں سے گزرتا ہے۔

بہت (دریائے جہلم) قدیم باشندے اس کو بدستا کہتے تھے جو ب کی زیر دال زبر (س) ساکن ت لائی نقطوں والی اور الف سے لکھا جاتا ہے۔ اس کا سرچشمہ ایک ایسی جھیل ہے جو کشمیر کے علاقہ میں پرگنہ ویر میں واقع ہے۔ یہ دریا سری نگر کے درمیان سے جو کہ کشمیر کا پایہ تخت ہے گزر کر ہندوستان میں داخل ہوتا ہے۔

صفحہ ۵۳، ۵۴

ختا: ترکستان کے شہر کا نام۔

سواد: سوات۔

گیتی خداوند: یعنی خداوند گیتی۔ دنیا کا مالک مراد۔ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ۔

کم ہمتا: بے نظیر۔ بے مثال۔ لاثانی۔

بسان: مانند

گیہان پیرا: جہاں کو پیراستہ کرنے والا مراد جلال الدین محمد اکبر بادشاہ۔

برخی: کچھ۔ بعض۔

گیتی: دنیا۔

سازگار: موافق۔

کشت و کار: کھیتی باڑی، کاشتکاری، زراعت

آبیاری: آبپاشی۔ سیرابی۔

کالا: سامان تجارت۔

گیہان: جہان۔

ریگ شوئی نمودن: ریت دھونا۔

طلا: سونا۔

نقرہ: چاندی۔

مس: تانبا۔

برنج : پیتل۔
نادرہ کار : انوکھا کام کرنے والے۔
توران : ترکستان۔
افزدن : زیادہ۔ شدید۔
گزیدہ : چنا ہوا۔
دیگ شو : نیار یا۔
کم ہمال : بے نظیر۔ لاثانی۔ بے مثال۔
لہاور : لاہور کا قدیم نام۔
ارک : عمارت جو بڑے قلعے کے اندر بنی ہو۔
کاخہا : محلات۔

گوناگوں : مختلف قسم قسم کے۔
سترگ : بزرگ۔عظیم۔بڑا۔
میان : درمیان۔
بیتہ جالندھر : بست جالندھر۔
باری : دوآبہ باری۔
چنہٹ : دوآبہ چھچھ۔
ہفدہ : سترہ۔
باستانی زیجات : یعنی تجارت باستانی۔ قدیم زائچے۔جنتریاں۔
ابدپیوند : ابد سے تعلق رکھنے والی۔ یعنی ہمیشہ برقرار رہنے والی۔
والا : بلند، باعظمت۔
بنگاہ : گھر۔ ٹھکانہ۔ جگہ۔

(ترجمہ) بھیرہ اُس کے کنارے پر واقع ہے۔دریائے سندھ اس کا سرچشمہ کشمیر اور کاشغر کے درمیان بتایا جاتا ہے اور بعض لوگ ختا بتاتے ہیں۔ یہ دریا سوات، اٹک، بنارس اور چپارہ کی سرحدوں سے بہتا ہوا بلوچستان سے گزرتا ہے۔

دنیا کے مالک یعنی اکبر بادشاہ نے دریائے ستلج اور بیاس کے درمیانی علاقے کو بست جالندھر کا نام دیا اور دریائے بیاس اور دریائے راوی کے درمیانی علاقے کو رچنا اور چناب اور جہلم کے درمیان علاقے کو جہنٹ اور بہت (جہلم) اور سندھ کے درمیانی علاقہ کو سندھ ساگر کہتے ہیں۔ ستلج سے بیاس تک کا فاصلہ پچاس کوس ہے۔ بیاس سے راوی تک سترہ کوس۔ راوی سے چناب کا تیس کوس اور چناب سے جہلم تک بیس کوس اور اُس

جہلم سے سندھ تک اڑسٹھ کوس کا فیصلہ ہے۔ یہ آباد ملک ہے۔ اس کی آب و ہوا نہایت ہی خوشگوار اور معتدل ہے۔ کاشت کاری کے لحاظ سے بھی بے مثال ہے۔ اس کے اکثر حصے کی سرسبزی کنوؤں کی آبیاری سے ہے۔ یہاں سردی کا موسم اگرچہ ایران اور ترکستان جیسا نہیں لیکن ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ ہے۔ اور دنیا کو آراستہ کرنے والے بادشاہ کی توجہ کی وجہ سے اس میں ایران، ترکستان اور ہندوستان کے بہترین مال مہیا ہیں۔ بعض مقامات پر ریت دھونے (یعنی نیاریئے کا کام) بھی ہوتا ہے اور ریت ہی سے سونا، چاندی، تانبا، کانسہ، جست پیتل اور شیشہ نکلتا ہے۔ یہاں قسم قسم کے اچھوتا کام کرنے والے کاریگر اور ہنرمند موجود ہیں۔

لاہور ایک بہت بڑا شہر ہے جو دوآبہ باری میں واقع ہے اپنی وسعت اور آبادی کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ قدیم جنتریوں میں اسے لہاور کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس شہر میں ہمیشہ برقرار رہنے والی سلطنت (اکبر کی حکومت) نے اس کا قلعہ اور اس قلعہ کے اندر کی عمارات پکی اینٹوں سے بنائی ہیں اور جب کچھ عرصہ دارالخلافہ بنا رہا تو اس میں بڑے شاندار محل بھی تعمیر کیے گئے۔ اور دلکشا باغوں نے اس کی رونق کو اور بڑھا دیا اور یہ شہر مختلف شہروں کے گوناگوں لوگوں کا مرکز و صدر مقام بن گیا اور انھوں نے اس میں بڑی اہم خدمات انجام دیں۔

صفحہ نمبر ۵۵ تعلیم کی ترقی میں ریڈیو اور سینما کی خدمات ۔

راڈیو :- ریڈیو

معارف :- معرفت کی جمع (علوم) تعلیم ۔ علم ۔

توسعہ :- وسعت ، ترقی

متفکرین :- متفکر کی جمع ، متفکرین

عقائد :- عقیدہ کی جمع ، نظریات ۔ خیالات ۔

پیشرفت :- ترقی ۔

وسائل :- وسیلہ کی جمع ، ذرائع ۔

فکری :- ذہنی ، دماغی ۔

رکود :- جمود ، ٹھہراؤ ۔

رکودِ فکر :- فکری جمود ۔

شؤون :- شان کی جمع ۔ حالات ۔ بڑے کام ۔

گوتانبرگ :- گوتنبرگ جوہان ۔ وہ پہلا شخص جس نے چھاپہ خانہ ایجاد کیا ۔ وہ ۱۴۰۰ء میں جرمنی میں پیدا ہوا ۔ اس نے ۱۴۶۸ء میں انتقال کیا

تعمیم یافتن :- عام ہونا ۔

دست یافتند :- موقع پایا ۔ موقع حاصل کیا ۔ مہارت حاصل کی ۔

گنجینہ :- خزانہ ۔

متمتع :- تمتع حاصل کرنے والا ، مستفید ، بہرہ مند ۔

مطبوعات :- کتابیں ، مطبوعہ چیزیں اخبارات ، صحافت (پریس وغیرہ)

امروزی :- آج کل کی ۔ موجودہ ۔

روزنامہ ہا :- اخبارات ۔

پیش رفتن :- آگے بڑھنا ، ترقی کرنا ۔

تربیت :- پرورش ۔

افکار :- جمع فکر کی (خیالات ۔

مظاہر :- مظہر کی جمع ۔

ترویج یافتن :- رواج پانا ، رائج ہونا

متمتع شدن :- فائدہ اٹھانا۔
حیاتی :- زندگی سے متعلق۔
چاپ :- طباعت، چھپائی۔
اختراع کرد :- ایجاد کی۔
نواقص :- جمع نقص، خرابی۔
پیشرفت :- ترقی
دست یافتن :- موقع پانا یا مہارت کرنا
برخوردار :- مالامال۔
عدہ :- تعداد۔
سطح بالا بردن :- معیار بلند کرنا۔

سطح :- معیار
امروزہ :- آج کل۔
رقابت نمودن :- ہمسری کرنا۔ مدِمقابل ہونا
نشر :- نشر و اشاعت پھیلانا، تشہیر کرنا
دانشمندان :- اہل علم۔
علماء :- جمع عالم۔
نشر کردن :- پھیلانا۔
رفع شدن :- دور ہونا۔
تغیرات :- تبدیلیاں۔
معترف بودن :- اعتراف کرنا

(ترجمہ) پرانے وقتوں میں ترقی و تربیت اور وسعت خیال کے ذرائع بہت محدود تھے کیونکہ متفکر اور عالم آسانی سے اپنے خیالات و نظریات کی نشر و اشاعت نہیں کر سکتے تھے اور اس لحاظ سے تمام نہایت ضروری امور اور مظاہر میں فکری جمود ظاہر اور نمایاں تھا۔ لیکن جب گوتنبرگ (GUTEN BERG) نے طباعت (کا طریقہ) ایجاد کیا۔ اور اس کے بعد اس کی خرابیاں دور ہو گئیں اور وہ مختلف ممالک میں عام ہو گیا تو (یہ) علم کی ترقی میں ایک بہت بڑا اقدام تھا، بلکہ عوام کو بھی (اس سے مستفید ہونے) کا موقع ملا۔ اور وہ علم و دانش کے خزانوں سے مالامال اور بہرہ ور ہوئے۔ اور متفکرین اور علما بھی زیادہ آسان اور سہل (طریقے سے) اپنے نظریات و افکار (لوگوں کی) زیادہ تعداد تک پہنچا سکے۔ یہی (وجہ) تھی کہ علم (سائنس) نے رواج پایا۔ کتب و مطبوعات (پریس) کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ اس نے زندگی و خیالات کا معیار بلند کر دیا۔ اور دنیا میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کیں۔

لیکن آج کل مطبوعات (PRESS AND PUBLICATION) کے علاوہ

دوسری چیزیں بھی حقائق کو رائج کرنے میں کوشش کر رہی ہیں اور ان تمام میں سے ریڈیو، سینما اور ان جیسی دوسری (چیزیں) ہیں۔

یہ اعتراف کرنا ضروری ہے کہ موجودہ تہذیب یافتہ دنیا میں ریڈیو اور سینما اس شعبہ میں مطبوعات (PRESS) کا مدمقابل ہو سکتا ہے اور مشرقی ممالک میں سینما اور ریڈیو اخبارات و مطبوعات کے دوش بدوش علم کی ترقی اور تمدن کی نشر و اشاعت میں آگے بڑھ رہے ہیں۔

صفحہ نمبر ۵۵، ۵۶

روشن فکر :۔ روشن خیال، وسیع القلب
اعتیادات :۔ عادات ۔
بطور کامل :۔ مکمل طور پر، پوری طرح ۔
مزایا :۔ مزیت کی جمع، شرف، بزرگی برتری ۔
اینجاست :۔ یہی وجہ ہے ۔
کمک :۔ امداد
چیرہ دست :۔ غالب، قادر۔
ملت :۔ قوم، ایک ہی ملک میں بسنے والے لوگ ۔
ابنیہ :۔ بنا کی جمع عمارتیں ۔
دریا :۔ سمندر، چھوٹا ۔
اوقیانوس :۔ سمندر، بحر اعظم ۔
ثانیہ :۔ سیکنڈ ۔
قلل :۔ قلہ کی جمع، چوٹیاں
مرتفع :۔ بلند، اونچی

طیاران :۔ طیار کی جمع اڑنے والے پرندے
طیران :۔ پرواز، اڑان ۔
طبیعت :۔ قدرت، نیچر، فطرت ۔
طبیعی :۔ قدرتی، فطرتی، نیچرل ۔
دانش آموزان :۔ طالب علم
درازی اینکہ :۔ بجائے اس کے بمابر مقابل ۔
وقائع :۔ واقعہ کی جمع ۔ واقعات ۔
فراگرفتن :۔ حاصل کرنا ۔ سیکھنا ۔
مورد استفادۂ زیادہ است : زیادہ مفید ہے ۔ زیادہ استعمال ہوتی ہے ۔
فیلم :۔ فلم ۔
طبیعی :۔ نیچرل، قدرتی ۔
مطبوعات :۔ پریس (PRESS)
شرح دادن :۔ بیان کرنا، وضاحت کرنا ۔
بالآخر :۔ آخر کار
زبردست :۔ بڑے بڑے بزرگ ۔

فقدان :۔ کمی ۔

درحین حال :۔ ساتھ ہی ۔

اطبا :۔ طبیب کی جمع ۔ ڈاکٹر، طبیب ۔

جراحی :۔ آپریشن

پارہ :۔ ٹکڑا ۔ کچھ ۔ تھوڑا ۔

لبطور ندرت :۔ کبھی کبھار، شاذ و نادر ۔ بہت کم ۔

عملیات :۔ آپریشن، سرگرمیاں، مساعی کوششیں، مشاغل ۔

برای العین :۔ آنکھوں کے سامنے، آنکھوں دیکھا، چشم دید ۔

دست یافتن ۔ موقع ملنا یا پانا ۔

تداوی نمودن :۔ دینا، علاج کرنا ۔

نویسندہ :۔ محرّر، ادیب

مجسم نمودن :۔ جسمانی طور پر سامنے لے آنا ۔

یارای :۔ قوّت، طاقت، زور ۔

زیراکہ :۔ کیونکہ ۔

پارہ :۔ کچھ ۔

متداول :۔ رائج ۔

فیلم برداشتن ۔ فلم تیار کرنا ۔ عکس لینا ۔

(ترجمہ) "لکھنے والا (یعنی ادیب) خواہ روشن خیال اور قادر ہو ۔ وہ کسی قوم و ملت کی حرکات و سکنات ۔ رسوم و عادات اور تہذیب و تمدن کو مکمل طور پر بیان نہیں کر سکتا اور قدرتی مناظر اور فطری برتری کو جیسا کہ وہ ہیں نظر (کے سامنے) مجسم نہیں کر سکتا ۔ یہی وجہ ہے کہ مطبوعات (PRESS) کی مدد کو اٹھتا ہے ۔ اور ایسے موقعوں پر وضاحت کرتا ہے جہاں قلم کو بیان کا یارا نہیں ہوتا ۔ کیونکہ سینما عمارتوں، بلڈنگوں، سمندر کی موجوں کے چلنے کے طریقے اور سمندر کے عجیب و غریب جانوروں کو ہماری نظر کے سامنے پیش کرتا ہے اور چند سیکنڈ کے بعد برف سے ڈھکے ہوئے بلند پہاڑوں کی چوٹیوں اور پرندوں کو جو فضا میں مصروف پرواز ہوتے ہیں ہماری نظر کے سامنے مجسم کر دیتا ہے ۔ آخرکار سینما قدرت کا بہترین ترجمان بلکہ خود قدرت ہے ۔

آج کل سینما مدرسوں میں زیادہ استعمال ہوتے ہیں اور طالب علم بجائے اس کے کہ کچھ واقعات اور معلومات کو کتابوں سے سیکھیں ۔ سینما کے ذریعے زیادہ آسان سہل

وساتھ ہی زیادہ جامع (طور پر) سیکھ سکتے ہیں - خاص طور پر طب کی دنیا میں سینما زیادہ مفید ہے - ایسے موقعوں پر جبکہ زبردست ڈاکٹر بہت خطرناک آپریشنوں میں مشغول ہوتے ہیں - یا ایسے وقت جبکہ کچھ بیماریوں کا جو زیادہ عام نہیں ہیں - اور کبھی کبھار پیدا ہوتی ہیں - علاج کرتے ہیں ان کی سرگرمیوں (مشاغل) کی فلم اتار سکتے ہیں - اور اس طریقے سے طالب علم ان سرگرمیوں (آپریشنوں) کا چشم دید مشاہدہ کر سکتے ہیں - اور سیکھ سکتے ہیں - جبکہ اس ذریعہ کے نہ ہونے سے ممکن تھا انہیں کبھی بھی اس کے سیکھنے کا موقع نہ ملتا -

صفحہ نمبر ۵۶، ۵۷

بقسمی کہ :- اس طرح کہ -

سریع :- تیز، تیز رفتار

پی بردن :- کھوج لگانا، سمجھ لینا -

ساطع شدن :- چمکنا -

عکس برداشتن :- فوٹو اتارنا -

بطئی :- آہستہ، سست -

کند :- آہستہ، مدھم، آہستہ آہستہ -

طبیعت :- فطرت، قدرت -

تند :- تیز

دریافتن :- سمجھنا -

بایں معنی :- اس طرح -

فیلم :- فلم

محقق :- تحقیق کنندہ -

نشان دادن :- دکھانا، ظاہر کرنا -

طبیعت :- قدرت، فطرت -

فوق :- مذکورہ بالا -

سیر تکامل :- تدریجی ارتقا -

تکامل :- تدریجی کمال یا ترقی حاصل کرنا -

تغیرات :- تغیر کی جمع، تبدیلیاں -

درعرض :- دوران میں، اثنا میں، اندر اندر -

علل :- جمع علت کی، اسباب، وجوہ

بعکس :- برعکس، برخلاف -

وقوف یافتن :- واقف ہونا، جان لینا -

صورت گرفتن :- مکمل ہونا، مجسم ہونا، رونما ہونا -

قضیہ :- معاملہ، کیفیت، حالت -

معتذر :- عذر پیش کرنے والا، معذور، مجبور -

بطو: آہستگی - کندی -

فواصل :- جمع فاصلہ۔	متوالیاً :- پے درپے، لگاتار، متواتر
نشوونمو :- نشوونما، بڑھنا۔	کندی :- آہستگی

ترجمہ :- قدرت میں بعض حرکات اتنی تندی و تیزی کے ساتھ رونما ہوتی ہیں کہ انسان ان کی کیفیّت کو سمجھ نہیں سکتا۔ مثلاً جس وقت بجلی چمکتی ہے تو اس رفتار کے ساتھ کوئی شخص بھی اس کے چمکنے کی حرکات و کیفیّت کو معلوم نہیں کر سکتا۔ اسی موقع پر سینما ہماری امداد کرتا ہے وہ اس طرح جب بجلی چمکتی ہے تو لگاتار اس کی تصویریں اور فوٹو اتار لی جاتی ہیں۔ اور جب وہ فلم کی صورت میں آجاتی ہے تو اس کی حرکت کو اس سے زیادہ آہستہ جو کہ قدرت میں واقع ہوتی ہے دکھلاتا ہے۔ اور یہاں اس کا سمجھنا انسان کے لئے زیادہ آسان اور سہل ہو جاتا ہے۔

مذکورہ بالا صورت کے برعکس قدرت میں نشوونما اور تدریجی ارتقا آہستہ آہستہ رونما ہوتا ہے (مکمل ہوتا ہے) جب ایک محقق کسی چیز کی نشوونما کی ابتدا و انتہا کو تھوڑی سی مدت میں اپنی نظر سے گزارنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے مشکل ہے بلکہ وہ معذور و مجبور ہے۔ مثلاً اگر ہم چاہتے ہیں چند منٹ کے اندر اندر گندم کے ایک دانہ جسے ہم مٹی کے سینہ کے سپرد کرتے ہیں اس وقت تک جبکہ مکمل طور پر دان چڑھ کر خوشہ پیدا کرتا ہے، کی تبدیلیوں کا مشاہدہ کریں تو اس تھوڑی سی مدت کے اندر اندر عالم قُدرت ان میں تبدیلیوں کو دیکھنا ناممکن، لیکن سینما کے ذریعے مکمل طور پر ممکن ہے۔ ہو بہو ان تبدیلیوں کو جو قدرت میں آہستگی سے رونما ہوتی ہیں۔ ہم دیکھ سکتے ہیں۔ اور اس چھوٹے سے دانے کی نشوونما کی وجوہات سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ چونکہ اگر ان تبدیلیوں کو زیادہ فاصلوں پر مشاہدہ کریں تو وجوہات کے اس سلسلے سے جو ان تبدیلیوں کو وجود میں لاتے ہیں واقف نہ ہو سکیں گے۔ لیکن اس کے برعکس جس وقت ان کو متواتر اور چند منٹ کے اندر دیکھیں گے تو ہمارے لئے ان کا سمجھنا آسان ہو جائے گا شاید یہ مشاہدہ

صفحہ ۵۷

علم طبیعیات : قدرتی علوم ۔
Natural Science

ہیئت :۔ ساخت ۔

تہیہ نمودن :۔ تیار کرنا

غیر مرئی :۔ مخفی ۔ نظر نہ آنے والی ۔ غیر محسوس ۔

ہویدا :۔ ظاہر ، نمایاں ۔

سلولہا :۔ سلول کی جمع ۔ سادہ حساس اور متحرک مخلوق ۔ یا عنصر جس سے انسان کا جسم بنا ہے ۔ خلیے ۔

مرتب :۔ باقاعدہ ۔

وظائف :۔ وظیفہ کی جمع ۔

عمیق :۔ گہرا

روحیات :۔ جمع روحی ۔ ذہنی اثرات یا روحانی کیفیات ۔

اعتیادات :۔ عادات ۔

فوق العادہ :۔ غیر معمولی ۔

تجربیات :۔ تجربات ۔

میکروسکپ :۔ خوردبین ۔

دقیق :۔ باریک ۔

نوامیس :۔ ناموس کی جمع ، قوانین ۔

میکروبہا :۔ جراثیم ۔

ذرہ بینی :۔ خوردبین سے نظر آنے والے ۔

اختراعات :۔ ایجادیں ۔

تغذیہ :۔ غذا پہنچانا ۔ پرورش کرنا ۔ کھلانا ۔

بنوبہ خود :۔ اپنی باری پر ۔

ادامہ دادن :۔ جاری رکھنا ، برقرار رکھنا

اکتشافات :۔ اکتشاف کی جمع ، از کشف ۔

نافذ :۔ تیز ، دور رس ، زود فہم جاری ۔

دارای :۔ رکھنے والی ، حامل ۔

امیال :۔ میل کی جمع ، آرزوئیں ، خواہشات تمنائیں ۔

واجد :۔ مالک

تعاطی :۔ تبادلہ ، معاوضہ ۔

جہات : جہت کی جمع ۔

معجزہ آسا :۔ معجزہ کی مانند ۔

نطقہا :۔ نطق کی جمع ، تقریریں ۔

معہذا :۔ اس کے باوجود

طبیعی :۔ قدرتی ۔

مجرا :۔ راہ ، ذریعہ ، واسطہ ۔

نوبت :۔ باری ۔

نشر :۔ جاری ہونا ، پھیلنا ۔

از جہات زیادی: کئی لحاظ سے۔
باسرع اوقات:۔ بہت تھوڑے وقت میں، بہت تیزی سے۔

معرفت: علم
نفوذ:۔ اثر و رسوخ۔

(ترجمہ) بظاہر مفید واقع نہ ہو۔ لیکن قدرتی علوم کے ایک عالم (سائنس دان) کے لئے بہت زیادہ غیر معمولی اہمیت کا مالک ہے۔ اور اس کے تجربات میں بہت زیادہ موثر ہے۔

حال ہی میں خوردبین کی مدد سے فلمیں تیار کی گئی ہیں جو نظر نہ آنے والی تبدیلیوں اور حرکات کو بہت باریک ہماری نظر کے سامنے مجسم کر دیتی ہیں اور قدرت کے قوانین کو ہمارے لئے روشن و واضح کرتی ہیں۔ ان فلموں میں عجیب و غریب حیوانات کی نشو و نما بہت چھوٹے جراثیم انسان اور حیوان کے جسم
ان کی حرکت اور پرورش کے طریقے کو بخوبی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور دیکھا جا سکتا ہے کہ دنیا کی سب سے چھوٹی مخلوقات ایک باقاعدہ اور منظم قواعد کے تحت اپنی زندگی برقرار رکھتی ہیں۔ اور اپنے فرائض کو مکمل نظم و ترتیب (یعنی باقاعدگی) سے انجام دیتی ہیں۔

ان ایجادات اور انکشافات نے اٹھارویں صدی کی قوموں کے ساتھ یا موجودہ دنیا کی قوموں کی آرزوؤں اور عادات اور ذہنی و روحانی کیفیات پر گہرے اور دور رس اثرات کی فنی لحاظ سے کسی قسم کی مشابہت نہیں ہے۔ ان معجزہ نما ایجادوں میں سے ایک ریڈیو کی ایجاد ہے۔

اگرچہ ریڈیو کی ایجاد بھی اپنی جگہ اہمیت کی مالک اور علوم کی اشاعت اور علم کے تبادلے کا باعث ہے۔ اور علمی اور سیاسی تقریروں اور خبروں کو دنیا کے تمام مقامات میں بہت جلد پہنچا دیتی ہے۔ اس کے باوجود سینما جیسے اثر و نفوذ اور اہمیت کی مالک نہیں ہے۔ کیونکہ یہ قدرتی ہے جو کچھ کر آنکھوں کے ذریعے دل دماغ میں

صفحہ نمبر ۵۷، ۵۸

خطور کردن:۔ سوجھنا، دل میں آنا۔
تاثیرات:۔ اثرات

مخیلہ۔ قوت متخیلہ۔ تخیل، خیال، تصور۔
گزارش:۔ کیفیت، بیان، تفصیل، سرگذشت حالات، رپورٹ

اصوات :۔ صوت کی جمع ، آوازیں

کنسرٹ :۔ کنسرٹ ۔

سایر :۔ باقی تمام

ناطقین :۔ ناطق کی جمع ، مقررین ۔ تقریر کرنے والے ۔

گوش دادن :۔ سننا ۔

عکس :۔ فوٹو

کشفیات :۔ انکشافات ، دریافتیں

درعین حال :۔ ایک ہی وقت میں ، ساتھ ہی ۔

مظاہر طبیعی :۔ قدرتی مظاہر ۔

خرسند :۔ خوش ۔

متعہد شدن :۔ بیڑا اٹھانا ، اپنے ذمے لینا ، اپنے اوپر لینا

خلاصہ :۔ مختصر یہ کہ ۔

بمراتب :۔ بدرجہا ۔

صوت :۔ آواز

منکر شدن :۔ انکار کرنا

سیم :۔ تار ۔

فرسنگ :۔ تین میل کا فاصلہ ۔

سرود :۔ گیت ، نغمے ۔

مملکت :۔ حکومت ، ملک ۔

تمتع بردن :۔ فائدہ اٹھانا ۔

صحبت نمودن :۔ گفتگو کرنا ۔

تلویزیون :۔ ٹیلیویژن ۔

منعکس نمودن :۔ منعکس کرنا ۔

اختراعات :۔ ایجادات ۔

تامین نمودن :۔ پورا کرنا ، تحفظ کرنا ۔

مظاہر :۔ مظہر کی جمع ۔

برخوردار :۔ مالامال ، مستفید ، بہرہ مند ۔

مزایا :۔ مزیت کی جمع ، خوبیاں ۔ برتریاں ۔

ردیف :۔ صف ، قطار ۔

تعمیم دادن :۔ عام کرنا ۔

"

"

(ترجمہ) آتا ہے اس کے اثرات سننے سے بدرجہا زیادہ ہیں ۔ حالانکہ سینما آواز اور شکل کو ہمارے تخیل میں منقش کر دیتا ہے ۔

اس صورت میں ریڈیو کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آوازوں کو بغیر کسی تار کے کئی فرسنگ (میلوں) تک منتقل کر دیتا ہے ۔ اور انہیں ہمارے کانوں میں پہنچاتا ہے اور ملکوں کو ایک دوسرے کی زندگی کے حالات سے مطلع کرتا ہے ۔

گیت اور کنسرٹ اور ضیافت کی محفلیں جو ایک ملک میں منعقد ہوتی ہیں باقی تمام ملک بھی ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جب مقررین مختلف سیاسی، فلسفیانہ، ادبی اور علمی موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں۔ تو اس سے (یعنی ریڈیو) سے تمام دُنیا کے لوگ بھی سن سکتے ہیں۔

ٹیلیویژن کی ایجاد نے دنیا میں ریڈیو کے اثر و نفوذ اور اہمیت کو اور بڑھا دیا ہے۔ چونکہ جس وقت ریڈیو آواز کو منتقل کرتا ہے ٹیلیویژن فوٹو اور تصویروں کو آپس میں منعکس کرتا ہے۔ جب یہ ایجاد کمال کی حد کو پہنچ گئی اور اس کی فنی خرابیاں دُور ہو گئیں تو کہا جا سکتا ہے کہ ایسے وقت میں (موقع پر) جب کہ وہ (انسان) نئی دنیا کے تہذیب و تمدن سے بہرہ مند رہا ہے اور ایجادات و اکتشافات اس کی خوشی کو پورا کر رہی ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں قدرتی مظاہر اور اس کی زیبائشوں سے متمتع ہو سکتا ہے، اور ان کے دیکھنے سے بھی خوش ہو سکتا ہے۔ کیونکہ انسان صرف مصنوعات کا ہی فریفتہ اور متوالا نہیں ہے کبھی اس کی یہ تمنا بھی ہوتی ہے کہ وہ قدرت سے تعلق رکھے۔ پانی کے چشموں کو دیکھے۔ قدرتی مناظر کا مشاہدہ کرے اور جب ٹیلی ویژن کی ایجاد کمال کو پہنچ گئی تو وہ اس کام کو پورا کرنے کا ذمہ لے سکتا ہے اور (اس کے ذریعے) قدرتی مناظر کو ہماری نظر میں مجسم کر سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ موجودہ دنیا میں سینما اور ریڈیو مطبوعات کی صف میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ تعلیم کو تمام دنیا میں عام کر رہے ہیں اور پھیلا رہے ہیں۔

سید محمد علی جمالزادہ

نام و شہرت و لقب	سید محمد علی جمالزادہ
جائے پیدائش	اصفہان
سال تولد	۱۸۹۵ء میلادی
ابتدائی تعلیم	تہران میں تحصیلات متوسط بیروت میں علم قانون لوزان و دیژون (فرانس) ڈپلومہ لا کالج۔

جمالزادہ کے مقالات فارسی اور جرمنی زبان میں بے شمار ہیں۔ بقول ان کے ان کو اپنے افسانے مرتب کرنے کی فرصت نہیں۔ بہر حال ان کا ارادہ ہے کہ وہ اپنے مقالات اور افسانوں کے مجموعے کو مرتب کرکے دنیائے طب وادب کے سامنے پیش کریں۔
سردست ان کی تالیفات کی مختصر فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ گنج شایگان یا ایران کی اقتصادی حالت مطبوعہ برلن ۱۳۳۵۔

۲۔ یکی بود و یکی نبود۔ مطبوعہ برلن (کامران پریس۔ اب تک سات آٹھ مرتبہ چھپ چکی ہے)۔

۳۔ روزنامہ کاوہ۔ برلن سے شائع ہوتا رہا۔ سید حسن تقی زادہ بطور مدیر کام کرتے رہے۔

۴۔ جمو حسین علی یا ہفت قصہ۔ مشہور و معروف کتاب ہے۔ حال ہی میں "دو شاہکار" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

۵۔ راہ آب نامہ۔ دوسری مرتبہ تہران سے شائع ہوئی ہے۔

۶۔ قلتشن دیوان: تہران سے شائع ہوئی ہے۔ ۱۳۲۴ ہجری شمسی۔

۷- دارالمجانین - مطبوعہ تہران -

۸- صحرائی محشر ۱۳۲۶ ہجری شمسی -

۹- معصومہ شیرازی -

۱۰- تلخ و شیریں -

۱۱- کہنہ و نو - مطبوعہ تہران -

۱۲- تاریخ روابط ایران و روسیہ - مطبوعہ برلن -

۱۳- قصہ و قصہ ہا - مطبوعہ برلن -

۱۴- پندنامہ سعدی مطبوعہ تہران -

۱۵- ہزار بیشہ - مطبوعہ تہران -

۱۶- کشکول جمال دو جلد - مطبوعہ تہران -

۱۷- سر و تہ یک کرباس دو جلد -

۱۸- بانگ نای (داستانہای مثنوی) مطبوعہ تہران -

۱۹- سرگذشت محشر - ترجمہ انگریزی -

۲۰- ویلیم تل از شلر ترجمہ از جرمنی -

۲۱- دون کارلوی - ترجمہ از انگریزی -

۲۲- جنس عصر مولہ - ترجمہ از فرانسیسی -

۲۳- داستانہای برگزیدہ

۲۴- خاک و آدم - مطبوعہ تہران -

۲۵- کتاب لغات عامیانہ - زیر طبع -

۲۶- غیر از خدا ہیچ کس نبود - زیر طبع -

۲۷- ہشت کشور - زیر طبع -

ان کے علاوہ بے شمار مقالات ہیں جو یغما اور سخن میں شائع ہو چکے ہیں۔ سید حسن تقی زادہ اور علامہ قزوینی دونوں آقا محمد علی جمالزادہ کی تعریف و توصیف

میں رطب اللسان ہیں۔ مثلاً سید حسن تقی زادہ جن کا سن اس وقت ستر پچہتر سال کے لگ بھگ ہے۔ اور ایرانی فضلا میں ان کا مقام بہت بلند ہے "مجلہ دانشکدہ ادبیات تبریز" میں (دورہ ششم شمارہ سوم ۱۳۳۹ شمسی) رقم طراز ہیں۔

"محمد علی جمالزادہ ہمارے زمانے کے بہترین ارباب قلم اور فضلا میں سے ہیں"۔ وہ لکھتے ہیں کہ اپنی موجودہ عزت و شہرت کے باوجود بھی کہا جا سکتا ہے کہ صحیح معنوں میں ان کی قدر نہیں کی گئی۔ حالانکہ وہ ایران کی قابلِ قدر اور قابلِ فخر شخصیت ہیں۔ ضروری ہے کہ ہماری موجودہ نسل کو ان کے اوصافِ حمیدہ اور فضائل پسندیدہ کے علاوہ ان کی تحریر ان کے علم و فضل اور فضیلت کے بلند مقام سے آشنا کیا جائے۔ علامہ تقی زادہ لکھتے ہیں کہ جمالزادہ ایران کے مشہور و معروف واعظ سید جمال الدین مرحوم کے فرزند ارجمند ہیں۔ سید جمال الدین واعظ ایران کی سیاسی آزادی کے علم برداروں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ دورہ مشروطیت یعنی ۱۳۲۴ اور ۱۳۲۶ شمسی کے لگ بھگ تقریباً دو سال ان کو سید جمال الدین واعظ مرحوم سے دوستی کا شرف حاصل رہا ہے (حسن تقی کو) اور ان کے وجود کے فیض سے سیراب ہوتے۔ وہ خود بھی مشعل آزادی کے حامل رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مرحوم سید جمال الدین ماں کی طرف سے ہمدانی تھے۔ لیکن چونکہ ان کا قیام اصفہان میں رہا، اس لئے اصفہانی مشہور ہو گئے۔ انہوں نے حریت اور آزادی کا پرچم بلند کیا۔ اور استبداد کے خلاف جنگ لڑی۔ وہ حقیقت میں شمع آزادی کے پروانے تھے۔ ان کا خلوص نیت سب میں مسلم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو فن تقریر تکلم اور سخن گوئی کی خوبیاں عطا کیں۔ ان کی خدمات کی داستان بہت طویل ہے۔ ان کے فرزند ارجمند سید محمد علی جمالزادہ بھی ایسی ہی شخصیت ہیں۔ جن پر نہ صرف ایران بلکہ دنیائے فارسی زبان کی طرف سے بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل فرانس میں کی۔ اور قانون کی ڈگری کے حصول کے بعد ادبی کاموں میں مشغول ہو گئے "یہ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کا زمانہ تھا۔

محمد علی جمالزادہ اپنے والد بزرگوار کی حیات مبارک میں تحصیل علم کے لئے بیروت، تشریف لے گئے اور تقریباً دو سال وہاں رہے۔ پھر سوئٹزر لینڈ اور فرانس میں

تعلیم کی تکمیل کی۔

سید حسن تقی زادہ فرماتے ہیں کہ جنگ عظیم کے شروع میں جرمنی پہنچا تاکہ ایران کی نجات کے لئے اپنے ایرانی دوستوں سے مشورہ کروں۔ میری کوشش تھی کہ یورپ میں جتنے ایرانی عناصر موجود ہیں ان کو ایک مرکز پر جمع کر لوں۔ چنانچہ تاروں کے ذریعے سے کاظم زادہ ایرانی پور داؤد محمد خاں قزوینی محمد علی جمالزادہ اور دیگر فضلاء کو مدعو کیا۔ اور وہ برلن میں تشریف لائے۔ جمالزادہ جنہوں نے حال ہی میں شادی کی تھی۔ اپنی دلہن کو لے کر برلن تشریف لے گئے۔ ہم نے جو نقشہ تیار کیا تھا۔ اس کے مطابق ایران اور اس کے گرد و نواح میں وطن پرست لوگ پھیل گئے محمد علی جمالزادہ عازم بغداد ہوئے۔ جمالزادہ کی کوشش ملک و وطن کی حمایت میں قابل تعریف و تحسین ہے۔ پھر وہ کاوہ کی اشاعت معطل ہو جانے کی وجہ سے برلن کے ایرانی سفارتخانے میں ملازم ہو گئے۔ پھر سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔ اور انجمن بین المللی کے دفتر میں جو جینوا میں ہے تقریباً ۲۷ سال کام کیا۔ روزنامہ کاوہ کے مدیر کی حیثیت سے بلند پایہ نفیس عالمانہ محققانہ اور دلکش مقالات لکھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی شہرت کا آغاز اس زمانہ میں ہوا۔ جب انہوں نے اپنی کتاب "یکی بود و یکی نبود" کو شائع کیا۔ یہ عوامی زبان میں لاجواب کتاب تھی۔ اور دوسری ان کی کتاب تاریخ روابط ایران و روس جس کو علمی اور تاریخی لحاظ سے اہم جانا جاتا ہے۔ جمالزادہ کی شہرت روز افزوں ہوتی گئی۔ اور آج وہ آسمان علم و ادب پر ایک روشن ستارے کی طرح نظر آتے ہیں۔

جمالزادہ کے فضائل اور دوسری خوبیاں اس کی تحریر پر ہی منحصر نہیں اور وہ نہ صرف صاحب ذوق سلیم اور روشن بین ہے جو صحیح دیکھتا ہے اور صحیح سمجھتا ہے بلکہ انسانی اخلاق فضیلت شرف صداقت، وفا خلوص، جوانمردی، خیر خواہی، سلامت ہوش بلند، خیالی نکتہ سنجی اور حکمت و دانائی کے لحاظ سے بھی اپنی قوم کے افراد میں وہ ممیز اور ممتاز ہے۔ ان کے اوصاف پر ایرانی قوم ان پر بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔ مزید برآں جمالزادہ کی طبیعت میں حسد بغض اور کینہ قطعاً نہیں بلکہ وہ ہر مبتدی اور

متنبّی کی تشویش کا باعث ہوتے ہیں وہ حقیقتاً اس سے بھی بلند تر شخصیت کے مالک ہیں۔ مغربی ادبیات میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ بہت کم مغربی ادبار اور فضلا ایسے ہوں گے جن کی کتابوں کا انہوں نے مطالعہ نہ کیا ہو اور ان کے افکار و عقائد پر ان کو عبور نہ ہو۔ خاص طور پر فرانسیسی اور جرمنی میں ان کو مہارت تامہ حاصل ہے۔ عربی زبان میں بھی خوب مہارت رکھتے ہیں۔ فارسی زبان میں تو ان کی فصاحت اور بلاغت عدیم النظیر ہے۔ نہ صرف تقی زادہ ان کے مداح ہیں اور ان کے فصاحت زبان اور ذوق سلیم کے معترف ہیں بلکہ مرحوم علامہ قزوینی بھی ان کی تعریف کرتے ہیں۔ اور ان کی بے شمار خوبیوں کے قائل نظر آتے ہیں۔

جمالزادہ بحیثیت افسانہ نویس

جمالزادہ فارسی افسانہ نویسی میں ایک ممتاز مقام کے مالک ہیں۔ انہوں نے ہی سب سے پہلے فنِ افسانہ نویسی کو ایران میں شروع کیا۔ ان سے پہلے کہانیاں تو تھیں لیکن وہ کلیلہ و دمنہ یا گلستان وغیرہ کی صورت میں تھیں۔ انہوں نے فن میں زندگی پیدا کی یعنی فن کو زندگی کے لئے استعمال کیا۔ یہ فن برائے فن کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے دہخدا کے روشناس کرائے ہوئے راستوں کو استوار کیا۔ یہ نظریہ پیش کیا کہ ہر قسم کے فکر کا صحیح منبع و مآخذ معاشرہ اور ماحول ہی ہے۔ ایک فنکار میں حسنِ جمالیات تو ضرور ہوتی ہے لیکن وہ بھی زندگی سے ہی بہرہ ور ہوتی ہے۔ علم زندگی کے اصولوں کو صحیح طور پر بتانے والا فنکار ہی ہوتا ہے۔ احسان طبری کہتے ہیں کہ بہترین فنکار وہ ہے جو اپنے معاشرے کو کامل بنانے کے لئے جد و جہد کرے، معرفت کو بڑھائے اور شخصیتوں کو ارفع کرے۔ بزرگی کی تعریف میں رطب اللسان ہو، ریاکاری کی تذلیل کرے۔ قباحتوں کے زریں پردے کو پھاڑ ڈالے، عدل و انصاف کو بڑھانے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ زندگی کے صحیح مفہوم سے روشناس کرائے۔ فن کو نوشدارو ہونا چاہیئے نہ کہ جان کو گھلانے والا زہر۔

چنانچہ احسان طبری کے قائم کئے پیمانے پر اگر ہم جمالزادہ کو بحیثیت ایک افسانہ نگار کے پرکھیں تو یوں احساس ہوتا ہے کہ جمالزادہ نے فن کو سوسائٹی کے لئے استعمال کیا۔ اس عظیم افسانہ نویس نے یہ ثابت کر دکھایا کہ ماحول چاہے کتنا ہی ناسازگار کیوں نہ ہو اور لوگوں کو چاہے کیسے ہی نظریات کیوں نہ ہوں فن کار کو چاہیئے کہ جراتِ رندانہ کے ساتھ منطقی راستے پر گامزن ہو۔ اور دوسروں کی بیہودہ گوئی کی کوئی پرواہ نہ کرے۔

جس وقت اس فنکار نے اپنے فن افسانہ نویسی کے پرچم کو لہرایا تو ہنر رو بہ انحطاط تھا۔ سوائے رکیک اور پست موضوعات کے کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ لیکن اس نے اسے ایک مقصد کے لئے استعمال کیا، عصرِ حاضر کے مشہور ایرانی محقق علامہ قزوینی، جمالزادہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”دیگر آقای سید محمد علی خان جمالزادہ یکی از بہترین امیدہای آئندۂ ایران کہ کتاب ”روابط روس و ایران“ او نمونہ از وسعت اطلاعات و قوۂ انتقادی تدقیق اواست بسبک او و پائیان و کتاب ”یکی بود و یکی نبود“ او نمونہ داری از شیوۂ انشای شیرین سہل سادہ خالی از عناصرِ خارجیٔ اوست و اگر چہ این سبک اِشارکارِ آسان نیست، و باصطلاح سہل ممتنع است ولی معذلک فقط این طرز و شیوہ است کہ باید سرمشق چیز نویس ہر ایرانی جدیدی باشد کہ میل دارد بزبان پدر، مادری خود ش چیز بنویسد، و نمیخواہد کہ بواسطہ عجز آزادی مقصود خود بزبان فارسی محتاج بدریوزہ نمودن کلمات و جمل و اسالیب تعبیر کلام از اروپائیہا بشود چنانچہ شیوۂ ناخوش از نویسندگان دورۂ جدید است۔“

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جمالزادہ نے عامیانہ زبان و لہجے کو اپنے افسانوں میں سمویا۔ اُس نے روزمرہ زبان کو ادبی حیثیت دینے کی کامیاب کوشش کی۔ ”یکی بود و یکی نبود“ کے دیباچہ میں جہاں انہوں نے افسانے، ناول کی دلچسپی اور مقبولیت کا ذکر کیا ہے۔ وہاں سب سے زیادہ افسانہ کی افادیت کا یہ پہلو خاص طور پر پیش کیا ہے۔ کہ کہانی بیان کرتے وقت زبان عام فہم لکھی جائے۔ وہ اصطلاحات و محاورات استعمال

کئے جائیں جو روزمرہ کی زبان میں بولے جاتے ہیں۔ ایرانی کلاسیکی زبان اور روزانہ بول چال میں جو بُعد اور فرق ہے وہ افسانہ کی زبان سے ہی دُور ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے خیالات و افکار کو عوام تک پہنچانے کے لئے عام فہم بولی کا استعمال ہی زیادہ موزوں سمجھا ہے۔ بیرونی ممالک کے لوگ ایران کے کلاسیکی ادب سے تو واقف ہیں لیکن ایران کی روزمرہ زبان سے آگاہ نہیں۔ علماء طبقے کے لوگ اب بھی عربی کے بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرتے ہیں یا پھر تمدنِ غرب سے متاثر تعلیم یافتہ یورپین زبانوں کے الفاظ تقریر و تحریر میں استعمال کرنا قابلِ فخر سمجھتے ہیں۔ مصنّف نے اپنے افسانہ "فارسی شکراست" میں اسی قسم کے اسالیب گفتگو کا مذاق اڑایا ہے۔

فارسی نثر ایک مدت مدید سے جامد و راکد تھی، لیکن اس میں زندگی پیدا کرنے والے اشخاص و اشخاص جمالزادہ اور پھر صادق ہدایت ہیں۔ جمالزادہ نے فارسی نثر کو دائرہ ابتذال سے باہر نکالا۔ اور عام لوگوں کی زبان کو زندہ کیا اور پھر اس کو ادبی حیثیت دے کر ایک ممتاز مقام پر فائز کیا۔

فارسی زبان پر اسے پوری دسترس حاصل تھی۔ ان کی فارسی دانی محض رسمی قال و علاؤ تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ عوام کی زندہ زبان کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اُس کی بے پناہ عنایت کا انہیں شعور تھا۔ اپنے ذاتی علم و فضل سے نثر کے اس بے جان قالب میں نئی روح پھونک دی۔ نہ ہی انہیں ملاؤں کے مذاق کا خوف تھا، نہ قدامت پسندوں کی کڑی تنقید کی۔ اپنے فہم و ادراک کی بنا پر اصلاحات، ضرب الامثال، عامیانہ لُغت کو اپنی نثر میں بطریق احسن سمویا۔ اور ادبیاتِ فارسی میں ایک بڑے خزانے خزانے کا اضافہ کیا جس میں اس قسم کی سلاست و روانی ہے کہ تصنع اور بناوٹ کا شائبہ تک نہیں۔ اُس کے ہاتھ کلماتِ موم کی طرح ہیں جنہیں موزوں ترین مواقع پر استعمال کیا ہے۔ انسانی زندگی کے حقائق و واقعات کو انتہائی دلکش طریقے سے لکھتے ہیں۔

زبان عامیانہ سے متعلق محمد علی جمالزادہ کے افکار و خیالات وہ اپنے ایک مقالہ

میں رقم طراز ہیں۔ آج سے چند پہلے اگر مختلف تصانیف و تالیفات اور مطبوعات پر نظر ڈالی جائے تو ثابت ہو گا کہ آج جس زبان میں ہم ہر روز گفتگو کرتے ہیں اس میں کوئی مستند کتاب نہیں لکھی گئی۔ اور جہاں تک ہماری ادبیات کا تعلق ہے اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ زیادہ تر نظم پر مشتمل تھا۔ اور نثر میں بہت کم کتب لکھی گئیں۔ اور اگر کچھ موجود تھیں تو وہ ادبی زبان میں لکھی گئیں نہ کہ اس زبان میں جو شہر و کوچہ و بازار کے عام لوگوں کے درمیان متداول ہے۔ حتمی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ آغاز مشروطیت تک محاورہ۔ روزمرہ اور عامیانہ لحاظ سے کوئی اہم چیز نہیں لکھی گئی حتیٰ کہ وہ لوگ بھی مثلاً طالبوت مرزا ملکم خان مرزا فتح علی آخون مرزا آقا خاں کرمانی سیاحت نامہ ابراہیم بیگ کے مؤلف اور کتاب حاجی بابا اصفہانی کے مترجم اور رویاء صادقہ کے مصنفین نے سادہ فارسی میں چیزیں لکھی ہیں۔ ان کی زبان بھی عوام کی زبان نہیں کہی جا سکتی۔ اور انہوں نے جو کلمات۔ اصطلاحات۔ ضرب الامثال اور عام بازاری محاورات استعمال کئے ہیں وہ بہت کم ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے ادبا نے اس قسم کے عامیانہ کلمات استعمال کرنے سے ہمیشہ اجتناب کیا ہے یا انہوں نے اپنی تحریروں میں ایسے کلمات اور اصطلاحات کو لانا کسر شان سمجھا۔ اور کلاسیکل اسلوب اور سبک کے طرفدار ہے۔ وہ ہمیشہ یہ سمجھتے رہے کہ عامیانہ کلمات۔ اصطلاحات اور امثال و حکم کا استعمال شرائط ادب سے خارج ہے۔ اور لوگوں میں مقبول اور پسندیدہ نہیں۔ میرے نزدیک یہ حقیقت ہے کہ جس طرح اپنے جان و مال کی حفاظت کے لئے ہم کوشاں رہتے ہیں اسی طرح اس بات کی کوشش بھی ضرور کرنی چاہیئے کہ عامیانہ کلمات۔ اصطلاحات۔ تعبیرات اور ضرب الامثال جو زبان زد عوام الناس ہیں۔ ان کو محفوظ کر لیا جائے۔ ورنہ دور ایام سے یہ تمام چیزیں ضائع ہو جائیں گی اور زبان کی بیماری کا سامان پیدا ہو جائے گا۔ یہ درست ہے کہ زبان بھی ہماری طرح طفلی۔ جوانی۔ پیری کے تمام منازل طے کرتی ہے اور بالآخر ایک دن فنا ہو جاتی ہے اور لغت کی کتب کے گورستان میں فراموشی کے گرد و غبار کے نیچے مدفون ہو جاتی ہے۔ لیکن جو لوگ فارسی زبان و ادب سے ارادت رکھتے ہیں ان کو چاہیئے کہ تمام تغیرات کو پیش نظر رکھیں۔

اور ان عوامانہ کلمات کو محفوظ کر لیا کریں۔ ہمارے بزرگوں نے بلاغت کی تعریف میں یوں فرمایا ہے کہ بلیغ کلام وہ ہے جس کو عوام سمجھیں اور خواص اس کو پسند کریں۔ بلکہ اگر یہ دعویٰ بھی کیا جائے کہ عوامانہ کلمات تو کلام اللہ میں بھی موجود ہیں تو بیجا نہیں ہوگا۔

سقراط کے متعلق مشہور ہے کہ وہ عوامانہ کلمات اور الفاظ بکثرت استعمال کرتا تھا اور اپنے بلند ترین افکار اور خیالات کو عام لوگوں کی زبان میں جو وہ ہر روز گلی کوچوں میں بولتے ہیں بیان کرتا۔ بہرحال ہمیں افکار اور مطالب کو ایسی زبان میں ظاہر کرنا چاہیئے جو عوام کے فہم میں قابل قبول ہو۔ اور خواص بھی اس کو پسند کریں۔ زبان ادبی خوبیوں سے عاری نہیں ہونی چاہیئے۔ اور محض یہ سمجھ کر کہ سب لوگ اہل فضل و کمال ہیں ذرہ نادرہ کی زبان استعمال کی جائے کہ عام لوگ اس کو سمجھنے سے عاجز ہوں اور خواص اس کو سمجھنے میں تفکر۔ سوچ و بچار۔ اور لُغت سے مدد چاہنے لگیں۔ مرحوم علامہ فروغی فرہنگستان ایران،، کے نام ایک پیام میں فرماتے ہیں کہ :

" اسلوب تحریر ہر زمانے میں ایسا ہونا چاہیئے کہ لوگ اگر زیادہ وقت نظر سے نہ دیکھیں کہ لکھنے والے کی عبارت عام روزمرّہ کے استعمال سے تفاوت رکھتی ہے۔

ہمارے اکثر شعرا اور ادبا اور فضلائے بھی عوامانہ کلمات کو استعمال کیا ہے۔ اور بظاہر ہمیں کوئی سبب نظر نہیں آتا کہ ہم ان کے استعمال سے پرہیز کریں۔ ایسے کلمات اور محاورات کے استعمال سے اجتناب کا نتیجہ یہی ہے کہ یہ چیزیں لغت کی کتابوں میں منضبط نہ ہو سکیں۔ اور جہاں تک اہل زبان کے علاوہ دوسرے خارجی لوگوں کا تعلق ہے وہ تو بالکل ایرانی محاورہ اور روزمرّہ سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ جمالزادہ نے اپنی مشہور و معروف کتاب "یکی بُود و یکی نبود،، کے مقدمہ میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اور وہ لکھتے ہیں کہ وہ خارجی لوگ جو فقط چند کتابوں اور چند اسباق کے ذریعے سے فارسی سیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ وہ جب سالہا سال کی تحصیل کے بعد گفتگو فرماتے ہیں تو ایرانیوں کو ان کی زبان اور گفتگو سُن کر ہنسی آتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عوامانہ کلمات کا لغت کی زبانوں میں منضبط نہ ہو۔ زبان فارسی کا ایک بہت بڑا نقص ہے۔ اور پھر لطف تو یہ ہے کہ بعض کلمات ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا مترادف پیدا کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے جو ابھی مفہوم اور معنی کو ادا کر سکیں۔

مثلاً "خل"، ایک ایسا کلمہ ہے کہ اس کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کئی کلمے ادا کرنے پڑتے ہیں اور ہو سکتا ہے تب بھی مفہوم ادا نہ ہو سکے۔

کلمات بھی حیات و ممات کے اکثر ادوار سے گزرتے ہیں جن کو ہم کثرت سے استعمال کرتے ہیں وہ زندہ رہتے ہیں اور جن کو کثرت سے استعمال نہیں کرتے وہ ضعیف ہو کر اپنی موت مر جاتے ہیں۔ اور فنا ہو جاتے ہیں۔ امثال و حکم اور اصطلاحات میں بے شمار ایسی چیزیں ہیں جو فنا ہو چکی ہیں آج ہم کو ان کے معنی معلوم نہیں۔

جمالزادہ پر یہ اعتراض کیا جا رہا ہے کہ وہ بیس پچیس سال سے اپنے وطن سے باہر ہیں اس لئے انہوں نے یہاں کے تحولات کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، وہ سنی سنائی باتوں کو ذہن میں رکھ کر نقشہ کھینچتے ہیں۔ اُن کے افسانوں کے ایک مجموعہ تلخ و شیرین کو پڑھ کر یہ اعتراض درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان افسانوں کی زبان میں پہلا سا چٹخارہ اور شگفتگی نہیں اور پہلے محاورات ہیں جو بار بار استعمال ہو رہے ہیں لیکن اس کے باوجود مصنف کا کمال سمجھنا چاہیئے کہ وہ باوجود لُعد و دوری کے ایرانیوں کے اطوار اس صراحت سے بیان کرتے ہیں کہ ہو بہو آنکھوں کے سامنے تصویریں کھنچ جاتی ہیں۔ ان کا تخیل واضح ہے۔ انکے بیان میں صراحت ہے۔ ایرانیوں سے دُوری کی وجہ سے اخلاص کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ ویسے زبان کی توانائی تو بہر حال واضح ہے۔

اس کے بعد جمالزادہ کے فن افسانہ نویسی کا دوسرا پہلو ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ ہے افادی پہلو۔ جمالزادہ اپنے اس مقصد سے کہیں بھی غافل نہیں ہوتے۔ وہ اپنے وطن کی سیاسی اور اقتصادی بدحالی سے آگاہ ہیں اور اپنے ہم وطنوں کی پستی اخلاق کو دیکھ کر ان کا دل متاثر ہوتا ہے۔ معاشرے کے افراط و تفریط پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ وہ ایک خوشحال معاشرے کے متمنی ہیں جس میں غریبوں کے احساسات کو کچلا نہ جائے۔ جس میں خواہشات کا گلا نہ گھونٹا جائے۔ اور جس میں نچلے طبقے سے جینے کا حق نہ چھین لیا جائے۔ اس طرح سے جمالزادہ کے سینے میں ایک حقیقی محب وطن کا دل دھڑکتا ہے۔ اور وہ حتی الوسع اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔

"یکی بود و یکی نبود" ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۳۴۰ ہجری میں شائع ہوا۔ یہ چھ افسانوں پر مشتمل ہے۔

اس میں "دوستی خالہ خرسہ" کے سوا سب کہانیوں میں کسی نہ کسی معاشرتی خرابی کا بیان ہے۔ مذکورہ بالا کہانی میں جنگ عظیم میں روسیوں کی سنگدلی اور بیوفائی کو بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ ایک ایرانی نے ایک زخمی روسی پر رحم کھا کر اس کی جان بچائی۔ لیکن اُس نے اپنی حد میں پہنچ کر ایرانی کو روسیوں کے ہاتھوں مروا ڈالا۔ رجل سیاسی میں ایک سیاستدان کا کچا چٹھا عبرت ناک صورت میں پیش کیا ہے کہ سیاسی لیڈر اپنی خودغرضیوں کے لئے عوام کو دھوکا دے کر کس طرح لوٹتے ہیں۔

درد دل ملا قربان علی ایک روضہ خوان کی ہوسناکی، کم علمی، اور پستی اخلاق کی خود نوشت داستان ہے۔ بیلہ دیگر بیلہ چغندر میں ایرانیوں کی پسماندگی، سادہ لوحی اور جہالت کے ساتھ ساتھ ایرانی سوسائٹی کے تین طبقات یعنی مزدور، نوکری پیشہ اور امراء کو اخلاقی نقطہ نظر سے عریاں کرکے پیش کیا ہے۔

اس مجموعہ کی اشاعت کے بعد جمالزادہ کے خلاف ایک طوفان برپا ہوا۔ امراء نے اس کو غدار وطن کہا۔ ملاؤں اور واعظوں نے کفر کے فتوے دیئے۔ آخر میں اس قدر پر جوش پروپیگنڈا کی وجہ سے یہ کتاب بحق سرکار ضبط ہو گئی۔

اس مجموعے کی سب کہانیاں مقصدی ہیں اور ان کی افادی حیثیت غالب ہے کہ بیانیہ انداز میں ایران کی تمدنی اور معاشرتی کا حال لکھا جا رہا ہے۔ کہانیوں کا ماحول ایرانی ہے۔ ایرانی ہی متشکل ہو کر آنکھوں کے سامنے گزرتے ہیں اور اپنا اپنا حال بیان کرتے ہیں۔ یہ کہانیاں یقیناً حاجی بابا اصفہانی اور سیاحت نامہ ابراہیم بیگ سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔

اسی طرح سے راہِ آب نامہ جو ایک طویل افسانہ ہے اور تکنیک کے لحاظ سے بڑی کامیاب کہانی ہے اس میں مقصدیت ہویدا ہے۔ اس میں رضا شاہ سے پہلے اور شروط کے درمیانی زمانے میں ایران کی معاشرتی زندگی کا نقشہ پیش کیا ہے۔ حکومتی اداروں

ہیں نااہلی، رشوت ستانی اور کنبہ پروری کا زور ہے۔ درمیانی اور نچلے طبقے کے لوگ پست اخلاق ہیں۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک بد معاملہ، جاہل، ریاکار، باتونی، تکلف پسند اور کام چور ہیں۔ ناولٹ کی افادی اور مقصدی حیثیت واضح ہے۔ ایرانیوں کا اپنا کردار ان کے سامنے پیش کر کے اُن کے دل میں اصلاح کا ایک شعور اور احساس پیدا کرنے کی ایک بہترین کوشش کی ہے۔ مصنف نے لگی لپٹی رکھے بغیر ان کے اخلاق و کردار پر بے لاگ تنقید اور تعریض ہے۔

علاوہ ازیں جمالزادہ کے ایک طویل افسانہ تلتش دیوان میں بھی جنگ اور اس کے بعد کے زمانے کا تہران پیش کیا گیا ہے۔ مستبد اور مشروطہ طلبوں کی باہمی آویزش جا بجا نظر آتی ہے۔ وزراء، امراء اور حکمران عیاش، بے رحم اور غاصب ہیں۔ عوام غریب، مصیبت زدہ اور مفلوک الحال ہیں۔ حق رسی اور داد رسی کا کوئی انتظام نہیں۔ حکام اور امراء نے بد معاش ملازم رکھے ہوئے ہیں جو اُن کے مخالفین کو قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتے کیونکہ قاتل کی پناہ گاہ خود حکومت ہے۔ حکومت کے ساتھ اثر و رسوخ رکھنے والے امیر جنگ کے ناسازگار حالات سے فائدہ اٹھا کر ذخیرہ اندوزی اور نفع خوری سے امیر تر ہوتے جاتے ہیں تلتش دیوان (کردار کا نام) اپنی فریب کاریوں سے حکام اور پولیس کی مدد سے نیکنام سرپرست یتامیٰ ہو کر مرتا ہے۔ حاج شیخ سقط فروش (دوسرا کردار جس کی زندگی ایثار و قربانی کا نمونہ ہے) ذخیرہ اندوز ذلیل اور بدنام ہو کر جان دیتا ہے افسانہ میں اُس زمانے کی اقتصادی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی اپنے صحیح خط و خال میں نمایاں ہے۔

اس طرح سے مصنف نے معاشرے کے مختلف پہلوؤں کی پردہ دری کی ہے اور یہ ایک اصلاح کے لئے صدائے احتجاج بھی ہے۔

جمالزادہ بحیثیت فنکار

کردار نگاری:۔ جمالزادہ نے کئی ایک افسانوں میں کردار نگاری کا بھی اچھا مظاہرہ

کیا ہے۔ مختلف افسانوں میں مختلف کرداروں کو اس طرح سے پیش کیا ہے کہ ہو بہو ان کی تصویر کھینچ دی ہے۔ اگرچہ ٹیکنیک کے اعتبار سے جمالزادہ کو فن افسانہ نویسی میں بلند مقام حاصل نہیں لیکن کردار نگاری میں اور مختلف واقعات کا تجزیہ کرنے میں انہوں نے اپنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ راہِ آب نامہ کے کردار بڑے واضح اور جاندار ہیں۔ روح اللہ انگلستان سے تعلیم یافتہ حساس دردمند باتمیز نوجوان ہے۔ مسجد کا نیم ملا رجب علی نیم حکیم مرزا موش نیم سیاسی ملت خواہ، ادھیڑ عمر کی فیشن پرست بیگم خان اور مزدور طبقے کا نمائندہ شاطر نا لوا اور ایک فرنگی مآب معمار اور مہندس اس قصہ کے اہم کردار ہیں۔ مصنف کے اپنے بیان سے اور کرداروں کے اپنے مکالموں سے ہر ایک کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے۔ سید جمالزادہ کے مشاہدات غائر اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ انہوں نے کردار نگاری میں بڑی مہارت سے کام لیا ہے۔ پانچ اشخاص قصہ کی وہ پانچ تقریریں جو انہوں نے راہِ آب کی تعمیر کی حمایت ارشاد فرمائیں وہ ان کی انفرادی خصوصیات کی حامل ہیں اور ہر تقریر میں کردار انفرادیت موجود ہے۔ کردار نگاری میں یہ چیز بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

قلتشن دیوان میں بھی کردار نگاری کا اچھا مظاہرہ کیا ہے۔ افسانے کا ایک ایک کردار جیتا جاگتا شخص معلوم ہوتا ہے۔ پڑھنے والے کی نگاہوں میں ہو بہو اس کا نقشہ پھر جاتا ہے۔ قلتشن دیوان، حاج شیخ سقط فروش اور حاکم شہر کے کردار اپنی وضاحت اور صراحت کے لحاظ سے کامل ترین نمونہ پیش کرتے ہیں۔

جہاں تک افسانے کے فن کا تعلق ہے۔ جمالزادہ کو صادق ہدایت کی سی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ کیونکہ ان کے افسانے فنی اعتبار سے اتنے کامیاب ثابت نہیں ہوئے کیونکہ عموماً افسانہ کی شرائط میں ضروری ہے کہانی مختصر ہو۔ مرکزی خیال ایک ہو۔ کردار کی تعداد محدود ہو۔ اور وہ آپس میں مربوط ہوں کہانی میں اگر پلاٹ ہو تو اس کا آغاز و انجام ہو۔ اور کوزہ میں دریا بند کر دیا جائے یعنی مختصر ہیئت میں زندگی کے تمام رُخوں پر اس طرح سے اُچٹتی ہوئی نظر ڈالی جائے کہ کوئی بھی پہلو باقی نہ رہے۔

جمالزادہ کے سوائے چند ایک افسانوں کے کسی کا بھی اندازِ بیان یہ نہیں کہ پہلے ابتدائی مقامات بیان ہوں۔ پھر قصہ عروج پر پہنچے اور آخر میں زوال اور پیچیدگیوں کی کشائش کہانیوں کی اٹھان اس طرح ہو کہ پڑھنے والے کی توجہ اس کی طرف کھچ جائے۔ اور مصنّف کو اس طرح لپیٹ کر رکھے کہ آخر تک کہانی میں دلچسپی کم نہ ہو۔

جمالزادہ کی کہانیاں، بایو گرافی کا انداز لئے ہوتے ہیں۔ سب کہانیوں کا کردار ایک شخص ہے جو آپ بیتی بیان کرتا ہے۔ دو اشخاص یا دو نقطۂ نظر کا ٹکراؤ جس سے کردار اُبھرتے ہیں، کسی بھی افسانے میں نہیں۔ مصنّف کی اپنی شخصیت ہر کہانی میں نمایاں ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک دردمند محب وطن اس لئے کہانی بیان کر رہا ہے۔ اس طرح مصنّف ایک خطیب یا واعظ کا روپ دھار لیتا ہے، جس سے افسانے کو فنّی اعتبار سے ٹھیس پہنچتی ہے۔ صادق ہدایت میں یہ چیز نہیں۔ اُس نے افادیت کو کامل طور پر فن کو حاوی نہیں کیا۔ وہ مقصد بھی بیان کر جاتا ہے لیکن اس طرح سے کہ قاری کی دلچسپی بھی برقرار رہتی ہے۔ اکتاہٹ و بیزاری کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ اور افسانے کی ٹیکنیک بھی بحال رہتی ہے۔

لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُن کے افسانے، افسانے کہلانے کے مستحق نہیں بلکہ کہانیاں ہیں۔ کیونکہ انہوں نے جابجا ٹیکنیک کا مظاہرہ کیا ہے۔ اگرچہ ساری شرائط پوری نہیں کیں۔ مثلاً راہ آب نامہ میں کہانی کی ساخت، اور پلاٹ میں آغاز ارتقا اور اختتام کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ کہانی نقطۂ عروج پر بھی پہنچتی ہے۔ آخر تک دلچسپی قائم رہتی ہے۔ لیکن کہانی کے پچھلے پندرہ صفحوں میں ایرانیوں اخلاقی خرابیوں پر تاثرات ہیں۔ اور یہ ایک مضمون مکالمہ کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ اگر یہ حذف بھی کر دیئے جاتے کہانی کے مجموعی تاثر میں کچھ فرق نہ پڑتا۔

ان کے افسانوں کے ایک مجموعہ تلخ و شیریں میں سات افسانے ہیں۔ لیکن ٹیکنیک کے اعتبار سے "خواستگاری" اور "پیشوا"، ہی افسانوں میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔

قلتش دیوان کی کہانی کی ساخت درست ہے۔ پلاٹ میں ارتقاء موجود ہے۔ دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس "بیلہ دیگر بیلہ چغندر" اور "ریلان الدولہ" میں بیانیہ انداز ہے۔

اس طائرانہ جائزہ کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ جمالزادہ فارسی افسانہ کے پیشرو ہیں لیکن اس میں کمال حاصل کرنے والے صادق ہدایت ہیں کیونکہ جمالزادہ کامل ٹیکنیک کا مظاہرہ نہیں کر سکے۔

ثواب یا گناہ

صفحہ نمبر ۶۳

رخت شوئی :۔ کپڑے دھونا، لانڈری کا کام۔

نخس :۔ شریر۔

دوست داشتن :۔ پسند کرنا۔

اواسط :۔ جمع وسط، درمیان۔

آفتاب رو :۔ سورج کی طرف منہ کرکے۔

کفِ صابون :۔ صابن کی جھاگ۔

عرق ریزان :۔ بہتا ہوا پسینہ۔

لاغری :۔ کمزور۔

ذرع :۔ گز۔

بازی کردن :۔ کھیلنا۔

عذاب میداد :۔ تنگ کرتا تھا۔

بنای فحش و نفرین را گذاشتن :۔ گالیاں دینا اور لعن طعن شروع کرنا۔

نفرین :۔ لعن طعن۔

اعتنا داشتن :۔ توجہ دینا۔

بامزہ :۔ دلچسپ۔

صدا کردن :۔ بلاتا۔

لوسش میکردند :۔ اُس کی خوشامد کرتے تھے، لاڈ پیار کرتے تھے۔

پائیز :۔ خزاں۔

طشت :۔ طشتری۔

چمباتمہ زدن :۔ پنجوں کے بل بیٹھنا۔

مردنی :۔ مریل۔

گیر آوردن :۔ حاصل کرنا، قابو کرنا۔

آنطرفترک :۔ ذرا سا اُدھر۔

مادر مردہ :۔ مسکین، بیچارہ۔

صدای مرمر :۔ میاؤں میاؤں کی آواز

فحش :۔ گالی۔

بنای گذاشتن : شروع کرنا۔
غافل گیر کردن :۔ چپ چاپ آدبانا۔
خیس : گیلے۔ تر، پُر نم۔
حالا بزن و کی نزن :۔ یہی تو موقع ہے پیٹنے کا۔ (خوب زور سے مارنا)
درمیان افتادن :۔ بیچ میں پڑ جانا۔
رنگ پریدہ :۔ اڑا ہوا رنگ۔
کج و معوج :۔ ٹیڑھی، بھدی۔
آب دماغ :۔ ناک کا کثیف پانی ناک کی غلاظت۔

چوبک :۔ لکڑی۔
پریشان کردہ بود :۔ بھونڈا الا تھا، منتشر کر دیا تھا۔
لب و لوچہ :۔ وضع قطع، شکل و صورت
خونابہ :۔ اشک خونین۔
بہم آمیختہ :۔ ملا جلا۔
بزمین نقش بستہ بود :۔ زمین پر جم گیا تھا۔

(ترجمہ) جلیبہ سلطان جو کہ سالہا سال سے ہمارے گھر میں کپڑے دھوتی تھی، اُس کا ایک بیٹا انتہائی دلچسپ تھا۔ بہت شریر اور شوخ، سہراب نام تھا۔ لیکن سوری کے نام سے پکارتے تھے۔ سبھی اُسے پسند کرتے تھے اور ہر جگہ اُس سے دل لگی اور شوخی مذاق کرتے۔

موسم خزاں کے درمیانی ایام میں سے ایک دن جبکہ اُس کی ماں سورج کی طرف منہ کرکے، صابن کی جھاگ سے بھرے ہوئے تھال کے ساتھ پنجوں کے بل بیٹھ کر پسینے میں شرابور کپڑے دھونے میں مصروف تھی، مجھے معلوم نہیں کہ سوری بلی کے ایک مریل اور کمزور بچے کو کہاں سے پکڑ لایا تھا، اور اپنی ماں سے ذرا سا اُدھر دو تین گز کے فاصلے پر، جیسا کہ بچوں کی عادت ہوتی ہے، کھیلنے میں مشغول تھا، یعنی وہ اس طرح اُس مسکین جانور کو ستا رہا تھا کہ اُس کی میاؤں میاؤں کی آواز بلند ہو گئی۔

اُس کی ماں نے گالیاں دینا اور لعن طعن کرنا شروع کر دیا، اور جب اُس نے دیکھا کہ سوری کوئی توجہ نہیں کر رہا۔ یہاں تک کہ اُس کی باتوں کا جواب دینے میں بھی گستاخ ہے۔ وہ اپنی جگہ سے کودی اور لڑکے کو چپ چاپ آدبایا اور ایسا پیٹا کہ معلوم

ہوتا تھا کہ یہی مناسب موقع اُس کے پیٹنے کے لئے ہے۔ اپنے گیلے ہاتھوں کے ساتھ، اور صابن آلودہ چھڑی کے ساتھ بچے کے سر اور کھوپڑی پر اتنی بیدردی سے مار رہی تھی کہ اگر میں مداخلت کر کے بیچ بچاؤ نہ کرتا تو اُس معصوم بچے کی کھوپڑی کو پھوڑ ڈالتی سوری بیچارہ اڑے ہوئے رنگ، بھدی، ٹیڑھی وضع قطع کے ساتھ جبکہ اُس کے نتھوڑے سے خون آلود آنسو ناک کی غلاظت کے ساتھ مل کر اُس کے منہ کے گوشے سے بہہ کر زمین پر بجتے جاتے تھے، وہ آنسو بہا رہا تھا اور چیخ چلا رہا تھا۔

صفحہ نمبر ۶۳، ۶۴

ازحال رفتن :۔ پریشان ہونا، بدحواس ہونا۔

حق حق گریہ کردن :۔ روتے روتے گھگی بندھ جانا۔

دل سوختن :۔ رحم آنا، ترس کھانا، دل کا پسیج جانا۔

آدم شدن :۔ انسان بننا۔

تخم حرام :۔ حرامی۔

مجاناً :۔ مفت، بلاقیمت۔

تغیر ماہیت دادن :۔ حالت بدل جانا

معقول :۔ باہوش۔

منزل :۔ گھر۔

نشان دادن :۔ دکھانا۔

سر و وضع :۔ شکل و صورت۔

دشمن دوش :۔ اُس کی مزدوری۔

چادر قد :۔ چادر، دوپٹہ۔

بندہ نترسی : ظالم انسان۔

آب راحت از گلو پائین رفتن :۔ اطمینان کا سانس لینا۔

وصلہٴ شکم کردن : پیٹ کا دھندا کرنا۔

از من ساختہ نیست :۔ میرے بس کا روگ نہیں۔

مخارجی :۔ اخراجات۔

قبول کردن :۔ داخل کر لینا۔

از آب درآمد :۔ ہیئت سدھر گئی بچ نکلا۔

مؤدّب :۔ باادب۔

نمرہ :۔ تمیز۔

متوجہ بودم :۔ ملتفت تھا۔

سپردن :۔ حوالے کرنا۔

کمک :۔ مدد

خرج تحصیل :۔ تعلیمی اخراجات۔

تحصیلاتِ متوسط: مڈل اور ہائی سکول کی تعلیم۔
پایتخت: دارالخلافہ۔
پرداختن: ادا کرنا۔
تمام کردن: ختم کرنا۔
ادارت دولتی: سرکاری محکمے۔

(ترجمہ) بیچاری حبیبہ سلطان خود بھی پریشان ہوگئی تھی، بکھرے ہوئے بالوں اور پھٹے ہوئے دوپٹے کے ساتھ اپنے بیٹے کے پہلو میں بیٹھی ہوتی تھی، روتے روتے اُس کی گھگی بندھ گئی تھی۔ خدا اور اُس کی مخلوق سے سوال کر رہی تھی کہ اُس سے کیا تقصیر سرزد ہوئی ہے؟ کہ ایسے حالات میں مبتلا ہے جہاں نہ کسی کو خدا کا خوف ہے اور نہ ہی نقصان کا۔

میرا دل اُن کی حالت دیکھ کر پسیج گیا، میں نے کہا حبیبہ سلطان اس بچے کو سکول میں داخل کیوں نہیں کروا دیتی، تاکہ تو خود بھی کچھ آرام محسوس کرے اور چین کا سانس لے، اور شاید وہ بھی انسان بن جائے۔

اُس نے کہا "میرے پاس تو روٹی تک نہیں کہ میں پیٹ پال سکوں، میں کہاں سے پیسے لاؤں کہ اس حرامی کو سکول میں داخل کراؤں۔ آپ ہی بتائیے کہ کیا میں اس بڑھاپے میں اب چوری چکاری کروں، پھر بھی تو میرے بس کا روگ نہیں۔

میں نے کہا "اگر خدا نے چاہا تو میں ایسی صورت حال پیدا کر لوں گا کہ اُسے مفت داخلہ مل جائے اور تجھ پر اخراجات کا بوجھ نہ ہو۔"

جونہی سوری مدرسہ میں داخل ہوا، اُس کی حالت ہی یکسر بدل گئی گویا کہ اُس نے آفت سے نجات پائی ہے۔ سبق پڑھنے میں مستعد، وقت کا پابند، ہوشمند اور بادب، کبھی کبھار وہ اپنی ماں کے ساتھ ہمارے گھر آتا تھا، اور اپنے سکول کے نمبر مجھے دکھاتا تھا، میری بھی خواہش تھی کہ اُس کی وضع قطع آبرومندانہ ہو۔ اور میں نے سب کو یہ کہہ رکھا تھا کہ جب کبھی اُس کی ماں کپڑے دھونے کیلئے آئے اور اُسے اُجرت دی جائے تو دو تین تومان اُسے اُس کے بیٹے کے تعلیمی اخراجات کے الاؤنس کے طور پر دیئے جائیں۔

اب سہراب اکیس سالہ نوجوان تھا، اُس نے میٹرک تک تعلیم مکمل کر لی تھی اور دارالخلافہ کے دوسرے نوجوانوں کی طرح سرکاری محکموں میں سے ایک میں

صفحہ نمبر ۶۴، ۶۵

حقوق :- تنخواہ -

بجا می دہد :- پورا کرتی ہے -

حوائج :- جمع حاجت، ضرورت

تنگ نفس شدن :- تنگ آ جانا، جینا دوبھر ہو جانا -

سروکار :- معاملہ

این قبیل :- اس قسم کے

دریں قبیل مواد :- اس قسم کے نوٹوں پر

گرد گذاشتن :- گرد رکھنا -

دیگ :- ہنڈیا -

فرش :- قالین -

النگو :- چوڑیاں، کنگن -

دانشکدہ طب :- میڈیکل کالج -

تیرش لنگ آمد :- ناکام و نامراد رہا -

چارہ سازی ہا :- علاج و مداوا -

جوانک :- نوجوان، چھوکرا

حلقہ بستن :- بن جانا، وجود میں آنا -

قسمت :- حصہ -

دریافت داشتن : وصول کرنا

از عہدۂ رخت شستن برنمی آید :- کپڑے دھونے کے کام سے فرصت نہیں ملتی -

بہیچ وجہ :- کسی طرح بھی -

مخارج :- اخراجات

متوسل گشتن :- وسیلہ ڈھونڈنا، مدد چاہنا -

دار و ندار :- پونجی، سامان -

سینی :- تھال

گوشوارہ - بالیاں، جھمکے -

وارد شدن :- داخل ہونا -

بہر دری زدن :- جو بھی چارہ کرتا، جو وسیلہ بھی ڈھونڈتا -

مساعدت ہا :- کوششیں -

بدل :- دل میں -

اشک :- آنسو -

جلو :- سامنے -

دانشکدہ :- کالج -

قطور :- موٹی موٹی، ضخیم -

حالِ خراب :- برگشتہ حالت -

منزل :۔ گھر
گیر افتادہ :۔ پکڑا گیا، پھنس گیا۔
بی نہایت: حد سے زیادہ۔
تا حدی :۔ کسی حد تک۔
سرنوشت :۔ قسمت، مقدر۔
در صدد بر آمدن :۔ کسی کام میں لگنا۔ معروف ہونا۔
یکراست :۔ سیدھا، براہ راست۔ فوراً
نیم بستہ :۔ ادھ کھلی۔
مندرس :۔ بوسیدہ، پھٹا پرانا۔
پینہ :۔ کپڑے یا چمڑے کا ٹکڑا۔
پر وصلہ :۔ جوڑ دار
ہای ہای بنای گریستن را گذاشت :۔ رونا پیٹنا شروع کر دیا۔

تماشای دانشجویان میکرد :۔ طالب علموں کو دیکھتا۔
بزیر بازو :۔ بغل میں۔
روح متلاطم :۔ بیقرار و مضطرب روح۔
برمیگشت :۔ واپس لوٹتا۔
زندانی :۔ قیدی۔
اسباب تعجب :۔ میری حیرت کا سامان۔
تربیت شدۂ خودم :۔ میرا پروردہ و تربیت یافتہ
بی علاقہ :۔ بے پرواہ، بے توجہ
مسائلہ :۔ مسئلہ، قضیہ۔
باز بود :۔ کھلا تھا۔
رختخواب :۔ بستر

(ترجمہ) کام کرے یا نہ کرے، شروع میں تھوڑی سی تنخواہ جو کہ اس کی ضروریات کے کچھ حصے کو پورا کرتی ہے۔ ہر مہینہ کے شروع میں وصول کرتا ہے۔ وہ چیز (جو کہ قابل ذکر ہے) یہ ہے اس کی ماں (جو کہ بیمار رہے) اس کے لئے جینا دوبھر ہے۔ وہ تو کپڑے دھونے کے قابل بھی نہیں رہی، اور اس کے علاوہ اس کا واسطہ زیادہ تر ڈاکٹر، دواخانہ اور دواؤں سے رہتا ہے، بیمار رہتی ہے۔ سہراب کی تنخواہ کسی طرح سے بھی اس قسم کے اخراجات کو پورا نہیں کر سکتی تھی، ماں اور بیٹا انہی کاموں پر مجبور رہ گئے جن سے کہ ایسے موقعوں پر ہمارے اکثر ہموطن چارہ جوئی کرتے ہیں۔ یعنی اپنی پونجی اور سازو سامان مثلاً ہنڈیا، تھال، قالین، بالیاں اور چوڑیاں وغیرہ کو بیچنا یا گروی رکھنا، سہراب کی خواہش ہمیشہ یہی رہی کہ جیسے بھی بن پڑے وہ میڈیکل کالج

میں داخل ہو، لیکن جہاں بھی وہ کوشش کرتا اُسے ناکامی کا سامنا کرنا ہوتا۔ میری کوششیں اور چارہ سازیاں بھی بے نتیجہ رہیں، اور یہ خواہش اُس چھوکرے کے دل ہی میں رہی۔ وہ انتہائی حسرت سے آہیں بھرتا، اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آتیں، وہ ہفتے میں ایک دو مرتبہ اُس کالج کے سامنے پہنچ جاتا اور ان طالبعلموں کو دیکھتا جو کہ ضخیم کتابوں کو بغل میں دبائے کالج سے باہر نکلتے، وہ پرگشتگی کے عالم میں بے چین روح کے ساتھ گھر واپس لوٹ آتا۔

کافی عرصہ گزر گیا کہ مجھے اُس کے اور اُس کی ماں کے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملی کہ اچانک یہ خبر پہنچی کہ سہراب نے ایک آدمی کو مار ڈالا ہے اور اب وہ مصیبت میں پھنسا ہوا ہے اور جیل میں مقید ہے۔ میں بہت زیادہ حیران ہوا، اور چونکہ کسی حد تک یہ میرا پروردہ اور تربیت یافتہ تھا، اور میں اُس کی قسمت اور مقدر سے بھی غافل نہ تھا۔ میں اس تحقیق و تفتیش میں لگ گیا کہ دیکھوں اصل معاملہ کیا ہے۔

میں سیدھا اُن کے گھر گیا، گھر کا دروازہ کھلا تھا، اور اس کی ماں نیم وا آنکھوں کے ساتھ جوہڑ اور پیوند لگے بوسیدہ بستر پر پڑی تھی۔ جب اُس کی نظر مجھ پر پڑی اُس نے چیخیں مارنا شروع کیں اور بلند آواز سے رونے لگی۔

صفحہ ۶۵

شبانہ :۔ رات کے وقت۔

ثروت مندان :۔ سرمایہ دار لوگ، امیر لوگ

کارد : چھری

تسلیت پذیر :۔ حوصلہ و تسلی دینے کے قابل۔

قضیہ :۔ جھگڑا، معاملہ۔

شہربانی :۔ پولیس۔

راہ و بیراہ : جس طرح بھی بن پڑا۔

بنام : مشہور۔

دستگیر شدن :۔ گرفتار ہونا۔

تہ دلوی کار را در آوردن : معاملہ کی تہہ تک پہنچنا، پوری تحقیق کرنا۔

از کجا آب میخورد : کہاں سے ہوتا ہے۔

بہر تر تیبی بود :۔ جس طرح بھی بن پڑا۔	یکسر :۔ فوراً
خوشحال شد :۔ خوش ہوا۔	اجازہ :۔ اجازت۔
معلوم بود :۔ ظاہر تھا۔	حرف زدن :۔ بات کرنا۔

ترجمہ۔ معلوم ہوا کہ اُسے بھی صحیح خبر معلوم نہیں اور اسی قدر اُس نے اوس پڑوس سے سُنا ہے کہ اس کا بیٹا رات کے وقت حاجی فتح اللہ جو کہ ان کے پڑوس میں مقیم تھا، اور شہر کے نامور امیروں میں سے ایک تھا جس طرح بھی بن پڑا اُس کے گھر میں کود پڑا۔ حاجی فتح اللہ کو چھری سے قتل کر دیا اور جس وقت بھاگنا چاہتا تھا، پکڑا گیا اور وہ اب قید خانے میں پڑا ہے۔

میں نے دیکھا کہ اس قسم کی مصیبت زدہ ماں تسلی دینے کے قابل نہیں ہے۔ جیسا بھی ہو چاہیئے کہ اس معاملہ کی پوری چھان بین کی جائے اور دیکھا جائے کہ یہ معاملہ شروع کہاں سے ہوتا ہے؟۔

پولیس میں میرے بہت سے دوست اور شناسا تھے۔ میں فوراً اُس طرف بھاگ کھڑا ہوا، اور جس طرح بھی بن پڑا میں نے سہراب سے ملاقات کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔

مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا، میرے سامنے شرم کے مارے آنکھیں جھکائے کھڑا تھا۔ اُس کے ہونٹ پر کپکپی طاری تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے استفسار کا منتظر ہے تاکہ جواب دے۔

میں نے کہا "سہراب!" میں کیا کچھ سن رہا ہوں، لوگ جو باتیں کرتے ہیں اُن میں کوئی حقیقت بھی ہے؟"

کہنے لگا "جو کچھ لوگ کہتے ہیں درست ہے۔"

میں نے کہا "کہتے ہیں کہ چھت کے راستے تو حاجی فتح اللہ کے گھر گیا ہے اور اُسے تو نے قتل کر ڈالا ہے۔"

وہ بولا "ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا " تو کس لئے وہاں گیا تھا"؟

صفحہ نمبر ۶۵، ۶۶

دزدی : چوری ۔

مدرسہ دیدہ : پڑھا لکھا، تربیت یافتہ۔

آدمکشی : لوگوں کو مارنا، قتل کرنا۔

کثافت :۔ غلاظت، میل۔

بیرون کشیدن :۔ نجات پانا۔

غصہ :۔ غم

عاقبت :۔ انجام

پول دوست :۔ حریص

وضع زندگانی :۔ زندگی گزارنے کا طریقہ

کائنات :۔ دنیا۔

دزد :۔ چور

کتاب خوان :۔ کتاب پڑھنے والا۔

بالای سیاہی کرد نگی نیست :۔ اس سے بڑھ کر اور کیا بدبختی ہوگی۔

فلاکت :۔ غریبی، ناداری۔

منجلاب :۔ جوہڑ، گندہ نالا۔

خلق شدن :۔ پیدا ہونا۔

پولدار :۔ امیر، مالدار

خیرش باحدی نمی رسید : اُس کی بھلائی کسی حد کو نہ پہنچتی تھی۔

(ترجمہ) وہ کہنے لگا "چوری کے لئے"

میں نے کہا "تو چور نہ تھا"

کہنے لگا "کوئی بھی چور پہلے چور نہیں ہوتا"

میں نے کہا "تو پڑھا لکھا، کتاب پڑھنے والا اور علم دوست تھا، تجھے چوری اور قتل سے کیا سروکار"

بولا "میں مریض ماں کے پہلو میں پڑا رہا اور اُس کی آہ وزاری سنی کہ میں اپنی زندگی سے بیزار ہو گیا۔ اور میں نے کہا کہ اس سے بڑھ کر اور کیا بدبختی ہوگی، (میں نے فیصلہ کیا) کہ جس طرح بھی بن پڑے میں اپنے آپ کو اس غلاظت اور افلاس و ناداری سے نجات دلاؤں"

میں نے کہا کہ "تو نے بھی عجیب راہ فرار ڈھونڈی تو چاہتا تھا کہ غلاظت سے نجات پائے، لیکن تو گندے پانی کے نالے میں گر پڑا، تو چور بنا، قاتل ہوا، تیری ماں بھی

اس غم میں گھل کر مر جائے گی"۔

وہ کہنے لگا "میں پیدائشی طور پر بد قسمت ہوں، خدا کسی کو مفلس اور محتاج نہ کرے، کہ اُس کا انجام یہی ہے جو کہ آپ دیکھتے ہیں"۔

میں نے کہا "اب باتوں کا موقع نہیں ہے۔ بتاؤ کہ مجھے بھی معلوم ہو کہ اصل معاملہ کیا ہے۔

وہ کہنے لگا "اس حاجی فتح اللہ کو تم پہچانتے ہو! وہ ثروتمند آدمی تھا اور حریص بھی، لیکن اُس کے وجود سے کسی کو بھی فیض نہیں تھا، چونکہ ہمارے پڑوس میں ہی رہتا تھا، اور اُس کے ملازموں اور خادموں کے ہم واقف تھے، اور اُس کی زندگی کے اطوار سے بھی آشنا تھے، سب اس حقیقت کو جانتے تھے کہ اُس کی دولت اُس کی اپنی ذات پر بھی حرام تھی اور دنیا سے فقط روپے کا مطالبہ کرتا تھا۔

صفحہ نمبر ۶۶، ۶۷

پولِ سیاہ :۔ پھوٹی کوڑی، دمڑی۔

حاضر نہ بود :۔ آمادہ نہ تھا۔

مرگ :۔ موت۔

مسئول :۔ ذمہ دار۔ جوابدہ۔

دردِ سرہا :۔ زحمتیں۔

بنا شدن :۔ طے پانا۔

چہ خبر است :۔ معاملہ کیا ہے؟

شکم سفرہ کردن :۔ پیٹ پھاڑ دینا

سنگ بروی سنگ قرار نمی گیرد :۔ گڑبڑ، بدنظمی، بدامنی کا عالم۔

ہیئات :۔ شکل، صورت، گروہ۔

خرج کنند :۔ خرچ کرے۔

الجنون فنون : جنون بھی کئی فنون کا مجموعہ ہے۔ دیوانگی کے ہزاروں ڈھنگ

ربط : تعلق۔

حروف زدن :۔ باتیں کرنا۔

عملی شدن :۔ برآنا، پورا ہونا۔

بچون ما :۔ ہماری مانند۔

فاتحہ خواندن :۔ ماتم کرنا، مایوس ہو جانا۔

جامعہ :۔ سوسائٹی، معاشرہ۔

شیطان توی پوست افتادن :۔ شرارت سوجھنا۔

طاقت طاق شدن :۔ حوصلہ کا ختم ہونا بیقرار ہونا ۔	کار از کار گزشتن :۔ معاملہ بگڑ جانا ۔
بخود آمدن :۔ اپنے آپ کو سنبھالنا، ہوش میں آنا ۔	خاکی بر سر کردن :۔ ذلیل ہونا، مٹی پلید ہونا ۔
دنیا را بسر کوبیدن :۔ آسمان ٹوٹ پڑنا پریشان ہونا ۔	نقل کردن :۔ بیان کرنا ۔
	حلقوم گرفتن :۔ گلا پکڑنا ۔

(ترجمہ) اگر اُس کی آنکھوں کے سامنے تو بھوک سے تڑپ کر مرجائے وہ قطعاً اس چیز کے لئے آمادہ نہ تھا کہ ایک پھوٹی کوڑی بھی تیری ذات پر خرچ کرے، اور یہاں تک کہ اُس کی بیوی اور بچے بھی خدا سے اُس کی موت کے لئے دعائیں مانگتے تھے ۔

میں نے کہا "کیا تو نے سنا نہیں کہ دیوانگی بھی ایک فن ہے، اور یہ بھی ایک قسم کی دیوانگی ہے ۔ لوگوں کے مسائل کا تو جوابدہ نہیں ہے ۔ اُس کا اپنا مال تھا اور وہ خرچ نہیں کرنا چاہتا تھا، میرے اور تیرے ساتھ تو اس کا کوئی واسطہ نہیں ۔

وہ کہنے لگا "تم آسودگی کی بنا پر ایسی باتیں کرتے ہو اگر تم میری جگہ ہوتے اور تمہارے غم، حرماں نصیبیاں، زحمتیں اور مچلتی خواہشیں کبھی بھی کسی منزل تک نہ پہنچ سکتیں، تو تم میرے قائل ہوتے، اور اس طرح باتیں نہ کرتے"۔

میں بولا "میرے پیارے! اگر یہ طے پائے کہ ہر شخص رنج والم رکھتا ہے ۔ اور اُس کی آرزوئیں کبھی بھی پوری نہیں ہوتیں، تو وہ چھری اٹھالے، آدھی رات کے وقت جائے اور اپنے ہمسائے کا پیٹ چاک کر دے، اور پھر معاملہ کیا ہے؟ یہی نہ کہ وہ نہیں چاہتا کہ اپنے مال کو ہمارے جیسے نادار اور مفلس لوگوں کو دے دے ۔ اور اگر اسی طرح بدنظمی کا عالم رہے تو پھر دنیا اور معاشرے کی صورت پر ماتم کرنا چاہیئے"۔

وہ بولا "میں نے مدت ہوئی دنیا کا ماتم کیا تھا، تحمل کا مادہ ختم ہو چکا تھا شیطانی خیالات پیدا ہو رہے تھے، اور ہوش مجھے اُس وقت آیا جبکہ پانی سر سے گزر چکا تھا ۔

میں نے کہا "میرے لئے پوری وضاحت کرو، میں دیکھوں کہ کیا مٹی پلید ہوئی ہے"۔

اُس نے کہا "ایک عرصہ ہُوا تھا کہ جس وقت بھی میری نظر اس شخص پر پڑتی تھی، آسمان میرے سر پر ٹوٹ پڑتا۔ میں اُسے دیکھنا گوارا نہیں کرتا تھا، میرا دل چاہتا تھا کہ اُسے پکڑ لوں اور

صفحہ نمبر ۶۷

حقہ بازی : داؤ فریب۔
حسادت : حسد۔
طمع :۔ لالچ۔
متمول :۔ سرمایہ دار۔
دلمان :۔ اپنے دل کو۔
دستبرد :۔ کسی کا مال لے اڑنا۔
تفاوت :۔ فرق۔
اسناد :۔ جمع سند، رجسٹریاں۔
بار آمدن :۔ کسی خاص طریق پر پرورش پانا۔
ترس :۔ خوف۔
دل هره :۔ تشویش و اضطراب۔

بالا بیار :۔ اُنہیں نکال۔
بخل :۔ کنجوسی۔
چشم تنگی :۔ تنگ نظری۔
داور :۔ خدا، انصاف کرنے والا۔
تصمیم گرفتن :۔ فیصلہ کرنا۔
ابداً :۔ ہرگز۔
کار راہ انداختن : کام چلانا۔
گنجہ :۔ الماری۔
برگشتگی طالع :۔ قسمت کی خرابی اُلٹی تقدیر
لرزر :۔ کانپتے ہوئے۔ کپکپی۔
کذائی :۔ ایسا ویسا۔

(ترجمہ) کہوں، یہ غریب لوگوں کے پیسے جو کہ ہزاروں داؤ اور فریب سے تو نے ہضم کئے ہیں اب اُن کو پیدا کر۔"

میں نے کہا "سہراب پیارے! اس کو حسد، کنجوسی، لالچ، تنگ نظری کہتے ہیں۔ یہی امیر آدمی ہیں جو کہ اُن لوگوں کو جو مفلس ہیں کھانا دیتے ہیں۔ حقیقی منصف تو خدا ہے۔ کوئی بھی دوسروں کی نیکی اور بدی کا جوابدہ نہیں ہے۔

کہنے لگا کہ "ہاں ہم ایسی ہی باتوں سے اپنے دل خوش کرتے ہیں، لیکن جب میں نے ارادہ کیا کہ جیسے بھی ہو اس شخص کے گھر پہنچوں، اور تھوڑی سی لوٹ کھسوٹ

کروں کہ اس سے اُسے تو ہرگز کوئی فرق نہیں پڑے گا، لیکن میں اپنا کام چلالوں گا۔ اس قسم کا تصور (قتل کرنے کا) کبھی میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔

میں نے کہا،، تو گھر کے راستے کو کس طرح جانتا تھا۔

وہ کہنے لگا،، سینکڑوں مرتبہ گھر اور کمروں کی چھت پر سے میں نے اُسے آتے جاتے دیکھا تھا، اور اس محلے میں سبھی جانتے تھے کہ حاجی اپنی نقدی، جواہرات اور کاغذات کو کس کمرے اور الماری میں رکھتا ہے۔

میں نے کہا،، یہ سب کچھ اپنی جگہ پر ہے تو اُس کے مال کا دشمن تھا، تو نے خود اُسے ہی کیوں مار ڈالا؟ تو قاتل تو پیدا نہیں ہوا تھا۔

اُس نے کہا،، یہ سب میری گردشِ تقدیر کی وجہ سے ہُوا۔ جونہی کہ میں ہزاروں قسم کے ڈر، خوف، کپکپی، احتیاط اور تشویش و اضطراب کے ساتھ اُس رات کی تاریکی میں اُس فضول سے کمرے میں داخل ہوا۔

صفحہ نمبر ۶۷، ۶۸

اسباب :- سامان۔
گنجہ :- الماری۔
چراغ جیبی برقی :- بجلی کا چھوٹا لیمپ۔
سبزہ شد :- اچانک ظاہر ہوا۔
کاردِ تیز و بلند :- تیز اور بڑی چھری۔
فریاد :- چیخ۔
پنجرہ :- کھڑکی
ضربت دیدہ :- چوٹ لگ گئی۔
صحبت در میان است :- بات چیت ہو رہی ہے۔

ابزاری :- اوزار۔
حاضر کردہ بودم :- میں نے تیار کیا تھا۔
طپانچہ :- پستول
گلولہ :- گولی
فرو بردن :- گھونپنا، گھسیڑنا۔
بی محابا :- فوراً، بغیر ہچکچاہٹ کے
رانِ چپ :- بائیں ران۔
قدم از قدم نمیتوانم بردارم :- پوری طرح نہیں چل سکتا۔
نفر :- شخص۔

دورم را گرفته اند: مجھے گھیر لیا ہے۔
پاسبان: سپاہی۔
کلانتری: تھانہ، پولیس سٹیشن۔
شیون وفغان: رونے پیٹنے کی آواز، اور چیخ وپکار۔
نفسش بند آمد:۔ اُس کا سانس رُک گیا۔
مستولی گردید:۔ چھا گیا غالب آگیا۔
بی حاصل :۔ بے فائدہ
دست بسر وشانہ کشیدن: پیار دینا۔
٫٫

شہربانی: پولیس۔
پلیس: پولیس
از داخل عمارت:۔ مکان کے اندرونی حصّہ سے۔
بغض غریبی گلویش را گرفت:۔ گھگی بندھ گئی، رونے سے آواز رُک گئی
تشنج:۔ پٹھوں کا اکڑ جانا، اینٹھ جانا۔
استمالت خاطر:۔ دلجوئی، تسلی تشفی۔
سر آمدن :۔ ختم ہونا۔
زندان :۔ قید خانہ

ترجمہ:۔ اور میری نظر الماری پر پڑی، اور میں اپنے اُس سامان اور اُن اوزاروں کو جو کر میں نے الماری کھولنے کے لئے بنائے تھے، اپنی جیب سے نکالنے ہی والا تھا کر دفعتاً میں نے حاجی کو دیکھا کہ ایک ہاتھ میں چھوٹا سا بجلی کا لیمپ اور دوسرے ہاتھ میں ایک پستول لئے شب خوابی کا لباس پہنے یک لخت میرے سامنے نمودار ہُوا۔ اُس کی آنکھوں سے اس قسم کی آگ برس رہی تھی کہ موت کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، تھوڑی سی حرکت کے بعد گولی میری کھوپڑی میں پیوست ہو سکتی تھی۔ الماری کھولنے کا وہ ہتھیار جو تیز چھری کی طرح تھا اور لمبا تھا جو کہ میرے ہاتھ میں تھی ایک ہی وار میں اُس کے پیٹ میں گھونپ دی اور جونہی اُس نے چیخ ماری وہ زمین پر گر پڑا، بغیر اس کے کہ میں یہ دیکھوں کہ اُس کا کیا بنا ہے، میں نے بغیر ہچکچاہٹ کے کھڑکی سے باہر چھلانگ دی، اور جس وقت میں ہوش میں آیا اور دیکھا کہ میرا پہلو اور میری بائیں ران کو اس طرح چوٹ لگی ہے اور درد کرتی ہے۔ یہاں تک کہ میں پوری طرح سے قدم بھی نہیں اٹھا سکتا، اور چند لوگوں نے مجھے گھیر لیا ہے، اور پولیس، سپاہی اور تھانہ کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ اور عمارت کے اندرونی حصّہ سے عورتوں کی آہ وزاری اور نالہ وبکا کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں

سمجھ گیا کہ حاجی مارا گیا ہے۔

جونہی کہ سہراب کی گفتگو یہاں پہنچی، اچانک اس کی گھگی بندھ گئی اس طرح سے کہ اُس کا سانس رُکنے لگا، اور اُس کا منہ کھلا رہ گیا۔ اُس نے اپنی پیشانی اس طرح زمین پر رکھ دی گویا کہ وہ سجدہ ریز ہے۔ اُس وقت شدید قسم کی اینٹھن اُس کے سر سے لے کر پاؤں تک غالب تھی۔

اُس وقت اس قسم کے آدمی کی دلجوئی بے فائدہ تھی، اور چونکہ ملاقات کا وقت بھی ختم ہو چکا تھا۔ میں نے محض پیار دینے پر اکتفا کیا اور انتہائی پریشان دل کے ساتھ قید خانے سے باہر چلا گیا۔

صفحہ نمبر ۶۸، ۶۹

جان سپردن :۔ مر جانا۔

بغایت :۔ انتہائی حد تک۔

برگذار شدن :۔ منائے جانا۔

جلو نرفت :۔ آگے نہ بڑھے۔

خوش آیند :۔ بھلی بات۔

حالتِ بہتی یا اُو دست دادہ بود :۔ حیرت و سراسیمگی اور حواس باختگی کا عالم اُس پر طاری تھا۔

علنالید۔ چیخ پکار کرتی تھی۔

ہذیان :۔ سرسام میں بدحواسی میں باتیں کرنا۔

زن فقیر :۔ غریب عورت۔

منظور :۔ مقصود۔

اقدامات :۔ جمع اقدام، کوشش کرنا، قدم اٹھانا۔

مجلس ختم :۔ درود فاتحہ پڑھنے کی محفل۔

باشکوہ :۔ شاندار طریقہ سے۔

حامی :۔ حمایت کرنے والا۔

سری زدن :۔ اتفاقیہ کسی کے گھر جانا۔

از پسرش :۔ اسکے بیٹے کے بارے میں۔

اغلب :۔ زیادہ تر۔

عوالم :۔ جمع عالم جہان۔

پرستاری :۔ دیکھ بھال۔

استخلاص :۔ رہائی دلانا۔

جلوِ خودرا بگیرم :۔ اپنے آپ کو روک لوں۔

مدافعہ۔ آپس میں بچ بچاؤ کرنا۔

مجازات : سزا۔ عقوبت۔

تحصیل کردہ۔ حاصل کر کے۔

وکلای عدلیہ :۔ عدالت کے وکیل۔ مسلول :۔ سل کا مریض۔
تخفیف :۔ کمی عناوین :۔ جمع عنوان۔ طور طریقہ۔
قوطی سیگار :۔ سگرٹ کی ڈبیا۔ رمق :۔ زندگی کا آخری سانس۔

(ترجمہ) حاجی فتح اللہ اس کمرے میں جہاں کہ اسے زخم لگا تھا، جاں بحق ہو گیا۔ اس کی فاتحہ و درود و خوانی کی محفل میں جو کہ انتہائی تزک و احتشام سے منائی جا رہی تھی میرا جی چاہتا تھا کہ اس میں شامل ہو جاؤں لیکن میرے پاؤں آگے نہ بڑھے اور میں ڈرتا تھا کہ چونکہ مجھے سہراب کا طرفدار سمجھتے ہیں اس لئے یہ بھلا نہ ہوگا۔

دو تین مرتبہ میں حبیبہ سلطان کے گھر میں اتفاقیہ طور پر گیا، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا حیرت و سراسیمگی اور حواس باختگی کا عالم اس پر طاری تھا، وہ اپنے بیٹے کے بارے میں اتنی باتیں نہیں کرتی تھی، اور نسبتاً کم آہ و زاری کرتی تھی، اور زیادہ تر اپنے ساتھ باتیں کرتی تھی، یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ مدہوشی کے عالم میں بڑبڑا رہی ہے۔ وہ بدحواسی کی باتیں زیادہ تر اپنی جوانی کے زمانے کے بارے میں اور اپنے ماں اور شوہر کے متعلق تھیں۔ اس کے ہمسایوں میں سے ایک بڑھیا عورت کو اس کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کر دیا، اور میں نے خود سہراب کی نجات کے لئے کوششوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا، اور اگرچہ مجھے یہ شدید احساس تھا کہ میری ساری کوششیں اکارت جائیں گی، تاہم میں اپنے آپ کو نہ روک سکا۔

عدالت کے وکیل بہت سے وعدے وعید دیتے اور کہتے تھے اپنی مدافعت میں یہ قتل ذفوخ پذیر ہوا ہے اور اس وجہ سے سزا میں کمی ہو جائے گی، میں اسی طرح اپنے دل کو بہلاتا رہا، اور پھر میں نے اجازت حاصل کی، تھوڑا سا کھانا اور تین سگریٹ کی ڈبیا لے کر میں سہراب کو ملنے گیا۔

افسوس، میں نے اسے کس حالت میں دیکھا، سہراب کی ساری دلکشی اور خوبصورتی رخصت ہو چکی تھی، سل کے مریض کی طرح جس کا ایک پاؤں قبر میں ہوتا ہے اس کی زندگی آخری سانسوں پر معلوم ہوتی تھی، اس نے پھر جب مجھے دیکھا تو رونے لگا

یوں لگتا تھا کہ چند دن بیت گئے ہیں اُس نے بالوں میں

صفحہ نمبر ۶۹

موبالیش رنگ شانہ ندیدہ بود:- بالوں کو کنگھی نہ کی گئی تھی۔

دستہ بدستہ: لٹوں کی صورت میں بہت زیادہ۔

آتش زدن:- جلانا، روشن کرنا۔

پرزور:- شدید۔

چشمانش را در چشمان من دوختہ:- اپنی آنکھوں کو میری آنکھوں میں ڈال کر۔

خدانخواہد:- خدانخواستہ۔

اعدام:- پھانسی پر لٹکانا، موت کی سزا

مجسم ساختن:- آنکھوں میں پھر جانا، سامنے آجانا

آدم کش:- قاتل۔

درہم برہم:- بکھرے ہوئے۔

یکبارہ:- دفعتاً، یکدفعہ۔

پُک:- سگریٹ کا کش۔

متوالی:- لگاتار، مسلسل۔

کمک:- مدد۔

تمام کردن:- ختم کرنا، مار ڈالنا۔

وکلای مبرز:- نمایاں وکیل۔

محکوم شدن:- مقدمہ چلنا۔

کلک کندہ شدن:- خاتمہ ہوجانا، جان خلاص ہونا۔

دادی:- افسوس۔

انس:- انسان۔

ترجمہ:- کنگھی نہ کی تھی، بال بکھرے ہوئے تھے اور لٹوں کی صورت میں اُس کی پیشانی اور چہرے پر پڑے ہوئے تھے۔ دفعتاً اُس کا چہرہ ٹیڑھا ہوگیا تھا۔

میں نے سگریٹ جلا کر اُس کے ہاتھ میں دیا۔ بڑے زور زور سے مسلسل کش لینے لگا اور آدھے منٹ میں ہی وہ ختم ہوگیا، اور اچانک وہ اپنی آنکھوں کو میری آنکھوں میں ڈال کر کہنے لگا "کاش تم میری مدد کرتے کہ میں اپنے آپ کو ختم کر سکتا"۔

میں نے "یہ کیسی باتیں کرتے ہو۔ عدالت کے لائق وکیل اطمینان دلاتے ہیں کہ تم نجات ضرور پاؤگے"۔

اُس نے کہا "خدا نہ کرے میں نجات پاؤں۔ میری زیادہ خواہش یہ ہے کہ مجھے پھانسی دینے کا فیصلہ کیا جائے اور میری جان خلاص ہو جائے، اور اس عذاب سے جو کہ ہر گھڑی موت کو میرے تصور میں مجسم کرتا ہے، رہائی پاؤں"۔

میں نے کہا "پیارے سہراب میں تیرے مدعا کو نہیں سمجھ سکا، تو کونسے عذاب کے بارے میں کہنا چاہتا ہے۔

وہ کہنے لگا "میرے محترم! میں نے ایک انسان کو قتل کیا ہے۔ ایک خدا کے بے گناہ انسان کو قتل کیا ہے۔ جتنا بھی وہ برا تھا، پھر بھی مارے جانے کا مستحق نہ تھا، میں قاتل ہوں میں انسان کو مارنے والا ہوں۔ حیف صد حیف...!"

میں نے کہا "سہراب یہ محض اتفاق ہے۔ تو نے مارا نہیں تھا، یہ آدمی جس کی موت کو کیا جن اور کیا انسان خدا سے مانگتے تھے، خود ہی مر گیا، نہ جانے وہ کن کن مصیبتوں اور بیماریوں میں گرفتار رہتا، یہ کہاں لکھا ہوا ہے کہ وہ معدہ کے زخم اور

صفحہ ۶۹، ۷۰

صغرا و کبرا :- منطق کی دو اصطلاحیں کسی موضوع کو ثابت کرنے کیلئے دو قضیے پیش کئے جاتے ہیں۔ پہلے کو صغری۔ دوسرے کو کبرای اور تیسرے کو نتیجہ کہتے ہیں۔

چیدن :- چننا۔ جمع کرنا۔

نفسِ زندہ :- زندہ شخص۔

فجایع - جمع فجیعہ، دردناک حادثہ۔

مرتکب شدن :- ارتکاب کرنا، کسی چیز کا سرزد ہونا۔

مبداء کل :- وہ قوت جس سے تمام چیزوں کی تخلیق ہوئی ہے یعنی خدا تعالیٰ۔

وجدان :- نفسِ باطنی، قوتِ پنہانی، ضمیر۔

واچیدن :- دوبارہ جمع کرنا۔

معدوم ساختن :- مار ڈالنا، نابود کرنا۔

معصیت ہا :- گناہ

انابت :- توبہ و زاری۔

صفای باطن :- باطنی صفائی۔

حلقوم :- گلا، حلق۔

شکنجہ :- آزار، اذیت

یاور :- مددگار

طناب رسی

نفس کشیدن : سانس لینا۔
یار : دوست۔
نیم ذرع : آدھا گز۔

ترجمہ۔ سرطان کے مرض میں مبتلا نہ ہوتا، قسمت کا یہی فیصلہ تھا۔ اس قسم کی گفتگوؤں اور بے تابیوں کا کوئی فائدہ نہیں۔

وہ کہنے لگا میں خود بھی ان تمام چیزوں کو جانتا ہوں، اور سینکڑوں مرتبہ اسی قید خانے کے گوشے میں اور رات کی تاریکیوں میں منطق کی دو اصطلاحوں صغرا اور کبرا کے ثبوت، دلائل کو اپنے وجدان اور ضمیر کو دھوکا دینے کے لئے ترتیب دیا ہے اور سامنے لایا ہوں۔ لیکن کوئی بھی فائدہ نہ ہوا، میرے جسم کا ایک ایک ذرّہ مجھ سے کہتا ہے کہ تو نے انسان کو قتل کیا ہے۔ ایک جیتے جاگتے شخص کو نابود کر دیا ہے اور تجھے اس چیز کا قطعاً کوئی حق نہ تھا۔ اور تو نے ظلم کیا ہے اور بدترین سانحہ اور مکروہ ترین گناہ کا مرتکب ہوا ہے۔ تو ازل سے ابد تک سیاہ رو بن گیا ہے اور رہے گا ....!"

میں نے کہا "سبھی مذاہب توبہ و زاری پر یقین رکھتے ہیں۔ اور اگر تو بھی خدا اور سبھی چیزوں کے منبع و سرچشمہ (خدا) کے سامنے انتہائی نیک نیتی اور باطنی پاکیزگی کے ساتھ توبہ کرے تو مجھے یقین ہے کہ تیری توبہ قبول ہو جائے گی"۔

وہ کہنے لگا "میں نہیں چاہتا کہ میری توبہ قبول ہو، میں نے گناہ کبیرہ کیا ہے۔ اور میں ایک رسّی چاہتا ہوں کہ اپنے اس حلق میں ڈال لوں، اور اپنے آپ کو نجات دلاؤں۔ یہ زندگی، اس کا ہر لمحہ میرے لئے انتہائی اذیت ناک چیز ہے۔ خدا سے، دنیا سے، لوگوں سے اور تم سے جو کہ اس دنیا میں میرے واحد دوست اور مددگار ہو میرا مطالبہ صرف ایک ہے۔ موت ہے .... موت۔ دو لمحہ کی فراغت اور آدھا گز رسی کافی ہے۔

صفحہ نمبر ۱۷

بزانو در آمد : گھٹنے ٹیک لئے۔
خم شد : وہ جھکا۔
سپس : اس کے بعد۔
مشاہدہ : نظارہ، دیکھنا۔
خم شد : وہ جھکا۔
رنج : تکلیف۔

نیمۂ آجری :- آدھی اینٹ۔
جان گیرندہ :- جان لینے والا۔
آشفتگیٔ خاطر :- دل کی پریشانی وانتشار۔
تلاطمِ درونی :- اندرونی ہیجان۔
مخوف :- خوفناک۔
زندانی :- قیدی۔
سماجت :- خوشامد۔
مؤدبی :- باادب۔
آخرین بار :- پچھلی مرتبہ۔
بی نہایت :- بہت زیادہ۔
از قراری :- جس طرح سے۔
گویا :- ایسا معلوم ہوتا ہے۔
مشاہدہ :- نظارہ، دیکھنا۔
تبی :- تھکاوٹ۔

جان آفرین :- جان پیدا کرنے والا۔
سربار :- بوجھ پر
باشد :- یہ ہو سکتا ہے۔
مہلک :- نقصان دہ، ہلاک کرنیوالا۔
ازینرو :- اس طرح سے۔
معطلی :- تعطل، انتظار۔
رئیس زندان :- قید خانے کا افسر اعلیٰ۔
اجازۂ لازم :- ضروری اجازت
دلم بحالش سوخت :- مجھے اس پر رحم آیا
صحبت داشتن :- باتیں کرنا۔
گذارش میدہند :- بیان کرتے ہیں۔
پشیمان :- نادم۔

(ترجمہ) پھر پہلی مرتبہ کی مانند جب اسے ملنے کے لئے گیا، پہلے وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا اور اس کے بعد بے اختیار جھک گیا اور اس کی پیشانی زمین کو چھو رہی تھی اور اس کے جسم نے کانپنا اور اینٹھنا شروع کر دیا۔ میں اس نظارے کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکا اور باہر چلا گیا۔

دو تین دن کے بعد خبر لائے کہ حبیبہ سلطان بغیر اس کے کہ وہ کسی قسم کی تکلیف اور نقصان کو محسوس کرے، گویا کہ سوتے ہوئے ہی دوسری دنیا میں رخصت ہو گئی۔ اور ایک مرتبہ ہی سب قسم کے کپڑے دھونے سے پالی ہے۔ دروازے سے بیرونی قبرستان کے ایک گوشے میں اسے سپرد خاک کر دیا اور نشانی کے طور پر ایک ٹوٹی ہوئی اینٹ کا ٹکڑا اس کی قبر پر نصب کر دیا۔ پیدا کرنے والے اور مارنے والے کے سپرد کر کے

ہم شہر لوٹے۔

چند دن تک میں اپنے آپ میں متذبذب رہا کہ میں اُس کی ماں کی وفات کی خبر سہراب کو دوں یا نہ؟ پہلے میں ڈرا کہ اس غم کا ابھی اُس کے دیگر غموں پر اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن جس وقت اُس کی پریشان حالی اور اُس کے دل کی خلش کے بارے میں مَیں نے سوچا تو مجھے خیال آیا کہ "ہو سکتا ہے کہ اُس کی ماں کی وفات کی خبر اُسے منہمک رکھے اور وہ اُس خوفناک اور مہلک اندرونی ہیجان سے رہائی پائے اور اس طرح میں نے پکا ارادہ کر لیا میں اُس کے پاس پہنچوں اور اُسے تمام کیفیتِ حال سے مطلع کر دوں"۔

قیدی سے ملاقات کرنے کی اجازت طلب کرنے کے لئے تھوڑی دیر کے انتظار اور خوشامد کے بعد قید خانے کے افسرِ اعلیٰ کے دفتر میں داخل ہُوا۔ بہت با اخلاق انسان تھا اور دوسرے میرے واقف کاروں میں سے بھی تھا، اور بغیر معمولی حیل و حجت کے ضروری اجازت دے دی، میں نے کہا "پچھلی مرتبہ جب میں اس قیدی نوجوان سے مِلا تو اُس کی حالت دیکھ کر میں بہت متاثر ہُوا، وہ بہت زیادہ پریشان تھا، اور ہمیشہ موت کی تمنا کرتا اور خودکشی کے بارے میں باتیں کرتا تھا۔

وہ بولا "زیادہ تر قیدیوں کے برعکس جو کہ ہمارے پاس ہیں یہ زیادہ حساس ہے اور جس طرح سے کہ رپورٹ ملتی ہے اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنے کئے ہوئے پر بہت زیادہ نادم

صفحہ نمبر ۱۱۶:

مدام :۔ ہمیشہ۔

مراقب : نگہبان، محتاط، متوجہ۔

سپردہ ام :۔ میں نے حکم دیا ہے۔

فکری :۔ نظریہ، خیال۔

گمان میکنم :۔ میرا خیال ہے۔

حلال میطلبد :۔ تقصیر کی معافی مانگتا ہے۔

مبادا :۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ

قضیہ :۔ معاملہ۔

محکمہ :۔ عدالت۔

حکم اعدام : پھانسی کا حکم۔

واللہ :۔ خدا کی قسم۔

قضائی :۔ عدالتی، قانونی۔
منقاعد شدن : مطمئن ہونا۔
تصوّر میرود :۔ یہ خیال کیا جاتا ہے۔
پاسبان :۔ سپاہی۔
باکراہ :۔ ہچکچاہٹ کے ساتھ۔
بادوست خواہد داد۔ اُس میں پیدا ہو جائے گی۔
سروضع :۔ شکل وصورت، ہیئت۔
لباس پاک : صاف ستھرا لباس

این قبیل :۔ اس طرح کے۔
قضات :۔ قاضی، جج۔
دادستان :۔ سرکاری وکیل۔
پیش ببرد :۔ عملی جامہ پہنائے، آگے بڑھائے۔
مکراست :۔ سیدھا۔
شکنجہ روحی :۔ روحانی اذیت، کوفت۔
باور کردنی :۔ قابلِ یقین۔
مرتب :۔ سلجھی ہوئی۔
روی تختخوابش : اپنے بستر پر۔

(ترجمہ) ہے اور ہر وقت اُس شخص کے بارے میں جو اُس کے ہاتھوں قتل ہوا ہے باتیں کرتا رہتا ہے، اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے۔ میں نے یہ حکم دیا ہے کہ اُس کی نگرانی کریں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو کوئی گزند پہنچالے۔

میں نے پوچھا "کیا آپ کو کچھ معلوم ہے کہ اُس کے بارے میں کیا خیال رکھتے ہیں"۔ وہ کہنے لگا "معاملہ تو واضح ہے۔ ایک انسان کو مارا ہے اور اسی چوری اور قتل کیلئے آدھی رات کے وقت لوگوں کے گھر میں گھس گیا ہے۔ اور میرا تو یہ خیال ہے کہ آج یا کل ہی عدالت اس کو پھانسی کا حکم جاری کر دے گی۔

میں نے کہا "شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اپنی مدافعت کے لئے قتل کا فعل اُس سے سرزد ہُوا ہے۔ اُس کی سزا میں کمی کا قائل ہو جانا چاہیئے"۔

وہ کہنے لگا "خدا کی قسم! میں اس قسم کے قانونی و عدالتی مسئلوں کو نہیں جانتا لیکن ایک ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ جج ابھی مطمئن نہیں ہوئے۔ سرکاری وکیل نے اُس کو پھانسی دینے کو کہا ہے۔ اور یہ گمان ہے کہ شاید اس کو آگے بڑھائے (عملی جامہ پہنائے)

ایک سپاہی کے ساتھ قید خانے کے افسر اعلیٰ کے دفتر سے سیدھا سہراب کے قیدخانے کی طرف گیا، میں بہت زیادہ ہچکچاہٹ کے ساتھ قدم اٹھا رہا تھا، میں جانتا تھا کہ پھر جب میری طرف دیکھے گا، تو اُس پر اُسی اذیت اور روحانی کوفت کی حالت طاری ہو جائے گی، اور مجھے بھی بہت مضطرب کر دے گا، لیکن جس وقت اُنہوں نے دروازہ کھولا اور میں اُس کمرے میں داخل ہُوا، میں اس قدر متحیر ہوا جو کہ قابلِ یقین نہیں، میں نے دیکھا کہ اُس کی ہیئت سلجھی ہوئی ہے، صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے اور بالوں میں کنگھی کئے ہوئے، اپنے بستر پر بیٹھا ہُوا

صفحہ نمبر ۱۷، ۲۷

آرام :- سکون، سکوت۔

سیگار کشیدن: سگرٹ پینا۔

تعارف :- آداب تکلّف۔

آب خوردن :- شروع ہونا۔

جہت داشتن :- وجہ ہونا، پہلو ہونا۔

شیطان توی پوستت رود :- تجھے کوئی شرارت سوجھے۔

براستی :- حقیقت یہ ہے۔

سیر :- مطمئن۔

تغیّرِ حالت : تبدیلی۔

دستگیر شدن :- سمجھنا۔

خوش روئی :- خندہ پیشانی۔

صوت :- آواز

تبرئہ شدہ ای :- تو آزاد ہوگیا ہے۔

سردماغ :- وجد کی حالت میں۔

از سر گرفتن :- نئے سرے سے شروع کرنا۔

سرنوشت :- مقدر۔

دقیقہ :- منٹ۔

وازادہ :- بیزار

خستہ :- تھکا ہوا۔

تشنہ :- پیاسا۔

(ترجمہ) انتہائی سکون اور خندہ پیشانی کے ساتھ سگرٹ پینے میں مشغول ہے، اور اُس کی آواز، علیک سلیک کے لہجہ اور آداب تکلفات سے ہے۔ سمجھ گیا کہ مکمل طور پر اُس کی حالت بدل چکی ہے اور وہ دوسرا انسان بن گیا ہے۔

میں نے سوچا کہ شاید اس لئے کہ اُس کے اضطراب میں کمی ہو جائے گی اسے دھوکا

دیا ہے اور کہا ہے "دو تو بری ہو گیا ہے۔ لیکن میں جلد ہی سمجھ گیا کہ معاملہ بالکل اور ہے اور یہ قلبی تغیر کسی اور چیز سے شروع ہوا ہے۔

میں نے کہا "ماشاءاللہ! آج حالت اچھی ہے اور تیرے حواس بھی ٹھیک ہیں۔ حق بھی یہی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس طرح تو پریشان رہے، اور دیوانگی کا مظاہرہ کرے۔ اگر خدا نے چاہا تو آج کل ہی تیری رہائی کی خوشخبری پہنچے گی۔ تو نہایت شادماں اور صحیح و سالم باہر آئے گا، زندگی اور جوانی کو نئے سرے سے شروع کرے گا، اور پھر کبھی بھی تجھے نئی شرارت نہیں سوجھے گی۔"

وہ کہنے لگا "میں چاہے جس قدر بھی احمق کیوں نہ ہوں، میں ان باتوں سے اپنے دل کو خوش نہیں کروں گا، اور میں بڑی اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ میری قسمت کیا انتظار کر رہی ہے اور نہ صرف یہ کہ میں موت اور پھانسی سے نہیں ڈرتا، میں دل و جان سے اُس کا متمنی بھی ہوں، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ زندگی جس کا ایک لمحہ بھی میری دلی آرزو کے مطابق نہیں گزرتا۔ میں سیر ہو چکا ہوں، میرا دل بیزار ہو گیا ہے اور میں تھک چکا ہوں۔ میں آرام کا پیاسا ہوں۔"

میں نے کہا "اس صورت میں اس قسم کی تبدیلی جو تجھ میں ہے۔ میری سمجھ میں تو کچھ آ نہیں رہا۔"

صفحہ نمبر ۳۷۲، ۳۷۳

داشت مرا دیوانہ کرد: مجھے پاگل کرنے ہی والا تھا۔	دستبرد:۔ اڑالینا، ہتھیانا۔
نصیبم شود:۔ مجھے مل جائے۔	مال و منال: مال و دولت۔
ملک:۔ جائیداد۔	ثروت:۔ دولت۔
علی المسویہ:۔ برابر	رفاہ:۔ آرام و آسائش
منشاء:۔ پیدا ہونے کی جگہ	تامین نمودن:۔ محفوظ کرنا، حفاظت کرنا۔
قیافہ تلخ:۔ تلخ چہرہ	شکم گندہ:۔ موٹے پیٹ والا۔

عبوسی :۔ غصیلا ، ترش رو۔
انگاری :۔ گویا کہ ۔
سکۂ قلبی :۔ کھوٹا سکہ۔
غل :۔ کینہ، حسد، انتقام، میل۔
مہر کردہ اند :۔ ثبت کیا ہے۔
فرا گرفتن :۔ چھا جانا۔
مؤاخذہ :۔ گرفت۔
گردہ :۔ پشت، پہلو، گردہ۔

نقطہ بنقطہ اش :۔ اُس کا ایک ایک ذرّہ۔
ضرابخانہ :۔ ٹکسال۔
غش :۔ فریب، جعلسازی۔
سرتاپا :۔ سراپا۔
پایان دادن :۔ ختم کرنا۔
مورد مواخذہ قرار دادن :۔ کسی گناہ کے بدلے پکڑنا۔
تیر کشیدن :۔ درد اٹھنا، ٹیس اٹھنا۔

ترجمہ :۔ وہ کہنے لگا "جیسا کہ آپ نے دیکھا ہے۔ حاجی فتح اللہ کا خیال مجھے دیوانہ کیے دیتا تھا، لوگ جو چاہتے ہیں، لیکن میں قتل کے ارادے سے اس شخص کے گھر میں داخل نہ ہوا تھا۔

میں نے یہ سوچا تھا کہ اگر لوٹ کھسوٹ سے اُس کے مال سے ایک، دو، تین ہزار تومان مجھے مل جائیں، اُس کے لئے جو کئی کروڑ مال و متاع، جائیداد اور دولت رکھتا ہے، بالکل برابر ہوگا (کوئی فرق نہیں پڑتا) دوسری طرف میں اُس روپے سے میڈیکل کالج میں داخل ہو سکتا ہوں اور وہ شیفتگی جو کہ میں اس علم کے پڑھنے اور حاصل کرنے کیلئے رکھتا ہوں، میں (فارغ التحصیل ہو کر) میڈیکل کالج سے باہر آؤں اور اپنی زندگی کا ایک حصہ، اپنے آرام و آسائش اور اپنی بوڑھی ماں کی حفاظت کروں، لیکن قسمت کو کسی اور طرح ہی منظور تھا، اور یہ شخص میرے ہاتھوں قتل ہوا، اور اگرچہ میں جانتا ہوں کہ اُس کا وجود بھلائی اور برکت کا منبع و سرچشمہ نہ تھا، اور جس وقت میری نظر اُس بڑے پیٹ والے، درشت و ترش رو پر پڑتی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے ہر ہر حصے کو کھوٹے سکے کے ساتھ جو کہ لالچ، بے انصافی، کینے، غلاظت اور فریب و جعلسازی کی ٹکسال سے بنا ہے۔ نقش کر دیا ہے۔ یہ خیال ہمیشہ دامن گیر رہتا تھا۔ اس کے باوجود میں نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی منحوس عمر اور زندگی میرے ہاتھوں

ہی ختم ہو۔ اور جس وقت مجھے یاد آجاتا کہ میں قاتل ہوں اور اُس کا قتل میرے ہاتھوں وقوع پذیر ہوا ہے اور قیامت کے دن مجھے خدا کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا اور اُس کے خون کا ہر ہر قطرہ میدانِ محشر میں (چلچلاتی) دھوپ میں مجھے پکڑ دائے گا۔ تو میرے پہلو میں درد اٹھتا تھا۔

صفحہ نمبر ۷۳

سرم دوار میداشت :۔ میرا سر چکراتا تھا

صمیم قلب :۔ سچے دل سے۔

بیخوابی :۔ نہ سونا۔

از حال رفتم :۔ مجھے کوئی خبر نہ رہی۔

تختخواب :۔ چارپائی۔

بشاش :۔ خوش و خرم۔

بیامرزد :۔ بخشے۔

پشت :۔ پیچھے۔

پای سکوی :۔ تھڑے کے پاس۔

بغل سگہا :۔ کتوں کے پاس۔

لای :۔ تلچھٹ، نیچ۔

سوراخ وسمبہ :۔ کھڈے اور دراڑیں۔

دم و دستگاہ :۔ مال و اسباب و دولت۔

بکرم :۔ میرا خیال، اندیشہ۔

منفعل :۔ شرمندہ۔

استیصال :۔ پریشانی نیز گھبراہٹ۔

گیج :۔ چکرانا۔

نوازش دادن :۔ پیار کرنا۔

لطف : پیار۔

سمسار : کباڑیا، دلال۔

شاگرد پادو :۔ معمولی کام کرنے والا ملازم۔

یکشاہی : دمڑی، ایران کا ایک ادنیٰ سکہ۔

روی ہم گذاشتن۔ ایک دوسرے پر جوڑنا۔

لای کہنہ می پیچیدم۔ پرانی چیزوں میں لپیٹتا تھا۔

پستوی : کمرے کے پیچھے چھوٹا کمرہ کوٹھری

چہ مزہ ای دارد۔ کیا لطف رکھتی ہے۔

ذکرم :۔ میری باتیں۔

(ترجمہ) اور میرا سر چکراتا تھا، اور اپنے ہی کئے پر اس طرح سے نادم اور شرمندہ ہوا کہ میں سچے دل سے موت طلب کرتا، لیکن پر سول رات سارے بدن کی بدحالی اور پریشانی اور دو تین راتوں کی بیخوابی کی وجہ سے میرا سر چکرا رہا تھا اور نقاہت محسوس کرتا تھا۔

اسی بستر پر گر پڑا اور مجھے کوئی خبر نہ رہی اچانک میں نے دیکھا کہ حاجی فتح اللہ انتہائی خوش و خرم اور ہنستا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا اور آ کر میرے پاس کھڑا ہو گیا۔ اور اُس وقت اپنے ہاتھوں کو انتہائی پیار سے میرے بالوں پہ پھیرتا تھا، اور شفقت اور محبت سے بھرپور آواز میں کہنے لگا۔

"سہراب پیارے! خدا تیرے باپ کو بخشے کہ تو نے مجھے نجات دی ہے۔ تجھے کیا معلوم کہ میں تیرا کس قدر شکر گزار ہوں۔ میری عمر انسٹھ برس کی ہو چکی تھی، اور میں نے آرام کا منہ بھی نہ دیکھا تھا، بچپن ہی سے جب سے مجھے یاد پڑتا ہے میں مرغی بازار کے پیچھے ایک کباڑیے کی دکان پر معمولی ملازم تھا، اور چونکہ نہ ہی میرے ماں باپ تھے اور نہ ہی گھر بار تھا اس لئے رات کو اپنے مالک کو بتائے بغیر اسی جگہ دُکان کے تھڑے کے پاس کتوں کے پاس سو جاتا اور چرا چرا کر میں دمڑی دمڑی جمع کرتا اور پرانی چیزوں میں لپیٹتا جاتا، اور دکان کی کوٹھڑی کے سوراخوں اور دراڑوں میں چھپا دیتا۔ یہاں تک کہ ایک دن میں اس شہر کا ممتاز تاجر بن گیا اور حاجی ہو گیا۔ میں نے مال و اسباب اور دولت بنالی، یقین کرو، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ آرام کسے کہتے ہیں اور زندگی میں کیا لطف ہے، اور جیسا کہ تو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ میری ساری سوچ بچار اور میری گفتگو دولت جمع کرنے کے لئے تھی اور بس۔

صفحہ نمبر ۳، ۴،

کاملاً :۔ مکمل طور پر۔

از چہ راہی باشد :۔ جس طریقے سے بھی ہو۔

خاطرم جمع بود :۔ مجھے اطمینان تھا۔

بغض :۔ کینہ۔

نمی گزاشت بخوابم :۔ مجھے سونے نہیں دیتا تھا۔

مدعیان :۔ جمع مدعی، دعویٰ کرنے والا

دادگستری : عدالت۔

مساوی :۔ برابر۔

غیر مشروع :۔ غیر شرعی۔

اعتنا :۔ توجہ

محبت :۔ پیار

چہ بسا :۔ کیونکہ بہت مرتبہ۔

بر ضد من ۔ میرے خلاف

اقامہ دعویٰ کردن :۔ شکایت کرنا دعویٰ کرنا۔

محکوم کردن : قید کرنا۔
شل کردن :۔ ڈھیلا کرنا۔
از خواب می پریدم :۔ جاگ اٹھتا تھا۔
بمالش افتادن :۔ درد ہونا۔
غلط میزدم : لوٹتا، کروٹیں لیتا۔
سگِ تاتوله خورده۔ زہریلی بوٹی کھائے ہوئے کتا۔ باؤلا کتا۔
تا بہر نحوی شده۔ جسطرح بھی بن پڑے۔
وکیل :۔ وکالت کرنے والا۔
روزنامہ نویس :۔ صحافی۔
شام و نہار :۔ رات اور دوپہر کا کھانا۔
تصدقشاں بشوم :۔ اُن پر واری جاؤں۔

سرکیسہ : تھیلی کا منہ۔
سراسیمہ :۔ پریشان۔
قلبم میزد :۔ میرا دل دھڑکتا۔
عرق سرد :۔ ٹھنڈا پسینہ۔
نقشہ می چیدم :۔ تجویزیں بناتا تھا۔
تو : میں
کلاہی بسرم بگذارند :۔ مجھے دھوکا دے سکیں۔
سناتور :۔ متعلمان یونیورسٹی کا ممبر۔
وزیر و معاون :۔ وزیر اور اُس کا اسسٹنٹ۔
جانم جانم تحویل بدہم بہان کو میری جان کہہ کر لپکا روں۔
دنداں گردی :۔ حریص و بخیل۔

(ترجمہ) میرے لئے یہ مکمل طور پر برابر ہے کہ کوئی بھی ذریعہ ہو (روپے کمانے کا) چاہیئے صرف اتنا کہ ظاہرداری ہو اور قانونی طور پر کوئی شخص بھی یہ ثابت نہ کر سکے کہ یہ دولت حرام اور غیر شرعی طریقے سے مجھے ملی ہے۔ میں پوری طرح سے مطمئن تھا اور میں لوگوں کے ساتھ کینہ اور محبت یہاں تک کہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کوئی سروکار نہ رکھتا، اور رات کے وقت جب میں چاہتا کہ سو جاؤں، تو میں یہ سوچتا کہ آج میرے سرمائے میں کسی چیز کا اضافہ ہوا ہے۔ میں اپنے آپ سے اور دُنیا بھر سے خوش ہو جاتا، لیکن افسوس کہ سوچ بچار اور تخیل کی اُڑان مجھے سونے نہ دیتی، کیونکہ بہت مرتبہ سوتے جاگتے ہوئے میں دیکھتا کہ بہت سے دعویداروں میں سے ایک نے عدالت میں میرے خلاف مقدمہ دائر کر دیا ہے اور مجھ پر مقدمہ چلنے ہی والا ہے۔ کوئی بھی میرے وعدے وعید پر توجہ نہیں دیتا اور کہتے ہیں کہ تجھے

اپنی تھیلی کے منہ کو ڈھیلا کر دینا چاہیئے۔ پریشان ہو کر میں جاگ اٹھتا، میرا دل دھڑکتا تھا، میرا سر درد کرتا، میرے خراب پیٹ میں درد ہوتا، اور میرے جسم پر ٹھنڈا پسینہ آ جاتا، اور گھنٹوں میں کروٹیں بدلتا رہتا، اور تجویزیں بناتا۔ علی الصبح کبھی ایک پیالی چائے پی کر اور کبھی بن پیئے ایک باؤلے کتے کی طرح گلیوں میں چکر لگاتا پھرتا تاکہ جس طرح بھی بن پڑے مجھے کوئی دھوکا نہ دے سکے'۔

وکیل، یونیورسٹی کے منتظمین اور صحافی، وزیر اور اُس کے اسسٹنٹ مجھے اس قدر بُرے لگتے تھے کہ اس کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں اپنے نفع کی حفاظت کے لئے مجبور تھا، ہر صبح اور ہر شام اُنہیں کھانا دیتا۔ اُن کو میری جان کہہ کر پکارتا۔ اُن پر واری قربان جاتا اور پھر میرے جیسا حریص اور بخیل شخص جو کہ عزرائیل کو بھی جان نہیں دیتا تھا۔

صفحہ نمبر ۵۰۷،

کرہ: مکھن۔

از آب کرہ گرفتن: کنجوس ہونا، مال جمع کرنے کی فکر میں پڑے رہنا۔

لاقبائی: فلاکت زدہ جیکے کوٹ کا استر نہ ہو۔

جایدات: تنخواہ۔

تملق: خوشامد

بقالب نرم: مصنوعی طور پر خوش کرنا۔

رجالِ سیاسی: سیاسی لوگ۔

برای مصلحتِ روزگار: زمانہ سازی کے لئے۔

تودہ۔ عام لوگ۔

شام۔ رات کا کھانا۔

ولنگار: بے پروا، آرام طلب

باج سبیل: ناحق اور زبردستی چھینا ہوا مال۔

قار قار کردن: آواز پیدا کرنا۔

مرتبستان: اُن کی مقررہ۔

خوش زبانی: میٹھی میٹھی باتیں۔

اساساً: بنیادی طور پر۔

رم میکردم: بھاگتا تھا۔

ناہار خوردن: دوپہر کا کھانا کھانا۔

راہ و بیراہ: اُلٹے پلٹے راستے پر۔

حرفہای دو پہلوی: منافقت پر مبنی باتیں۔

اصلاً: درحقیقت۔

بروی خود نیاوردم : سُنی ان سُنی کر دینا۔
با آنہمہ خونِ دل : ۔ اس ساری محنت کے باوجود
تومان : ۔ ایرانی سکہ۔
ضیق نفس : ۔ خفقان، دل کا دھڑکنا۔
عدد : ۔ پیچھے۔
گوشہ ہا و کنایہ ہا زدن : ۔ طعنہ دینا۔
تغییری : ۔ تبدیلی۔

قران : ۔ ایرانی سکہ۔
فشارِ خون : خون کا دباؤ بلڈ پریشر۔
خلا : سرکہ۔
کلفتم : میری لونڈی۔
پرداختن حقوق و مواجب۔ تنخواہ دینا۔
متوجہ بودم : ۔ میں جانتا تھا۔
برہان : ۔ دلیل۔

سایرین : ۔ باقی ماندہ کو۔

(ترجمہ) اور انتہائی خسیس و بخیل تھا۔ اس قسم کے بیکار آرام طلب و لاپرواہ لوگوں کو زبردستی چھینے ہوتے مال کی مانند دیتا، وہ غریب آدمی جن کے کوٹ میں استر بھی نہ ہوتا تھا، جن کے پیٹ میں بھوک سے چوہے دوڑتے، اور اُن کی مقررہ اور متعینہ تنخواہیں (آمدنیاں) میرے نوکروں سے بھی کم تھیں ہزار ہا خوشامدیں کرتا، سینکڑوں قسم کی چکنی چپڑی باتیں کرتا، اور چاپلوسی سے مصنوعی طور پر خوش کرتا، میں بنیادی طور پر سیاست بازی سے متنفر تھا، اور سیاسی لوگوں سے بھاگتا تھا، لیکن زمانہ سازی کے لئے دن کے وقت تو اکیلے ہی کھانا کھاتا، اور عام لوگوں کو اس لئے کہ وہ میرے ہمسایوں کے دُکھوں سے آشنا نہ ہوں اُلٹ پلٹ راستوں سے رات کے کھانے کے لئے اپنے گھر لے جاتا، اور سب جھوٹ بولتا، اور اُن کی منافقت پر مبنی پر تمام باتیں سُنتا، لیکن سنی ان سنی کر دیتا، اور ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہتا۔ میرے معدے میں زخم ہو گئے تھے اور وہ رقم جسے کہ انتہائی محنت سے پہلے دمڑی دمڑی اور کئی سالوں کے بعد پیسہ پیسہ اور اس کے بعد ایک ایک تومان اور پھر سو سو اور ہزار ہزار تومان کے حساب سے جمع کیا تھا، کیا میرا دل چاہتا کہ حکیم اور دوا کے لئے دوں۔ فشارِ خون (بلڈ پریشر) کی مجھے بہت زیادہ تکلیف تھی، دوسرے اعصاب بھی ناکارہ ہو گئے تھے، خفقان کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا، میرے منہ میں عفونت پیدا ہو گئی تھی۔

میرے دانت خراب ہو چکے تھے اور پھر بھی میں نے کوشش نہ کی کہ علاج کرواؤں مجھے یہ بھی اچھی طرح احساس تھا کہ میرے رشتہ دار یہاں تک کہ نوکر اور نوکرانی بھی طنزاً اشارے کرتے لیکن میں ان سنی کر دیتا اور صرف ان کو تنخواہ دینے کے موقعہ پر میں اس کا بدلہ لے لیتا، کتے کی سی زندگی بسر کرنا اور مجھے احساس بھی تھا لیکن طمع اور حرص و آز اس چیز کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ میں اپنی زندگی کی روش اور ہنج میں کوئی تبدیلی لاؤں اور ہزار ہا دلیلوں اور نکتوں کے ساتھ اپنے آپ کو اور دوسروں پر بھی۔

صفحہ نمبر ۷۵، ۷۶

احیاناً - اتفاقاً

دارای بانک - بینک بیلنس

فلک را حجاب میکردم - بحث میں آسمان کو بھی خاموش کر دیتا

چه درد سر بدہم - کیا سمع خراشی کروں

می آشامند - پیتے ہیں

ببلعد - نگل لے

اوضاع - جمع وضع حالت

اصلاً - درحقیقت

کوک کردن - چابی دینا - مروڑنا

آز و طمع - لالچ اور حرص

تیک تیک - ٹک ٹک

خوش بختم - میں خوش قسمت ہوں

کوچک گذشتن - نظر بچا کر گزرنا ادنی بن کر گزرنا

بتازیم - ہم حملہ کرتے ہیں۔

گوشہ حساب - حساب کی کاپی

نشان دادن - بتانا

خلاصہ - المختصر، قصہ کوتاہ

چہ قماش - کس قسم کا - نوعیت کا۔

حساوت - حسد

بطالت - سستی۔ کاہلی

ببطالت میگزرانند - بیکار ضائع کرتے ہیں

عرعر - تیز و کرخت آواز نکالنا - رینگنا۔

جمع آوری مال - دولت اکٹھا کرنا۔

کلید - چابی

عقربک ہا - سوئیاں

کامگار - کامیاب

برانیم - ہم ہانکتے ہیں

اوقاتم تلخ شد - مجھے بہت غصہ آیا۔

فحش - گالی۔

کلہ اش - اُس کی کھوپڑی۔

بنداری: گویا کہ
فرد کردن: پیس دینا۔ چھوٹا کرنا۔

چیزی کہ نمایدہ بودم: میرا بس نہ چلا۔

ترجمہ: ثابت کرتا کہ صحیح راستہ وہی ہے جس پر کہ میں گامزن ہوں۔ اور اگر اتفاقاً کوئی شخص مطمئن نہ ہوتا تو میں حساب کی کاپی اور بینک بیلنس دکھا دیتا۔ بحث میں آسمان کو بھی خاموش کرا دیتا، الغرض کیا سمع خراشی کروں۔ تم خود بہتر جانتے ہو کہ میں کس قسم کا انسان تھا اور کس قسم کی زندگی بسر کرتا تھا جس وقت میں سادہ انسانوں کو دیکھتا جو کہ اپنی بیوی بچوں آشناؤں اور دوستوں کے ساتھ سیر کے لیے جا رہے ہیں، باتیں کرتے ہیں، ہنستے ہیں، کھاتے ہیں اور پیتے ہیں۔ حسرت کی شدت حسد کا رنگ اختیار کر لیتی، اور میری خواہش یہ ہوتی کہ زمین شق ہو جاتی اور ان کو نگل لے، کہ میری آنکھیں انہیں نہ دیکھیں، لیکن میں ظاہر داری سے کام لیتا اور کہتا۔

"افسوس ہے کہ ان لوگوں پر کہ اپنے قیمتی وقت کو اس طرح سے بیکار کاموں میں ضائع کرتے ہیں۔ اپنے اور اپنے ہموطنوں کے حالات کی بہتری کے بارے میں سوچ بچار نہیں کرتے، حیوانوں کی طرح چرتے ہیں اور غراتے ہیں۔ اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں سوچتے"

دراصل میں روپیہ جمع کرنے میں مشین بن گیا تھا، کہ زمانے نے حرص اور طمع کی چابی کے ساتھ مجھے چابی دے دی تھی، اور میری سوئیاں دن رات کام کرتیں اور میرے جسم کے کانوں میں ٹک ٹک کرتیں اور مجھے یہ سمجھنے کا موقع ہی نہ ملتا کہ میں خوش قسمت ہوں یا کہ بد قسمت، کامران ہوں یا ناکام، مجھے اب بھی یاد ہے کہ ایک دن جبکہ میں ساری دنیا سے نظر بچا کر گزر گیا۔ ایک فقیر کی آواز میرے کانوں میں پڑی جو کہ اس شعر کو پڑھتا تھا۔

شعر: ہم مستعدی سے کام کرتے ہیں، تیزی سے بڑھتے ہیں۔ اور جب لمحہ بھر کے لیے آرام کرتے ہیں۔ اٹھو

تشریح: زندگی کش مکش و جد و جہد کا مرقع ہے۔ اور جب انسان کچھ

دم ستانے کے لئے بیٹھتا ہے تو پھر کوئی نئی مصیبت اُسے مستعد ہونے کے لئے مجبور کر دیتی ہے ستانے سے مراد بڑھاپا بھی ہے کہ عہد شباب کی کشمکش کے بعد جب کچھ جد و جہد میں کمی ہوتی ہے تو پیغام اجل آجاتا ہے۔

مجھے اس قدر غصہ آیا گویا کہ میرے ماں باپ کو اُس نے گالی دے دی ہے میرا بس نہیں چلتا تھا کہ لاٹھی کے ساتھ اُس کی کھوپڑی کو پھوڑ ڈالوں۔

صفحہ نمبر ۷۶:

لابد - یقیناً

ارزاں - سستا

بوقِ سحر زدہ - جونہی صبح طلوع ہوتی

اجلِ معلق - منڈلاتی ہوئی موت

عدلہا - گٹھے

چار پا دار - اٹھانے والا بوجھ لدے جانوروں کو ہانکنے والا

مچلشان را گیر میاوردم - عین موقع پر جرم پکڑ لینا۔

سجاف - کپڑے کی درز یا شگاف

رقعات - ٹکڑے

حمال ہا - مزدور بوجھ اٹھانے والے

بدست بریدہ خودم - اپنے ٹوٹے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ۔

قسمہای شداد و غلاظ - بہت شدید اور سخت قسمیں۔

گران - مہنگا

پشم و پنبہ - اون اور روئی

مشتری فرنگی - انگریزی گاہک

بوق زدن - بگل بجانا

آرنج - کہنی

میطپاندم - بیقراری سے مارنا۔

قاطرچی - خچر کو ہانکنے والا

آتش روشن ساختن - فساد کی نیت سے جھگڑا پیدا کرنا۔

عدل - گٹھا۔

آجر - اینٹ

لای - نیچے

پدر فرنگی را سوزاندم - انگریزوں کو بُرا بھلا کہا۔

تف - لعنت

از خجالت آب میشوم - شرمندگی سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

کاروانسرا - سرائے

بکیسہ زدم۔ جیب میں ڈال لیے۔

ترجمہ: "جیسا کہ تم یقینی طور پر جانتے ہو کہ میرے متعدد کاروباروں میں سے ایک اُون اور کپاس کی تجارت بھی تھی کہ ان تدبیروں سے جن تک ارواحِ غیبی کی عقل بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ایرانیوں سے سستا مال خریدتا اور انگریز گاہکوں کے پاس مہنگا بیچ دیتا جس دن سامان تہران پہنچا ہوتا اُس دن میں نہ سو سکتا تھا اور یونہی کہ پو پھٹتی اس سرائے میں جہاں کہ سامان پہنچا ہوتا منڈلاتی ہوئی موت کی طرح داخل ہو جاتا اور اپنے بازوؤں کو کہنی تک اون اور روئی کے گٹھوں میں پھیر دیتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیچنے والے دلال، گدھوں کو ہانکنے والے، خچر کے مالک (جن پر یہ لاد کر لایا جاتا تھا) اس سے جنس چرا کر اس کی جگہ پتھر ڈال دیئے ہوں۔ اور پھر جس وقت انہیں عین موقع پر پکڑ لیتا تو فساد کی نیت سے جھگڑا پیدا کرتا، جس کی پیٹ میں ساری دنیا آجاتی لیکن ایک دن یہ خبر پہنچی کہ جس دن وہ روئی جسے کہ میں نے جرمنوں کے آگے بیچا تھا ہمبرگ میں اسے جہاز سے اتارا گیا تو گٹھے کی سرے کی جلائی تھوڑی سی پھٹ گئی تو اس میں سے پتھر اور اینٹ کے ٹکڑے مزدوروں کے سر پر گرے تھے۔ اگرچہ ان پتھروں اور اینٹوں کو میں نے خود اپنے ان لوٹے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ روئی کے نیچے رکھا تھا۔ عدالت کے سامنے خدا، محمد صلعم، حضرت عیسیٰؑ، بارہ اماموں، چودہ معصومین کی بڑی بڑی سخت اور بہت موٹی موٹی قسمیں کھائی تھیں کہ میرے فرشتوں کو بھی اس معاملے کی خبر نہیں اور جیسے بھی بن پڑا اس گناہ کا ذمہ دار بیمہ کمپنی کو ٹھہرایا۔ انگریزوں کو گالیاں دیں۔ باتیں تو لوگوں کے سامنے کرتا اور روپے جیب میں ڈال لیتا، لعنت ہے ایسی تجارت اور ایسی زندگی پر کہ اب جس وقت بھی میں اسے یاد کرتا ہوں تو میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں لعنت ہے ایسے کاروبار پر اور ایسی زندگی پر۔

صفحہ نمبر ۷۶، ۷۷

شمر ذی الجوشن۔ یزید کا سپہ سالار جس نے امام حسینؑ کا سر کاٹا تھا

شقی تر۔ زیادہ سنگدل

ریش و سبیل۔ داڑھی اور مونچھیں

حاضر بود۔ آمادہ تھا۔ تیار تھا

سیگاری آتش زدہ۔ جلتا ہوا سگرٹ

چہار انگشت از اشک خیس شدہ۔ آنسوؤں سے بہت زیادہ گیلا ہوگیا ہے

بجبوحہ۔ درمیان گھما گھمی

جان کندنہا۔ تھکا دینے والی محنت

سگ دو یہا۔ بہت گھومنا۔ محنت کرنا

دشنہ۔ خنجر

رستگاریم۔ میری نجات

بمعنی اینکہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے

دور۔ اردگرد

دُنجی۔ تاریک و خلوت

حِس۔ احساس

مال و مکنت۔ مال و دولت

عوالم۔ جہان (جمع عالم)

ہق ہق بنای گریستن راگزاشت۔ روتے روتے گھگی بندھ گئی۔

دردِ بی درمان۔ بغیر علاج کے درد

دنبالۂ صحبتش را گرفتہ۔ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے۔

دغل بازیہا۔ دھوکا بازیاں

قیل وقالہا۔ بحث مباحثہ

بپایان رسید۔ ختم ہوگئی

مفتاح الفرج۔ نجات، آرام کی چابی

عوض شدہ است۔ بدل گئی ہے

بر خودم۔ اپنے جسم کو

معاملہ و امکان را دو ستد۔ لین دین کا سودا، کاروبار

سُود پرستی۔ منفعت پرستی۔

وجود۔ جسم

ترجمہ:۔ جب حاجی فتح اللہ باتیں کرتا کرتا یہاں پہنچا۔ یہ آدمی جو کہ شمر ذی الجوشن سے بھی زیادہ سنگدل تھا اور وہ اس چیز کے لیے بھی آمادہ تھا کہ سو دینار کے بدلے میں علی اصغر حسین کا سر اپنے ہاتھ سے کاٹ دے۔ اچانک روتے روتے اس کی گھگی بندھ گئی اس طرح سے کہ اس کے آنسو اس کی ڈاڑھی اور مونچھوں سے گزر کر میرے سر اور میرے بالوں پر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میرا دل اس کی کیفیت پر پسیجا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ بستر پر بٹھایا، اور سگرٹ جلا کر اس کے ہونٹوں کے کونے میں تھما دیا۔ اور کہا۔

کوئی ہرج نہیں آنسو بہاؤ کیونکہ رونا ہر لا علاج دکھ کی دوا ہے۔ کافی دیر تک

اُس کے کندھے روتے ہوئے کبھی اوپر اٹھتے اور کبھی نیچے آتے، اور آنسو بہاتا رہا، اور اس کے بعد ایسے چہرے کے ساتھ جو آنسوؤں سے بری طرح گیلا ہو گیا تھا اس نے اپنی باتوں کو یوں جاری رکھا اور کہا۔

ہاں میں اور کیا سر درد کا موجب ہوں، اندھی دھوکا بازیوں، انتھک کوششوں، بحث مباحثہ، جدوجہد اور بہت زیادہ بھاگ دوڑ کی گھما گھمی میں جو کہ زحمتوں سے بھرپور تھی اور جسے کہ میں نے تجارت، کاروبار اور زندگی کا نام دے رکھا تھا، تیرے مشکل کشا ہاتھ سے میری زندگی ختم ہو گئی، اور تیرا خنجر میری نجات کی کشایش کا ذریعہ بنا۔ میں ایسے سمجھا کہ دنیا ہی بدل گئی ہے۔ اور میں ایک دوسری دنیا میں داخل ہو گیا ہوں۔ میں نے سانس لیا اور اپنے اردگرد اور اپنے اوپر نظر ڈالی۔ اور جب میں نے دیکھا کہ تنہا اور تاریک جگہ ہے۔ کاروبار اور لین دین کا امکان نہیں ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منفعت پرستی اور مال و دولت کا احساس میرے جسم میں سرد پڑ گیا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو ایسا فارغ البال اور پرسکون دیکھا کہ کبھی بھی ویسا نہیں دیکھا تھا۔ اور اس وقت کے بعد ہر لمحہ اور ہر گھڑی وہ لذت و لطف جو کہ میں ان نئی کیفیات۔

صفحہ نمبر ۷۷، ۷۸

نو ظہور۔ نئی ظاہر ہوئی ہوئی	دالان۔ میدان۔ صحن
لابلای۔ اندرونی حصہ بیچ میں سے	کرم۔ کیڑا
بلولم۔ میں لوٹتا ہوں	علیل۔ بیماری
شاف۔ انیما	تنقیہ۔ جلاب لینا
عدہ ای۔ بہت سے۔ متعدد	جلو۔ سامنے
دم جنبان۔ دم ہلاتے ہوئے	تکہ۔ ٹکڑا
دوروئی۔ منافقت	بقای عمر۔ عمر کی درازی
دم سیخ شدن۔ تڑپنا	چانہ بیندازم۔ مرجاؤں
خزینہ دار۔ خزانہ رکھنے والا	میراث خوارگان۔ وارث

واگزارم ۔ سپرد کردن
نکبت ۔ نحوست
جادۂ نورانی عافیت ۔ آرام کا پُرنور راستہ
سپاسگزاری کردن ۔ شکریہ ادا کرنا
یکدنیا خلوص وپاکی ۔ بہت زیادہ صمیمیت اور صفائی قلب سے
من دستم خالی است ۔ میرے ہاتھ خالی ہیں ۔
عالم بالمخفیات ۔ جو کہ عیب کو جاننے والا ہے
رمز ۔ راز ۔ خفیہ چیز

عرب نی میانداز د ۔ ویران جگہ شہر سے بہت دور
وسط ۔ درمیان
رستگاری مطلق ۔ مکمل رہائی
سراغنت ۔ تیرا نشان
عوض دادن ۔ معاوضہ دینا
سر ۔ راز
متاع دنیا ۔ دنیاوی مال
بخدامی سپارم ۔ خدا کے سپرد کرتا ہوں

ترجمہ :۔ حاصل کرتا ہوں، وہ بڑھتا جاتا ہے ۔ اور مجھے یقین ہے کہ میں جنت کے صحن میں ہوں اور مجھے اطمینان خاطر نصیب ہے کہ میں بہشت کی طرف جانے ہی والا ہوں ۔ اور ہر لمحہ ہزار بار تیری جدائی کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اگر تو نہ ہوتا، تو پھر میں سال ہا سال تک اپنی انہی کثافتوں اور آلودگیوں میں کیڑے کی طرح لوٹتا اور پیچ وتاب کھاتا، یہاں تک کہ ایک دن ہزار یادکھوں، بیماریوں، ناخوشیوں، انیما اور جلاب کے بعد اُن چند لوگوں کی آنکھوں کے سامنے جو ان کتوں کی طرح جو کہ قصاب کی دکان کے سامنے دُم ہلاتے ہوئے ایک ہڈی کے ٹکڑے کا انتظار کرتے ہیں ۔ میری موت کا انتظار کر رہے ہیں اور سب یونہی جھوٹ موٹ ریاکاری ومنافقت سے میری عمر اور دولت کی بقا کے لیے دعا کرتے ہیں اور نذر ونیاز بھی دیتے ہیں (وہ چاہتے ہیں) کہ میں تڑپ کر مر جاؤں اور یہ منحوس دولت جس کا کہ میں تنہا مالک تھا اور خون پسینہ ایک کر کے اُسے جمع کیا تھا ۔ اپنے وارثوں کے لیے چھوڑ دوں اور تنہائی اجڑی اغیر آباد اور ویران جگہ میں چلا جاؤں ۔ اے عالی ہمت تو نے مجھے اس ذلت اور نحوست سے نجات دی ہے، تو میں نے تیرا ہاتھ پکڑا ۔ اور مکمل نجات وآرام کے نورانی راستے میں چھوڑ دیا ۔ اگر پورے ہزار سال تک سو

زبانوں سے تیرا شکریہ ادا کروں تو پھر بھی کم ہی کروں گا۔ تجھے دیکھنے کی آرزو میرے دل میں کروٹیں لیتی رہی ۔جیسے بھی بن پڑا میں نے تیرا پتہ لگا ہی لیا، اور میں اس جگہ تیرے پاس پہنچ ہی گیا ۔اور اپنے آپ کو اس جگہ تیرے پاس پہنچا دیا، کہ میں تیرے چاند جیسے چہرے کو سچے اور پاکیزہ دل کے ساتھ چوموں اور تجھے کہوں کہ میں خالی ہاتھ ہوں اور تجھے معاوضہ دینے سے قاصر ہوں، خدا جو کہ خود اسرارِ غیبی کو جاننے والا ہے اور ہر راز اور بھید کو مجھ اور تجھ سے ہزارہا درجہ بہتر جانتا ہے وہی تجھے اجر دے کیونکہ اس قسم کے افعال خیر کا بدلہ اس دنیاوی مادے سے نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی اس کی تلافی کی جاسکتی ہے اب فی امان اللہ۔ تجھے میں خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

صفحہ نمبر ۷۸

بوی سیگاری ۔ سگرٹ کی بو

تہِ نیم سوختہ آن ۔ اس کا آدھا جلا ہوا حصہ۔

اعماق ۔ (جمع عمق) اتھاہ گہرائیاں۔

یکمرار میکرد ۔ گونجتی تھی۔

تردیدہ ۔ شک وشبہ رد کرنا۔ غلط ٹھہرانا۔

ایمانِ قطعی ۔ راسخ عقیدہ

وسوسہ ۔ وہم

یکسرہ ۔ مکمل طور پر

ماوری ۔ بالاتر

برای العین ۔ چشم دید

بیکران ۔ بغیر کنارے کے

از آب در آمدن ۔ نتیجہ نکلنا، بچ نکلنا، محفوظ ہو جانا۔

کشیدہ بود ۔ پیا تھا

باور کنم ۔ یقین کروں

وجدانم ۔ میرا ضمیر

حقیقت صرف است ۔ مکمل حقیقت ہے۔

از باطن بیرون راندن ۔ دل سے نکال دینا۔

اظہارات ۔ خیالات کی توضیح

دغدغہ ہا ۔ انتشارات ۔ پراگندگی

منزہ ۔ پاک ۔ مبرا

لذت و آسایش خاطری ۔ دلی سکون ولذت

مکشوف گردیدہ ۔ مجھ پر عیاں ہوا ہے

مشیتِ غیبی ۔ خدا کی رضا

خودم ایستادم ۔ میرے سامنے

ترجمہ:۔ جس وقت میں جاگا، میں اکیلا تھا، لیکن ابھی تک میرا چہرہ حاجی کے آنسوؤں سے گیلا تھا۔ اور وہ سگریٹ جو اس نے پیا تھا۔ اس کی بُو کمرے میں پھیلی تھی، اور اس آدھا جلا ہوا ٹکڑا میری چارپائی کے سامنے زمین پر پڑا ہوا تھا، میں نہیں چاہتا کہ یقین کروں کہ یہ واقعہ خواب و خیال کے علاوہ کچھ اور بھی تھا، لیکن میری روح کے کان میں اور میرے ضمیر کی اتھاہ گہرائیوں میں بار بار یہ آواز گونجتی تھی کہ جو کچھ تو نے دیکھا اور سُنا صریحاً حقیقت اور واقعیت لیے ہوئے ہے اور اس میں شک و شبہ اور جھٹلانے کی کوئی گنجائش نہیں۔ مجھے یہ آواز اتنی بار سنائی دی کہ ہر غلط خیال کو اپنے دل سے نکال دیا مجھے پکا یقین اور راسخ اعتقاد ہو گیا کہ یہ حاجی کی روح تھی، اور مجھے دیکھنے کے لیے آئی تھی اور ان خیالات کی توضیح کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں مکمل طور پر بدل چکا ہوں۔ تمام اندیشے، وسوسے اور انتشارات میں بھول گیا، اور ایک عجیب و غریب صفائی قلب کہ جس کی مانند میں نے کبھی بھی محسوس نہیں کیا تھا، میں نے اپنے آپ میں دیکھی۔ اور اس آدمی کی طرح جو گرم اور نرم حمام سے ہلکا پھلکا باہر آئے میں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر ہر پلیدی اور کثافت سے دھلا ہوا اور مبرا پایا۔ اور اُسی پرسوں کی رات سے میں نے اپنے لیے ایک کائنات بسالی ہے جو کہ ان دنیاؤں سے بالاتر ہے۔ اور اپنے قلبی و ذہنی لطف اور آرام میں غوطہ زن ہوں کہ میں اس طرح سے سوچتا ہوں کہ کسی شخص نے کم ہی اس مزے اور ذائقے کو چکھا ہوگا۔ اب موت اور زندگی میرے لیے برابر ہے۔ میں دونوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہوں۔ اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر مجھ پر واضح ہوا ہے کہ زندگی ہلکے سے پانی سے زیادہ نہیں جو کہ خدا کی رضا کے بحرِ بیکراں میں گرتا ہے۔

میں نے کہا" سہراب تو گناہوں سے پاک ایک عجیب و غریب خداشناس بن گیا ہے مبارک ہو کہ تم موت کو اب ان نظروں سے دیکھتے ہو (موت کو نئے زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہو اور اہمیت نہیں دیتے) مجھے انتہا درجہ افسوس ہے کہ میں تمہیں ایک

بُری خبر سنانے والا ہوں ۔ آج پورا ایک ہفتہ گزر گیا ہے کہ تیری ماں اللہ کو پیاری ہو گئی ہے اور میں نے خود اپنے سامنے اس کو غسل دلایا اور تجہیز و تکفین کروائی ۔

ص ۷۸، ۷۹

برافروخت ۔ تمتما اُٹھا

در قیافہ اش ۔ اس کے چہرے پر

غصہ ۔ رنج

بی پرستار ۔ بغیر کسی دیکھ بھال کرنے والے کے ۔

وقت سرآمدہ بود ۔ وقت ختم ہو چکا تھا ۔

اول وقت ۔ صبح کے وقت

جلو خواہش نفس را بگیرم ۔ اپنے نفس پر قابو پا لوں

دلم گواہی نداد ۔ میرے دل نے ساتھ نہ دیا ۔ نہ مانا

طولی نکشید ۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا ۔

پای دار ۔ تختہ پھانسی پر

خداحافظی و وداع را میرسانید ۔

خداحافظی اور الوداعی سلام دیتا ہے

طناب پائین آمد ۔ رسی نیچے آئی

بشاشت ۔ خوشی

الحمد للہ رب العالمین ۔ اے جہانوں کے پالنے والے تیرا شکر ہے ۔

لابد ۔ یقیناً

شیرزن ۔ بہادر عورت

محکوم ۔ پھانسی کی سزا

اعدامش میکنند ۔ اسے پھانسی دیں گے ۔

اعدامگاہ ۔ پھانسی دینے کی جگہ ۔

سروقت ۔ وقت پر

یکراست ۔ سیدھا

چشمان یکدیگر افتاد ۔ ہماری آنکھیں ایک دوسرے سے ملیں

نقش بست ۔ ظاہر ہوئی

نیم لبخند بی رمقی ۔ تھوڑی سی مسکراہٹ

حداکثر سکینہ و سکون را میرسانید ۔

انتہائی طمانیت قلبی اور سکون خاطر ظاہر تھا ۔

ترجمہ :۔ اور اپنی جگہ پر اُسے دفن کیا ہے ۔ اگر خدا نے چاہا تو تو جلد ہی رہا ہو جائے گا اور پھر ہم اکھٹے اس کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے جائیں گے ۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے کوئی خوشی و مسرت کی خبر سن لی ہے ۔ اُس کا چہرہ

تمتما اٹھا اور خرمی و خوشی کی علامتیں اس کے چہرے پر ظاہر ہوئیں اور کہنے لگا "جہاؤں کے پالنہار کا شکر ادا کرتا ہوں۔ یہی ماں کا فکر مجھے افسردہ اور مغموم بنائے ہوئے تھا۔ جو کہ یقیناً میرے ہی غم کی وجہ سے مرگئی ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ میں مرجاؤں گا، تو تن تنہا، بے یار و مددگار، بے زبان اور بغیر کسی دیکھ بھال کرنے والے کے وہ جائے گی۔ اس نے کتنا اچھا کیا ہے کہ مجھ سے ہی پہلے چل بسی ہے۔ خدا اسے جوارِ رحمت میں جگہ دے کہ بہادر عورت اور بہترین ماں تھی۔

وقت ختم ہو چکا تھا، میں نے سہراب کو بوسہ دیا اور قید خانے سے باہر چلا گیا۔

دو دن بعد منگل کے دن یہ خبر پہنچی کہ اسے پھانسی کی سزا دی گئی ہے اور جمعرات کی صبح کو اُسے تختۂ دار پر لٹکا یا جائے گا۔ اگرچہ میری یہ جدید خواہش تھی کہ میں ضبطِ نفس سے کام لوں اور پھانسی دینے کی جگہ پر نہ جاؤں۔ لیکن میرا دل نہ مانتا تھا میں عین وقت پر وہاں پہنچ گیا۔

زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ سہراب کو لائے۔ سولی تیار تھی، اور اسے سیدھا تختۂ دار پر لے گئے اور ایسا لگتا تھا کہ وہ چند لوگ جو کہ دیکھنے کے لیے آئے تھے، اس کی آنکھیں میری متلاشی تھیں۔ جب ہماری آنکھیں ٹکرائیں تو اس کے ہونٹوں کے گوشوں پر ہلکا سا تبسم بے جان بکھر گیا اور اس نے سر کے ہلکے سے جھٹکے سے خدا حافظ اور الوداع کہا، میں نے بھی اس کا جواب دیا۔

جس وقت رسی نیچے آئی میں بھی دوسرے تماشائیوں کے ساتھ اُس کے اور قریب گیا۔ اسی مسکراہٹ کے ساتھ جو کہ انتہا درجہ کے اطمینان اور سکون کی دلیل تھی۔ ہم نے سُنا۔

ص: ۶۷

دتانی۔ آہستگی

شل و سفت کرد۔ نرم و سخت، ڈھیلا اور مضبوط۔

خفت:۔ حلقہ، گرہ

محکم:۔ مضبوط

اعتنا: توجہ

بانوکِ پا۔ پاؤں کے پنجوں سے

کر و کوری۔ بہری اور اندھی

تلخ کامی۔ تلخیاں

معنی دیگری۔ دوسری حقیقت

نویدھای۔ خوشخبریاں

امان۔ پناہ

دنیا و مافیہا۔ کائنات اور اس کی چیزیں۔

تیرہ و تار۔ تاریک اور اندھیری

کینہ توزی۔ کینہ پروری

بی اعتنائی۔ دھتکار، بے توجہی

امثال او۔ اس کی مانند

تسلیت بخش۔ سکون دینے والی

حساب کنید۔ فیصلہ کریں۔

ترجمہ۔ کہ کہتا ہے "اس راحت اور مسرت پر" اور انتہائی آہستگی کے ساتھ اس گروہ کو جو رسی کے سرے پر انہوں نے لگائی ہوئی تھی۔ اس نے دو تین مرتبہ نرم و سخت، ڈھیلا اور مضبوط کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انہوں نے بہت مضبوطی سے گرہ نہ لگائی ہو اور اس وقت مرکر تھوڑا سا جھکا کر اپنے ہاتھ سے اس پھندے میں سے گزار دیا۔ اور بغیر اس کے کہ وہ دنیا اور جو کچھ اس میں ہے اس پر کوئی توجہ مبذول کرے اس نے اس زمین کو جو کہ اندھیری اور تاریک ہے، بہری اندھی ہے جو کہ اس کے لیے کینہ پروری، تلخیوں اور بے التفاتیوں کے علاوہ اور کوئی حقیقت نہ رکھتی تھی۔ اپنے پاؤں کے پنجے سے ٹھکرایا اور گویا کہ اس نے زمین سے اٹھ کر چمکدار اور تاباں آسمان کی طرف جو کہ سہراب اور اس کی مانند دوسرے لوگوں کے لیے شیریں وعدوں سے اور اطمینان بخش خوشخبریوں سے بھرپور ہے اور وہ امن و امان اور راحتوں کی دنیا ہے۔ اُڑنے کے لیے پر اور بازو ڈھونڈ لیئے تھے،

یہ تھی اس کے گناہ کی سزا یا اس کے کارِ خیر کی جزا۔ جو بھی فیصلہ کریں یہ آپ پر ہے۔

دوسرا حصّہ

حصّۂ نظم

بابا طاہر عُریاں

بابا طاہر عریاں کی رباعیات اصنافِ سخن میں ایک اہم مقام کی مالک ہیں۔ لیکن اس سے قبل کہ ان کی سوانح حیات یا رباعی گوئی کے بارے میں کچھ کہا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رباعی کی صنفِ سخن پر مختصر روشنی ڈال دی جائے۔

رباعی کی وجہ تسمیہ:۔ صاحب بدائع الافکار لکھتا ہے کہ رباعی کو رباعی اس لیے کہتے ہیں کہ بحر ہزج اشعارِ عرب میں مربع الاجزا ہے عربوں کے خیال کے مطابق ہر ایک وزن دوبیت مربع کی طرح ہے اور مجموعہ چہار بیت ہے مگر اہل عجم اس کو دوبیتی کہتے ہیں اور مجموعہ کو دوبیت مانتے ہیں۔

حاشیہ مجمع الصنائع میں لکھا ہے کہ رباعی منسوب بر رباع بمعنی چار ہے۔ چونکہ ہر رباعی میں چار مصرعے ہوتے ہیں اس لیے اس کو رباعی کہتے ہیں۔ اور اسی لیے اس کا نام چہار مصرعی اور دوبیتی رکھا گیا ہے۔

رباعی کے دوسرے نام:۔ مولانا جامیؒ عروض میں اور ملاّ حسین واعظ کاشفی بدائع الافکار میں لکھتے ہیں کہ رباعی کو ترانہ بھی کہتے ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک ترانہ کے معنی سرود و نغمہ کے ہیں۔ اور چونکہ اکثر گائی جاتی ہے اور اس کا وزن گانے میں نہایت خوش آئند و خوش آہنگ معلوم ہوتا ہے اس لیے اس کا نام ترانہ ہو گیا۔

بابا طاہر عُریاں کے حالاتِ زندگی

بابا طاہر عریاں جس کی رباعیات نو سو برس سے آج تک سارے ایران میں گائی جاتی ہیں۔ خود ان کی اپنی ذات کے بارے میں یعنی بقول حمد اللہ مستوفی مصنف

تاریخ گزیدہ نام کے سوا یقینی طور پر صرف اسی قدر معلوم ہے کہ کچھ معلوم نہیں۔

منظومات فارسی کے جس قدر مجموعے بھی ایران میں شائع ہوئے ہیں۔ سب ہی میں ان کے کلام کا تھوڑا بہت نمونہ موجود ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کے سوانح حیات کے متعلق کسی میں ایک لفظ بھی نہیں۔

رضا قلی خاں نے اپنی کتاب مجمع الفصحاء میں بابا طاہر کی دس رباعیاں نقل کی ہیں اور لکھتا ہے کہ:۔

طاہر عریاں ہمدانی، اس کا نام بابا طاہر عریاں تھا۔ وہ اپنے عہد کے صوفیائے کبار میں سے تھا۔ بعض مصنفوں کا یہ خیال کہ بابا طاہر سلجوقیوں کے عہد میں تھا۔ غلط ہے، وہ دیالمہ کے دور میں قدیم شیوخ میں سے تھا۔ ۳۵۰ھ کے عروج و شہرت کا زمانہ ہے۔ اس نے عنصری، فردوسی اور ان کے ہمعصروں سے پہلے وفات پائی۔ اس نے قدیم زبان میں اعلیٰ درجہ کی رباعیاں کہی ہیں جواب تک موجود ہیں۔

یہی مصنف اپنی بعد کی تصنیف ریاض العارفین میں بیان کرتا ہے کہ بابا طاہر نے ۴۱۰ھ یعنی ۱۰۲۰ء یا ۱۰۱۹ء میں انتقال کیا۔

لطف علی بیگ آذر نے اپنی کتاب آتش کدہ میں بابا طاہر کی پچیس رباعیاں نقل کی ہیں۔ وہ بابا طاہر کے متعلق لکھتا ہے:

"عریان الشمس بابا طاہر دلوانہ الیست از ہمدان، فرزانہ الیست ہمہ دان، احوالش دوپارہ کتب مذکور و اخلاقش بین العرفاء مشہور، عاشق شیدا و سوزش جان از اشعارش ہویدا، بزبان راجی بوزن خاصی دوبیتی بسیار گفتہ کہ اکثر از آنہا امتیاز کلی دارد"

مسٹر کامٹ ڈی گا بینو نے اپنی ایک کتاب میں بیان کیا ہے کہ بابا طاہر ایران میں اہل حق یا نصیری فرقہ میں شیوخ کبار میں شمار ہوتا ہے۔

مسز ہیلن ایلین اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ مندرجہ ذیل واقعات کپتان چارلس کیمبل برطانوی ریزیڈنٹ متعین بوشہر نے ایک ایرانی عالم کے ذریعے میرے لیے بہم پہنچائے کہتے ہیں کہ طاہر عریاں ایک ناخواندہ لکڑہارا تھا۔ لڑکپن میں وہ دن کو مدرسے جایا کرتا

تھا۔ لڑکے جب سبق پڑھتے تو وہ سنا کرتا۔ لیکن اس کی سادہ لوحی کی وجہ سے لڑکے اس کا مذاق اڑاتے۔ ایک دن اس نے اپنے کسی ہم سبق سے پوچھا کہ مجھے تعجب ہے کہ تم لوگ معلّم کی باتیں کس طرح سمجھ لیتے ہو۔ ہم سبق نے مذاقاً کہا کہ ہم لوگ رات کو تالاب میں جا کر چالیس مرتبہ سر کو پانی میں غوطہ دیتے ہیں۔ اس سے معلّم جو کچھ کہتا ہے ہماری سمجھ میں آجاتا ہے۔ بابا طاہر نے اس بیان کو سچ جانا اور خود بھی ایسا ہی کیا۔ حالانکہ سخت سردی کا موسم تھا۔ معاً روشنی کا ایک شعلہ نمودار ہوا، اور بابا طاہر کے منہ میں گھس گیا۔ دوسرے دن جب وہ مدرسے آیا تو طلبہ سے فلسفیانہ باتیں کرنے لگا۔ جسے وہ سمجھ نہ سکے، اور نہ کوئی جواب ہی دے سکے۔ جب انہوں نے اس تبدیلی کی وجہ پوچھی تو اس نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ انہوں نے کہا کہ رات میں نے ایک کردی کی طرح گزاری اور صبح ہوتے ہی میں ایک عرب کی مثل تھا۔

کہتے ہیں کہ اس کے جسم سے ایسی غیر معمولی گرمی نکلتی تھی کہ کوئی اس کے پاس نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس کے بعد وہ عموماً جنگلوں اور پہاڑوں میں پھرا کرتا تھا اور اکثر ہمدان کے گلی کوچوں میں برہنہ پھرتا ہوا دیکھا گیا اسی لیے عریاں مشہور رہے۔

اب ایک بات باقی رہ جاتی ہے وہ یہ کہ بابا طاہر کی رباعیاں کس زبان میں ہیں۔ بابا طاہر اکثر لری کہلاتا ہے۔ اسٹینگاس میں لورن ایک قبیلہ کا نام بتایا ہے۔ جس سے لری ماخوذ ہے۔ مسٹر کامٹ ڈی گابینو کا خیال ہے کہ یہ رباعیاں لری زبان میں ہیں۔ مسٹر شمانزکو نے اپنی کتاب پاپولر پوئٹری آف پرشیا میں بیان کیا ہے۔ کہ یہ رباعیات مازندرانی زبان میں ہیں۔ لیکن ہیرن ایلن صاحبِ آتشکدہ کے ہم خیال ہیں۔ یعنی یہ رباعیات راجی یارے کی زبان میں ہیں جو فارسی زبان کی ایک شاخ ہے اور شمالی ایران سے تعلق رکھتی ہے۔

بابا طاہر عُریاں کی رباعیات کی خصوصیات

بابا طاہر عریاں کی رباعیات نفسِ مضمون کے اعتبار سے بھی اور ہیئت کے اعتبار سے

بھی بہت ممتاز ہیں۔ پہلے ہم بابا طاہر کی رباعیات کا نفسِ مضمون کے اعتبار سے تجزیہ کرتے ہیں یعنی بابا طاہر نے اس مختصر صنفِ سخن میں کیا پیغام دیا ہے۔

۱۔ متصوفین کی مسلم روایات کے مطابق دل روشن وجدان کا مرکز ہے لیکن وہ طریقہ جس کے ذریعے وجدان وجدانی دل تک پہنچتی ہیں، ہمیشہ پُراسرار رہتا ہے۔ بعض علمار کا قول ہے کہ دل کے بھی پانچ حواس ہوتے ہیں۔ بابا طاہر حواس خمسہ ظاہری کو "دیدہ" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے اور وجدانی قوتوں کا مرکز دل کو ہی سمجھتا ہے۔ لکھتا ہے:

زدستِ دیدہ و دل ہر دو فریاد
کہ ہر چہ دیدہ وینہ دل کند یاد
بسازم خنجر نیشش ز پولاد
زنم بر دیدہ تا دل گردو آزاد

۲۔ بابا طاہر عریاں کے ہاں یہ احساس بھی شدید ہے کہ دل اگرچہ علم وجدانی کا مرکز ہے لیکن اس کا عمل ایک راز سربستہ ہے جس کے ذریعے دل اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ کشف والقا کا مخزن بن جائے۔ وہ یہ بیان نہیں کر سکتا کہ وہ اس چشمۂ کشف والقا سے کیونکر فیض یاب ہُوا اور اس فیضان کی نوعیت کیا ہے اس لیے بابا طاہر عریاں کہتا ہے:

مگر شیر و پلنگی ای دل ای دل — بمو دائم بجنگی ای دل ای دل
اگر دستم فتی خونت وزیرم — ووینم تا چہ رنگی ای دل ای دل

۳۔ بابا طاہر یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ وہ اس وسیع و عریض کائنات میں تنہا ہے اس کا ذہنی خلفشار اس کے احساسِ تنہائی کو اور بھی زیادہ شدید کرتا ہے۔

بہ عالم ہمچو مو پروانہ نہ — جہاں را ہمچو مو دیوانہ نہ
ہمہ ماراں و موروں لانہ ویرن — من بیچارہ را ویرانہ نہ

۴۔ شریعت اور طریقت میں جو بُعد ہے اس کا بیان صوفی شعرار کا محبوب موضوع رہا ہے اگرچہ بابا طاہر کے بعد آنے والے شعرار نے اس بُعد کی بہت حسین تصاویر کھینچی ہیں لیکن

باباطاہر نہ تو عالم ہے نہ فلسفے کے دقیق نکات کا شارح۔ جو کچھ اس کے دل پر گزرتی ہے اسے شعر میں بیان کر دیتا ہے۔

تہ کہ ناخواندہ علم سخوات
تہ کہ نا بردہ پی در خرابات
تہ کہ سود و زیاں خود ندونی
بمردوں کہ رسی ہیہات ہیہات

۵۔ باباطاہر نے یہ بات اصول کے طور پر بیان کی ہے کہ صوفی ہر مذہب میں، ہر گروہ میں ہر مسلک میں پائے جاتے ہیں لیکن ان سب کے عقیدے یکساں ہوتے ہیں۔

اگر مستان مستیم از تہ ایموں
اگر بی پا و دستیم از تہ ایموں
اگر گوریم و ترسا از مسلموں
بہر ملت کہ ہستیم از تہ ایموں

۶۔ باباطاہر ایک قلندر تھا لیکن اس کے وقت تک قلندرانہ روش کا مفہوم اصطلاحی نہیں ہوا تھا اور مقصد اس کلمے کے استعمال سے صرف یہ تھا کہ یہ اشارہ کیا جائے کہ صوفی اپنی زندگی بے نیازانہ بسر کرتا ہے اور عیش و عشرت دنیا سے مستغنی رہتا ہے۔ باباطاہر نے اپنی وضع زیست اور بے نیازی کا بیان کئی رباعیوں میں کیا ہے جس سے پڑھنے والا نہ صرف متاثر ہوتا ہے بلکہ اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ باباطاہر واقعی مضطرب اور بیقرار ہے۔ کوہساروں میں بھٹکا کرتا، جہاں شام ہوئی وہیں اپنا مسکن بنا لیتا۔

مون آں رندم کہ نامم بی قلندر
نہ خون دیرم نہ مون دیرم نہ لنگر
چوں روز آیہ بگردوم گرد گیتی
چوں شو گردہ بہ خشتی وانہم سر۔

۶۔ باباطاہر پیشہ ور صوفی نہیں ہیں۔ نہ ان کے کلام میں کوئی منظم تصوف کا فلسفہ پایا جاتا ہے۔ لیکن ان کی رباعیات میں بعض بنیادی تصورات نمودار ہوتے ہیں جو بعد میں قصر تصوف کے نقش و نگار بنتے ہیں۔ صوفیا کو اس بھری دنیا میں کوئی ہمدم اور ساتھی نہیں ملا، کیونکہ حقیقت کو کھلم کھلا بیان کرنا ناممکن ہے۔ لوگ اس کی تاب نہیں لا سکتے اور انا الحق کہنے والے آخر دار و رسن کے ذریعے حق سے جا ملتے ہیں تنہائی کا یہ احساس بیگانگی کا یہ شعور، اکیلے پن کا یہ ادراک، ہمدم اور رفیق کی کمی، محرم راز اور دم ساز کی غیر موجودگی یوں بھی حرمان کا نہایت قاتل احساس پیدا کرتی ہے۔ بابا طاہر نے اس احساس کو بڑا خوبصورت جامہ پہنایا ہے۔

خدا وندا کہ بوشم با کہ بوشم
مژہ پر اشکِ خونین تا کہ بوشم
ہم کز در برانن سوتہ آیم
تو کہ از در برانی وا کہ بوشم

۷۔ غزل اور شعر کی رمزی اور کیفیتوں میں خوشبو کو نغموں کو اور رنگ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان تینوں چیزوں میں یعنی خوشبو، رنگ اور نغمے میں وہ آزادانہ ایتلافِ افکار موجود ہوتا ہے جس کی وجہ سے آدمی کا خیال کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ غزل کی علامتوں کو لے کر بابا طاہر سے اکثر رباعیات میں ان کو الف انبساط کا نقشہ کھینچا ہے جو صوفی کو تجلی کے دیدار سے حاصل ہوتے ہیں۔ طاہر نے تجلی کو ایک شکل جسمانی بخشی ہے اور اسے محبوب کے روپ میں دیکھا ہے۔ پھر جب ایسا ہو گیا تو اس کی زلفیں اور کاکل بھی تخلیق کر لیے گئے اور شعر میں کوئی کیفیت پیدا کر دی گئی ہے جو مجاز کے دائرے میں ہوتی ہے۔

نسیمے کز بن آن کاکل آیو
مرا خوشتر ز بوی سنبل آیو
چو شو گیرم خیالت را در آغوش
سحر از بسترم بوی گل آیو

۸۔ باباطاہر نے اپنے معاصی، اپنی ناکسی اور اپنی تباہ کاری پر تاسف کے آنسو بہائے ہیں اور خدا سے مغفرتِ گناہ کی التجا اور دستگیری کی استدعا کی ہے۔ مثلاً:

ازاں روزی کہ مارا آفریدی
بغیر از معصیت از ما چہ دیدی
خداوندا بحق ہشت و چارت
زمو بگذر شتر دیدی نہ دیدی

باباطاہر عریاں بحیثیت فنکار

باباطاہر عریاں نے نہ فقط معنوی اعتبار سے رباعی کو مالا مال کیا ہے بلکہ اس نے فنکارانہ چابکدستی کے ثبوت دیئے ہیں اور اس کے سوز و گداز کو فن کی چاشنی کے ساتھ ایسا حسین امتزاج ہے کہ زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں سامنے آگئی ہیں۔ باباطاہر کا انداز بیان بھی نہایت سادہ اور آسان ہے جو قدما کی نمایاں خصوصیت ہے کسی بات کو پیچ دے کر نہیں کہتا۔ خیالات بھی زیادہ گہرے اور فلسفیانہ نہیں ہیں اور زیادہ تر جذباتِ نفسانی اور تاثراتِ قلبی سے متعلق ہیں۔ اس کے کلام میں بیشتر انہی حالات اور واردات کا مذکور ہے جو عموماً ہر شخص کے لیے ناگزیر ہے اور جب کوئی اس کا کلام پڑھتا ہے تو اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ خاص اسی خیالات کی ترجمانی اور خود اسی کے حالات کا بیان ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام کو اس درجہ ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل ہے۔

طرزِ ادا کی سادگی اور بے ساختگی میں لاکھوں بناؤ اور بلا کی دلکشی و دلفریبی ہے۔ درد ہجر و فراق، غم نصیبی و ایذا کشی اور نالہ و زاری کے مضامین اس کے یہاں بکثرت ہیں اور ان مضامین کو وہ کچھ ایسے پیرایہ اور درد بھرے انداز بیان کرتا ہے کہ چوٹ کھایا ہوا دل تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ ساتھ ہی کثیر معنی اور طویل مفہوم کو تھوڑے لفظوں میں بیان کر دیتا ہے وہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ تیرے لیے میرا حال تباہ ہے۔ بے خانماں، آوارہ جنگلوں کی خاک چھانتا پھرتا ہوں۔ رات اس طرح بسر ہوتی ہے کہ سر کے نیچے ایک پتھر رکھا اور زمین پر

پڑ رہا۔ بس یہی بالین و بستر ہے۔ مگر یہ سب آخر کس جرم کی سزا ہے؟ اس جرم کی کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ اس مضمون کو کس خوبصورتی اور کیسے دردناک پیرائے میں بیان کیا ہے۔

دلم از دردِ تو دائم غمینہ ... بہ بالین خشتم و بستر زمینہ

ہمیں جرم کہ مو تہ دوست دیرم ... نہ حرکت دوست دارہ حافش اینہ

باباطاہر کے زمانے میں یہ ضروری نہ تھا کہ رباعیات معنوی اعتبار سے بھی انتہائی بلند پایہ ہوں۔ کیونکہ اصلاً یہ ایک ایسی صنفِ شعر تھی جسے لوگ اکثر موسیقی سے خاص طور پر مربوط تصور کرتے تھے۔ چنانچہ اسی لیے ایک کا نام "ترانہ" بھی ہے۔ موسیقی اور شعر کا ویسے بھی چولی دامن کا ساتھ ہے۔ سنسکرت میں چڑھتی ہوئی سر کو تیور اور اتری ہوئی کو "کومل" کہتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ سنسکرت ادب کے ماہروں نے اور راگ ودّیا کے پنڈتوں نے لکھا ہے کہ جذبہ جہاں شدید ہوگا۔ ادب میں تیور اور اتنیو سروں سے ظاہر ہوگا اور جہاں لطیف اور نرم ہوگا وہاں کومل۔ اور کومل سُروں کے ذریعے ظاہر ہوگا۔

ژ۔ یعنی بحور کا متناسب استعمال ہے۔ جہاں جذبہ کی شدت ہے وہاں انہوں نے مختصر بحر کو منتخب کیا ہے جس میں جوئے کہسار کی سی روانی اور جوش و خروش ہے مثلاً:

دِلی دیرم خریدارِ محبت
کزہ او گرم است بازارِ محبت
لباسی بافتم برقامتِ دِل
زپودِ محنت و تارِ محبت

ایک اور رباعی ملاحظہ ہو:

خوشا آنوں کہ واتہ ہمنشینہ
ہمیشہ بادلِ خرم نشینہ
بود ایں رسمِ عشق و عشق بازی
کہ گستاخانہ آئند و تہ دینہ

جس رباعی میں وہ افسردہ ہیں اور قاری کو بھی افسردہ بنانا چاہتے ہیں وہاں طویل بحر کا انتخاب کیا ہے اور اس کی طوالت سے شعر میں ایک خاص قسم کا تاثر پیدا ہو جاتا ہے جو کہ یاسیت اور افسردگی کو اچھی طرح سے واضح کر دیتی ہے۔

چرا آزردہ حالی اے دل اے دل
مدام اندر خیالی اے دل اے دل
بر دگنجی نشیں شکرِ خدا کن
کہ شائد کامیابی اے دل اے دل

۲۔ حروف کی تکرار:۔ اس سے پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ موسیقی اور شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جن چیزوں کو اسلوب نگارش میں ترنم اور نغمہ کہتے ہیں اس کے علاوہ ترنم خوشگوار سادہ اصوات کی تکرار کا نام ہے۔ ترنم سے مٹھاس اور شیرینی پیدا ہوتی ہے۔ صاحب ذوق سلیم پہچانتا ہے کہ الفاظ اور حروف کی کس ترکیب میں ترنم مخفی ہوگا اور کس ترکیب میں نغمہ۔ بابا طاہر عریاں کی اس رباعی میں "ب" کی تکرار ملاحظہ ہو۔

بہار آئی بہر شاخِ گلی بی
بہر باغی ہزاراں بُلبلی بی
بہر مرزی نیارم پا نہادن
مباد از مو بتر سوتہ دلی بی

ایک اور رباعی ملاحظہ ہو جس میں "ا" اور "ش" کی تکرار ہے۔

خوشا آنا کہ اللہ یارشون بی
کہ حمد و قل ھو اللہ کارشون بی
خوشا آنان کہ دائم در نماز ند
بہشت جاوداں بازار شون بی

۳۔ تشبیہ واستعارہ کا متناسب استعمال: تصویریت جیسا کہ نام سے

ظاہر ہے لفظوں میں تصویر کھینچنے کا نام ہے۔ تجسیم سے مراد ہے کہ تشبیہ اور استعارہ سے ذہنی اور روحانی کوائف اور حقائق کو مادی چیزوں کے ذریعے پڑھنے والے تک منتقل کیا جائے تجسیم کا کلمہ خود پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں صفت ہوں جس کے ذریعے فن کار اور شاعر ان افکار اور تصورات کو پیراہن اسم وزبان بخشتا ہے جو اپنی لطافت کی بنا پر کسی طرح بیان نہیں ہو سکتے۔ فنکار جب تشبیہ اور استعارے کا دامن تھامتا ہے تو اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ دل کی واردات کی وہ نازک، نفیس اور دلکش سرتیاں جو دھیمی بھی ہیں اور کومل بھی، پڑھنے والے کو صاف صاف سنائی دیں۔ من کی نگری میں جو دھواں دھواں، دھندلی دھندلی پرچھائیاں سی خیالوں پر پڑتی ہیں وہ سایہ کی طرح واضح ہو جائیں۔ بالفاظ دیگر تجسیم یا استعارہ کے لیے شاعر معروف سے مجہول کی طرف جاتا ہے اَن جانی اور ان دیکھی چیزوں کو جانی بوجھی بنا دیتا ہے۔ اس طرح بابا طاہر کی ان رباعیات میں آگ کی رنگینی، روشنی اور تابش نے جو لطف پیدا کیا ہے، وہ ذوقِ سلیم پرور روشن ہے۔ تمثیلی اندازِ بیان کی بھی یہ رباعی بڑی اچھی طرح سے عکاسی کر رہی ہے

خور آئین چہرہ ات افروتہ تربی
دلم از تیرِ عشقت دوتہ تربی ذوختہ
زچہ خالِ رُخت دونی سیاہہ دانی
ہر آن نزدیک خور بی سوتہ تربی

ایک اور رباعی ملاحظہ ہو۔

مو آں شمعم کہ اتشم آذرین بی
کسی کو سوتہ دل اتشش نہ این بی
ہمہ شو سوجم دگریم ہمہ روز
زتہ شامم چنوں روزم چنیں بی

۴۔ خیال افروزی: خیال افروزی کے معنی یہ ہیں کہ شاعر شعوری طور پر ایسے کلمات اور الفاظ استعمال کرتا ہے کہ پڑھنے والے کا دھیان کہیں سے کہیں پہنچ

جاتا ہے اور وہ مطلب بھی سمجھ میں آتا ہے جو بظاہر الفاظ سے ظاہر نہیں ہوتا۔ خیال افروزی وہ پُر اسرار صفت ہے جس سے ہمارا تخیل ان دنیاؤں میں پہنچ جاتا ہے جس کی جھلک شاعر نے دیکھی تھی اور جن کی دھندلی سی پرچھائیں لفظوں میں نظر آتی ہے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ شاعر کون سے لفظ استعمال کرے گا جن کے اثر سے پڑھنے والا اپنے دل میں یاد کی چنگاریوں کو کریدنے لگے۔ خیال کہیں کا کہیں پہنچ جائے۔ ذہن ایک پردۂ تصویر بن جائے مگر فانوس خیال کی صورت اختیار کرلے۔ ملاحظہ ہو:

چہ خوش بی مہربانی کھز دو سر بی
کہ یکسر مہربانی دردِ سر بی
اگر مجنوں دل شوریدہ ای داشت
دلِ لیلےٰ ازاں شوریدہ تر بی

باباطاہر کے کلام میں صنائع لفظی وبدائع معنوی بہت کم ہیں لیکن جتنی بھی ہیں بہت خوبصورتی سے استعمال کی گئی ہیں کہ پڑھنے والے کی توجہ معنی سے ہٹ کر لفظ پر کبھی نہیں جمتی بالالفاظ دیگر طاہر نے صنعت گری کو معنی آفرینی کے تابع رکھا ہے اور وہ جھوٹی چمک پیدا نہیں کی جو مرصع تصویروں اور رنگین غزلوں میں ہوتی ہے۔ جو صنعتیں زیادہ تر استعمال کی ہیں وہ یہ ہیں:

تضاد۔ ایہام۔ تناسب۔ مراعاۃ النظیر۔ تلمیح

ان تمام صنعتوں میں اہمیت تناسب کو حاصل ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ شاعر دو لفظ استعمال کرتا ہے۔ ایک لفظ کے دو معنی اور جب وہ اپنی واردات کا اظہار کرتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی ماہر مغنی راگ میں تمام جذبات کے اور تمام تمناؤں کے گھاؤ دکھا رہا ہو، باطمینان قلب گاتا ہے۔ اس کے الفاظ کے ساز میں سوگ بھی ہوتا ہے۔ بروگ بھی۔ سہاگ بھی اور سنجوگ بھی۔ دُکھ بھی اور سُکھ بھی۔ مختصر یہ کہ زندگی اپنی تمام گوناگوں کیفیتوں کے ساتھ ایک نگار رعنا کی طرح اس کے محمل الفاظ سے جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے مثلاً:

بلایہ دل بلایہ دل بلایہ — بلا ہے دل بلا ہے دل بلا ہے
گنہ چشمون کو دن دل مبتلایہ — خطا آنکھیں کریں دل مبتلا ہے
اگر چشمون نہ دینن ذُدی زیبا — اگر آنکھیں حسینوں کو نہ دیکھیں
چہ ذونوں دل کہ خوبوں درکجایہ — تو کیا جانے دِل کہ کہاں دل ربا ہے

❖

نسیمی کز بن آن کاکل آیو — خوشتر زبوی سنبل آیو
چو شو گیرم خیالش اُو ورم آغوش — سحر از بسترم بوی گل آیو

چنانچہ اس جائزہ کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ بابا طاہر اگرچہ حافظ اور سعدی کی طرح سے فارسی ادب میں ممتاز مقام کے مالک نہیں ہیں۔ تاہم ان کی فضیلت رباعی گوئی کے بیان میں جھٹلائی نہیں جا سکتی۔ رباعی کے ارتقار میں بابا طاہر کا بہت حصہ ہے۔ انہوں نے فارسی شاعری کو تصرف کے میدان سے روشناس کرایا۔ اور پھر ایک خاص بولی میں لکھنے کی وجہ سے ان کی رباعیات دوسرے شعرار کے کلام میں خلط ملط بھی نہیں ہوتیں۔

فرہنگ بابا طاہر

مو۔	می
ویرم۔	دارم
وارون۔	داران۔ جمع دار بمعنی درخت
نومہ۔	نامہ
خونون	خوانان
بوشم۔	باشم
خونن۔	خوانند
چرہ۔	چرد
خورہ۔	خرد
شوو روز۔	شب و روز
بستون۔	بستان
بلایہ۔	مبتلائے بلا است
چشمون۔	چشمان
مبتلایہ۔	مبتلا است
نوینن۔	نہ بیند

برانن۔ برانند
سوتہ؛ سوی تو
دا۔ با
کشیمون۔ کشی مرا
تہ۔ تو
اندوتہ۔ اندوختہ
پوتہ۔ پختن سے پختہ
ذولو۔ واند
سوتہ دلون۔ سوختہ دلاں
کریم۔ کنیم
اون۔ آن
ویرن۔ دارند
نرولیو۔ نردید
گدازہ۔ گدازد
آیو۔ آئید
برایہ۔ برآید
بسوحم۔ بسوزم
کشہ۔ کشد
نومہ۔ نامہ
آمیتہ۔ آمیختہ
کرومہ۔ کدام است
سارلبون۔ ساربان
میرون۔ میران

خربودن۔ خوبان
فریاد۔ فریاد
وینہ۔ بجند
یاد۔ یاد
پولاڈ۔ پولاد
آزاز؛ آزار
گردہ۔ گرددر
بی۔ بود۔ باشد
خون مون۔ خانمان
مارون۔ ماران
مورون۔ موران
ویڑہ۔ ویزد
نمونہ۔ نماند
ویتم۔ ببنم
نموین۔ نمائید
بنوشہ۔ بنفشہ
می کرم۔ می کنم
بیتہ۔ بی تو
ندونی۔ ندانی
بورہ۔ بیائید
گیشرہ۔ ویڑہ۔ پریشان و سرگردان
الالہ۔ لالہ۔ لالہ ۱
کوہساروں۔ کوہساران

نسوجه.
نبوه.
بسوچنم.
سوزه

کناروں.
ته.
ندوني.

صفہ ۸۹

رباعیات باباطاہر عُریاںؒ

رباعی نمبر ۱۔

مو۔	من	فردا۔	قیامت
ویرن۔	دارم	نومہ۔	نامہ یعنی نامۂ اعمال۔ خط
دارون۔	جمع داران۔	خونن	خوانند
	بمعنی درخت	خونون۔	خوانان

قالوبلیٰ :۔ یہ قرآن مجید کی آیت مبارک ہے اوراشارہ ہے روزازل کے اس واقعہ کی طرف جب خداوند کریم نے تمام روحوں کو اکٹھا کیا اور کہا تھا۔ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو انہوں نے جواب دیا۔ قَالُوْ بَلٰی۔ ہاں۔ بیشک۔ یعنی تو ہمارا رب ہے۔ یعنی روزازل تمام روحوں نے اس طرح اقرار ربوبیت کیا تھا۔

ترجمہ :۔ میں قالوبلیٰ سے تشویش رکھتا ہوں (یعنی ڈرتا ہوں) کہ میرے گناہ درختوں کے پتوں سے بھی زیادہ ہیں۔ کل (یعنی قیامت کے دن) جب نامہ (اعمال) پڑھنے والے اپنے اپنے نامۂ اعمال پڑھیں گے تو میں اپنا نامہ ہاتھ میں لیے سر جھکائے کھڑا رہونگا۔

تشریح :۔ روزاول جو اقرار ربوبیت میں نے کہا تھا۔ میں نے دنیا میں آکر اسے فراموش کردیا۔ میں بارگاہ الٰہی سے ہٹ کر اِدھر اُدھر سرگرداں رہا اور بے شمار گناہوں کا مرتکب ہوا۔ میری تمام کارگزاریاں نامۂ اعمال میں درج ہوتی رہیں۔ قیامت کے دن رب العلمین کے روبرو جب کہ نامہ اعمال سب کے ہاتھوں میں دیا جائے گا تو میں اپنے کردہ گناہوں کی فہرست دیکھ کر شرم سے جھک جاؤں گا۔ کیونکہ خداوند عالم کی ربوبیت کے اقرار کا

یہ تقاضا ہے کہ ہم اللہ کے ہو کر گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتے ۔ مگر دنیا میں آ کے بعد ہم دنیاوی مشاغل میں کچھ ایسے کھوئے کہ اپنے خالق کو بھول گئے ۔ چنانچہ قیامت کے دن خالق کے حضور میں جب ہمارا نامۂ اعمال پڑھا جائے گا تو ہم ازبس شرمندہ ہوں گے ۔ بقول حافظ ۔

فردا کہ پیشگاہ حقیقت شود پدید
شرمندہ راہروی کہ عمل بر مجاز کرد

رباعی نمبر ۲ :-

	برنن ۔	برانند
بوشم ۔ باشم	سوتہ ۔	سوی تو ۔ تیری طرف
مژہ ۔ پلک	کم ۔	کم مرا ۔
ہم ۔ ہم مرا	واکہ ۔	باکہ

رائدن ۔ ہانکنا ۔ نکالنا ۔ دھتکارنا

ترجمہ ۔ خداوندا میں کون ہوں اور کس کے ساتھ ہوں ۔ میری پلکوں پر کب تک خون آلودہ آنسو رہیں گے ۔ جب لوگ مجھے اپنے دروازے سے دھتکارتے ہیں ۔ تو میں تیری طرف آتا ہوں لیکن اگر تو بھی مجھے اپنے دروازے سے نکال دے تو پھر کہاں جاؤں ۔

تشریح ۔ بابا طاہر مجذوبیت کا عالم طاری ہے ۔ محبوب حقیقی کے فراق میں اس کی آنکھیں خون کے آنسو رو رہے ہیں ۔ لوگ اسے دیوانہ کہہ کر اپنے پاس سے بھگا دیتے ہیں ۔ تو وہ اپنے رب کے آستانے پر دستک دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اے محبوب میں نے تیرے لیے تمام ماسوا سے کنارہ کشی کر لی ۔ اب اگر تو بھی مجھے دھتکار دے تو میں کہیں کا نہ رہوں گا ۔ تیرا درِ دولت ہی میری منزلِ مراد ہے مجھے یہیں پناہ لینے دے ۔ قتیل کا یہ شعر بھی اسی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتی ہے ۔

نکل کر دیر و کعبہ سے اگر ملتا نہ مے خانہ
تو ٹھکرائے ہوئے انسان خدا جانے کہاں جاتے

رباعی نمبر ۳۔

کُشیمون ۔ کُش مرا ۔ مجھے جان سے مار ڈالے۔
نیمۂ دل ۔ آدھا ہے دل ۔ مراد شکستہ دل ۔
ار ۔ اگر
مودا ۔ من با

ترجمہ :۔ اگر تو مجھے رلا رلا کر جان سے مار دے یا مجھے ذلیل کر کے اپنے دروازے سے دھتکار دے تو تجھے کس کا خوف ہے ۔ جب میں شکستہ دل کسی سے نہیں ڈرتا تو تو جس کے پاس دو جہاں کے دل ہیں کسی سے کب ڈر سکتا ہے ۔

تشریح :۔ اے خدائے ذوالجلال تو مختار کل ہے اور ہم محض بندے ۔ تو ہمیں جس حال میں بھی رکھے تیری مرضی ہے ۔ اگر تو ہمیں جان سے بھی مار دے تو تب بھی ہم تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ۔ ذلیل وخوار کرے تب بھی ہم کچھ نہیں کر سکتے ۔ جب ہم تیرے بندے ہونے ہوئے بھی کسی سے خائف نہیں ہیں تو تو جو کہ قادر مطلق ہے کب کسی سے ڈر سکتا ہے !

رباعی نمبر ۴۔

اندوتہ ۔ اندوختہ
ذولو ۔ راند
پوتر ۔ از بختن
پوتہ ۔ کٹھالی
بوده ۔ برويد ۔ بیائید
سوتہ دلون ۔ سوختہ دلان ۔ دل جلے
عیار ۔ کسوٹی پر لگانا ۔

ترجمہ ۔ نالۂ غم کی آواز صرف اندوہگین انسان ہی جانتا ہے ۔ خالص سونا تو کٹھالی ہی پرکھ سکتی ہے ۔ اے دل جلو ، آؤ ، کہ ہم سب مل کر آہ وزاری کریں ۔ دل جلے کا حال صرف دل جلا ہی جانتا ہے ۔

تشریح :۔ کسی غم کو وہی سمجھ سکتا ہے جو خود بھی غمزدہ ہو ۔ کیونکہ یہ ایک وجدانی کیفیت ہے جو نہ تو دکھائی جا سکتی ہے اور نہ سمجھائی جا سکتی ہے ۔ بس محسوس کی جا سکتی ہے ۔ بعینہ جیسے کہ کٹھالی میں سونے کے خالص ہونے کا پتہ چلتا ہے ۔

چنانچہ شاعر دل جلوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ہمیں مل جل کر آہ وزاری کرنی چاہیئے تاکہ ہمیں ایک دوسرے کے درد کا احساس ہو سکے ۔ اشعار ذیل میں یہی مضمون بیان کیا

گیا ہے۔

سعدیا حال پراگندہ گوی آں داند | کہ ہمہ عمر بچوگان کسی افتادہ است
آعندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں | تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل
اے بلبل اگر می من باتو ہم آوازم | تو عشق گلی داری من عشق گل اندامی

رباعی نمبر ۵۔

پورہ۔ بیائید | سوتہ تریم۔ سوختہ تریم
سوتہ دلاں۔ سوختہ دلاں۔ دل جلے | سنجیم۔ ہم تولیں
واہم۔ باہم | سنگیں۔ زیادہ بھاری۔ بوجھل
کریم۔ کنیم

ترجمہ۔ اے دل جلو، آؤ ہم سب جمع ہوں۔ اور مل کر باتیں کریں اور غموں کو ہلکا کریں۔ ترازو لائیں۔ غموں کا اندازہ کرلیں۔ ہم میں سے جو زیادہ دل جلے ہوں گے۔ وہی زیادہ بوجھل ہوں گے۔

تشریح:۔ دل جلے مل کر بیٹھیں اور ایک دوسرے سے حال دل بیان کریں تو اس سے ایک تو ایک دوسرے کی کیفیت کا پتہ چلتا ہے اور دوسرے غم کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہو جاتا ہے۔ مل جل کر بیٹھنے اور آپس میں بات چیت کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کون زیادہ دردمند ہے۔ جو جتنا زیادہ دردمند ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ قابلِ قدر ہوگا۔ کیونکہ۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیان

دل جلوں کا مل کر بیٹھنا اور آپس کی دل کی بھڑاس نکالنا ایک ایسا موضوع ہے جس پر اردو اور فارسی میں بے شمار اشعار موجود ہیں۔ نمونہ کے طور پر ایک دو شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

تا نہ سوزد بر نیائید بوئے عود   پختہ داند کایں سخن با خام نیست

رباعی نمبر ۶ :-

چرہ -	شجاع ۔ نر باز	ہراون -	ہرآن
نخچیر -	شکار	چرہ -	چرد
مو -	مو ۔ من	خورہ -	خورد
مچر -	نہی از چریدن		

ترجمہ - میں ایک باز تھا - شکار کے پیچھے چلا - کسی سیاہ چشم نے میرے بازو پر تیر مارا ۔ جا! کوہساروں میں غافل ہو کر نہ چر - چونکہ جو غفلت سے چرتا ہے وہ ناگہاں تیر کھاتا ہے ۔

تشریح : انسان بزعم خود کتنا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو، عشق کے دام میں پھنس ہی جاتا ہے چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ میں اپنی دانست میں ایک چالاک باز تھا اور شکار کرنا میرا محبوب مشغلہ تھا - لیکن ایک سیاہ چشم محبوب نے مجھے تیرِ نظر سے گھائل کر دیا ، جب میں چالاک ہوتے ہوئے بھی شکار ہو سکتا ہوں ، تو اے لوگو! تم جو غفلت پڑے ہو اور اپنے پس و پیش سے بے خبر ہو ضرور شکار ہو گے ، کوئی حسین محبوب اچانک تمہیں اپنے تیرِ نظر سے زخمی کرے گا اور پھر تم بھی عشق میں میری طرح تڑپنے لگو گے ۔

رباعی نمبر ۷ -

شو -	شب ۔ رات	بستون -	بستان
مو -	من ۔ میں	لے لے ،	چھین لے

ترجمہ - خداوندا ! میں اس دل کے ہاتھوں نالاں ہوں اور رات دن اس کی وجہ سے دکھی رہتا ہوں - اب تو میں نالہ و فغاں (آہ وزاری) سے بھی اکتا گیا ہوں - کوئی ہے جو یہ دل مجھ سے لے لے کہ میں اس دل سے بیزار ہو گیا ہوں ۔

تشریح : - شعراء کی نظر میں دل تمام جذبات و احساسات کا مخزن ہے - چنانچہ عشقیہ واردات اور حزنیہ کیفیات بھی اسی دل پر گزرتی ہیں - اسی پریشانی کے پیشِ نظر شعراء نے دل سے پناہ مانگی ہے - مثلاً :

خدایا داد ازیں دل داد ازیں دل | نگردیدیم یکدم شاد ازایں دل
چو فردا داد خواہاں داد خواہند | برآرم من دو صد فریاد ازیں دل
(بابا طاہر عریاں)

یا

پریشاں ہوں کہ میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے (اقبال)

رباعی نمبر ۸۔

بلایہ۔	بلااست	ذو تو۔	داند
چشمون۔	چشمان، آنکھیں	خوبون۔	خوباں۔ خوبرو
مبتلایہ۔	مبتلااست	کجایہ۔	کجااست
وینن۔	بینند۔		

ترجمہ:۔ یہ دل بھی عجیب بلا ہے کہ گناہ آنکھیں کرتی ہیں لیکن گرفتار دل ہو جاتا ہے۔ اگر آنکھیں حسین چہروں کو نہ دیکھیں تو دل (بچارہ) کیا جانے کہ حسین کہاں ہے؟

تشریح:۔ شاعر دل کو نردوش اور آنکھوں کو قصوروار ٹھہرا رہا ہے کیونکہ آنکھیں ہی ہیں جو کہ حسین چہروں کا نظارہ کرتی ہیں اور اس نظارے سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ بعد کی بات ہے۔ تاثر کا تعلق دل سے ہے اور نظارے کا آنکھ سے۔ گویا اس تاثر کی پیدائش کی ذمہ دار آنکھیں ہیں۔ چنانچہ اس تاثر کی بدولت دل جس کرب و بلا میں مبتلا ہوتا ہے اس کی ذمہ دار بھی آنکھیں ہیں۔ دل بیچارا تو مفت میں سزا پاتا ہے بقول کسے:۔

آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی

لیکن دل کی اس حوصلے کی داد دینی پڑتی ہے کہ وہ آنکھوں کے قصور پر خود کو ہی مبتلائے آزار کرتا ہے۔ مذکورہ رباعی میں اس حوصلے کے پیش نظر دل کو بلا کہا گیا ہے۔ بابا طاہر نے چشم و دل کی اس حالت کا اظہار درج ذیل رباعی میں بھی کیا ہے ؎

ز دست دیدہ و دل ہر دو فریاد | کہ ہر چہ دیدہ بیند دل کند یاد
بسازم خنجری نیشش ز پولاد | زنم بر دیدہ تا دل گردد آزاد

صدا ۹

رباعی نمبر ۹۔

دبیند۔	بیند دیکھے	پولاذ۔	پولاد ۔آزاد
فریاد۔	فریاد	آزاذ۔	آزاد
کنہ ۔	کند	گردہ ۔	گرود
یاذ ۔	یاد		

ترجمہ:۔ آنکھ اور دل دونوں کے ہاتھوں فریاد ہے کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے دل اسے یاد کر لیتا ہے ۔میں ایک ایسا خنجر بناؤں گا جس کی نوک فولاد کی ہوگی اور وہ خنجر آنکھ میں ماروں گا۔ تاکہ دل آزاد ہو جائے ۔

تشریح :۔ یہ رباعی گزشتہ رباعی کی مزید وضاحت ہے ۔ شاعر آنکھ سے اس لیے نالاں ہے کہ وہ مشاہدہ کرتی ہے اور دل سے اس لیے بیزار ہے کہ وہ آنکھ کے مشاہدہ کو محفوظ کر لیتا ہے ۔ظاہر ہے کہ آنکھ کا یہ مشاہدہ حسین وجمیل چہروں کا نظارہ ہے جو خلش یا تڑپ بن کر دل میں بس جاتا ہے اور دل کو اس خلش یا تڑپ کے ہاتھوں گوناگوں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔چنانچہ دل کو ان پریشانیوں سے بچانے کا حل شاعر اس چیز میں ڈھونڈتا ہے کہ آنکھ کو پھوڑ لیا جائے تاکہ نہ رہے بانس ، نہ بجے بانسری ۔یعنی نہ آنکھیں دیکھ سکیں گی اور نہ ہی دل میں کوئی تاثر پیدا ہو سکے گا ۔جس کے باعث وہ مبتلائے آزار ہو ۔ دل کی بے قراری کے متعلق کسی اردو شاعر کا یہ شعر بھی ملاحظہ کے قابل ہے ۔ ؎

ہوتا ہے بیقرار حسینوں کو دیکھ کر
ایسا دیا تھا کیوں میرے پروردگار دل

رباعی نمبر ۱۰۔

مو ۔	من ۔میں	گردہ ۔	گردہ
بی ۔	بود	لنگر ۔	ساز و سامان
خون ۔	خان ۔خانہ	قلندر ۔	فقیر ۔اللہ والا

دیرم - دارم | رند - لاابالی - بے قید انسان - قیود شریعت سے آزاد انسان
مون - مان، مسکن
آیہ - آید | شو - شب - رات
خون ومون - خانماں - گھربار

ترجمہ:- میں ہی وہ رند ہوں جس کا نام قلندر ہے نہ میرا گھر بار ہے نہ ساز وسامان۔ جب دن ہوتا ہے تو دنیا میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ اور جب رات ہوتی ہے تو کسی اینٹ پر سر رکھ کر سو جاتا ہوں۔

تشریح :۔ اللہ والوں کو دنیوی ساز وسامان کی پرواہ نہیں ہوتی وہ ترکِ دنیا کے قائل ہوتے ہیں۔ ان کا من صرف عشق حقیقی سے سرشار ہوتا ہے یہی عشق ان کا اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے۔ وہ دن رات دیوانوں کی طرح صحرا بصحرا پھرتے رہتے ہیں اور رات کو جہاں موقع مل جاتا ہے گھڑی دو گھڑی آرام کر لیتے ہیں۔ کانٹوں کا بستر اور اینٹوں کا سرہانہ انہیں پھولوں کی سیج معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کے پاس عشق حقیقی کی دولت ہوتی ہے۔ اس کی بدولت یہ فقیری میں بھی بادشاہی کرتے ہیں۔

رباعی نمبر ١١۔

نہ - نیست | لانہ - بیل - بل - سوراخ - بھٹ
موروں - موران جمع مور - چیونٹی | دیرن - دارند - رکھتے ہیں۔

ترجمہ :۔ دنیا میں مجھ ایسا پروانہ نہیں ہے اور عالم میں مجھ سا دیوانہ نہیں ہے۔ سانپ اور چیونٹیاں یعنی تمام حشرات الارض یا کیڑے مکوڑے اپنے رہنے کا ٹھکانہ رکھتے ہیں۔ لیکن مجھ خستہ حال کو کوئی ویرانہ میسر نہیں۔

تشریح :۔ جس طرح پروانہ شمع سے شدید عشق کرتا ہے اسی طرح عاشق بھی اپنے محبوب سے بے حد محبت کرتا ہے اور اس محبت میں اتنی شدت ہے کہ وہ دیوانہ ہو گیا ہے دنیا بھر میں سب سے زیادہ وہ محبوب کا والہ وشیدا ہونے کے باوجود اسے رہنے کو جگہ میسر

نہیں چنانچہ وہ لب شکایت وا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے محبوب! کتنے تعجب کا مقام ہے کہ اہل دنیا حتیٰ کہ حشرات الارض بھی آرام اور چین سے زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن میں جو تیرا عاشق زار ہوں اتنا کم نصیب ہوں کہ دنیا میں میرے لیے کوئی ٹھکانہ نہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ عاشق ہوتا تو اسی دنیا کا فرد ہے لیکن اس میں کچھ ایسے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں کہ دنیا والے اسے سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں اور وہ بھری دنیا میں خود کو تنہا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کی زبان کو سمجھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ جیسا کہ حالی نے بھی فرمایا ہے ؎

مجھے کچھ کہنا ہے اپنی زباں میں ‏ ‏ کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں

حافظ نے بھی درج ذیل شعر میں اسی تنہائی کا رونا رویا ہے ؎

سینہ مالا مال درد است اے دریغا مرہمی

دل ز تنہائی بجاں آمد خدا را ہمدمی

بابا طاہر مذکور رباعی میں کسی جھونپڑے کا متلاشی نہیں ہے جہاں وہ سر چھپا سکے بلکہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کوئی فرد و بشر نظر نہیں آتا جو میری دیوانگی کو سمجھ سکے اور جس کے پاس بیٹھ کر مجھے خوشی ہو۔

رباعی نمبر ۱۲۔ ‏ ‏ بے حاصل۔ جس سے کچھ ہاتھ نہ آئے۔

نرویو۔ ‏ ‏ نروید ‏ ‏ مراد۔ بنجر۔

کشت: ‏ ‏ کھیتی ‏ ‏ گیاہ۔ ‏ ‏ گھاس پھوس

ترجمہ:۔ میرے دل کی کھیتی میں غم کے سوا کچھ نہیں اُگتا۔ میرے باغ میں ماتم کے پھولوں کے علاوہ کچھ نہیں اُگتا۔ میرے بنجر دل میں نا امیدی کی گھاس بھی پیدا نہیں ہوتی۔

تشریح:۔ عاشق کو گوناگوں مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ لذتِ وصل میسر آتی ہے تو اس کا دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا ہے اور تمام کائنات اسے رقص کرتی نظر آتی ہے۔ ہجر کی صعوبت کا سامنا ہوتا ہے تو دل زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے اور دنیا اسے کفن میں ملبوس دکھائی دیتی ہے۔ گویا کائنات بجائے خود نہ رقص

کرتی ہے اور نہ کفن میں ملبوس ہوتی ہے بلکہ اپنی حالت اور موڈ جیسا ہوتا ہے ویسی ہی نظر آتی ہے۔ انگریزی شاعر کالرج نے اسی کے پیش نظر کہا ہے۔

جس کا مفہوم ہے کہ

"زرق برق لباس پہنانے والے بھی ہم خود ہیں۔ اور کفن اوڑھانیوالے بھی ہم ہی ہیں" ہمارا موڈ جیسا ہوتا ہے کائنات ویسی ہی دکھائی دیتی ہے۔ مذکورہ رباعی میں عاشق کی ایسی ہی حالت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس پر شدید قسم کی مایوسی کا عالم بھی طاری ہے جس کے باعث وہ قنوطی ہو گیا ہے اور قنوطیت کے عالم میں وہ اس حقیقت کو فراموش کر چکا ہے کہ اگر اس وقت غم ملا ہے تو کیا ہوا۔ قنوطی بھی عنقریب مل جائے گی۔ بقول حافظ ؎

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند
چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند یا

چوں سر آمد دولت شبہائی وصل بگذرد ایام ہجراں نیز ہم

لیکن عاشق کو تو اپنی موجودہ حالت کا علم ہے۔ اسے اپنی زندگی حرماں پروش دکھائی دے رہی ہے اور خوشی خواب و خیال میں بھی نظر نہیں آتی۔ غم کی شدت میں وہ اب اس مرحلے پر پہنچ گیا ہے جہاں انسان تمام احساسات سے عاری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے خوشیوں کی امید تو درکنار اب تو میرے دل میں ناامیدی بھی جنم نہیں لیتی۔ گویا دل کچھ باقی نہ رہا۔ بقول غالب ؎

دل میں شوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

صفحہ ۹۲

رباعی نمبر ۱۳۔

ببالینم۔ میرے سرہانے۔

ترجمہ۔ اگر میرا درد ایک ہی ہوتا تو کیا برائی تھی اور اگر غم تھوڑا ہوتا تو کیا نقصان تھا! میرے سرہانے میرا محبوب یا چارہ گران دونوں میں سے اگر ایک ہوتا تو کیا حرج تھا۔

تشریح :۔ بقول شاعر ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو　　　　ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

دنیا میں آکر دردِ دل کے علاوہ اور بھی بہت سے غموں کا سامنا کرنا پڑا۔ جیسا کہ فیض نے کہا ہے ع

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

چنانچہ مذکورہ رباعی میں شاعر کہہ رہا ہے کہ جس دردِ دل کے لیے ہمیں پیدا کیا گیا ہے اگر وہی ایک درد ہمارے دل میں رہتا تو کیا قباحت تھی۔ ہمارے لیے دنیا کے غموں سے دردِ دل ہی بہتر ہے خواہ وہ تعداد میں کم ہی کیوں نہ ہوں۔ دنیا کے غم چاہے زیادہ ہوں۔ لیکن دردِ دل کے سامنے ہیچ ہیں۔ کیونکہ دردِ دل ہماری زندگی کا حاصل ہے اور یہ درد دنیا کے غموں کو میسر نہیں۔ بس دردِ دل دنیا کے غموں سے بدرجہا اچھا ہے پھر شاعر کہتا ہے کہ ہمارے دل میں جس محبوب کے لیے ٹیسیں اٹھ رہی ہیں اسے چاہیئے کہ ہماری جانب التفات کرے۔ اگر وہی اپنے دردمندوں کا خیال نہیں کرے گا تو کون کرے گا۔ محبوب کا قرب نہ ہونے کی صورت میں وہ کسی چارہ ساز یا غم گسار کا خواہش مند نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی موجودگی سے بھی غم زدہ طبیعت کو کسی قدر سکون مل جاتا ہے۔ چارہ ساز کی بجائے اگر ناصح گلے پڑ جائے تو بڑی کوفت ہوتی ہے جیسا کہ غالب نے کہا ہے ؎

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

رباعی نمبر ۱۴۴ :۔

بی ۔	بوز	مدام ۔	مدام میرا
پی ۔	درپے	گدازہ ۔	گدازد۔ گداز است
ذولو ۔	داند	نی ۔	بانسری ۔

ترجمہ :۔ میرا دل آہ و زاری کرنے میں بانسری کی طرح ہے تیرا دردِ فراق ہمیشہ

میرے: مجھے لگا رہتا ہے۔ تیرے غم میں مجھے قیامت تک جلنا اور گھلنا ہے۔ خدا معلوم قیامت کب آئے گی۔

تشریح:۔ جس طرح بانسری کے نالوں میں اپنی اصل (نیستان) سے جدا ہونے کا شکوہ ہے۔ اسی طرح میری بانسری کی آہ و فغاں میں بھی یہی کیفیت ہے۔ میری روح اپنی اصل سے ملنے کے لیے بہت بے قرار ہے ؎

پردہ ہائی رباب ہستی میں — کتنی بے چین روح آدم ہے

لیکن یہ ملاپ قیامت سے پہلے ممکن نہیں اور قیامت کب آئے گی۔ اس کا کسی کو بھی علم نہیں۔

رباعی نمبر ۱۵:۔

آید۔ آید — بود۔ بی

مرز۔ بوم۔ زمین۔ کیاری — مو۔ من

پا نہادن۔ قدم رکھنا — سوتہ دلی۔ سوختہ دلی

ترجمہ:۔ بہار آئی ہے باغ میں ہر طرف پھول کھل رہے ہیں، ہر ٹہنی پر ہزاروں بلبلیں نغمہ سرا ہیں (لیکن) میں، ہر کیاری پر پاؤں نہیں رکھ سکتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی مجھ سے بھی زیادہ سوختہ دل نہ ہو۔

تشریح:۔ ہوا چاروں طرف اقصائے عالم میں پکار آئی
بہار آئی بہار آئی بہار آئی بہار آئی

خزاں ختم ہوتی ہے تو کائنات میں چاروں طرف بہار کی آمد آمد ہوتی ہے کائنات کا حسن پورے نکھار پہ ہوتا ہے۔ باغ و بہار کی رنگینیاں ان کا دل کھینچنے لگتی ہیں۔ کلیاں کھلتی ہیں، غنچے چٹکتے ہیں۔ پھول مسکراتے ہیں، لالہ و یاسمین، گلاب و نرگس مہکتے ہیں۔ پھولوں کا یہ تبسم اور درختوں کا یہ رقص انسان تو انسان پرندوں کو بھی مست کیے دیتا ہے مرغانِ خوشنوا نغمے الاپتے ہیں۔ بلبلیں جھوم جھوم کر ترانے سناتی ہیں۔ قدرت کی صناعی، فطرت کی رعنائی شاعر کو متاثر کرتی ہے۔ مگر وہ کیاریوں میں گلگشت نہیں کرتا۔ کیونکہ

اسے یہ کیاریاں دل جلوں سے بنی نظر آتی ہیں۔ یہی مضمون خیام نے اس رباعی میں پیش کیا ہے ؎

ہر سبزہ کہ بر کنار جوی رستہ است — گوئی زلب فرشتہ خوی رستہ است
ہاں بر سر سبزہ پا بخواری ننہی — کاں سبزہ کہ خاک لالہ روی رستہ است

غالب کا یہ شعر بھی اسی مضمون کا حامل ہے ؎

سب کہاں! کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

رباعی نمبر ۱۶:۔

مو۔ من — ظرف۔ برتن
آمدستم۔ آمدہ ہستم۔ آمدہ ام — الفی۔ ایک ہزار
الف قدے۔ کشیدہ قامت۔ دراز قد

ترجمہ۔ میں وہ برتن ہوں کہ سمندر میں سما گیا ہوں۔ وہ نقطہ ہوں کہ حرف میں آگیا ہوں۔ ہزار سال کی مدت میں ایک کشیدہ قامت (بزرگ شخص) نمودار ہوتا ہے۔ میں وہی کشیدہ قامت ہوں جس کا ظہور ہزار برس میں ہوا ہے۔

تشریح:۔ دل ہر قطرہ میں ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اہل تصوف کا یہ نظریہ ہے کہ کائنات میں ذاتِ الٰہیہ کے سوا کوئی اور ذات نہیں۔ باقی جو چیزیں نظر آتی ہیں وہ صفاتِ خداوندی کے مختلف مظاہر ہیں۔ ہر چیز میں اس کی ذات جلوہ ریز ہے۔ ستاروں کی گردش اجزائے عالم کی کشاکش، مہتاب کی ضو فشانی۔ آفتاب کی درخشانی، سب میں اسی کا پرتو ہے۔ انسان بھی اسی کی ذات سے علیحدہ نہیں۔ ذاتِ باری تو ایک بیکرِ بے کراں ہے اور انسان اس بحر میں ایک قطرہ ہے۔

دوسرے لفظوں میں انسان خود ایک بحر ہوا۔ اور یہ بحر جسم خاکی میں خود بمنزلہ ایک برتن یا کوزہ کے ہے سما گیا ہے۔ ویسے تو ہر انسان نائبِ الٰہی اور خلیفۃ الارض ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں بھی بزرگ لوگ بقول اقبال دیدہ ور صدیوں بطاہر ہوتے ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مذکورہ بالا رباعی میں بابا طاہر نے اپنی بزرگی کا دعویٰ کیا ہے اور ان کی بزرگی میں قرار واقعی کسی کو کلام نہیں

رباعی نمبر ۱۷:۔ صفہ ۹۳

مو	من	آذرین	آتشی
بسوجم	بسوزم	برہم زنم بال	اگر میں پھڑپھڑاؤں
کشہ	کشد	بال	پر
تمثال	تصویرکشی کرنا	خونہ	خانہ

ترجمہ:۔ وہ آتشی پرندہ ہوں کہ اگر اپنے پر پھڑپھڑاؤں تو اسی دم دنیا کو جلا دوں اور اگر مصور میری تصویر دیوار پر بنائے۔ تو اپنی تصویر کی تاثیر سے گھر کو جلا کر راکھ کر دوں۔

تشریح:۔ اس رباعی میں انسان کے فطری سوز و گداز کا ذکر ہے شاعر کے وجود میں یہ سوز و گداز اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ وہ سراپا آگ بن گیا ہے اس کا قرب گویا آگ کا قرب ہے وہ اگر چاہے تو تمام دنیا کو درہم برہم کر سکتا ہے بلکہ اسے تو یہاں تک دعویٰ ہے کہ اگر کوئی مصور اس کی تصویر بنا دے تو اس تصویر میں بھی اتنی حرارت ہوگی کہ وہ کم از کم جہاں بنائی گئی ہو، اس جگہ اور اس کے آس پاس کے ماحول کو جلا کر راکھ کر دے کم و بیش ایسا ہی مضمون غالب کے اس شعر میں ہے۔

عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

رباعی نمبر ۱۸۔

دلبرہ ۔ دلبر است دمہ ۔ نام است

دلہ ۔ دل است آمیتہ ۔ آمیختہ ۔ ملا ہوا

ندونم ۔ ندانم کہ ۔ کہ است، کیست؟

کردمہ ۔ کدام است ۔ کون ہے ۔ کونسا ہے؟ دیرم ۔ دارم

ترجمہ :۔ اگر دل ہی دلبر ہے تو پھر دلبر کون ہے؟ اور اگر دلبر ہی دل ہے تو پھر دل کیا شے ہے؟ دونوں آپس میں اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ ان میں دل کون سا ہے اور دلبر کون ہے؟۔!

تشریح :۔ اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے

حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں (غالب)

ہستیٔ انسان اپنی اصل سے ملی ہوئی ہے ۔ وجودِ مطلق کی صفات جب اضافی جسم اختیار کر لیتی ہیں تو وہ مخلوق کے روپ میں نظر آتی ہیں۔ جس طرح ایک دھاگے میں گرہیں لگا دی جائیں تو ظاہر بین آنکھوں کو گرہوں کا وجود جداگانہ دکھائی دیتا ہے لیکن حقیقت میں ایک ہی دھاگہ ہوتا ہے ۔ جو مختلف صورتوں میں نظر آتا ہے یہی حال انسان کا ہے اس نے تمیز کے لئے ہر چیز کا الگ الگ نام رکھ دیا ہے اور من و تو کے الفاظ سے یہ امتیاز پیدا کیا گیا ہے ورنہ دراصل دل اور دلبر ایک ہی ہیں دوئی جو نظر آتی ہے وہ باطن کے بھینگے پن کا نتیجہ ہے۔

بقول ابوسعید ابوالخیرؒ

ہستی کہ باصلِ خویش وحدت دارد در دیدۂ احول تو کثرت دارد

یہی وجہ ہے کہ جب سالک تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب کے ذریعے یہ بلند مقام حاصل کر لیتا ہے تو یہ حقیقت مکشوف ہو جاتی ہے عاشق و معشوق اور طالب و مطلوب ایک ہی ذات کے دو نام ہیں اس مقام پر پہنچ کر ہی وہ انا الحق کا نعرہ لگاتا ہے

اور سبحانی ما اعظم شانی کی صدا بلند کرتا ہے من و تو کے امتیازات خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ اور دل و دلبر کا فرق نہیں رہتا۔ ؎

من تو شدم - تو من شدی من جان شدم تو تن شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

رباعی نمبر ۱۹

مائلستم - مائل ہستم دلستم - دل ہستم
منعم - منع مرا میرون - میران
سو - من قافلستم - قافلہ ہستم

ترجمہ :- اگر میں کسی حسین کے چہرے پر فریفتہ ہوں تو مجھے مت روکو اس لئے کہ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ اے ساربان! خدا کے لئے ذرا (اونٹ کو) آہستہ چلا۔ کیونکہ میں اس قافلے سے چھوٹ کر پیچھے رہ گیا ہوں۔

تشریح :- من کہ در سینہ دلی دارم و شیدا چہ کنم ؟
بیل بہ لالہ رخاں گر نکنم تا چہ کنم ؟

حسن خواہ پیکر انسان میں ہو، خواہ مناظر فطرت اور مظاہر قدرت میں بلا کی کشش رکھتا ہے بڑے بڑے زاہد، مدبر اور دانش مند حسن کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے اردو میں کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
ان سے پوچھا چاہیئے کہ اتنے کیوں پیارے ہوئے

جہاں دوست کے نظارے میں شاعر اس قدر محو ہو گیا کہ اپنے ساتھیوں سے بہت پیچھے رہ گیا۔ چنانچہ قافلہ سالار سے قافلہ کو آہستہ چلانے کی استدعا کرتا ہے تاکہ اپنے ساتھیوں مل سکے ؎

تو دستگیر شو ای خضر پی خجستہ کہ من
پیادہ می روم و ہمرہان سوارہ اند

رباعی نمبر ۲۰ -

نسوجہ - نسوزد نبوہ - نبود

بسوجم - بسوزم بسوجونم - بسوزانم

ترجمہ :- اے سنگدل! تیرا دل ہماری حالت پر نہیں کڑھتا - ہاں اگر پتھر جلے تو کیا تعجب ہے چونکہ تیرا دل، دل نہیں بلکہ پتھر ہے اس لئے کسی کے درد سے متاثر نہیں ہوتا مگر میں تو جلوں گا اور اس طرح سے جلوں گا کہ تیرے دل میں بھی محبت کی آگ بھڑک اٹھے کیونکہ آگ میں گیلی لکڑی تنہا نہیں جلتی اس کے ساتھ کچھ سوکھی لکڑیاں بھی جلانی پڑتی ہیں پس چونکہ تو بمنزلہ چوب تر ہے اور میں تیرے دل میں بھی آگ لگانا چاہتا ہوں - اس لئے کہ میں چوب خشک کی مانند ہوں میں خود بھی جلوں گا تاکہ اس طرح ہی تیرے دل میں بھی محبت کا شعلہ بھڑک اٹھے -

الفت کا جب مزا ہے کہ ہوں وہ بھی بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

صفحہ ۲۰

رباعی نمبر ۲۱

دیرم - دارم گیژ - گیج بمعنی پریشان خاطر

دیژہ - دیژہ است اور دیژ جو کہ دراصل دیج ہے، گیج کا تابع مہمل ہے جیسے پانی وانی میں وانی پانی کا تابع مہمل ہے -

سیلابہ خیشرہ - سیلاب خیزاست

سوژہ - سوزد

ریژہ - ریزد

بی - بود

ترجمہ :- میرے پہلو میں ایک ایسا دل ہے جو تیرے عشق میں پریشان اور سرگرداں ہے پلک جھپکتے ہی آنسوؤں کا سیلاب امڈ آتا ہے عاشق کا دل گیلی لکڑی کی مانند ہے کہ اس کے دوسرے سرے سے خون بہتا ہے -

تشریح :- قاعدہ ہے کہ کم گیلی لکڑی جب جلتی ہے تو اس کے سرے سے جو کہ آگ میں نہیں ہوتا - لکڑی کا عرق نکلتا ہے اسی طرح ایک عاشق کا دل جو کہ چوب تر کی مانند

ہے جب ایک طرف سے جلتا ہے تو دوسری جانب سے آنسوؤں کی شکل میں اس کا خون بہتا ہے
دل کا خون سرچشمہ ہے اور آنسو خون ہی کی ایک شکل ہیں رنگ کی تبدیلی کیمیائی عمل کا
نتیجہ ہے جو خون کے دل سے آنکھوں تک پہنچنے کے دوران جسم کے اندر ہوتا ہے
خون اور آنسوؤں کے اس تعلق کے پیش نظر شاعر دل کو بھی آنکھوں سے بہا دیتے ہیں
مثلاً۔

دل بھی آخر کو قطرہ خون تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہو گا!

رباعی نمبر ۲۲۔

نموڈ نماند دینم - بینم
نمویں نمایند

ترجمہ :- تیرے بغیر میرا دل دم بھر بھی خوش نہیں رہتا۔ اگر تجھے دیکھ لوں تو غم نہیں رہتا
اگر میرے دل کا درد تقسیم کر لیا جائے تو دنیا میں کوئی دل درد سے خالی نہیں رہے گا

تشریح :- رنج و غم درد والم حسرت و ارمان رہے
خانہ دل میں مکیں میرے یہ مہمان رہے
نالہ و آہ و فغاں یاس و تمنا افسوس
میرے ہمدرد میرے دل کے نگہبان رہے

عاشق کے لئے تو معشوق ہی سب کچھ ہے دیدار محبوب اور وصال محبوب ہی
اس کے دل کو خوش کر سکتے ہیں ورنہ رنج والم میں مبتلا رہتا ہے خواب و خور حرام
ہو جاتے ہیں کائنات کی رنگینیاں بے کیف نظر آتی ہیں اسے نہ پھولوں کا قہقہہ بھلا لگتا ہے
نہ غنچوں کا تبسم بھاتا ہے آبشاروں کے دلنواز نغمے بہاروں کے مسحور کن مناظر پرندوں
کے روح پرور ترانے، ہوا کے عنبر آفریں جھونکے سب اُسے بے کار دکھائی دیتے
ہیں۔ اسے تو صرف محبوب سے دلچسپی ہے اس کا دیدار ہو جائے تو مردہ جسم میں جان
پڑ جائے۔ چونکہ ہ

دردِ مندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست

اس موضوع پر کسی لکھنوی شاعر کا شعر بھی قابلِ ملاحظہ ہے۔

عناب لب، لعاب دہن، شربتِ وصال
نسخہ یہ چاہیئے تیرے بیمار کے لئے

رباعی نمبر ۲۳۔

ترجمہ:۔ اس کی زلفوں سے جو ہوا آتی ہے مجھے سنبل کی خوشبو سے زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے جب رات کو اس کے تصور سے ہمکنار ہوتا ہوں تو صبح کو میرے بستر سے پھولوں کی خوشبو آتی ہے۔

تشریح:۔ معشوق عاشق کو جان سے پیارا ہوتا ہے اس لئے اسے معشوق کی ہر چیز پیاری لگتی ہے حتیٰ کہ اسے وہ شئے بھی بھلی معلوم ہوتی ہے جو معشوق کے ساتھ ذرا بھی تعلق رکھتی ہو چنانچہ ہوا عاشق کو اس لئے اچھی لگتی ہے کہ وہ محبوب کی کاکل مشکیں سے مس ہو کر آتی ہے اس سے عاشق کے مشام جان معطر ہو جاتے ہیں۔

خوشبو سی بھینی بھینی فضاؤں میں بس گئی
یہ کس نے گیسوؤں کو سنوارا ہے آج کل

معشوق کے حسن و جمال اور رنگ و روپ جیسی کوئی چیز عاشق کو نظر نہیں آتی چنانچہ وہ بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے ؂

تیرے رخسار و گیسو کو بتا تشبیہ دوں کیونکر
نہ ہے لالہ میں رنگ ایسا نہ ہے سنبل میں بو ایسی

معشوق کا وجود تو سحر مجسم ہے لیکن اس کا تصور عاشق کے لئے سحر آگین ہے چنانچہ اس تصور کو ساتھ لے کر رات کو جب وہ سوتا ہے تو صبح بستر اسے خوشبوؤں میں بسا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

رباعی نمبر ۲۴

کوہساروں ۔ کوہساراں   بی ۔ بود

بنوشہ - بنفشہ　　　کنارون-کناراں - کناروں
کرم - کنم　　　گلعذارون-گلعذاران - پھول جیسے
رخساروں والے خوبرو

ترجمہ:- گل لالہ کوہساروں پر ہفتہ بھر سے زیادہ نہیں رہتا بنفشہ ندی کے کنارہ پر ایک ہفتہ اپنی بہار دکھاتا ہے میں شہر بشہر یہ اعلان کروں گا کہ حسینوں کی وفا ایک ہفتہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔

تشریح:- شاعر معشوق کا ستایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ معشوق نے اس کے ساتھ وفا کی لیکن یہ وفا بہت جلد جفا میں بدل گئی گویا وہ لالہ کوہسار اور بنفشہ جوئبار کی طرح ناپائدار تھی۔ عاشق اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ معشوق کی وفا مستقل ہے لیکن جب وہ عارضی ثابت ہوئی تو اسے تکلیف ہوئی خود تو اس نے چوٹ کھالی لیکن اپنے ہم جنسوں کو اس چوٹ سے بچانے کے لئے وہ شہر شہر اور قریہ قریہ منادی کرنا چاہتا ہے کہ حسینوں سے کوئی دل لگانے کی کوشش نہ کرے اور اگر کوئی ایسی غلطی کر بیٹھا ہے تو ان پر اعتماد نہ کرے چونکہ حسن والے فریبی ہوتے ہیں ان میں وفا کا وجود بہت عارضی ہوتا ہے وہ اپنی دلکش اداؤں سے پہلے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا کر ان کا دل اڑاتے ہیں اور جب لوگ ان کے نام کی مالا جپنے لگتے ہیں تو وہ کسی اور سے آنکھیں لڑانے لگتے ہیں۔

دل لے ہی چکے ناز سے، شوخی سے ہنسی سے
اب ان کی بلا آنکھ لڑاتی ہے کسی سے

صفحہ ۹۵

رباعی نمبر ۲۵

آذرین - آتشین　　　بی - بدرد
سوتہ دل - سوختہ دل　　　تہ - تو
سوجم - سوزم　　　چنوں - چنیں

ترجمہ:- میں وہ شمع ہوں، جس کے آنسو شعلہ زا ہیں جو سوختہ دل ہوتا ہے کیا اس کے

آنسو ایسے (آتشیں) نہیں ہوتے۔ میں ساری رات جلتا ہوں تیری وجہ سے میرے شب وروز یوں گزرتے ہیں۔

تشریح:۔ عشق نے دو بڑے مرحلے ہوتے ہیں ایک ہجر اور دوسرا وصل۔ وصل کی سعادت تو عاشق کو بہت کم ہی نصیب ہوتی ہے لیکن ہجر کی صعوبت کا ہر وقت سامنا رہتا ہے ہجر ایک بھٹی کی مانند ہے جس میں عاشق کا دل تپ کر سونا بن جاتا ہے اور اس میں جذبہ عشق کی صداقت اور شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ بقول

عشق کی آگ میں جل کر یہ فنا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

مذکورہ رباعی میں عاشق کو ہجر کی صعوبتیں درپیش ہیں اس کا جذبہ عشق ہجر کی آگ میں جل میں صداقت وشدت کے مرحلے تک پہنچ گیا ہے چنانچہ اشکوں کی شعلہ باری اور دن رات کی آہ وزاری کے ذریعے محبوب یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ وہ عاشق صادق ہے محبوب اس کا امتحان نہ لے بلکہ عشق کے دوسرے مرحلہ وصل سے ہمکنار کر دے۔

رباعی نمبر ۲۶۔

بتیہ۔ بے تو۔ تیرے بغیر   آید۔ آید

شو وروز۔ رات دن۔ شو وروز کی بجائے   نخل۔ درخت

شو وروز طباعت کی غلطی ہے   بی بر۔ بغیر پھل کے

ترجمہ:۔ تیرے فراق میں میری نمناک پلکوں سے آنسو گرتے ہیں تیرے بغیر میری امیدوں کا درخت بے ثمر ہے تیرے ہجر میں رات دن خانہ عزلت میں بیٹھا ہوں تاکہ یہ زندگی ختم ہو جائے۔

تشریح:۔ مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقول حضور

فراق یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو

محبوب کی جدائی عاشق کو خون کے آنسو رلا رہی ہے اس کے دل میں کرب وبلا کا دریا

موجزن ہے اور اس کے شب و روز بڑی بے قراری میں گزر رہے ہیں ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اسے محبوب کے دیدار یا وصال کی امید بھی نہیں چنانچہ کوئی چارۂ کار پا کر وہ گوشہ نشین ہو گیا ہے اور اب خیال دوست سے اپنا جی بہلانے کی کوشش کر رہا ہے

روز آتا ہے میرے دل کو تسلی دینے
تجھ سے تو دشمن جاں تیرا خیال اچھا ہے

لیکن وہ جانتا ہے کہ یہ جھوٹی تسلیاں ہیں اس لئے وہ اس لمحہ کا منتظر ہے کہ کب موت آئے اور کب اس کی دکھ بھری زندگی کا خاتمہ ہو سکے

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

رباعی نمبر ۲۷۔

ترجمہ:۔ میرے دل میں سدا آگ اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی رہتی ہے میرا خم عیش خونِ جگر سے لبریز رہتا ہے۔ اگر میرے مرنے کے بعد میری قبر پر تیرا گزر ہو گا تو میں تیری خوشبو سے دوبارہ جی اٹھوں گا۔

تشریح:۔ عاشق کا دل جذبہ عشق سے سرشار ہے اس جذبے میں اتنی حرارت ہے کہ اسے یوں محسوس ہوتا ہے گویا دل میں آگ لگی ہوئی ہے اس کی آنکھیں فراق محبوب میں روتی رہتی ہیں اس عالم میں عیش و نشاط کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا چنانچہ اسے اب نشاط انگیز کی بجائے خونابہ جگر پی پی کر گزارہ کرنا پڑ رہا ہے عاشق کے لئے خونابہ جگر یا خون دل قوت لایموت کا کام بھی کرتا ہے اور ان کی ظلمت بدوش زندگی میں چراغاں کا باعث بھی ہوتا ہے۔ مثلاً۔

ہم سے خجل ہے چاند ستاروں کی روشنی
بیٹھے ہیں خون دل سے چراغاں کئے ہوئے

عاشق کو عشق کی صداقت اور شدت کا اتنا احساس ہے کہ وہ یہ دعوے کرتا ہے کہ اگر اس کا محبوب مرنے کے بعد بھی اس کی قبر پر آ جائے تو دیدار کے وفور اشتیاق میں دوبارہ جی اٹھے گا۔

رباعی نمبر ۲۸

تازہ خیز ۔ نوخیز ۔ کمسن ۔ کم عمر — سرمہ ریز ۔ سرگین
طاہر ۔ بابا طاہر عریاں ہمدانی کا تخلص — بچشون ۔ بچشمان
مو ۔ من

ترجمہ:۔ میرے کم سن محبوب تو کدھر ہے؟ میرے سرگین آنکھوں والے معشوق تو کہاں ہے؟ طاہر کا دم (اس وقت) سینے میں اٹکا ہوا ہے اے پیارے محبوب تو (اس) جانکنی کے وقت تو کہاں ہے!

تشریح:۔ عاشق کا آخری وقت قریب آ گیا ہے اس کا دم سینے میں اٹکا ہوا ہے لیکن وہ مرنا نہیں چاہتا ۔ کیونکہ اُسے دیدار محبوب کی حسرت ہے اور یہ حقیقت ہے کہ مرنے والے کی جان اس وقت تک جسم سے نکلتی جب تک اس کی آخری خواہش پوری نہیں ہو جاتی عاشق کی آخری خواہش یہ ہے کہ محبوب کے رخ انور کا جلوہ نظر آجائے لیکن محبوب پاس نہیں ہے کہ دیدار کر سکے چنانچہ گڑ گڑا کر وہ یہ دعا مانگ رہا ہے اور رو رو کر اپنے محبوب کو پکار رہا ہے کہ میرے سرگین چشم محبوب اے دل و جان سے زیادہ پیارے معشوق اس وقت تو کہاں ہے آ دیکھ کہ تیرے عاشق زار کی جان نکلنے والی ہے کیا تو اپنے عاشق صادق پر آتنی عنایت نہ کرے گا کہ مرتے وقت اس کی آرزوئے دیدار پوری کر دے میں نے اپنا تن من دھن سب کچھ تیرے عشق پر نچھاور کر دیا ہے زندگی بھر تیرے نام کا ورد کرتا رہا گو میری زندگی میں مجھے یہ سعادت نصیب ہو سکی کہ تیرا دیدار کر سکتا لیکن اب جب کہ موت سر پر کھڑی ہے اور دوبارہ جینے کی امید نہیں تو للٰہ میری حسرت دیدار پوری کر دے اور رخ پر نور کی جلوہ پاشیوں سے میری آنکھوں کو خیرہ کر دے ایسا نہ ہو کہ مجھے اب بھی مایوس ہونا پڑے

دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے
یہ کون جا رہا ہے شب غم گزار کے

ہو سکتا ہے کہ میری سچی اور بے لوث محبت تیرا دامن کھینچ لے اور تجھے میری جانب آنا پڑے

لیکن اگر تو نے آنے میں دیر کی اور میری جان نکلنے کے بعد آیا تو کوئی فائدہ نہ ہوگا بقول امیر خسروؔ

بلبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازآں کہ من نہ مانم بچہ کار خواہی آمد

صف ۹۶

رباعی نمبر ۲۹۔

تہ ۔ تو | بمردون ۔ بمردان
ندونی ۔ ندانی | ہیہات ۔ افسوس
سہولت ۔ آسمان

ترجمہ:۔ اے شخص تو نے سموات کا علم نہیں پڑھا میخانے کے اسرار و رموز نہیں سمجھے تو اپنے نفع ونقصان کو کب سمجھ سکتا ہے افسوس تو اہل اللہ کے درجات تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟

تشریح:۔ اہل اللہ کے مقام تک پہنچنا آسان نہیں اس لئے تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کی ضرورت ہے ریاضت و مجاہدہ کرنا پڑتا ہے نفسانی خواہشات و علائق دنیوی سے کنارہ کش ہونا پڑتا ہے معرفت نفس اور عرفان ذات کے مختلف مراحل طے کرنے پڑتے ہیں تصوف کی اصطلاح میں میخانہ ذکر و فکر گاہ صوفیاں کو کہتے ہیں یعنی وہ جگہ جہاں خدا رسیدہ بزرگ ذکر و فکر الٰہی میں معروف ہوتے ہیں اور غیر اللہ سے رخ موڑ کر اللہ سے لو لگاتے ہیں مذکورہ رباعی میں بابا طاہر دنیا دار شخص کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اگر اہل اللہ کے درجات تک پہنچنے کی خواہش ہے تو خود کو پہچان خدا سے لو لگا اور کائنات کے اسرار و رموز سمجھنے کی کوشش کر ان اوصاف کے بغیر تیری رسائی اہل اللہ کے مراتب تک نہیں ہو سکتی بلکہ تو اپنے معاملات کو صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتا اور اپنے نفع و نقصان میں تمیز نہیں ہاں اگر تو ریاضت و مجاہدہ کر کے اپنے باطن کو پاک اور صاف کرے تو اس مقام کو پا سکتا ہے بقول اقبالؔ۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

مولانا جلال الدین رومی

محمد نام جلال الدین لقب عرف مولانائے روم۔ آپ کا شجرۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے ملتا ہے۔

آپ کے والد محمد حسین خطیبی، جو بہاءالدین ولد کے نام سے مشہور ہوئے۔ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے۔ درس و تدریس اُن کا پیشہ تھا۔ ان کے علم و فضل کی وجہ سے خوارزم کے حکمران سلطان علاؤالدین محمد کو آپ سے بڑی عقیدت تھی جسب روایت آپ خوارزم شاہ کے داماد بھی تھے اور اکثر علاءالدین آپ کی خدمت میں رہا کرتا تھا۔

مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ "ایک دن علاءالدین خوارزم شاہ مولانا کے پاس گیا تو ہزاروں کا مجمع دیکھا۔ خوارزم شاہ نے حد سے زیادہ بھیڑ بھاڑ دیکھ کر امام رازی سے کہا کہ کس غضب کا مجمع ہے۔ امام صاحب جو مجمع کے منتظر تھے، فرمایا! ہاں! - اگر ابھی سے تدارک نہ ہوا تو پھر مشکل پڑے گی۔ خوارزم شاہ نے امام کے اشارے سے خزانہ شاہی کی کنجیاں بہاءالدین کے پاس بھجوا دیں اور کہلا بھیجا کہ اسباب سلطنت سے صرف یہ کنجیاں ل میرے پاس رہ گئی ہیں وہ بھی حاضر ہیں، مولانا نے فرمایا اچھا جمعہ کو وعظ کہہ کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ جمعہ کے دن شہر سے نکلے۔ خوارزم شاہ کو خبر ہوئی تو بہت پچھتایا اور حاضر خدمت ہو کر منت سماجت کی۔ مگر ان کی غیور طبیعت نے اپنے عزم کو نہ توڑا۔"

چنانچہ آپ اپنے صاحبزادے جلال الدین کے ساتھ بغداد کے راستے حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ مولانا کے لڑکے سلطان ولد کی تصنیف کی ہوئی مثنوی کے بعض اشعار اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ یہ سفر فتنۂ مغول کے ظہور کے وقت اختیار کیا گیا تھا۔ اس لیے ممکن ہے کہ یہ سفر ۶۱۷ھ کے قریب ہی اختیار کیا گیا ہو۔

کہتے ہیں کہ ۶۱۷ھ میں ہی جبکہ مولانا روم کی عمر ۱۲ سال کی تھی۔ سفر کے دوران میں ان کا گزر نیشاپور کے علاقہ سے ہوا۔ اور یہاں شیخ مولانا بہاء الدین نے شیخ فرید الدین عطار کی بھی زیارت کی۔ انھوں نے جلال الدین کو گوہر تابندہ جانتے ہوئے سینے لگا کر دعا دی اور انہیں مثنوی "اسرار نامہ" تحفہ کے طور پر پیش کی۔ بعد ازاں آپ حج بیت اللہ کے لئے گئے مشرف بہ حج کے بعد آپ ملاطیہ پہنچے اور اس سال میں چار سال تک اقامت گزیں رہے۔ اس کے بعد لارندہ آئے۔ جو اس زمانہ سلاجقہ ایشیائے کوچک کے بارھویں بادشاہ سلطان علاء الدین کیقباد کی دعوت پر ان کے پایہ تخت قونیہ پہنچے۔ یہ بادشاہ بڑا علم پرور تھا۔ یہاں بہاء الدین ولد جو ظاہری اور باطنی علوم میں بہت عالی مرتبہ تھے۔ لوگوں میں رشد و ہدایت اور علوم و فضائل کی نشر و اشاعت میں مشغول ہو گئے۔ خود علاء الدین کیقباد آپ سے غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے۔ مولانا جلال الدین نے ابتدائی تعلیم و تربیت اور ارشاد و ہدایت کی تعلیم اپنے والد سے ہی حاصل کی۔

ابھی مولانا نے اپنے والد کے متاع بے بہا سے مکمل طور پر فائدہ نہ اٹھایا کہ ان کے والد ۶۲۸ھ اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ۶۲۹ھ میں سید برہان الدین محقق ترمذی جو بہاء الدین ولد کے شاگرد تھے اور اپنے دور میں زمرہ خواص اور اولیائے اہل طریقت میں شمار کئے جاتے تھے، قونیہ آئے۔ مولانا جلال الدین رومی نے ان کی جناب درسی سے کسب فیض کیا۔ اور پورے ۹ سال تک مردِ عارف کے ارشاد کے تحت زندگی بسر کی۔ اس کے سیاست۔ اخذِ معرفت اور اصحاب طریقت کا فیض صحبت اٹھانے کے لیے شام کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ عرصے تک حلب اور دمشق میں اقامت گزیں رہے۔ اور مقاماتِ بلند حاصل کئے۔ مثنوی تجارت اور علمی اکتسابات کی تکمیل کے بعد آپ قونیہ واپس آگئے۔ ان دنوں سید برہان الدین انتقال کر چکے تھے۔ چنانچہ سلطان کے حکم سے اپنے والد کی طرح علوم شرعی کی تدریس و تعلیم میں مشغول ہو گئے۔

گردشِ روزگار سے ایک دن اوتادِ زمانہ اور نوادرِ دوراں سے آپ کی ملاقات ہو گئی

اور اس ملاقات نے مولانا جلال الدین کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ یہ شمس الدین بن علی بن ملک داد تبریزی کی ذات تھی، جو کہ اپنے زمانے کے مجذوب پیروں میں ایک اہم مقام کے مالک تھے۔ اور اپنے سانس کی گرمی۔ اپنی ذات میں ایک زبردست کشش اور اپنے بیان میں غیر معمولی اثر رکھتے تھے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک راہ پیمائی کر کے ۶۴۲ھ میں مولانا جلال الدین کی تلاش میں قونیہ چلے آئے۔ ایک ہی نظر میں جلال الدین کے دل میں عشق و محبت کا شعلہ بھڑکا۔ اور انہیں اپنا معنوی شیفتہ بنا لیا۔ اور وہ آخر عمر تک اُن کے روحانی پیشوا اور مرشد بن گئے۔ جس ادب اور احترام کے ساتھ مولانا جلال الدین نے اپنے اشعار و اقوال میں اپنے آپ کو شمس تبریزی سے نسبت دیتے ہیں۔ ان سے بالکل ظاہر ہے کہ اُن کی محبت نے مولانا جلال الدین کے دل پر کتنا اثر کیا تھا۔ چنانچہ ذیل کے اشعار اس بات کے بین دلیل ہیں۔

شمس تبریزی کہ نور مطلقست
آفتاب است و از انوار حقست

کز برای حق صحبت سالہا
باز گو رمزی ازاں خوش حالہا

جیسا کہ ان اشعار سے بیان کیا گیا ہے۔ مولینا جلال الدین نے مثنوی کی حکایتیں کی شرح اور تصوف، معانی کے بیان کرنے کے لئے اپنے پیر و مرشد کو ہمیشہ یاد رکھا اور ان کی یاد سے ایک جوش اور ایک وجد و طرب کی کیفیت ان پر طاری ہو گئی ہے۔ مولینا نے ایک مدت اس عارف سوختہ و سوزندہ کے ساتھ خلوت اور ان کے فیض صحبت میں بسر کی۔ کچھ دنوں کے لئے آپ کے مرشد نے دمشق کا سفر اختیار کیا لیکن پھر قونیہ واپس آ کر ارشاد و تحریک اور مولینا کی آتش عشق کو شعلہ در بنانے میں مشغول ہو گئے کہا جاتا ہے کہ شمس تبریزی نے مقام وجد و شوق میں عنانِ اختیار اپنے ہاتھ سے دے دی تھی اور مضمرات درون کو برملا کہنے لگے تھے۔ عوام کے سطحی عقائد پر تنقید کرنے میں بے باک ہو گئے تھے اور اسرار درون فاش کرنے لگے تھے۔ ان کی سماع و طرب

کی محفلیں بے باکانہ منعقد ہونے لگی تھیں۔ اِس لئے روایت ہے کہ اُن کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے تھے۔ ایک دن قونیہ کے عوام نے شورش کر کے ان کو مجمع عام میں قتل کر ڈالا۔ یہ واقعہ ۶۴۵ھ میں پیش آیا اور اس حادثہ میں مولانا کے سب سے بڑے فرزند بھی سخت زخمی ہوئے۔ اور زخموں سے جانبر نہ ہو سکے۔

لیکن غزلیات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ شمس ایک روز غائب ہو گئے اور مولینا دو سال تک شب و روز اپنے کعبہ مقصود کے فراق میں گھلتے رہے۔ ان کی تلاش اور جستجو میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا لیکن اُن کا پتہ نہ پا سکے۔ اس واقعہ کے بعد مولانا جلال الدین نے ریاضت اور عالم عرفان کے تجارت میں بہت اونچا مرتبہ حاصل کیا۔ اور اس مسلک کے سالکوں کے قطب مانے گئے اس گروہ کے مشائخوں کی رسم کے مطابق آپ نے بھی اپنے خلیفہ مقرر کئے۔ آپ کے پہلے خلیفہ صلاح الدین فریدین زرکوب ہوئے۔ مولینا نے اُن کی طرف خاص توجہ فرمائی۔ اور ان سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کی اس توجہ کی وجہ سے صلاح الدین زرکوب مولانا کے تمام مریدوں کے محسود بن گئے تھے۔ اس طرح زرکوب دس (۱۰) سال تک اس خدمت پر مامور رہے۔ ان کے بعد مولینا نے ۶۵۷ھ میں حسام الدین بن محمد بن حسن کو اپنی خلافت عطا کی۔ آپ مولینا کی زندگی میں گیارہ (۱۱) سال تک مولینا کے خلیفہ رہے۔ اور مولینا کی وفات کے بارہ (۱۲) سال تک آپ کے جانشین رہے۔ مولینا نے ۶۷۲ھ میں قونیہ میں وفات پائی۔ اپنے باپ کے پہلو ہی میں بادشاہِ وقت کے حکم کے مطابق دفن کئے گئے۔

حسام الدین مولینا کے خاص مریدوں اور پیروں میں تھے۔ اور آپ نے ان کی طرف خاص توجہ فرمائی۔ مولینا نے ان کے بارہ میں جو کچھ فرمایا ہے اس سے ظاہر ہے کہ آپ طریقت کے تمام مراحل طے کر چکے تھے۔ اُن کا قول اپنے پیر و مرشد کے حضور میں نہایت مقبول اور اثر پذیر تھا۔ چنانچہ یہ انہیں کی تشویق اور تحریک کا نتیجہ تھا کہ کتاب مثنوی جو کہ ایران کے ذوقِ عرفان کا شاہکار ہے، عالم وجود میں آئی۔ مولینا مثنوی کو کبھی کبھی "کتاب حسام" بھی کہہ کر خطاب کرتے ہیں اور مثنوی کو اسی بانسری سے تشبیہ

دیتے ہیں جو حسام الدین کے ہونٹوں سے بج رہی ہے۔ حسام الدین نے ۶۸۳ھ میں وفات پائی۔ آپ کی وفات کے بعد خلافت مولینا کے فرزند سلطان ولد کو ملی۔ اور وہ تیس ۳۰ تک یاران طریقت کے پیشوا رہے۔

اولاد: مولانا کے فرزند سلطان ولد جو بعد میں مولویوں کے پیشوا ہوئے خود بھی عارفانہ اور شاعرانہ ذوق رکھتے تھے۔ آپ نے تین مثنویاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن میں سب سے مشہور مثنوی ولد نامہ یا ولدی ہے۔ اس میں آپ نے اپنے والد اور دوسرے اولیاء کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ اور عربی مطالب و مقالات کی تفسیر کی ہے۔

سلطان ولد ترکی زبان سے بھی واقف تھے۔ انھوں نے ترکی زبان میں شاعری بھی کی ہے۔ اور ترکی ادبیات پر ان کا اثر بھی پڑا ہے۔ ترکی میں فارسی ادبیات سے ذوق پیدا کرنے والے مختلف عوامل میں ایک عامل آپ کی ذات کو بھی سمجھنا لازمی ہے آپ نے ۷۱۲ھ میں بمقام قونیہ وفات پائی اور اپنے باپ کے مزار کے پہلو میں دفن کئے گئے۔

مولینا کے دو فرزند تھے علاء الدین محمد اور سلطان ولد علاؤ الدین ولد کے متعلق مشہور رہے کہ انھوں نے شمس تبریز کو شہید کر دیا تھا۔ سلطان ولد فرزند اکبر تھے۔ علوم ظاہری و باطنی میں یگانہ روزگار تھے۔ حسام الدین چلپی جو مولینا کے بعد سجادہ نشین ہوئے تھے کی وفات کے بعد مسند فقر کو زینت بخشی۔

مولینا کے معاصرین:۔ اکثر تذکروں سے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مولینا اپنے زمانہ کے مشاہیر سے اکثر ملتے۔ لیکن تفصیلی حالات نہیں ملتے جس قدر پتہ لگتا ہے وہ یہ ہے کہ شیخ محی الدین اکبر سے دمشق میں ملاقات ہوئی۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب مولینا تحصیل علم میں مشغول تھے۔ اور ان کی عمر ۲۴ برس کی تھی۔ سپہ سالار لکھتے ہیں کہ مولینا جس زمانہ میں دمشق میں تھے محی الدین شیخ سعد الدین حموی، شیخ عثمان رومی اور شیخ صدر الدین قونوی سے اکثر صحبتیں رہتی تھیں۔ شیخ شہاب الدین سہروردی جو شیخ سعدی کے پیر تھے ان سے بھی مولانا کی صحبتیں رہیں۔

علامہ قطب الدین شیرازی محقق طوسی کے شاگرد رشید تھے "درۃ التاج" فلسفہ کی مشہور کتاب ان کی تصنیف ہے۔ وہ مولینا کی خدمت میں امتحان لینے کی غرض سے حاضر ہوئے اور حلقہ بگوش ہو کر گئے اس سے مولینا کے رتبہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اخلاق و عادات:۔ مولینا کے اخلاق و عادات کا تفصیلی ذکر کسی تذکرہ میں نہیں ملتا۔ لیکن جستہ جستہ جن باتوں کا علم ہو سکا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

مولینا جب تک تصوف کے دائرے میں نہیں آئے ان کی زندگی عالمانہ جاہ و جلال کی شان رکھتی تھی۔ ان کی سواری جب نکلتی تھی تو امراء اور طلباء کا ایک بڑا گروہ رکاب میں ہوتا تھا۔ سلاطین اور امرا کے دربار سے بھی ان کو تعلق تھا۔ لیکن سلوک میں داخل ہونے کے ساتھ یہ حالت بدل گئی۔ مولینا کی صوفیانہ زندگی شمس تبریز کی ملاقات سے شروع ہوتی ہے۔

ریاضت و مجاہدہ حد سے بڑھا ہوا تھا۔ روزہ اکبر رکھتے تھے۔ نماز کا وقت آتا تو فوراً قبلہ کی طرف مڑ جاتے۔ اور چہرہ کا رنگ بدل جاتا۔ نماز میں بہت استغراق ہوتا تھا۔ ایک غزل میں اپنی نماز کی کیفیت بیان کی ہے مقطع میں لکھتے ہیں ؎

بخدا خبر ندارم چو نماز می گذارم — کہ تمام شد کوعے کہ امام شد فلانے

مزاج میں حد درجہ قناعت اور زہد تھا۔ سلاطین اور امرا ہر قسم کے تحائف اور نقدی بھیجتے تھے لیکن مولینا اپنے پاس کچھ نہ رکھتے صلاح الدین زرکوب یا چلپی حسام الدین کے پاس بھجوا دیتے۔

فیاضی اور ایثار کا یہ حال تھا کہ کوئی سائل سوال کرتا تو عبا یا کرتہ جو کچھ بھی بدن پہ ہوتا اتار کر دے دیتے۔

باوجود عظمت و شان کے نہایت درجہ بے تکلف، متواضع اور خاکسار تھے۔ ایک دفعہ بازار میں جا رہے تھے لڑکوں کو دیکھا تو ہاتھ چومنے کے لیے آگے بڑھے۔ آپ کھڑے ہو گئے۔ لڑکے ہر طرف سے آتے اور ہاتھ چومتے جاتے۔ ایک لڑکا جو کسی کام میں

مشغول تھا۔ اس نے کہا مولینا ذرا ٹھہریئے میں کام سے فارغ ہو لوں۔ مولینا اس وقت تک وہیں کھڑے رہے کہ لڑکا فارغ ہو کر آیا اور دست بوسی کی عزت حاصل کی۔

سراج الدین قونوی بڑے رتبے کے فاضل تھے۔ لیکن مولانا سے ملال رکھتے تھے کسی نے ان سے کہا کہ مولینا کہتے ہیں میں تہتر دوں مذہبوں سے متفق ہوں۔ انھوں نے اپنے ایک مستعد شاگرد کو بھیجا کہ مولینا سے پوچھنا کہ کیا واقعی یہ آپ کا قول ہے اور اگر اقرار کریں تو ان کی خوب خبر لینا۔ اس نے بھرے مجمع میں مولینا سے سوال کیا آپ نے کہا ہاں میرا یہ قول ہے۔ اس نے مغلظ گالیاں دینی شروع کیں۔ مولینا نے ہنس کر فرمایا کہ جو آپ فرماتے ہیں میں اس سے بھی متفق ہوں۔ وہ شرمندہ ہو کر چلا گیا۔

تصنیفات:۔ مولینا کی تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

(۱) فیہ ما فیہ:۔ یہ ان کے خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً معین الدین پروانہ کو لکھے یہ کتاب بالکل نایاب ہے۔

(۲) دیوان:۔ اس میں قریباً پچاس ہزار شعر ہیں۔ چونکہ غزلوں کے مقطع میں عموماً شمس تبریز کا نام ہے۔ اس لیے عوام اس کو شمس تبریز ہی کا دیوان سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ نہایت فاش غلطی ہے۔

(۳) مثنوی:۔ یہی کتاب ہے جس نے مولینا کے نام کو آج تک زندہ رکھا اور جس کی شہرت اور مقبولیت نے ایران کی تمام تصنیفات کو دبا لیا ہے۔ اس کے اشعار کی مجموعی تعداد جیسا کہ کشف الظنون میں ہے ۲۶۶۶۶ ہے۔

مشہور یہ ہے کہ چھٹا دفتر مولینا نے ناتمام چھوڑا تھا اور فرمایا تھا ؎

باقی این گفتہ آید بے گماں | دردل ہر کس کہ باشد نور جاں

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے بیماری سے شفا پاکر خود اس حصہ کو پورا کیا تھا اور ساتواں دفتر لکھا جس کا مطلع یہ ہے ؎

اے ضیاء الحق حسام الدین سعید | دولتت پائندہ عمرت بر مزید

غرض مولینا کی تصنیفات میں سے آج جو کچھ موجود ہے۔ وہ دیوان اور مثنوی ہے

چنانچہ ان دونوں پر کچھ تبصرہ درج ذیل ہے۔

دیوان:۔ دیوان میں اگرچہ کم و بیش ۵ ہزار اشعار ہیں لیکن صرف غزلیں ہی غزلیں ہیں۔ قصیدہ یا قطعہ وغیرہ بالکل نہیں۔ مولانا کی شاعری کا دامن مدح سے بالکل پاک۔

اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ غزل کو ترقی دینے والوں کی فہرست سے مولینا کا نام خارج نہیں سکتا لیکن انصاف یہ ہے کہ غزل گوئی کی حیثیت سے مولانا کا سعدی اور عراقی سے کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا سپہ سالار نے نہایت تفصیل سے لکھا ہے کہ مولانا نے بضرورت اور بہ جبر شاعری کا شغل اختیار کیا تھا مولانا خود فرمایا کرتے تھے:" از بیم آنکہ ملول شوند شعری گویم۔ واللہ کہ من از شعر بیزارم و" ولایت ما و قوم ما از شاعری تنگ تر کارے نبود۔"

مولینا کی غزلیات کی چند ایک خصوصیات درج ذیل ہیں:۔

۱۔ ان کی اکثر غزلیں کسی خاص حالت میں لکھی گئی ہیں اور اس وجہ سے ان غزلوں میں ایک ہی حالت کا بیان چلا جاتا ہے۔ تمام غزلوں کی طرح ہر شعر الگ نہیں ہوتا۔ مثلاً ان کی ایک خاص حالت تھی کہ جوش اور معنی میں اکثر وہ رات بھر جاگا کرتے تھے۔ اس کو ایک غزل میں اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

دیدہ خوں گشت و خوں نمی خسپد | دل من از جنوں نمی خسپد
مرغ و ماہی ز من شدہ حیراں | کایں شب و روز چوں نمی خسپد

مثلاً نماز میں جوان پر بیخودی طاری ہوتی تھی۔ اس کو ایک غزل میں ادا کرتے ہیں ؎

چو نماز شام ہر کس بنہد چراغ و خوانے | منم و خیال یارے غم و نوحہ و فغانے
چو وضو از اشک سازم بود آتشیں نمازم | در مسجدم بسوزد چو بدو رسد اذانے
عجباً نماز مستاں تو بگو درست ہست کہ | کہ نداند او زمانے نہ شناسد او مکانے

۲۔ مولینا کے کلام میں جو وجد، جوش اور مستی پائی جاتی ہے اور وں کے کلام میں نہیں۔ وہ فطرۃً پر جوش طبیعت رکھتے تھے اور شمس تبریز کی صحبت نے اس نقشہ

کو اور تیز کر دیا۔

بڑی خصوصیت ان کے کلام کی یہ ہے کہ عشق اور محبت کے جوش میں عاشق پر جو خاص خاص حالتیں طاری ہوتی ہیں ان کو اس خوبی سے ادا کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے ان کی تصویر کھینچ جاتی ہے اور یہ شاعری کا سب سے بڑا کمال ہے مثلاً عاشق کو کبھی یہ حالت پیش آتی ہے کہ دفعتہً عین انتظار و شوق کی حالت میں معشوق سامنے آجاتا ہے عاشق بے اختیار ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کیا وہ آگیا۔ لیکن پھر غایت استعجاب سے کہتا ہے کہ نہیں نہیں وہ یہاں کہاں؟ پھر زیادہ غور سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ نہیں ضرور وہی ہے اس حالت کی تصویر مولانا نے کھینچی ہے

یار آمد کردر خلوتیاں ادوست دوست   دیدہ غلط می کند نیست غلط اوست اوست

۴۔ مولانا کے کلام میں جو جلال، ادعا، بیتابی اور بلند آہنگی پائی جاتی ہے وہ صوفیہ میں سے کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ مرزا غالب مولانا کے ایک شعر پر جو بقا کی حالت کا ہے سر دھنا کرتے تھے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند   فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

مثنوی :- فارسی شاعری کی ابتدا سلاطین کی مداحی اور ان کی تفریح خاطر سے ہوئی۔ اور یہی وجہ تھی کہ اصنافِ سخن میں سب سے پہلے قصائد وجود میں آگئے۔ قصائد کی ابتدا غزل سے کی جاتی تھی جس کو تشبیب کہتے ہیں۔ اسی تعلق سے غزل گوئی کا آغاز ہوا۔

آلِ سامان اور سلطان محمود کو یہ ذوق پیدا ہوا کہ ان کے آباء اجداد کے کارنامے نظم میں ادا ہوں تاکہ ضرب المثل کی طرح زبانوں پر چڑھ جائیں۔ اس بنا پر مثنوی کی ایجاد ہوئی۔ جو تاریخی واقعات ادا کرنے کے لیے اصنافِ سخن میں سے سب سے بہتر صنف۔ فردوسی نے اس صنف کو اس قدر ترقی دی کہ آج تک اس پر اضافہ نہ ہو سکا۔ لیکن کل اصنافِ شاعری کی ترقی جو اس وقت تک ہوئی تھی۔ واقعہ نگاری خیال بندی اور صنائع بدائع کے لحاظ سے تھی۔ ذوق اور کیفیت کا وجود نہ تھا۔ سب سے پہلے ابو سعید ابو الخیر نے رباعی میں تصوف اور طریقت کے خیالات ادا کیے حکیم سنائی

نے حدیقہ لکھی جو نظم میں تصوف کی پہلی تصنیف تھی۔ حدیقہ کے بعد خواجہ فریدالدین عطار نے متعدد مثنویاں لکھیں۔ جن میں سے مثنوی منطق الطیر نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ مثنوی مولانا روم اسی سلسلہ کی خاتم ہے۔ اس امر کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں کہ خواجہ عطار کی تصنیفات مولانا کے لیے دلیل راہ بنیں مولانا خود ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

ہفت شہر عشق را عطار گشت   ما ہماں اندر خم یک کوچہ ایم

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

عطار روح بود سنائی دو چشم او   ما از پس سنائی و عطار آمدیم

مثنوی کی تصنیف میں حسام الدین چلپی کو بہت دخل ہے اور درحقیقت یہ نایاب کتاب انہی کی بدولت وجود میں آئی۔ وہ مولانا کے مریدانِ خاص میں سے تھے اور مولانا اس قدر ان کی عزت کرتے تھے کہ جہاں ان کا ذکر کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ پیر طریقت اور استاد کامل کا ذکر ہے۔ مثنوی کے چھ دفتر ہیں۔ بجز دفتر اول ہر دفتر ان کے نام سے مزین ہے۔ جب مثنوی کا پہلا دفتر تمام ہوا تو حسام الدین چلپی کی بیوی نے انتقال کیا۔ اس واقعہ سے ان کو اس قدر صدمہ ہوا کہ دو برس تک پریشان اور افسردہ رہے۔ چونکہ مثنوی کے سلسلہ کے وہ بانی اور محرک تھے۔ اس لیے مولانا بھی دو برس تک چپ رہے۔ چنانچہ دفتر دوم میں لکھتے ہیں ؎

مدتے این مثنوی تاخیر شد   مہلتے بایست تا خوں شیر شد

چوں ضیاء الحق حسام الدین عنان   باز گردانید ز اوج آسمان

چھٹا دفتر زیر تصنیف تھا کہ مولانا بیمار ہو گئے اور مثنوی کا سلسلہ یک لخت بند ہو گیا مولانا کے صاحبزادے بہاء الدین ولد نے ترک تصنیف کا سبب دریافت کیا مولانا نے فرمایا کہ اب سفر آخرت درپیش ہے۔ یہ راز اب کسی اور کی زبان سے ادا ہو گا۔ چنانچہ اس سے عام لوگوں کو غلطی ہوئی کہ ساتواں دفتر مولانا کی تصنیف نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا کو صحت ہوئی اور انھوں نے خود چھٹا دفتر مکمل کیا۔

اور ساتواں بھی لکھا۔

مثنوی کی شہرت اور مقبولیت:۔ مثنوی کو جس قدر شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے، فارسی کی کسی کتاب کو آج تک نہیں ہوئی۔

صاحب مجمع الفصحاؔ نے لکھا ہے کہ ایران میں چار کتابیں جس قدر مقبول ہوئیں کوئی کتاب نہیں ہوئی۔ شاہنامہ، گلستان، مثنوی مولانا روم۔ دیوانِ حافظ۔ اگر ان چاروں کتابوں کا موازنہ کیا جائے تو مقبولیت کے لحاظ سے مثنوی کو ترجیح ہوگی۔ مقبولیت کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ علمائ وفضلا نے مثنوی کے ساتھ جس قدر اعتنا کی، اور کسی کتاب کے ساتھ نہیں کی۔

مقبولیت کا سبب:۔ کسی کتاب کی مقبولیت دو طریقوں سے ہوتی ہے۔ کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ سادگی اور صفائی اور عام دلآویزی کی وجہ سے پہلے وہ کتاب عوام میں پھیلتی ہے، پھر رفتہ رفتہ خواص بھی اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور مقبولِ عام ہو جاتی ہے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ کتاب عوام کی دسترس سے باہر ہوتی ہے اس لئے اس پر صرف خواص کی نظر پڑتی ہے۔ خواص کی توجہ اور اعتنا وتحسین کی وجہ سے عوام میں بھی چرچا ہوتا ہے، اور لوگ تقلیداً اس کے معترف اور معتقد ہوتے ہیں۔ مثنوی کی مقبولیت اس قسم کی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کی مقبولیت اور کسی کتاب کو حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

فارسی زبان میں جس قدر کتابیں نظم یا نثر میں لکھی گئی ہیں کسی میں ایسے دقیق، نازک اور عظیم الشان مسائل نہیں مل سکتے جو مثنوی میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ فارسی پر موقوف نہیں اس قسم کے نکات اور دقائق کا عربی تصنیفات میں بھی مشکل سے ہی پتہ لگتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر علماؔ اور اربابِ فن نے مثنوی کی طرف تمام اور کتابوں کی نسبت زیادہ توجہ کی۔ اور یہاں تک مبالغہ کیا ؎

مثنوی مولوی معنوی
ہست قرآں درزبانِ پہلوی

تو کچھ عجب نہیں۔

مفتی میر عباس صاحب مرحوم مثنوی کی مقبولیت کی ایک اور وجہ بتاتے ہیں۔ وہ مثنوی کے ذکر میں فرماتے ہیں ؎

در تصوف می شود شیریں کلام   زانکہ باشد در گنہ لذت تمام

مثنوی کی ترتیب :- مثنوی سے پہلے جو کتابیں اخلاق و تصوف میں لکھی گئیں ان کا انداز ہ یہ تھا کہ اخلاق و تصوف کے مختلف عنوان قائم کر کے اخلاقی حکایتیں لکھتے تھے، اور ان سے نتائج پیدا کرتے تھے۔ منطق الطیر اور بوستان کا یہی انداز ہ ہے۔ حدیقہ میں اکثر مسائل کو مستقل طور پر بھی بیان کیا ہے۔ لیکن مثنوی کا یہ انداز ہ نہیں۔ مثنوی میں کسی قسم کی ترتیب و تبویب نہیں۔ دفتروں کی جو تقسیم ہے وہ خصوصیت مضمون کے لحاظ سے نہیں، بلکہ جس طرح قرآن مجید کے پارے یا ایک شاعر کے متعدد دیوان ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ علمی اور اخلاقی تصنیفات کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ مستقل حیثیت سے مسائل علمی بیان کئے جائیں۔ دوسرے یہ کہ کوئی واقعہ اور افسانہ لکھا جائے۔ اور علمی مسائل موقع بر موقع اس کے ضمن میں آتے جائیں۔ دوسرا طریقہ اس لحاظ سے اختیار کیا جاتا ہے کہ جو لوگ روکھے پھیکے علمی مضامین پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کر سکتے وہ قصہ اور لطائف کی چاٹ سے اس طرف متوجہ ہوں۔ مولانا نے یہی دوسرا طریق پسند کیا اور فرمایا ؎

خوشتر آں باشد کہ سہر دلبراں   گفتہ آید در حدیث دیگراں

یہ امر یقینی ہے کہ مولانا نے حدیقہ اور منطق الطیر کو سامنے رکھ کر مثنوی لکھی خود فرماتے ہیں ؎

ترک جوشی کردہ ام من نیم خام   از حکیم غزنوی بشنو تمام

لیکن یہ سب کچھ مولانا کی تواضع اور نیک نفسی ہے ورنہ مثنوی کو حدیقہ اور منطق الطیر سے وہی نسبت ہے جو قطرہ کو گوہر سے ہے۔

مولانا اور حدیقہ کے بیان میں قدر مشترک

مثال ۱ :- اس بنا پر حدیقہ میں سنائی نے وفے، کی اس طرح مدح سرائی کی ہے ؎

نالۂ نے ز درد خالی نیست   شوق از روئے زرد خالی نیست

اسی مضمون کو مولانا نے یوں بیان کیا ہے ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند — وز جدائیہا شکایت می کند

اسی طرح اور بہت سے مضامین دونوں کتابوں میں مشترک ہیں۔ ان کے موازنہ کرنے سے دونوں کا فرق صاف واضح ہو جاتا ہے۔

چونکہ مولانا کا فن شاعری نہ تھا اس بنا پر ان کے کلام میں وہ روانی۔ برجستگی۔ نشستِ الفاظ حسن ترکیب نہیں پائی جاتی۔ جو اساتذہ شعرا کا خاص انداز ہے۔ تاہم سیکڑوں بلکہ ہزاروں اشعار ایسے بھی ان کے قلم سے ٹپک پڑتے ہیں جن کی صفائی برجستگی اور دلآویزی کا جواب نہیں ؎

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما — اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اے علاج نخوت و ناموس ما — اے تو افلاطون و جالینوس ما

مثنوی کی خصوصیات :۔ سب سے بڑی خصوصیت جو مثنوی میں ہے، وہ اس کا طرزِ استدلال اور طریقہ افہام ہے۔ استدلال کے تین طریقے ہیں۔ قیاس۔ استقرا۔ تمثیل۔ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں زیادہ تر اسی قیاسِ تمثیلی سے کام لیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ عام طبائع کے افہام و تفہیم کا طریقہ یہی ہے۔

استدلال تمثیلی کے لئے تخیل کی بڑی ضرورت ہے جو شاعری کی سب سے ضروری شرط ہے۔ اس بنا پر مثنوی کے لئے یہی طریقہ زیادہ مناسب تھا۔ مولانا نے اسی طریقۂ استدلال کو اختیار کر کے دقیق مسائل کو ایسی نادر اور قریب الفہم تمثیلوں سے سمجھایا ہے جن سے بقدرِ امکان ان کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے۔

مثلاً یہ مسئلہ کہ مقام فنا میں انسان صفاتِ الٰہی کا مظہر بن جاتا ہے اور اس عالم میں اس کا "انا الحق" کہنا جائز ہے۔ اس طرح ثابت کیا ہے ؎

رنگِ آہن محو رنگِ آتش است — ز آتشے می لافد و آہن وش است

چوں بہ سرخی گشت ہمچو زرِّ کاں — پس انا النار است لافش بے گماں

یا مثلاً یہ کہ عارفِ کامل کو باقی اور فانی دونوں کہہ سکتے ہیں لیکن مختلف اعتبار سے اس کو اس طرح سمجھایا ہے ؎

چوں زبانہ شمع پیش آفتاب — نیست باشد ہست باشد در حساب

ہست باشد ذات او تا تو اگر	بر نہی پنبہ بسوزد زآں شرر

دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فرضی حکایتوں کے ضمن میں اخلاقی مسائل کی تعلیم کا جو طریقہ مدت سے چلا آتا ہے۔ مولانا نے اس کو کمال کے مرتبہ تک پہنچا دیا۔

مولانا نے ان حکایتوں کے ضمن میں نفسِ انسانی کے جن پوشیدہ اور دور از نظر عیوب کو ظاہر کیا ہے، عام لوگوں کی نگاہیں وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ پھر ان کو ادا اس طرح کیا ہے کہ ہر شخص حکایت کو پڑھ کر کہہ اٹھتا ہے کہ یہ تو خاص میرا ہی ذکر ہے، چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ ایک حکایت ہے کہ ایک شیر اور صحرائی جانوروں میں معاہدہ ٹھہرا کہ وہ ہر روز شیر کو گھر بیٹھے اس کی خوراک پہنچایا کریں گے۔ پہلے ہی دن جو خرگوش شیر کی خوراک کے لئے معین کیا گیا وہ دو ایک دن کی دیر کر کے گیا، شیر غصہ میں بھرا بیٹھا تھا، خرگوش گیا تو اس نے دیر کی وجہ پوچھی خرگوش نے کہا میں تو اسی دن چلا تھا لیکن راہ میں شیر نے روک لیا میں نے اسے بہتیرا کہا کہ میں حضور کی خدمت میں جاتا ہوں لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ بڑی مشکل سے ضمانت دے کر مجھ کو چھوڑا۔ شیر نے بپھر کر کہا کہ وہ شیر کہاں ہے؟ میں اس کو ابھی چل کر سزا دیتا ہوں، خرگوش آگے آگے ہو لیا اور شیر کو ایک کنوئیں کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا کہ حریف اس میں ہے۔ شیر نے کنوئیں میں جھانکا اور اپنے ہی عکس کو اپنا حریف سمجھا۔ بڑے غصہ سے حملہ آور ہو کر کنوئیں میں کود پڑا۔ مولانا یہ حکایت لکھ کر فرماتے ہیں ؎

عکس خود را او عدوئے خویش دید	لاجرم بر خویش شمشیرے کشید
اے بسا عیبے کہ بینی در کساں	خوئے تو باشد دریشاں اے فلاں
اندر ایشاں تافتہ ہستئ تو	از نفاق و ظلم بد مستی تو
آں توئی واں زخم بر خود می زنی	برخود آں دم تار لعنت می تنی

۲۔ قصہ ہے کہ ایک دفعہ مجنوں لیلیٰ سے ملنے کے لئے چلا۔ سواری میں اونٹنی تھی۔ جس نے حال ہی میں بچہ دیا تھا۔ لیکن بچہ ساتھ نہیں آیا تھا۔ مجنوں جب لیلیٰ کے خیال میں محو ہوتا تھا تو اونٹنی کی مہار ہاتھ سے چھوٹ جاتی تھی۔ اونٹنی یہ دیکھ کر کہ مجنوں غافل ہے، بچہ کی کشش سے گھر کا رُخ کرتی تھی۔ گھڑیوں کے بعد مجنوں کو ہوش آتا تھا تو اس کا رخ پھیرتا اور لیلیٰ کے گھر کی طرف لے چلتا

لیکن دو چار کوس بعد پھر محویت طاری ہوتی اور اونٹنی پھر گھر کا رُخ کرتی۔ اسی کشمکش اور تنازع میں مہینوں گزر گئے، اور ایک منزل بھی طے نہ ہوئی۔ یہ حکایت لکھ کر مولانا فرماتے ہیں کہ انسان کا بھی بعینہٖ یہی حالت ہے۔ وہ روح اور نفس کی کش مکش میں ہے ؎

جاں کشاید سوئے بالا بالہا — در زدہ من در زمیں چنگالہا

این دو ہمراہ یک دگر را راہزن — گمرہ آں جاں کو فرو ناید ز تن

۳۔ اکثر صوفیہ توکل کو سلوک کا ایک بڑا پایہ سمجھتے ہیں اور یہ خیال رفتہ رفتہ مختلف صورتوں میں قوم میں سرایت کر گیا ہے۔ مولانا نے اس مسئلہ کو ایک فرضی مناظر کے ذیل میں طے کیا ہے۔ جانوروں نے توکل اور شیر نے جہد اور کوشش کا پہلو اختیار کیا ہے۔ مولانا نے کوشش اور جہد صالح کے ساتھ توکل کی تلقین بدیں الفاظ کرتے ہیں ؎

گفت آرے گر توکل رہبر است — ایں سبب ہم سُنّتِ پیغمبر است

گفت پیغمبر باواز بلند — بر توکل زانوئے اشتر ببند

رمز الکاسب حبیب اللہ شنو — از توکل در سبب غافل مشو

رو توکل کن تو با کسب اے عمو — جہد می کن کسب می کن اے عمو

علم کلام :- مثنوی نے عالم شہرت میں جو مقام حاصل کیا ہے آج تک کسی مثنوی کو یہ بات حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس قدر مقبول ہونے اور ہزاروں لاکھوں دفعہ پڑھی جانے کے باوجود بھی لوگ اس کو صرف تصوّف و طریقت کی کتاب خیال کرتے ہیں۔ کسی کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ عقائد اور علم کلام کی بھی تصنیف ہے۔ موجودہ علم کلام کی بنیاد امام غزالی نے قائم کی اور امام رازی نے اس عمارت کو عرش کمال تک پہنچا دیا۔ اسی وقت سے آج تک سینکڑوں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔ لیکن مسائل عقاید جس خوبی سے مثنوی میں ثابت کئے گئے ہیں یہ تمام دفتر اس کے آگے ہیچ ہیں۔

الٰہیات۔ ذات باری :- خدا کے اثبات کے مختلف طریقے ہیں اور ہر طریقہ ایک خاص گروہ کے مناسب ہے۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ آثار سے مؤثر پر استدلال کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ خطابی ہے۔ اور عوام کے لئے یہی طریقہ سب سے بہتر ہے۔

دوسرا طریقہ جو حکما کا ہے یہ ہے کہ تمام عالم میں نظام اور ترتیب پائی جاتی ہے۔ اس لئے ضرور اس کا کوئی صانع ہے۔

تیسرا طریقہ مولانا کا خاص ہے۔ یہ طریقہ سلسلہ کائنات کی ترتیب اور خواص کے سمجھنے پر موقوف ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

عالم میں دو قسم کی اشیاء پائی جاتی ہیں۔ مادی مثلاً پتھر اور درخت وغیرہ غیر مادی مثلاً تصور، وہم، خیال، مادیات کے بھی مدارج ہیں۔ بعض میں مادیت یعنی کثافت زیادہ ہے۔ بعض میں کم اور بعض میں اس سے بھی کم۔ استقرائے سے ثابت ہوتا ہے کہ علت میں بہ نسبت معلول کے مادیت کم ہوتی ہے ؎

اول فکر آخر آمد در عمل	اول فکر ہے اور پھر عمل ہے
تبت عالم چناں واں در ازل	عالم کی افتاد اسی طرح ہے
صورت دیوار و سقفِ ہر مکاں	دیوار اور چھت کی صورت
سایہ اندیشۂ معمار داں	معمار کے خیال کا سایہ ہے

سلسلۂ کائنات پر غور کرنے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جو چیزیں محسوس اور نمایاں ہیں، وہ اصلی نہیں بلکہ جو چیزیں کم محسوس یا کم نمایاں یا بالکل غیر محسوس ہیں وہ اصلی ہیں ؎

روغن اندر دوغ باشد چوں عدم	دوغ در ہستی برآورده علم
نیست را بنمود ہست آں محتشم	ہست را بنمود بر شکل عدم
دست پنہاں و قلم بیں خط گزار	اسپ در جولان و ناپیدا سوار
بحر را پوشید و کف کرد آشکار	باد را پوشید بنمودت غبار

مولانا نے ایک اور طریقہ سے خدا کے وجود پر استدلال کیا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ یہ مسلم ہے کہ علت کو معلول پر ترجیح ہے۔ یعنی علت میں کوئی ایسی خصوصیت ہوتی ہے، جو معلول میں نہیں ہوتی۔ ورنہ اگر دونوں ہر حیثیت سے برابر ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک معلول ہو اور دوسرا علت۔ سلسلۂ کائنات میں علت و معلول کا سلسلہ اسی ذات پر ختم ہوتا ہے جو "واجب الوجود" ہے۔

صفاتِ باری :۔ اسلام میں اختلاف مذہبی کی جو بنیاد پڑی اور جس نے بڑھتے بڑھتے تمام اسلام کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ وہ اسی مسئلہ کی بدولت تھی۔ اسی مسئلہ نے اشعریہ، معتزلہ، حنبلیہ میں سینکڑوں برس تک وہ نزاعیں قائم رکھیں کہ لوگوں نے قلم کے بجائے تلوار سے کام لیا۔

مولانا نے ان نزاعوں کا یہ فیصلہ کیا کہ یہ بحث سرے سے فضول ہے۔ خدا کی نسبت صرف اس قدر معلوم ہو سکتا ہے کہ ہے۔ باقی یہ کہ کیسا ہے کہاں ہے، ادراک انسانی سے باہر ہے اور انسان جو کچھ ادراک کر سکتا ہے حواس کے توسط سے کر سکتا ہے لیکن خدا محسوس میں داخل نہیں اس لیئے اس کے ادراک کا کوئی ذریعہ نہیں۔ خدا "قدیم" ہے اور انسان "حادث" اس لئے حادث قدیم کو کیوں کر جان سکتا ہے۔

مولانا کی اصلی تعلیم یہ ہے کہ خدا کی ذات وصفات کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہیئے اور جو کچھ کہا جائے گا وہ خدا کے اوصاف نہ ہوں گے کیونکہ انسان جو کچھ تصوّر کر سکتا ہے خدا اس سے بری ہے ؎

ہر چہ اندیشی پذیرائے فنا است　　　　وانکہ در اندیشہ ناید آں خدا است

نبوّت :۔ یہ مسئلہ علم کلام کے مہمات مسائل میں سے ہے، اور اسی وجہ سے علم کلام کی کتابوں میں اس کے متعلق بہت طول طویل بحثیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ سب حشو اور زوائد ہے اور مغز سخن پر ایک دو سطریں بھی مشکل سے ملتی ہیں۔

مولانا نے اس بحث کے تمام اجزا پر اس خوبی سے لکھا ہے کہ گویا اس رازِ سربستہ کی گرہ کھول دی ہے۔

نبوّت کے متعلق امور ذیل بحث طلب ہیں :۔

نبوّت کی حقیقت، وحی کی حقیقت، مشاہدہ، ملائکہ، معجزہ۔

نبوّت کی تصدیق کیوں کر ہوتی ہے :۔

نبوّت کی حقیقت :۔ مولانا فرماتے ہیں کہ روح کا سلسلۂ ترقی اس حد تک پہنچتا ہے کہ روح انسانی اور اعلیٰ روح میں اس قدر فرق پیدا ہو جاتا ہے جس قدر روح حیوانی اور انسانی میں۔ لیکن اس درجہ کے مراتب مختلف ہیں۔ ادنیٰ طبقہ کو ولایت اور انتہائی اعلیٰ طبقہ

کو نبوّت کہتے ہیں۔

وحی کی حقیقت :۔ مادہ پرستوں کے نزدیک ادراک کے ذرائع صرف حواس ظاہری ہیں۔ لیکن حضرات صوفیہ کے نزدیک انسان میں ایک اور خاص قوت ہے جو حواس ظاہری کے توسط کے بغیر اشیاء کا ادراک کرتی ہے۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں ؎

حس ابدان قوت ظلمت می خورد　　حق جان از آفتابے می چرد

آئینہ دل چوں شود صافی و پاک　　نقشہا بینی بروں از آب وخاک

یہ ادراک انبیاءؑ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اولیاءؒ اور اصفیا کو بھی حاصل ہوتا ہے لیکن فرق مراتب کے لحاظ سے انبیاءؑ کی وحی کو وحی کہتے ہیں اور اولیاءؒ کی وحی کو الہام۔

مشاہدۂ ملائکہ :۔ وحی کا ایک طریقہ یہ ہے کہ دل میں خدا کی طرف سے القا ہوتا ہے دوسرا یہ کہ قوتِ ملکوتی مجسم بن کر مشاہدہ ہوتی ہے اور پیغام الٰہی پہنچاتی ہے۔ مولانا نے اس کی مثال دی ہے کہ انسان بعض وقت خواب میں دیکھتا ہے کہ کوئی شخص اس سے باتیں کر رہا ہے حالانکہ وہ کوئی غیر شخص نہیں ہوتا بلکہ خود ہی انسان ہوتا ہے۔ لیکن خواب میں اس سے الگ نظر آتا ہے چنانچہ دفتر سوم میں فرماتے ہیں ؎

چیزے دیگر ماند اما گفتنش　　باتو روح القدس گوید نے منش

نے تو گوئی ہم بگوش خویشتن　　نے من ونے غیر اے من ہم تو من

ہم چوں آں وقتے کہ خواب اندر روی　　تو ز پیش خود بہ پیش خود شوی

بشنوی از خویش و پنداری فلاں　　باتو اندر خواب گفت است آں نہاں

مولانا عبدالعلی بحرالعلوم ان اشعار کی شرح میں لکھتے ہیں۔

"جبرائیل جو انبیاءؑ علیہم السلام کو نظر آتے ہیں۔ اور خدا کی طرف سے وحی لاتے ہیں وہ حقیقت جبرائیلیہ ہے جو انبیاءؑ کو محسوس ہوتی ہے، اور خدا کی طرف سے قاصد بن کر پیغام لاتی ہے تو انبیاءؑ اپنے آپ ہی سے مستفیض ہوتے ہیں نہ کسی اور سے جو کچھ ان کو نظر آتا ہے وہی ہے جو خود ان کے خزانہ میں مخزون تھا۔

نبوت کی تصدیق :۔ اس بنا پر یہ قوی شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ حالت

ہے تو آخر نبی اور متنبی میں تمیز کا کیا ذریعہ ہے۔ کیونکر کہاں جا سکتا ہے کہ نبی کے دل میں جو مضامین القا ہوتے ہیں وہ خدا کی طرف سے ہوتے ہیں اور متنبی کے دل میں شیطان کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح میٹھے اور کھارے پانی کے پہچاننے کا ذریعہ صرف قوت ذائقہ ہے اسی طرح نبوّت کی تمیز کا ذریعہ صرف وجدانِ صحیح اور ذوق سلیم ہے ؎

ہر کرا در جان خدا بنہد محک | ہر یقین را باز داند او زشک
چوں شوائیم رنج و علت دل سلیم | طعم صدق و کذب را باشد علیم

معجزہ:۔ معجزہ کے متعلق تین امر بحث طلب ہیں۔

۱۔ مولانا نے اس بارے میں معتدل راہ اختیار کی ہے وہ اشاعرہ کے برخلاف اس بات کے قائل ہیں کہ عالم میں قانون قدرت اور ایک سلسلۂ نظام ہے اور اگر یہ نہ ہو تو انسان کسی کام کے لئے کوئی کوشش اور تدبیر نہ کر سکے کیونکہ جب یہ معلوم ہے کہ کوئی چیز کسی کی علت نہیں تو کسی کام کے اسباب اور علت کی تلاش کیوں ہوگی ؎

چوں سبب نبود چہ رہ جوید مرید | پس سبب در راہ می آید پدید

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ خدا کے تمام قانون قدرت کا احاطہ نہیں ہو سکا جن چیزوں کو تم اسباب سمجھتے ہو ممکن ہے کہ ایک ایسا قانونِ قدرت ثابت ہو جس کے سامنے یہ تمام سلسلۂ اسباب غلط ہو جائے۔

اس مہلکہ سے بچنے کے لئے انسان کو چاہیئے کہ سلسلۂ اسباب کے ساتھ ہر وقت اس بات پر نظر رکھے کہ گو واسطہ در واسطہ سینکڑوں ہزاروں اسباب کا سلسلہ قائم ہے لیکن در اصل یہ تمام کلیں ایک قوّتِ اعظم کے چلانے سے چل رہی ہیں۔ اس لئے یہ اسباب اصلی نہیں۔ اصلی سبب وہی قوتِ اعظم ہے جہاں تک یہ سلسلہ پہنچ کر ختم ہوتا ہے ؎

ایں سبب ہا بر نظر ہا پردہ ہا است | کہ نہ ہر دیدار صنعش را سزا است
دیدۂ باید سبب سوراخ کن | تا حجب را بر کند از بیخ و بن
تا مسبب بیند اندر لامکاں | ہرزہ بیند جہد و اسباب و دکاں
از مسبب می رسد ہر خیر و شر | نیست اسباب و وسائط را اثر

اس جگہ یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا نے جا بجا یہ تصریح کی ہے کہ انبیاؑ کے معجزات بغیر اسباب کے وجود میں آتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں ؎

انبیاؑ در قطع اسباب آمدند　　　معجزات خویش در کیواں زدند

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ قطع اسباب سے مولانا کا یہ مطلب نہیں کہ درحقیقت ان واقعات کا سبب نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ اسباب ہماری فہم سے بالاتر ہوتے ہیں۔ یعنی ان اسباب کے علاوہ ہوتے ہیں جن کو ہم تحقیق کر چکے ہیں

معجزہ دلیل نبوت ہے یا نہیں :۔ مولانا کے نزدیک نبوت کی تصدیق کے لئے معجزہ شرط نہیں جس کے دل میں ایمان کا مزہ ہوتا ہے۔ پیغمبر کی صورت اور اس کی باتیں اس کے حق میں معجزہ کا کام دیتی ہیں ؎

در دلِ ہر کس کہ از دانش مزہ است　　　روئے و آواز پیغمبر معجزہ است

لیکن مولانا نے اسی پر قناعت نہیں کی، بلکہ صاف صاف تصریح کی کہ معجزہ ایمان کا سبب نہیں ہوتا اور اس سے ایمان بھی پیدا ہوتا ہے تو جبری ایمان پیدا ہوتا ہے نہ ذوقی۔

معجزہ سے نبوت پر جو استدلال کیا جاتا ہے اس کی منطقی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ اس شخص سے یہ فعل صادر ہوا ہے۔

اور جس شخص سے یہ فعل (معجزہ) صادر ہو پیمبر ہے۔ اس لئے یہ شخص پیمبر ہے۔

اس صورت میں پیمبر کا اثر بالذات خارجی چیز ہوتا ہے۔ مثلاً دریا کا پھٹ جانا۔ سنگریزوں کا بولنا وغیرہ۔ اس اثر سے پھر بواسطہ 'قلب' پر اثر پڑتا ہے۔ یعنی آدمی اس بناء پر ایمان لاتا ہے کہ جب اس شخص نے دریا کو شق کر دیا تو ضرور پیمبر ہے

لیکن بجائے اس کے کہ معجزہ کسی پتھر، دریا یا جمادات پر اثر کرے یہ زیادہ آسان ہے کہ پہلے پہل دل پر ہی اثر کرے۔ خدا جب یہ چاہتا ہے کہ پیغمبر پر لوگ ایمان لائیں تو یہ زیادہ آسان اور زیادہ دلنشیں طریقہ ہے کہ بجائے 'جمادات' کے خود لوگوں کے دلوں کو متاثر کر دے کہ وہ ایمان قبول کر لیں اور یہی اصلی معجزہ کہا جا سکتا ہے۔

مولانا اس نکتہ کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں سہ

بر زند از جان کامل معجزات بر ضمیر جان طالب چوں حیات

اس شعر میں معجزہ کی اصلی حقیقت بتائی ہے۔ یعنی پیغمبر کا روحانی اثر خود طالب کی روح پر پڑتا ہے۔ کسی واسطہ اور ذریعہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

روح :- اس قدر عموماً مسلّم ہے کہ یہ مسئلہ عقاید کا سب سے اہم مسئلہ ہے عام لوگوں کے نزدیک اس کی اہمیت معاد کے عقیدہ کے لحاظ سے ہے کیونکہ اگر روح کا وجود نہ تسلیم کیا جائے، تو معاد کا اثبات نہیں ہو سکتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ کل نظام مذہبی کی بنیاد ہے۔ اسی بنار پر مولانا نے اس مسئلہ پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ عالم میں جو چیزیں موجود ہیں ان میں فرق مراتب پایا جاتا ہے۔ سب سے کمتر درجہ عناصر کا ہے۔ یعنی وہ چیزیں جن میں کسی قسم کی ترکیب نہیں۔ اور اس لئے ان میں دستِ قدرت اپنی صناعیاں نہیں دکھا سکتا۔ اس طبقہ کو جماد کہتے ہیں۔ اس کے بعد ترکیب شروع ہو جاتی ہے اور یہی عالم فطرت کی ترقیوں کی پہلی منزل ہے۔ ترکیب کا ابتدائی درجہ نباتات ہے۔ نباتات کی ہزاروں لاکھوں اقسام ہیں اور ان میں فطرت کی ہزاروں عجیب وغریب صنعت گریاں نظر آتی ہیں تاہم ان میں چونکہ ادراک کا شائبہ نہیں وہ ایک خاص درجہ سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ نباتات کے بعد حیوانات کا درجہ ہے جس کی صفت ممیزہ ادراک ہے اور یہیں سے روحانیت کی ابتدا ہے۔ روح کے گو اور بہت سے اوصاف ہیں جن کی وجہ سے وہ اوروں سے ممتاز ہے لیکن سب سے بڑا خاصہ ادراک ہے۔ اس لئے روح درحقیقت ادراک ہی کا نام ہے، اور چونکہ ادراک کے مراتب میں فرق ہے۔ اس لئے مولانا کی رائے کے موافق روحانیت بھی مشکک ہے جو بعض افراد میں کم بعض میں زیادہ اور بعض میں اس سے زیادہ ہے۔

روح اگرچہ تمام حیوانات میں پائی جاتی ہے اور اگرچہ حیوانات کے مختلف انواع میں اس کے مراتب نہایت متفاوت ہیں۔ تاہم حیوانات میں جو روح ہے وہ ترقی کی

ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس حد کو روح حیوانی کہتے ہیں۔ اس سے آگے جو درجہ ہے اُسے روحِ انسانی کہتے ہیں۔

روح کی ترقی کے مراتب سلسلہ بہ سلسلہ بڑھتے جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کا ایک ایسا درجہ ہوتا ہے جو عام روحِ انسانی سے اسی قدر بالاتر ہے جس قدر انسانی روح، حیوانی روح سے۔ یہی درجہ نبوّت کا ہے۔

معاد:۔ عقاید کا یہ اہم ترین مسئلہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ اعتقاد دل سے اُٹھ جائے کہ معاصی اور افعال بد پر کبھی کسی نہ کسی قسم کا مواخذہ ضرور ہوگا تو تمام دنیا میں اخلاق کا جو پایہ ہے، دفعتہً اپنے درجہ سے گر جائے گا۔

تمام متکلمین کا یہ دعویٰ ہے کہ روح کوئی مستقل چیز نہیں جسم کی ترکیب سے جو خاص مزاج سے پیدا ہوتا ہے، اسی کا نام روح ہے اس لئے کہ جب وہ مزاج فنا ہوگیا تو روح بھی فنا گئی۔ متکلمین کے برخلاف مولانا نے اس مسئلہ کی اس طرح تشریح کی کہ روح جسم سے جداگانہ ایک جوہر نورانی ہے، اور جسم کے فنا ہونے سے صرف اس قدر اثر پڑتا ہے جتنا ایک کاریگر پر ایک خاص آلہ کے جاتے رہنے سے۔

عمر خیام نے ایک رباعی میں لطیفہ کے طور پر معاد سے انکار کیا تھا اور کہا تھا کہ انسان کوئی گھاس نہیں ہے کہ ایک دفعہ کاٹ ڈالی جائے تو پھر اُگ آئے۔ مولانا اس کا جواب اسی انداز میں دیتے ہیں سہ

کدام دانہ فرو رفت در زمیں کہ نہ رُست ‏ ‏ ‏ ‏ چرا بہ دانۂ انسانْت ایں گماں باشد

جبر و قدر:۔ مولانا روم نے اس مسئلہ پر مختلف حیثیتوں سے بحث کی ہے۔ سب سے پہلے مولانا نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ گو جبریہ اور قدریہ دونوں غلطی پر ہیں لیکن ان دونوں کو نسبتاً دیکھا جائے تو قدریہ کو جبریہ پر ترجیح ہے۔ کیونکہ "اختیارِ مطلق" بداہت کے خلاف ہے اس قدر ہر شخص کو بداہتہً نظر آتا ہے کہ وہ صاحبِ اختیار ہے۔ باقی یہ امر کہ اختیار خدا نے دیا ہے کہ نظری مسئلہ ہے۔ یعنی استدلال کا محتاج ہے بدیہی نہیں۔

دونوں کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص دھواں اٹھتا دیکھ کر کہتا ہے کہ دھواں موجود ہے

لیکن آگ نہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ سرے سے دھواں ہی نہیں۔ ایک شخص کہتا ہے کہ دنیا موجود ہے لیکن آپ سے آپ پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا کوئی خالق نہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ دنیا سرے سے نہیں۔ ہر شخص یہ فیصلہ خود کر سکتا ہے کہ دونوں میں سے زیادہ احمق کون ہے۔

تصوّف :۔ تصوّف دو جزوں سے مرکب ہے۔ علم۔ عمل عقاید میں جن مسائل سے بحث کی جاتی ہے۔ ان میں ذات وصفات باری کے متعلق جو مسائل ہیں تصوّف میں بھی انہیں کے متعلق بحث ہوتی ہے۔ لیکن تصوّف میں ان عقاید کی حقیقت اور طرح بیان کی جاتی ہے۔ یہی حصہ تصوف کا علمی حصّہ ہے۔ لیکن تصوّف کے اس حصّہ میں جو چیز اصلی مابہ الامتیاز ہے یہ ہے کہ اس میں علم اور ادراک کا طریقہ عام طریقہ سے مختلف ہے عام حکمأ اور علماء کے نزدیک ادراک کا ذریعہ حواس ظاہری اور باطنی یعنی حافظہ تخیّل، حسِ مشترک ہیں۔ لیکن اربابِ تصوف کے نزدیک ان وسائل کے سوا ادراک کا ایک اور بھی ذریعہ ہے۔ حضرات صوفیہ کا دعویٰ ہے کہ مجاہدہ، ریاضت، مراقبہ اور تصفیۂ قلب سے ایک اور حاسہ پیدا ہوتا ہے جس سے ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو حواسِ ظاہری و باطنی سے معلوم نہیں ہوتیں۔

چونکہ یہ مسئلہ تصوف کے تمام علمی مسائل کی بنیاد ہے اس لئے مولانا نے اس کو بار بار بیان کیا ہے اور مختلف مثالوں سے سمجھایا ہے کہ اربابِ ظاہر سے اس کا منکر ہونا ایسا ہی ہے جیسا ایک بچہ مسائل فلسفیہ سے انکار کرتا ہے۔ یا ان کے سمجھنے سے قاصر ہے

توحید :۔ علمائے ظاہر کے نزدیک توتوحید کے یہ معنی ہیں کہ ایک خدا کے سوا کوئی اور خدا نہیں۔ نہ خدا کی ذات وصفات میں کوئی اور شریک ہے لیکن تصوف کی لغت میں اس کے معنی بدل جاتے ہیں۔ حضرات صوفیہ کے نزدیک توحید کے یہ معنی ہیں کہ خدا کے سوا اور کوئی چیز عالم میں موجود نہیں یا جو کچھ موجود ہے سب خدا ہی ہے۔ اسی کو "ہمہ اوست" کہتے ہیں۔

مولانا وحدت وجود کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک تمام عالم اسی ہستیٔ مطلق کی مختلف شکلیں اور صورتیں ہیں۔ اس بناء پر صرف ایک ذاتِ واحد موجود ہے۔ اور تعدد جو محسوس

ہوتا ہے محض اعتباری ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

گر ہزاراں اندیک کس بیش نیست — جز خیالات عدد اندیش نیست

بحر وحدانیست جفت و زوج نیست — گوہر و ماہیش غیر موج نیست

وحدت وجود کی صورت میں بھی یہ امر بحث طلب رہتا ہے کہ ذاتِ باری اور مظاہر کائنات میں کس قسم کی نسبت ہے۔ مولانا کی رائے یہ ہے کہ ذاتِ باری کو ممکنات کے ساتھ جو خاص نسبت ہے اور تعلق ہے وہ قیاس اور عقل میں نہیں آسکتا۔ نہ کیف وکم کے ذریعہ بیان کیا جاسکتا ہے۔ ؎

اتصالے بے تکیف بے قیاس — ہست رب الناس را با جانِ ناس

مولانا فرماتے ہیں کہ اس قدر مسلّم ہے کہ جان کو جسم سے بصارت کو روشنی سے خوشی کو دل سے غم کو جگر سے، خوشبو کو شامہ سے، گویائی کو زبان سے ہوا پرستی کو نفس سے ایک خاص تعلق ہے لیکن یہ تعلق بیچوں و بیچگون ہے اسی طرح خدا کو ممکنات سے جو نسبت ہے وہ کیف وکم سے بری ہے۔

مقاماتِ سلوک و فنا:۔ تصوف اور سلوک کے جو اہم مقامات ہیں مثلاً مشاہدہ فکر، حیرت، بقا، فناء الفناء۔ جہد۔ توکل وغیرہ ان سب کو مولانا نے مثنوی میں نہایت عمدگی اور خوبی سے لکھا ہے ان سب پر لکھنا طوالت طلب ہے۔ اس لئے صرف نمونہ کے طور پر ایک مقام فنا کی حقیقت کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔

مقام فنا کے متعلق لوگوں کو نہایت سخت غلطیاں واقع ہوتی ہیں۔ یہی مقام ہے جس کی بناء پر منصور نے دار کے منبر پر انا الحق کا خطبہ پڑھا تھا۔ جو لوگ سرے سے تصوّف کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ انسان خدا کیوں کر ہوسکتا ہے اور اگر ہوسکتا ہے تو فرعون نے کون سا جرم کیا تھا کہ کافر اور مرتد ٹھہرا۔

مولانا نے اس نکتہ کو نہایت خوبی سے حل کیا ہے۔ فنا کی یہ حقیقت ہے کہ سالک اپنی ہستی کو بالکل مٹا دے اور ذاتِ الٰہی میں فنا ہو جائے۔ یہی مقام ہے جس میں منصور نے انا الحق اور حضرت بایزید بسطامیؒ نے سبحانی ما اعظم شانی کہا تھا اور اس

حالت میں ایسا کہنا محل الزام نہیں ہے۔

مولانا نے اس حقیقت کو مختلف تشبیہوں سے سمجھایا ہے۔ ایک مثال میں اس مسئلہ کو اس طرح سمجھایا ہے کہ لوہا جب آگ میں گرم کیا جاتا ہے اور سرخ ہو کر آگ کا ہمرنگ بن جاتا ہے۔ تو گو وہ آگ نہیں ہو جاتا لیکن اس میں تمام خاصیتیں آگ کی پائی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ کہتے ہیں کہ آگ ہو گیا۔ فنافی اللہ کے مقام میں انسان کی بھی یہی حالت ہوتی ہے ؎

آدمی چوں نور گیرد از خدا ہست مسجود ملائک ز اجتبا

عبادات :- ارباب تصوف کے نزدیک عبادت کا مفہوم اس سے الگ ہے جو عام علماء اور ارباب ظاہر کرتے ہیں ان لوگوں کے نزدیک عبادت ایک قسم کی مزدوری ہے جس کے صلہ کی توقع ہے یا تعمیل حکم ہے جس کے بجا نہ لانے سے سزا کا خوف ہے لیکن تصوف میں عبادت کے معنی یہ ہیں کہ بغیر کسی توقع یا خوف کے محض محبت الٰہی کا باعث ہو

ارباب ظاہر عبادات کے لئے اوقات معینہ کے پابند ہیں لیکن اہل دل کے لئے ہر وقت عبادت کا وقت ہے ؎

پنج وقت آمد نماز رہنموں عاشقانش را صلوٰۃ دائمون

روزہ :- روزہ ارباب ظاہر کے نزدیک فاقہ کا نام ہے لیکن حضرات صوفیہ کے نزدیک اس کی حقیقت یہ ہے ؎

ہست روزہ ظاہر امساک طعام روزۂ معنی تو جہ داں تمام

فلسفہ و سائنس :- مولانا کو اگرچہ مثنوی میں فلسفہ کے مسائل بیان کرنا پیش نظر نہ تھا لیکن ان کا دماغ اس قدر فلسفیانہ واقع ہوا تھا کہ بلا قصد و ارادہ فلسفیانہ مسائل ان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں وہ معمولی سے معمولی بات بھی کہنا چاہتے ہیں تو فلسفیانہ نکتوں کے بغیر نہیں کہہ سکتے۔ اس موقع پر فلسفہ اور سائنس کے چند مسائل درج ہیں جو ضمناً اور تبعاً مثنوی میں بیان کئے گئے ہیں۔

تجاذب اجسام :- یعنی یہ کہ تمام اجسام ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں اور اسی کشش کے مقابلۂ باہمی سے تمام سیارات اور اجسام اپنی اپنی جگہ

پر قائم ہیں۔ اس مسئلہ کی نسبت تمام دنیا کا خیال ہے کہ نیوٹن کی ایجاد ہے۔ لیکن لوگوں کو یہ سُن کر حیرت ہو گی کہ سینکڑوں برس پہلے مولانا روم نے ظاہر کیا تھا وہ فرماتے ہیں ؎

ہست ہر جزوے بعالم جفت خواہ — راست ہمچوں کہربا و برگ کار

آسماں گوید زمین را مرحبا — باتوام چوں آہن و آہن ربا

تجاذبِ ذرات :۔ تحقیقاتِ جدیدہ کی روشنی میں یہ ثابت ہوا ہے کہ جسم کی ترکیب نہایت چھوٹے ذرات سے ہے جن کو اجزائے دیمقراطیسی کہتے ہیں۔ ان ذرات میں بھی باہم کشش ہے۔

تجاذبِ ذرات کے مسئلہ کو بھی مولانا نے نہایت صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے ؎

میل ہر جزئی بہ جزئی می نہد — ز اتحاد ہر دو تولیدے جہد

ہر یکی خواہاں دگر را ہمچو خویش — از پے تکمیل فعل و کار خویش

مسئلہ ارتقاء :۔ موجودات کی عالم کی تقسیم چار قسموں کی گئی ہے۔ جمادات، نباتات، حیوان، انسان، لیکن ان کے مسئلہ آفرینش میں حکمائیں اختلاف رائے ہے۔ عام رائے یہ ہے کہ یہ چاروں اپنے وجود میں مستقل ہیں۔ یعنی فطرت نے ان کو ابتداء ہی سے ایسی صورت میں پیدا کیا ہے، دوسرے فریق کا خیال ہے کہ اصل میں صرف ایک چیز تھی وہی ترقی کرتے کرتے آخیر درجہ میں یعنی انسان تک پہنچی۔ انسان پہلے جماد تھا پھر نبات پھر حیوان اور پھر انسان بنا۔ اس مسئلہ کا موجد ڈارون خیال کیا جاتا ہے۔ مولانا نے اس مسئلہ کو اشعار ذیل میں بصراحت لکھا ہے ؎

آمدہ اول بہ اقلیم جماد — وز جمادی در نباتی اوفتاد

سالہا اندر نباتی عمر کرد — وز جمادی یاد ناورد از نبرد

وز نباتی چوں بہ حیواں اوفتاد — نامدش حال نباتی ہیچ یاد

غرضیکہ مثنوی معنوی مولانا جلال الدین کے افکار کا گراں بہا ثمر صادر اُن کے اشعار کا بہترین مجموعہ ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ فارسی زبان میں تصوف کا مکمل ترین دیوان ہے۔

مولانا جلال الدین نے افکار و زبان پر بڑا زبردست اثر ڈالا ہے۔ ان کے پیرو مقلد بے شمار ہیں۔ آپ کا معنوی اور ادبی اثر نہ صرف ہندوستان اور ایشیائے کوچک میں اپنے انتہائی عروج پر ہے بلکہ آپ کی شہرت مغربی ممالک میں بھی پھیل چکی ہے۔ اور ان ملکوں کی مختلف زبانوں میں مثنوی کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ مثنوی کی متعدد شرحیں اور تفسیریں بھی لکھی گئی ہیں۔ ان میں کمال الدین خوارزمی کی فارسی شرح اور ترکی میں اسماعیل بن احمد کی شرح بہت مشہور ہیں۔ مشہور حکیم ملّا ہادی سبزواری نے بھی اس کی شرح اور تفسیر لکھی ہے۔

سبک و افکار:۔ جہاں تک جداگانہ بحث کا تعلق ہے مثنوی اور دیوان دونوں ہی مولانا روم کے ذہنِ بلیغ کے نادر نمونے ہیں۔ مولانا روم نے کسی فنّی نقطہ نظر سے شاعری کو اپنا پیشہ نہیں بنایا، بلکہ ان کی شاعری رسائی مقصود، ایقان بمطلب لطافت معنیٰ باریکی خیال، عرفانی فکر کی صفائی اور پختگی کی شاعری ہے۔ گویا سنائی نے عرفانی شاعری کا قوام اور اس میں عذوبیت تام پیدا کی۔ شیخ عطار نے اُسے لطیف معانی اور شور و شوق کا مظہر بنایا، اور مولانا جلال الدین نے اسے اوج کمال تک پہنچایا۔ اگر کوئی ایرانی شاعری کا تجزیہ کرے تو اس کا قیاس لازمی طور پر یہ ہوگا کہ فردوسی، داستانی اور رزمیہ شاعری کا اُستاد ہے خیام حکیمانہ رباعی کا ماہر ہے۔ انوری کی شاعری فنّی قصیدہ کا مرقع ہے۔ نظامی بزمیہ عشقیہ داستان بیان کرنے پر قادر ہے۔ سعدی اچھوتی نثر اور دلکش غزل کے مالک ہیں۔ مولانا جلال الدین عرفانی مثنوی میں بے مثال ہیں اور حافظ عرفانی غزل کے آقا ہیں۔

مولانا جلال الدین نے معانی کا رشتہ فکر دقیق اور حُسنِ دقیق کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ اور الفاظ میں اُن کو نہایت اچھی طرح سے واضح کیا ہے۔ انہوں نے دیگر شعرا کی طرح اپنے کلام میں الفاظ کی زینت کی طرف بالکل توجہ نہیں دی۔ انہوں نے مثنوی کا وزن بھی اپنے مقصد کی ادائیگی میں آسانی پیدا کرنے کے لئے اختیار کیا تاکہ معنوی شاعری ہونے کی وجہ سے لوگوں تک ہی نہ پہنچ سکے۔ عرفانی حقائق اور معانی بیان کرنے کا شوق مولانا پر کچھ اس قدر غالب تھا کہ انہوں نے لفظی آرائش کی بندش۔ اور عروض و قوافی کی قید و بند کی بھی پرواہ

نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں مثنوی میں بعض ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو فصاحت لفظی اور بعض ترکیبات قافیوں اور لفظوں کے اعتبار سے جاذب و دلکش نہیں۔ اسی لئے آپ نے اس حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے فرمایا ؎

غیر نطق و غیر ایمائے سجل　　　　از ہزاران ترجمان خیزد ز دل

اور جہاں لطائفِ سخن سمجھنے کے لئے عموماً اور مولانا کی تصانیف سمجھنے کے لئے خصوصاً اسلامی علوم سے شیفتگی اور صفائے ضمیر، شوق معرفت اور ذوق وحدت کی صوفیانہ اصطلاحوں سے واقف ہونا ضروری ہے اور اسی صورت میں ان کی تصانیف کو سمجھا جا سکتا ہے۔

رومی نے مثنوی کے لئے اگرچہ مربوط فلسفہ پسند کیا۔ لیکن اس میں وہ ربط و نظم نظر نہیں آتا جو کہ دوسروں کی مثنویوں کا خاصہ ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تسلسل جذبہ کے ہاتھوں ٹوٹ جاتا ہے۔ فکر کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں جذبہ کی بہت فراوانی ہے اور جب وہ ایک جذبہ کا اظہار کرتے ہیں تو کسی دوسرے جذبہ سے متاثر ہو کر اصلی موضوع سے دُور جا نکلتے ہیں۔ مثنوی کی تراش خراش میں وہ صنعت گری اور حسن و جمال مفقود ہے جو کہ دوسروں کے ہاں نظر آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ رومی کم فنکار تھے۔ بلکہ مثنوی میں وہ اپنے اندازِ بیان پہ مقصد کو ترجیح دیتے ہیں لیکن انہوں نے فن کو ترجیح نہیں دی۔ بعض جگہ رومی نے متروک الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ رومی زبان کے معاملہ میں بڑے بے پرواہ تھے۔ مگر باوجود اس چیز کے ان کی شاعری قاری کو اس قدر مسحور کر دیتی ہے کہ اس کی مثال کم کم ہی نظر آتی ہے۔ رومی کی شاعری ان کے جذبہ کی صداقت کی بیّن دلیل ہے۔ رومی کے بعض مضامین پڑھنے والے کے لئے مشکل تھے۔ چنانچہ رومی کو اس کا احساس تھا۔ اسی لئے انہوں نے اپنے بلند اور عمیق افکار کو ہر ایک تک پہنچانے کے لئے اور آسان بنانے کے لئے تمثیل کا سہارا لیا ہے۔ سنائیؒ اور عطارؒ کا بھی یہی انداز تھا۔ شعر کے علاوہ نثر میں بھی تمثیل رائج تھی۔ رومی نے بہت سے قرآنی اہم مطالب کی تشریح واقعات کی تمثیلات سے کی ہے۔ یہ واقعات تاریخی ہیں۔ فنی اعتبار سے مثنوی میں کوئی بات قابلِ ذکر نہیں بلکہ موضوع اور افکار کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ مثنوی میں مکمل ضابطۂ حیات ملتا ہے

اور اس کا منبع قرآن والہام ہے۔ حسن آفرینی اگرچہ مفقود ہے تاہم اثر افرینی بدرجہ اُتم موجود ہے۔

رومی کے دیوان میں بھی سوز و ساز ہے۔ دیوان اور مثنوی کا باہم مقابلہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ دیوان میں گہرا فکر ہی نہیں بلکہ غزل کا خاصہ تغزل کا جوہر بھی ہے۔ رومی نے غزل میں دلکشی اور دلچسپی پیدا کی۔ غزل میں جذبہ کی صداقت اور لطیف جذبات کا اظہار ملتا ہے رومی کی بعض غزلیں اس قدر وجد آور ہیں کہ ان کے بعد حافظ کے سوا اور کسی کے حصّہ میں نہیں آئیں۔ زندگی کے بارے میں حیات افروز خیالات کا اظہار جذبہ کی صداقت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ اس سے ایک سحر انگیز کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ رومی کے ہاں خیال کی رفعت اور جذبہ کی فراوانی ہے اور دونوں میں ہم آہنگی پائی جاتی ہیں۔ رومی جذبات کو تصویر کی صورت میں پیش کرتے ہیں تاکہ پیکر تراشی سے حسن آفرینی اور وضاحت پیدا ہو سکے۔ محسوساتی رنگ کو بھی انہوں نے برقرار رکھا۔ یہ چیز محسوساتی تشبیہات وغیرہ سے پیدا کی ہے بعض اوقات محسوساتی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ رومی کے ہاں معاملہ بندی بھی پائی جاتی ہے

گفتی زناز بیش مرنجان مرا برو — آن گفتنت کہ بیش مرنجان مرا ازدست

رومی کی غزلیں اکثر مسلسل ہیں۔ غزل میں ایک مزاج۔ معنوی ربط اور جذباتی ہم آہنگی ہے اشعار ایک دوسرے سے مختلف نہیں۔ یہ تسلسل حافظ اور امیر خسرو اور سعدی کے ہاں بھی ملتا ہے۔ اگرچہ الفاظ کے لحاظ سے مثنوی کی نسبت زیادہ محتاط رہے ہیں لیکن بعض جگہ غزل میں بھی ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو غزل میں نہیں جچتے۔ رومی نے اپنی ایک مسلسل غزل میں اپنی جان کی بے قراری، روح کی تڑپ، محبوب کی آرزو اور جان دینے کی تمنا۔ ہجر کی کیفیت کے احساس کو بیان کیا ہے۔

کناری ندارد بیابانِ ما — قراری ندارد دل وجانِ ما

رومی کے ہاں غزلیات میں فوق البشر اور عظمت آدم کا احساس پایا جاتا ہے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر — کز دام و دد ملولم انسانم آرزوست

زین ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می‌نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می‌نشود آنم آرزوست

رومی کے ہاں جد وجہد کا بہترین درس ملتا ہے۔ جہاں وہ "کوشش بیہودہ بہ از خفتگی" کہہ کر انسان میں حرکت پیدا کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اس عارفِ کامل کے کلام کا موضوع وحدت پر نظر۔ رجوع بباطن ظاہر سے رو گردانی۔ خلوص وصفا کی تعلیم، ظاہر پرستی اور ریاکاری اور بیرونی نمائش سے گزر کر کشائشِ درون سے ربط تجمل آفاق سے صرفِ نظر اور نورِ اشراق کے نظارہ کی دعوت ہے انہوں نے اسرارِ حیات کی عقدہ کشائی کی کوشش بھی کی ہے اور اس کوشش میں انسان کی عقل بے مائگی کا اقرار بھی۔ علم وحکمت کی گہرائیوں میں غوطہ زنی بھی ہے، اور گوہرِ مراد تک پہنچ کر اپنی کم فہمی کا عاجزانہ احساس بھی۔ انہوں نے ان تمام حقائقِ عالیہ جو ان کے ذاتی اور نفسی تجربات پر مبنی تھے۔ چند حکایتوں اور کہانیوں کے جامہ میں ملبوس کیا۔ اُن کے ہاں قرآنِ کریم کی اچھوتی تفسیر بھی ہے، اور مختلف احادیثِ نبویہ کی تشریح بھی۔

انہی عقود کی گرہ کشائی کی بدولت مولانا روم کی تشریح وتفسیر ہر دور میں اپنے وقتی ذوق اور علمی ترقی کے مطابق ہوتی رہی ہے۔ لیکن موجودہ دور میں اس برعظیم کے مسلمان اس مردِ راہ بین کے زندگی بخش تخلیقی کارناموں سے پوری طرح استفادہ نہ کر سکتے۔ اگر علامہ اقبال مرحوم بار بار پورے جوش وخروش کے ساتھ ان کی اہمیت کو اُجاگر نہ کرتے۔

باز برخوانم زفیضِ پیرِ روم — دفترِ سربستہ اسرارِ علوم
جانِ اُو از شعلہ ہا سرمایہ دار — من فروغِ یک نفس مثلِ شرار

بلکہ وہ تو یہاں تک کہہ گئے:

گر نیابی صحبتِ مردِ خبیر — ز آب وجد آنچہ من دارم بگیر
پیرِ رومی را رفیقِ راہ بساز — تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست — پائے او محکم فتد در کوئے دوست

حکمتِ رُومی ہے۔ دین ودانش۔ ایمان وعرفان کا اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ نفسِ انسانی کی ماہیت کیا ہے۔ میں کیا ہوں "انا" ایک جوہرِ بسیط ہے یا مرکب غرضیکہ

حقیقی عرفان اپنی خودی کی پہچان ہے۔ اسی پہچان سے آفاق کی پہچان اور خدا کی پہچان بھی ہو سکتی ہے "مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ"۔

مثنوی مولانا روم کے متعلق کہا گیا ہے کہ "ہست قرآن در زبان پہلوی" اس میں کوئی شک نہیں کہ مثنوی میں قرآنی معارف کی گہری تعبیر ملتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ مولانا نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

حرفِ قرآں را بدانم کہ ظاہر یست ۔۔۔ زیر ظاہر باطنے ہم قاہر یست

جنگِ ہفتاد ملت آسمانی صحیفوں کے الفاظ کی تاویل سے برپا ہوئی ہے۔ عارف رومی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس جنگ میں کسی ایک فریق کے طور پر شریک نہیں ہوئے چنانچہ مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی وسعت فکر نے ان کو حقیقت شناس کر دیا ہے اور چونکہ وہ حقیقت کے کسی پہلو سے گریز نہیں کرتے اس لئے تمام فرقوں کے پیروان کے بیانات سے اپنے لئے سند حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مجموعی طور پر ہر ایک کو کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے ؎

ہر کسے از ظن خود شد یارِ من ۔۔۔ وز درونِ من نہ جست اسرارِ من

قرآنِ کریم کا انداز اختیار کرتے ہوئے مثنوی کو بھی اس طرح شروع کیا ہے کہ جس طرح سورۃ فاتحہ تمام فرقانِ حمید کا لب لباب ہے اسی طرح روح کو بانسری سے تشبیہہ دے کر تمام عرفان و تصوّف کا خلاصہ پہلے صفحہ پر چند اشعار میں بیان کر دیا ہے۔

مولانا روحِ انسانی کو بانسری سے تشبیہہ دیتے ہیں لیکن یہ ایک لامحدود نیستان سے الگ ہوئی ہے۔ گویا عالم ارواح ایک ایسا عالم ہے جس میں وحدت بھی ہے اور کثرت بھی لیکن ارواح کی کثرت اشیاء کی کثرت کی طرح نہیں۔ یہ ایک راز ازلی ہے اور سر الاسرار ہے کہ ارواح کو وصالِ ازلی کے بعد فراق کس طرح لاحق ہوا۔ ہستی کا آغاز اور اس کا انجام دونوں اسرارِ الٰہی میں۔ مثنوی میں مولانا کہیں کہیں اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں مولانا روح کی ازلی کیفیت یوں بیان فرماتے ہیں ؎

منبسط بودیم یک گوہر ہمہ ۔۔۔ بے سر و بے پا بدیم آں سر ہمہ

یک گہر بودیم ہمچوں آفتاب بے گرہ بودیم وصافی ہمچوں آب

وحدت الٰہی کے اندر ارواح کی کثرت کے اشکال کو رفع کرنے کے لئے مولانا نے جا بجا بلیغ مثالوں سے کام لیا ہے۔ ایک مادی مثال سے اس طرح مطلب واضح کرتے ہیں ؎

گر تو صد سبب وصد آبی بشمری صد نماند یک شود چوں بفشری

مولانا مثنوی کا آغاز نالۂ فراق سے کرتے ہیں ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند وز جدائیہا شکایت می کند

یہ شکایت آمیز حکایت ہے اور کیوں ہے۔ اور کیا یہ حقیقت ہے کہ انسانی روح کی یہی کیفیت ہے۔

ابوالبشر جس وقت جنت سے نکلے وہ روح انسانی کی روح لاارواح سے وصل کی کیفیت تھی۔ وصال کے بعد زوال کا احساس دردِ فراق پیدا کرتا ہے۔ روح انسانی میں جو اپنی اصل سے جدائی کا احساس ہے اس کو مولانا ایک عام اصولِ حیات کے تحت لاکر اس طرح توجیہہ کرتے ہیں۔

كُلُّ شَيْءٍ يَرْجِعُ إِلَىٰ أَصْلِهٖ ہر چیز میں یہ فطری میلان ہے کہ وہ اپنی اصل کی طرف عود کرنا چاہتی ہے۔

روح کی مراجعت الی الوطن کے متعلق مولانا اپنے دیوان شمس تبریز کی ایک غزل میں فرماتے ہیں ؎

ما بفلک بودہ ایم یار ملک بودہ ایم باز ہما بخار ویم خواجہ کہ آں شہر ماست

اپنے اس اصل اور روحانی وطن کا احساس انسان کو ہر وقت نہیں ہوتا۔ غم ایام میں مبتلا ہو کر انسان دور کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے۔ لیکن گاہے گاہے مختلف ذرائع سے یہ احساس ابھرتا ہے۔ اس کا ایک ذریعہ سماع بھی ہے۔ سماع کے جائز یا ناجائز کرنے پر صوفیہ مختلف الرائے ہیں۔ لیکن مولانا اہل سماع میں سے ہیں، اور ترنّم کو غذائے روح سمجھتے ہیں مولانا کے نزدیک ترنم انسان کو اس کی گم گشتہ جنّت کی یاد دلاتا ہے اور اس میں اس تاثر کو بیدار کرتا ہے کہ اس عالم آب و گل میں وہ آوارۂ غربت ہے۔

نغمے کی دلکشی ویسے تو عام ہے لیکن عاشق کے لئے یہ دوا بھی ہے اور غذا بھی

بانسری اور عاشق میں ایک ظاہری مماثلت یہ ہے کہ دونوں کا سینہ پارہ پارہ ہوتا ہے جب تک سینے میں سوراخ نہ پڑیں نہ نے، نالہ آفریں ہو سکتی ہے اور نہ عاشق نالۂ شبگیر میں مبتلا ہو سکتا ہے ؎

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق   تا بگویم شرح دردِ اشتیاق

مولانا معرفت کا ایک لطیف نکتہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تمام اچھی صحبتوں کی طرح خدا اور روحِ انسانی کی صحبت میں دو طرفہ محبّت ہے۔ عشق کی آفرینش حسن سے ہوتی ہے یعنی خود حسن عشق کا آفریدگار ہے اور پروردگار ہے۔ حسن کی بے نیازی غلط ہے آرائشِ جمال عشق ہی کی خاطر ہوتا ہے۔

خدا صرف محبوب نہیں بلکہ محب بھی ہے، بلکہ یُوں کہو کہ وہ سراپا محبت ہے۔ جس نے محبوب و محب کی تفریق پیدا کی ہے۔ اگر ہم خدا کے محتاج ہیں تو وہ ہمارا مشتاق ہے۔ مولانا نے اس نکتہ معرفت کو "نے" ہی کی تمثیل میں بیان کیا ہے کہ دیکھو بانسری کے دو دہن ہوتے ہیں۔ ایک دہن تو نواز کے مُنہ میں ہوتا ہے اور دوسرے دہن سے نوا نکلتی ہے روحِ انسان ایک بانسری سے مشابہ ہے کہ بظاہر یہ فغاں انسانی روح کے دہن سے نکل رہی ہے لیکن اصل میں بجانے والا خود خدا ہے۔ جس کا دہن ہم سے پوشیدہ ہے ؎

دو دہاں داریم گویا ہمچوں نے   یک دہاں پنہانست در لبہائے وُے

یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما   ہائے ہوئے در فگندہ در سما

لیک داند ہر کہ او را منظر است   کایں فغاں ایں سری ہم زاں سر است

دمدمہ ایں نائے از دمہائے اوست   ہائے ہوئے روح از ہیہائے اوست

چونکہ مولانا سماع کو کاشف اسرار اور وصول الی الحق کا ذریعہ بتا چکے ہیں۔ ان کو معاً خیال ہوتا ہے کہ کہیں لوگ ہر قسم کی نے نوازی سے لطف اندوزی کو روحانی شغل خیال نہ کرلیں۔ اس لئے بدیں الفاظ تنبیہہ کرتے ہیں ؎

بر سماع راست ہر کس چیر نیست   طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

عشق :۔ عشق مثنوی کا اہم ترین موضوع ہے جو اس کے ہر دیگر مضمون پر چھایا ہوا ہے

مولانا نہ خود عشق کی گوناگوں کیفیتوں سے سیر ہوتے ہیں اور نہ اس کے بیان سے ان کو تشفی ہوتی ہے۔ عشق افراد کا بھی ہو سکتا ہے اور اشیاء کا بھی، اسی طرح بندے کو خدا کا بھی عشق ہو سکتا ہے۔ لیکن جو شخص اسیر ہوس ہے وہ اپنی اس ادنیٰ کیفیت کو بھی عشق ہی کہتا ہے۔ مولانا تنبیہہ کرتے ہیں ؎

این نہ عشق است ایں کہ در مردم بود — ایں فساد از خوردن گندم بود

مولانا کے نظریہ حیات کا لب لباب یہ ہے کہ روحوں کا اصلی ماخذ اور منام ذات الٰہی ہے کسی ناقابلِ فہم حکمت سے یہ ارواح اپنی اصل سے الگ ہو گئیں۔ فراق کی وجہ سے ہر روح بیتاب ہے اور اپنی اصل کی جانب کشش محسوس کرتی ہے، اسی کشش کا نام عشق ہے ظلمتِ عدم سے وجود کا ظہور اسی کی بدولت ہے۔ بقول میر ؎

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور

مولانا کے نزدیک کائنات میں ارواح کے سوا کچھ نہیں اور خدا یعنی روح الارواح ان لامتناہی ارواح کا مصدر وجود ہے۔

اکثر صوفیا نے یہ تمثیل دی ہے کہ خدا دریائے حقیقت ہے اور تمام ہستیاں اسی کی موجیں اور حباب ہیں۔ لیکن روح انسانی میں ایک عجیب تماشہ ہے ؎

ایں طرفہ تماشہ ہیں دریا بہ حباب اندر

روح کی قدامت کے متعلق مولانا نے بے شمار اشعار لکھے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ روح کا قالب کے بعد اس میں داخل ہونا یا قالب کا نتیجہ ہونا غلط ہے بلکہ عالم بھی روح پر مقدم نہیں ہو سکتا۔ قالب روح کا ایک آلہ ہے جو اس نے عالم زمان و مکان میں عمل کرنے کے لئے وضع کر لیا ہے۔ دوسرے عالموں میں جب یہ آلہ کام نہیں آئے گا تو اس کو چھوڑ کر کوئی اور آلہ وضع کر لیا جائے گا ؎

قالب از ما ہست شد نے ما ازو — بادہ از ما ہست شد نے ما ازو

عالم میں خدا اس لئے نہیں سما سکتا کہ عالم اعراض کا مجموعہ ہے، عرش ہو یا فرش سب مکانی چیزیں ہیں حقیقت لامکانی ان میں نہیں سما سکتی، چونکہ روح حقیقت لامکانی

اور لازمانی ہے اسی طرح خدا اس میں سما سکتا ہے۔

مولانا کہتے ہیں کہ میری روح کی نے اپنی اصل سے جدا ہونے کی وجہ سے مصروفِ فغاں ہے۔ زندگی کا تمام کاروبار سعی حصول وصال ہے لہٰذا کائنات میں جو کچھ ہے وہ عشق کا مظہر ہے تمام منزلات میں اسی لئے ارتقا کی میلان ہے کہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف بڑھتے ہوئے واصل الی الاصل ہو جائیں۔ ہر قسم کی حقیقی ترقی عشق ہی کی بدولت ہے۔ عشق حقیقی کا رجحان ہمیشہ کمال کی طرف ہو گا۔ اخلاق اور تزکیہ نفس کی تہ میں بھی اگر عشق نہ ہو تو یہ زہد خشک ہو گا۔ عاشق کے تمام امراض اس سے ساقط ہو جائیں گے ؎

شاد باش اے عشق خود سودائے ما　　　اے دوائے جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما　　　اے تو افلاطون و جالینوس ما

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تمام کائنات میں حرکت و ارتقائ عشق ہی کی بدولت ہے تو خدا جو سرچشمہ وجود ہے وہ فقط محبوب ہی ہے یا محب بھی ہے۔ خدا کی خلاقی اور ربوبیت کی اساس رحمت ہی ہے جو محبت ہی کا دوسرا نام ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ خدا نے بندوں کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ اس کی عبادت کریں۔ محض خدا کا نام ایک سطحی عبادت ہے۔ عبادت کی تکمیل اخلاقِ حسنہ اور اعمالِ صالحہ کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اور اخلاق میں حسن محبت کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ روح عبادت معبود کے آگے سر تسلیم خم کرنا اور اپنی مرضی کو اس کی مرضی میں ضم کرنا ہے۔ ایسے ہی عابدوں کے متعلق خدائے رحیم فرماتا ہے کہ خدا ان سے محبت کرتا ہے اور وہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔ مومن خدا کا محب بھی ہے اور محبوب بھی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ عشق کی ہمہ گیری　ذرات عالم میں بھی موجود ہے۔ جنہیں عام لوگ　زندگی سے محروم سمجھتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ عشق کے بغیر کائنات ہی نہ بن سکتی۔ کائنات میں جو اجسام اور اجرام ہیں۔ وہ باہمی کشش سے قائم ہیں۔ اسی نظریہ کو نیوٹن نے ثابت کیا لیکن عارف رومی کا وجدان اور میلان صدیوں پیشتر اس کی طرف اشارہ کر گیا ؎

ہست ہر جزوے بعالم جفت خواہ　　　راست ہمچوں کہربا و برگ کاہ

آسماں گوید زمین را مرحبا　　　با توام چوں آہن و آہن ربا

زمین میں ایک بیج ڈالا جاتا ہے وہ گردوپیش کے تمام جمادی مادے کے لئے نقطۂ جاذب بن جاتا ہے۔ زمین میں جتنے عناصر ہیں اپنی ہستی کو بیتاب عاشقوں کی طرح اس میں محو کرنے چلے جاتے ہیں۔ اگر ان میں باہمی تجاذب نہ ہوتا تو بیج یونہی پڑا رہتا۔ جمادات جب اس طرح عشق نباتات میں اپنے آپ کو محو کر دیتے ہیں تو یہ فنا ان کے لئے ارتقاء کا باعث بن جاتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اعلیٰ کے عشق میں فنا نہیں بلکہ ذریعہ ارتقا ہے۔ اسی جذبۂ عشق کی بدولت کائنات میں ارتقاء ہو رہا ہے اور یہ ارتقاء رجعت الی اللہ ہے۔

بقاؔ اور ارتقاءؔ کی جدوجہد زندگی کی فطرت ہے۔ اس کا وظیفہ ہی یہی ہے کہ ادنیٰ کو منسوخ کر کے اعلیٰ تر کو اس کی جگہ قائم کیا جائے۔

جرمنی کا مشہور شاعر حکیم گوئٹے بھی زندگی کے اسی اصول کی تلقین کرتا ہے کہ ہر قدم میں موت میں سے حیات پیدا کرتا ہو۔ اوپر کی طرف اٹھتا جا۔ مولانا بھی یہی فرماتے ہیں اور بڑے ادعا کے ساتھ کہتے ہیں کہ احسن تقویم والی روح جدائی میں "اَسفَلِ السَّافِلِیْن" تک گری۔ مدارج حیات میں "جماد اسفل السافلین" ہے۔ گویا جمادی حالت میں آگئی۔ پھر اس حالت میں سے نکلتے ہوئے اس کو بڑا عرصہ لگا۔

مولانا کہتے ہیں کہ روح جمادی حالت سے ترقی کر کے نباتی حالت میں آئی۔ اس سے ترقی کی تو حیوانیت میں آئی۔ حیوانیت کے درجے کو عبور کر کے انسانیت کی طرف بڑھی۔ اگر ادنیٰ درجہ کی موت وارد نہ ہوتی تو اوپر والے درجے میں عروج ناممکن تھا۔ پس ثابت ہوا کہ زندگی ارتقائے مسلسل ہے۔ روح نے خدا ہی سے الگ ہو کر یہ سفر شروع کیا تھا پھر وہیں واپس پہنچے گی تو یہ سفر ختم ہو گا ؎

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش　　　باز جوید روزگار وصل خویش

عشق اور عقل کا باہمی تعلق نہایت اہم مسئلہ ہے۔ حکمائے یونان کے ہاں خدا کا تصور ہے اور زندگی کا نصب العین یہ ہے کہ انسان عقل جزوی سے عقل کلی کی طرف ترقی کرے مولانا بھی ان حکمائے سے ہم نوا ہو کر عقل کی اہمیت کے کچھ قائل نہیں لیکن مولانا کے ہاں عقل و حکمت کا مفہوم فلاسفہ کے مفہوم سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ سائنس اور فلسفے

میں استعمال ہونے والی عقل کو وہ جزوی عقل کہتے ہیں، اور اس کی بے مائیگی مثنوی کا خاص مضمون ہے۔ لیکن مولانا عقلِ کلی اور حکمت عرفانی کی مدح میں اکثر رطب اللسان ہوتے ہیں۔ مولانا کہتے ہیں کہ حکمت کی ترقی انسان کو اس مقام تک پہنچا دیتی ہے جو وحی الہام کا مقام ہے۔ عقل ایک قسم کا نور ہے۔ لیکن نور کے مدارج ہیں اسی لئے قرآن کریم میں نور ذاتِ الٰہی کو نورٌ علیٰ نور کہا گیا ہے۔

انسان کی تعریف فلاسفہ نے یہ کی ہے کہ وہ حیوان ناطق ہے۔ عقل اور گویائی ایک ہی استعداد کے دو پہلو ہیں۔ اس لئے یہاں ناطق سے مراد ذی عقل ہیں۔ اور سخن عقل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ مولانا کے نزدیک وہ عقل جس کا نطق سے لازم و ملزوم کا رشتہ ہے ادنیٰ سطح کی ہے۔ چنانچہ وہ خدا تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ الٰہی مجھ کو بھی اس مقام پر پہنچا دے جہاں کلام میں الفاظ کا استعمال نہیں ہوتا ؎

اے خدا بنما تو جاں را آں مقام　　　کاندرو بے حرف روید کلام

جہاں ہر کلام بے حرف می ، اور جہاں ترکیب و عدد نہیں وہاں استدلالی عقل اور انسان کے وہم و خیال کو رسائی حاصل نہیں۔ لیکن وہ مقام حکمت کا سرچشمہ ہے۔ اور عقل نبوی کو وہیں سے فیضان حاصل ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس مقام توحید یا مقام عشق میں جس طرح ہمارے دلائل اور افکار کام نہیں دیتے۔ اسی طرح اس عشق کو یہاں کی شادی و غم کے حساب سے بھی نہیں سمجھ سکتے۔ مولانا جس عشق کا ذکر کرتے ہیں وہ کوئی خالی تاثرات کی حالت نہیں۔ جسمانی زندگی میں جس کو عشق کہتے ہیں وہ محض تاثرات کا ہیجان ہوتا ہے۔ انسان کے جسمانی عشق اس کو اندھا کر دیتے ہیں۔ لیکن عشقِ الٰہی اس کو بینا تر کر دیتا ہے۔

یہی معرفت آمیز عشق ہے جسے مولانا آبِ حیات اور کیمیائے سعادت سمجھتے ہیں۔ محبت اصلِ حیات اور مقصودِ حیات ہے۔ محبت مغزِ حقیقت ہے باقی سب خول ہی خول ہے عشق محبت کی ایک شدید صورت کا نام ہے۔ ان کے نزدیک عشق ہی تمام امراض کا علاج ہے وہ طبیبِ جسمانی بھی ہے اور طبیبِ روحانی بھی ؎

اے دوائے نخوت و ناموس ما　　　اے تو افلاطون و جالینوس ما

عارف رومی کہتے ہیں کہ محبت سے زندگی کی تلخیاں شیریں ہو جاتی ہیں۔ محبت میں اگر کسی کو سولی پر لٹکا یا جائے تو اس کو چوب دار چوب تخت شاہی محسوس ہوتی ہے ؎

از محبت دار تختے می شود ، دز محبت بار تختے می شود

محبت کی اس تمام کیمیاگری کو بیان کرنے کے بعد مولانا ایک اہم نکتہ بیان کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں

ایں محبت ہم نتیجہ دانش است ، کے گزافہ بر چنیں تختے نشست

محبت بھی دانش ہی کا نتیجہ ہے۔ محبت کے تخت پر کوئی بیہودہ اور بے عقل کہاں بیٹھ سکتا ہے۔ عالم کی فضیلت عابد پر اسی لئے ہے کہ وہ معرفت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ حکمت کی ترقی سے عارف کو خدا حسین و جمیل دکھائی دے گا۔ جب تک انسان خدا کی صفات جمیلہ سے واقف نہ ہو اس کے دل میں خدا کی محبت کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ محبت رسولؐ جو ہر مسلمان کا جزو ایمان ہے وہ بھی رسولؐ کو جاننے پہچاننے کے بعد ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ خدا اور رسولؐ کی محبت اولاد کی محبت کی طرح وہبی نہیں ہوتی بلکہ خدا اور رسولؐ کی محبت کے لئے انسان میں عقلی قوت رکھ دی گئی ہے۔ لہٰذا مولانا جس محبت کو نتیجۂ دانش کہہ رہے ہیں وہ جبلی محبتوں سے بالاتر چیز ہے۔

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ دانش کے مدارج ہیں۔ دانش ناقص بھی ہو سکتی ہے اور کامل بھی۔ دانش ناقص سے ناقص چیزوں کا عشق پیدا ہو گا۔ اور دانش کامل سے کمال اور مصدر کمال کی محبت پیدا ہو گی۔ دانش ناقص سے جو محبت پیدا ہوتی ہے وہ ناقص ہونے کی وجہ سے جماد سے چمٹی رہتی ہے۔ دانش ناقص عشق کے بلند مراتب تک نہیں پہنچا سکتی۔

عام صوفیہ کے مسلک سے الگ ہو کر مولانا عقل کی بے انتہا تعریف کرتے ہیں اور علم ہی کو آدم کی امتیازی خصوصیت سمجھتے ہیں۔ عارف رومیؒ کے عرفان میں حکمت اور تصوف ہم آغوش ہو گئے ہیں۔ اور عقل و عشق میں مصالحت ہو گئی ہے۔ سرسری نظر سے مثنوی پڑھنے والوں کو اس سے پریشانی ہوتی ہے کہ کہیں عقل کی بے حد تعریف ہے اور کہیں عقل کی بے حد مذمت ہے۔ لیکن غور سے پڑھنے سے یہ اشکال رفع ہو جاتا ہے۔ مولانا عقلِ الٰہی کو عقلِ کُل کہتے ہیں جو موجودات کی خلق اور ناظم ہے۔ اس کے مقابلہ میں نیچے کے

درجہ کی تمام عقلیں کم و بیش ناقص ہوتی ہیں، اسی طرح عقلِ حیوانی عقلِ انسانی کے مقابلہ میں کوتاہ بین ہے۔ لیکن انسانوں کے اندر بھی عقل کا بڑا تفاوت ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ دُنیا میں ایسے صاحبِ کمال ملتے ہیں جن کی عقلِ جزوی نے عقلِ کُلی سے رابطہ پیدا کر لیا ہے۔ عقلِ جزوی میں اگر ترقی کرنے کا تقاضا پیدا ہو اور وہ تکمیل کے لئے بیتاب ہو تو اس کو عقلِ کُل کا فیضان حاصل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ عقلِ جزوی کی ترقی کے لئے بھی عقلمندوں کی ضرورت ضروری ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ انسان کو عالم عقل و فکر نظر نہیں آتا اور مادی چیزیں اس کو نظر آتی ہیں، اسی وجہ سے انسان مادیت سے مغلوب ہو گیا ہے اور اس مغالطہ میں مبتلا ہو گیا ہے کہ مادہ ہی سب کچھ ہے، اور فکر ایک غیر مؤثر معاوضہ ہے۔

عقل و فکر۔ اندیشہ کی حقیقت آگ کی مثال سے سمجھ لو۔ فرماتے ہیں کہ نور کی طرح حرارت بھی نظر آنے کی چیز نہیں۔ حرارت کی نمود آگ سے ہوتی ہے لیکن آگ جو خود لطیف ہے جب تک کسی جسم کثیف کو نہ لپٹ لے مخفی رہتی ہے۔

ارتقائ تزکیہ نفس اور عشق کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ معرفت کے حصول میں جو دو مختلف منزلیں آتی ہیں ان کے متعلق مولانا نے ایک بلیغ تمثیل پیش کی ہے کہ کچھ دُور تک ہرن کا شکاری اس کے نقشِ قدم سے سراغ لگاتا چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد نقوشِ قدم غائب ہو جاتے ہیں تو پھر نافۂ آہو کی خوشبو اس کی رہبر بن جاتی ہے کہ جس طرف سے خوشبو کی لپٹیں آتی ہیں ہرن اسی طرف کو دوڑا ہو گا۔ پہلے مرحلے میں انسان نفس و آفاق کے آیات سے خدا کی معرفت حاصل کرتا ہے یہ منزل عقلی ہے تمام محسوسات و معقولات خدا کی خلاقی کے نقوشِ قدم ہیں۔ ایک حد تک یہ سراغ لگانے میں مدد دیتے ہیں لیکن اس کے بعد اس قسم کے آیات اور محسوسات غائب ہو جاتے ہیں پھر معرفت کی خوشبو بغیر کسی قسم کی آیات کے سالک کی رہبر بن جاتی ہے ؎

همچو صیادے سوئے اشکار شد | گام آہو دید بر آثار شد
چند گاہش گام آہو درخوراست | بعد ازاں خود نافِ آہو درخوراست

وحی والہام :- دین اور حکمت دونوں کے لئے اساسی مسائل فقط دو ہیں۔ ایک مسئلہ ماہیت وجود کا ہے اور دوسرا ماہیت علم کا کیا وجود صرف مادی ہے یا اس کے مدارج و مراتب ہیں۔ جن میں سے مادہ ادنیٰ ترین درجہ کا ہے۔ اسی طرح علم کی بحث ہے کہ علم کی حقیقت کیا ہے۔ ایک علم صرف حواس سے حاصل ہوتا ہے یا حواس سے ان کے بھی کچھ ذرائع ہیں جسے مادیت کہتے ہیں، اس کا نظریہ وجود یہ ہے کہ ہستی کی اصلیت مادہ ہی ہے جو حواس سے محسوس ہوتا ہے۔ انسان کا جسم بھی مادے ہی کی ایک ترکیب سے بنا ہے اور اس کے اندر دماغ ہی مادی ذرات یا ان کی حرکات کی بدولت وہ روشنی پیدا کرتا ہے جسے عقل یا علم کہتے ہیں۔

کوئی شخص اگر مادی وجود کے سوا کسی وجود کا قائل نہ ہو تو اس کا نظریہ علم بھی محسوسات پر ہی مبنی ہوتا ہے۔ فقط محسوسات کا قائل نہ نفس نہ روح کو مان سکتا ہے نہ خدا کا قائل ہو سکتا ہے، اور نہ حیات بعد الموت کا ہے۔

عارف رومی کی تمام تعلیم مادیت اور الحاد کے خلاف ایک جہاد ہے جس کا ایک پہلو استدلال اور دوسرا پہلو وجدانی ہے۔

مولانا کے نزدیک وجود کے مراتب ہیں، اور وجود کا ہر مرتبہ اپنی مخصوص عقل و اسباب علل کا ایک مخصوص نظام رکھتا ہے۔ جیسے جیسے وجود کے مراتب میں ترقی ہوتی ہے ویسے ویسے علم اور ذرائع علم میں بھی ترقی ہوتی ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ ارتقائے وجود انسان کی موجودہ حالت پر ختم نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی عقل کا ارتقا یہاں پہنچ کر رک گیا ہے۔ عام خیال ہے کہ علوم و فنون انسان کے تجربے اور مشاہدے اور قوت استدلال کی پیداوار ہیں۔ مولانا اس کے قائل نہیں وہ فرماتے ہیں کہ ہر علم و فن میں جو ترقی کا قدم اٹھا ہے یا کوئی نئی بات ظہور میں آئی ہے وہ عقلی جد وجہد کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ اولاً" الہام سے پیدا ہوئی ہے کسی غیر معمولی بصیرت والے شخص کو الہام ہوا کہ بات یوں ہے یا یوں ہونی چاہیئے۔ مسلمان مفسرین اور متکلمین نے وحی اور الہام کی اصطلاحیں الگ الگ کر دی ہیں اور وحی کو انبیأ کے لئے مخصوص کر دیا ہے لیکن قرآن کریم سے اس کی تائید

نہیں ہوتی۔ اتنی بات یقینی ہے کہ وحی والہام محسوسات اور معقولات کی پیداوار نہیں ہوتے اور یہ روح کے اعلیٰ تر ملکات سے تعلق رکھتے ہیں۔

مولانا وحی والہام میں فرق نہیں کرتے اور الہامات کے لئے اور ماورائے عقل حس وبصیرت کے لئے وحی ہی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ علوم وفنون مثلاً طب، نجوم وغیرہ بھی وحی سے پیدا ہوتے ہیں۔

انبیاء اور اولیا کو جو غیب کی باتیں معلوم ہوتی ہیں ان کا وقوف مختلف صورتوں میں ہوتا ہے۔ کبھی لکھی ہوئی سطروں میں کبھی لذیذ یا ڈراؤنی آوازوں میں۔ کبھی نہایت خوبصورت شکلیں دکھائی دیتی ہیں جو ان کو مخاطب کرکے غیب کی باتیں بتاتی ہیں۔

وحی والہام کے مسئلے کو سمجھنے کے لئے ملائکہ کی حقیقت کا حسب مقدور سمجھنا لازمی معلوم ہوتا ہے۔ اربابِ ظاہر کہتے ہیں کہ فرشتے پرندوں کی طرح مخلوق ہے جو زمین وآسمان کے درمیان پرواز کرتے ہیں۔ ملائکہ کے کئی نوع ہیں لیکن اکثر حکمائے اسلام کا عقیدہ ہے کہ ملائکہ عقول کائنات ہیں یا بالفاظ دیگر ملائکہ صُوَرِ علمیہ کا نام ہے۔ اکثر اولیا اور تمام انبیا کو کسی نہ کسی صورت میں ملائکہ کا مشاہدہ ہوا۔ یا ان کے افعال ووظائف کا کچھ تجربہ ہوا اسی لئے ملائکہ پر ایمان، ایمانِ کلی قرار دیا گیا۔ کائنات کا کاروبار علم سے چلتا ہے اور ملائکہ اس علم کی مختلف صورتیں ہیں۔ آدم کے مسجود ملائک ہونے کے یہ معنی ہیں کہ انسانی روح میں قوت موجود ہے کہ وہ تمام صورِ علمیہ پر حاوی ہو جائے۔ لیکن اس بصیرت کے لئے آدمی کو آدم صفی ہونا چاہیئے۔ جس کو آدمی صفی کہتے ہیں وہ آدمیت کی معراج ہے۔ اور اس کے ارتقائے روحانی کی آخری منزل ہے احسنِ تقویم پر قائم رہتے ہوئے جب انسان روحانی بلندیوں پر پہنچتا ہے تو یہ کیفیت ہوتی ہے ؎

پس محل وحی گردد گوش جاں — وحی چہ بود گفتن از حسِ نہاں

انسان محلِ وحی اس وقت بنتا ہے جب اس کو دولتِ دید حاصل ہو۔ مولانا اکثر خدا کو دوست کے لقب سے پکارتے ہیں، کیونکہ یار وفادار تو حقیقت میں خدا ہی ہے باقی دوستیاں تو اغراض سے ملوّث اور بے وفائی کے شائبہ سے خالی نہیں۔ حضرت

رسولِ کریم صلعم نے بوقتِ وصال خدا کو دوست بھی کہہ کر پکارا اور انہیں کو رفیقِ اعلیٰ کہا۔

ملائکہ کی حقیقت خواہ کچھ بھی ہو لیکن وہ حقیقت روح انسانی سے خارج نہیں ہو سکتی اسی لئے مولانا وحی کو "گفتن از حسِ نہاں" کہتے ہیں۔ لیکن یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں انسان اپنی نفسیاتی خواہش سے باتیں نہیں کرتا۔ مگر جبرائیل کہیں باہر سے نہیں آتا کیونکہ جو کچھ روح کی حقیقت سے خارج ہے وہ بے حقیقت ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر موردِ وحی والہام ہونا روح انسانی کا ایک درجہ کمال ہے تو کیا ہر شخص کے لئے ولی یا نبی ہونا ممکن ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ استعداد کا تفاوت ہمیشہ انسانوں میں رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ہر شخص دنیا کے مدرسے میں حساب اور ریاضی سیکھتا ہے۔ لیکن خوارزمی اور نیوٹن صدیوں میں ایک پیدا ہوتا ہے۔ روحانی ترقی کے دروازے کسی پر بند نہیں لیکن ترقی حسبِ استعداد اور حسبِ توفیق ہوتی ہے۔

تکمیلِ دین کے بعد موردِ وحی والہام ہونے کے باوجود کسی شخص کا اپنے آپ کو نبی کہنا کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا، کیونکہ ہر نبوت کے دعویٰ کے بعد ایک نئی اُمت پیدا ہوتی ہے جو رفتہ رفتہ دوسری اُمتوں سے برسرِ پیکار ہو کر انسانوں میں وصل کی بجائے فصل کا باعث بنتی ہے۔

مولانا کا عقیدہ یہی ہے کہ وحی والہام کا دروازہ بند نہیں۔ یہ لوگوں کا غلط خیال ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کے بعد کسی پر وحی نازل نہ ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ مصلحت کی وجہ سے اب اس کو وحی نہ کہیں۔

وحدتِ وجود:- وحدتِ وجود کا مسئلہ صدیوں سے حکماء، صوفیہ اور اہلِ کلام میں معرکہ خیز رہا ہے۔ یہ مسئلہ محض دینی زندگی سے نہیں اُبھرا۔ رسولِ کریم صلعم نے اس کو کوئی اہم مسئلہ سمجھا اور نہ صحابہ کرام اس بحث میں پڑے۔ اسلام کا اصل مقصد توحید کی تبلیغ تھی وحدتِ وجود کا مسئلہ وہاں پیدا ہوا جہاں دین میں علم کلام اور فلسفے کی آمیزش ہوئی۔ ہندوؤں میں اس مسئلے نے ویدانت کی صورت اختیار کر لی، جس کے اندر خدا یا الشعور ایک اعتباری مظہری اور اضافی تصویر بن گیا وہ ہستئ مطلق نہ رہا۔ بدھ مت

نے بھی اسی لاموجودیت اور لاکونیت کی تبلیغ کی ہے۔ کہیں خدا کا تصور نہیں۔

یونانی فلسفہ ترقی کرتے کرتے سقراط اور افلاطون کے نظریہ علم وجود تک پہنچا کہ ہستیٔ مطلق عقل کی ہے۔ فلاطینوس کے ہاں ہستی مطلق ماورائے عقل ہے۔

اسلامی تصوف میں جو نظریہ وحدت وجود ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے سوا اور کسی چیز کا وجود نہیں "ہمہ اوست" تمام مختلف ہستیوں میں ہستی مشترک ہے اور وہ ہستی خدا کا وجود ہے۔

مسلمانوں میں جب وجود کی وحدت کی بحث شروع ہوئی تو بعض صوفیوں نے اپنا کلمہ بھی عام مسلمانوں سے الگ کر لیا۔ مسلمان کہتا ہے۔ لا الہ الا اللہ بعض صوفی کہنے لگے لاموجود الا اللہ۔ خدا کے سوا کچھ موجود نہیں۔ اسلامی توحید یہ تھی کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اب ایسے لوگ آئے جو کہنے لگے کہ خدا کے سوا اور کوئی موجود ہی نہیں جب خدا کے سوا اور کوئی موجود نہیں تو عابد اور معبود کا فرق مٹ جائے گا اور پرستش کی کچھ حقیقت نہ رہے گی، چونکہ وحدت وجود کا نظریہ اپنے نتائج میں قرآنی تعلیم سے بے جا ٹکراتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس مسلمان صوفیہ اور حکماء کا ایک گروہ توحید وجودی کی بجائے توحید شہودی کا قائل ہے جس کے معانی یہ ہیں کہ خدا کی صفات کا مظہر ہے۔ وجود موجودات کا بھی ہے۔ اور خدا کا بھی، لیکن جن معنوں میں خدا موجود ہے ان معنوں میں موجودات موجود نہیں۔ خدا اور مخلوقات کی باہمی نسبت کسی جسم اور اس کے سایہ کی نسبت ہے۔ سایے کا بھی وجود ہے لیکن جسم کے وجود کے مقابلہ میں بے مایہ اور اپنی ذات کے لئے جسم کا محتاج۔

مولانا شبلی جو صوفی ہیں نہ حکیم، مولانا رومؒ کے نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "وحدت وجود اور وحدت شہود میں فرق یہ ہے کہ وحدت وجود کے لحاظ سے ہر چیز کو خدا کہہ سکتے ہیں جس طرح حباب اور موج کو بھی پانی کہہ سکتے ہیں، لیکن وحدت شہود میں یہ اطلاق جائز نہیں۔ کیونکہ انسان کے سایہ کو انسان نہیں کہہ سکتے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا رومیؒ کی نسبت کیا فیصلہ کیا جائے کہ ان کا وحدت وجود کے قائلین میں ہے یا وحدت شہود کو تسلیم کرنے والوں میں تمام مثنوی کے مطالعہ میں یہ

نتیجہ نکلتا ہے کہ مولانا پر کسی قسم کا لیبل لگانا مشکل ہے کیونکہ بقول ان کے ؎

چہ تدبیر اے مسلماناں کہ من خود را نمی دانم

جو شخص یہ کہے کہ میں بہتر فرقوں سے متفق ہوں اس کی نسبت کون کہہ سکتا ہے کہ وہ وجودی ہے یا شہودی۔ جبری ہے یا قدری۔ لیکن وجودی اور شہودی دونوں گروہوں کو مولانا کے اشعار سے مدد مل سکتی ہے۔ سینکڑوں اشعار ایسے ہیں جن سے مولانا کو وجودی کہہ سکتے ہیں ؎

جملہ معشوق است عاشق پردۂ

کہیں کہیں صاف کہتے ہیں کہ فقط ذاتِ واحد ہی موجود ہے ؎

گر ہزاراں اند یک کس بیش نیست　　جز خیالات وعدو اندیش نیست

بحرِ وحدانیست جفت و زوج نیست　　گوہر و ماہیش غیر موج نیست

وجودی اور شہودی تنازعہ میں مولانا کی بعض تمثیلوں سے واضح ہوتا ہے کہ وہ وحدتِ وجود کے مقابلے میں وحدتِ شہود کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ شمع کی لَو کو سورج کے سامنے رکھ کر دیکھو نصف النہار میں دیئے کی روشنی کالعدم ہوتی ہے حالانکہ وہ ایک لحاظ سے جوں کی توں موجود ہے۔ روئی کو اس کے قریب لاؤ دیکھو اس میں شعلہ افگن ہو کر شمع کس طرح اپنی ہستی کا ثبوت دیتی ہے۔

وحدتِ وجود کی تمام بحث ایک فلسفیانہ بحث ہے۔ مسلمان کے لئے توحید کا سادہ عقیدہ ہی اصل حقیقت ہے۔

توحید کے انداز میں وحدتِ وجود کی تعلیم قرآنِ کریم میں بھی موجود ہے۔ لیکن یہ فلاسفہ کی وحدتِ وجود نہیں۔ اوّل و آخر ظاہر و باطن خدا ہی ہے۔ اور ”ما خلا اللہ باطل“ اصل عقیدہ توحید ہے۔ مصوّر ہزار ہا چیزوں کی تصویریں بناتا ہے۔ ہر تصویر میں اس کا ہنر اور کمال موجود ہے۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ مصوّر اپنی ہر تصویر کے وجود میں موجود ہے۔ لیکن کوئی تصویر مصوّر کی عین ذات کی تصویر نہیں ہوتی۔ مصوّر کبھی روئے زشت کی تصویر میں ہی اپنا کمال دکھاتا ہے۔ لیکن وہ روئے زشت مصوّر کا اپنا روئے زشت نہیں ہوتا۔ ایک لحاظ سے

خدا اپنے ہر مظہر اپنی ہر آیت اور اپنی ہر مخلوق شے میں موجود ہے لیکن دوسرے لحاظ سے کوئی شے تصور کی عین ذات نہیں ؎

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عین اوست　　لیکن نمی تواں کہ اشارت باو کنند

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ

آدم :- انسان کے لئے اہم ترین علم اپنی حقیقت کا عرفان ہے۔ سقراط کہتا تھا کہ انسان کا اصلی موضوع علم خود انسان ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ شجر و حجر اور شمس و قمر کا علم بے کار ہے انفس و آفاق میں آفاق کا درجہ ثانوی ہے۔ دین کا مقصود آخری اور غایت عرفان خود اپنے نفس کے عرفان کے ساتھ وابستہ ہے۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ

قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ کائنات میں خدا کے بعد انسان کا درجہ ہے۔ مشرکین کے مذاہب میں یا تو خدا کا کوئی تصور ہی نہ تھا اور اگر کوئی مبہم تصور تھا تو وہ یہ تھا کہ وہ خالق تو ہے، لیکن حیات و کائنات کے نظم و نسق اور کاروبار میں ایک معطل ہستی ہے۔ زندگی کے معاملات میں دیوتاؤں کا دخل ہے۔ خدا کے بعد دیوتاؤں کا درجہ ہے۔ ان دیوتاؤں میں عظمت و جبروت کے مدارج ہیں۔ لیکن انسان ان سب کے مقابلے میں بے چارہ ہے۔ اسلام میں دیوتا نہیں لیکن ملائکہ ہیں جو مشیتِ ایزدی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ ان کی اپنی خواہشات کا کوئی وجود نہیں۔ نصب العینی آدم کے سامنے تمام ملائکہ کو سربسجود ہونے کا حکم دیا گیا۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ کائنات میں حکمِ الٰہی سے جو قوتیں اور قوانین کار فرما ہیں۔ وہ سب انسان کے لئے قابلِ تسخیر ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ شمس و قمر کو تمہارے لئے مسخر کیا گیا۔ علاوہ ازیں قرآنِ کریم سے ہم اشیاء کو اس تسخیر کا ذریعہ بتایا ہے۔ جب تک انسان علم میں ترقی نہ کرے تب تک یہ تسخیر ممکن نہیں ہوتی۔ آدم و ملائکہ کے بیان میں ایک طرف بنی آدم کی تکریم ہے تو دوسری طرف علم کی تنظیم، یہ علم، نفس و آفاق کے مطالعہ مظاہر اور نوامیس کا علم ہے۔ انسان خدا نہیں بن سکتا لیکن خدا کا نائب ہو سکتا ہے۔ چونکہ خدا کی قدرت اور اس کی حکمت کی کوئی انتہا نہیں، اسلئے تخلقوا باخلاق اللہ کا عمل

ارتقا بھی لامتناہی ہے۔

انسان کو کمال درجہ کی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے لیکن اس اَحسنِ تقویم کے ساتھ اس کو صاحب اختیار اس لئے بنایا گیا ہے کہ وہ خود سوچ سمجھ کر اپنی مرضی اور ارادے سے اپنے اقوال اور افعال خدا کی مشیت کے مطابق بنائے جو انسان ایسا نہ کرے وہ اَسفلَ السافلین تک گر سکتا ہے۔

اسلام حقیقت کائنات اور ربوبیتِ رب و رحمت عامہ کا دین ہے۔ اس میں رجا بھی ہے اور ارتقا بھی۔ یاس اور قنوط کفر کے مترادف ہے۔ کائنات محض فریب ادراک نہیں۔ زندگی آدم کے جرم سے یا کسی پہلے جنم کی سزا نہیں۔ دنیا جائے عقوبت نہیں۔ بلکہ موضوع عرفان اور موقع امتحان ہے۔

حیات بخش نظریہ زندگی وہی ہو سکتا ہے جو انسان کے قلب میں سے خوف اور حزن کو نکال دے۔ آدم کے متعلق جو قرآن کریم نے تعلیم دی ہے وہی اس کی ضامن ہو سکتی ہے کہ ہر قسم کا خوف جو زندگی کی قوتوں کو مفلوج کرتا ہے اس کی قطعی بیخ کنی ہو جائے۔ قرآن کریم نے انسان کو کہا کہ تو خلیفۃ اللہ ہے اور مسخرِ کائنات ہے، تو کسی سے مت ڈر۔ فقط خدا کا ڈر جو تمام خوفوں کا قاطع ہے اکسیر حیات ہے۔ خدا کا خوف حکمت کا سرچشمہ اور حیاتِ طیبہ کا ضامن ہے۔

مثنوی میں جا بجا مولانا نے اس مضمون کو دہرایا ہے کہ انسان کو علم و حکمت کی وجہ سے فضیلت حاصل ہوتی ہے لیکن ان کے ہاں عقل کے بے شمار مدارج ہیں۔ محسوسات و صور کا علم بھی علم ہے۔ لیکن علم میں ایک حد تک حیوان کو بہت خام اور پست معلوم ہوتا ہے۔ ڈارون کہتا ہے کہ زندگی محض نباتی یا حیوانی زندگی ہے۔ زندگی اصل میں مادی ہے، اور اس کا واحد مقصد مادی ماحول سے توافق پیدا کر کے اپنی بقا کا سامان مہیا کرتا ہے۔ زندگی کے جوہر میں کوئی اقدار نہیں۔ کوئی میلان عروج نہیں۔ اس کے مقابلے میں مولانا فرماتے ہیں کہ زندگی جس ہستی مطلق سے سرزد ہوتی ہے وہ مصدر اقدار اور جامع کمالات ہے۔ زندگی سکون طلب نہیں، بلکہ حرکت طلب ہے۔ اس کے اعمال میکانیکی نہیں، بلکہ

مقصد کی کوشش میں، تمام ارتقا خدا سے ہے اور خدا کی طرف ہے۔ چونکہ کوئی ہستی، ہستیٔ مطلق نہیں بن سکتی، اس لیے ارتقا کا عمل بھی لامتناہی ہو گا۔

عارف رومی نے آدم کے متعلق قرآن کی اصلی تعلیم کو واضح کیا اور تکریم آدم کو بحال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے بتایا کہ انسان کی ترقی کا راستہ کیا ہے اور یہ بھی سمجھایا کہ ترقی کی راہیں مسدود نہیں ہیں۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ اس ترقی کا منتہا رب ہے وَاِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَہٰی اس عقیدے کو بار بار مولانا بھی دہراتے ہیں کہ "منزل ما کبریاست" اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا منزل پر پہنچ کر ارتقا ختم ہو جاتا ہے۔ مولانا کا عقیدہ ہے کہ منزل اور منتہا تو بیشک خدا ہی ہے لیکن ارتقا لامتناہی ہے۔ یہ ارتقا دنیا میں بھی جاری ہے اور آخرت میں بھی جاری رہے گا۔

تمام مخلوقات پر انسان کی افضلیت ہے اور شرفِ خلافت زیادہ تر بالقوۃ ہے اور کمتر بالفعل ہے۔ اپنی فضیلت میں تو وہ بعض اوقات جانوروں سے بھی اسفل اور اہل ہو جاتا ہے اس پر اس قدر بے بسی طاری ہوتی ہے کہ کونین میں نہ سما سکنے کا آدم کی قوت ایک کانٹا چبھنے سے غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کی ترقی کے امکان اور اس کے اندر مضمر صلاحیتوں کا یہ حال ہے کہ افلاک کی امکانی وسعتیں اس کے ایک گوشۂ ادراک میں سما جاتی ہے۔ ادنیٰ منزل میں رہتے ہوئے فلک بھی اس سے افضل ہے اور ملک بھی لیکن ترقی کرتے کرتے وہ ان کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے

ملائکہ کو بھی انسان کے ساتھ شرکت حاصل ہے۔ وہ علم جس نے انسان کو مسجود ملائک بنا دیا صورتوں کا علم نہیں بلکہ معانی کا علم ہے۔ انسان کی روحانی زندگی کے لئے بحرِ معانی ہی آبِ حیات ہے۔

آدم کے لئے جو شمس و قمر مسخر ہو جاتے ہیں تو اس کی وجہ علم فطرت اور علم اشیا ہے۔ جس کی بدولت کائنات کی قوتیں اس کے ساتھ سر بسجود ہوتی ہیں۔ علم کی قوت میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔

اکثر ادیان نے دین کا مدار انسان کی بے بسی پر رکھا ہے اور اس کو یقین دلانے کی

کوشش کی ہے کہ تو کچھ نہیں۔ تیرا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے تو مجبور ہے۔ تو مقہور ہے۔ تو ناکردہ گناہ معتوب ہے۔ تیری نیکی کی کچھ حقیقت نہیں۔ تیری عقل جس پر تجھ کو ناز ہے ایک گمراہ کن چیز ہے۔ اسلام نے اس کے برعکس انسان کے اندر اذعان کو راسخ کرنے کی کوشش کی ہے کہ علم بے بہا نعمت ہے اور عقل وہ جوہر ہے جس پر کائنات کا نظام قائم ہے۔ چونکہ کائنات کی تنظیم عقل میں ہے اور انسان میں اس کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ صورت پائی جاتی ہے اس لئے انسان اپنی عقل کو کائنات کی عقل کا آئینہ بنا سکتا ہے۔ جو انسان عقل کا صحیح استعمال کرے گا اور اس کو جذبات اور عصبیاں کی آلودگی سے پاک رکھے گا اس کو تسخیر فطرت میں حصہ ملے گا۔ اور خلافت الٰہیہ سے بہرہ اندوز ہوگا۔ لیکن مادی سائنس کی ہر ترقی نے انسان کی تذلیل و تحقیر کی ہے۔ قرآن کریم نے مادیت حسن پرستی اور جبریت کو ابلیسیت قرار دیا ہے شیطان مادہ پرست بھی ہے، حسن پرست بھی اور جبری بھی۔ شیطان نے محض مادیت کے نقطۂ نظر سے اپنے آپ کو آدم پر مرجح اور اس پر افضل سمجھا ہے۔ وہ آدم کے اندر علم کی صلاحیت اور اس کے لامتناہی امکانات کو نہ دیکھ سکے۔

قرآن کریم نے کہا کہ انسان کی فضیلت اور خلافتِ الٰہیہ کے لئے اس کی صلاحیت علم کی بدولت ہے۔ مولانا بھی فرماتے ہیں کہ تمام ترقی علم و عقل اور آگاہی کی ترقی ہے۔

حیاتیاتی نظریہ جسے ڈاروِن نے پیش کیا وہ مولانا کے نظریہ ارتقاء کے مقابلہ میں ست

ما بفلک بودہ ایم یار ملک بودہ ایم — باز ہماں جا رویم باز کہ آں شہر ماست
ما ز فلک برتریم وز ملک افزوں تریم — زیں دو چرا نہ گزریم منزل ما کبریاست

اس وقت ملکیت انسانیت سے اوپر کا درجہ معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملکیت انسان کی موجودہ بہیمی حالت سے برتر ضرور ہے کیونکہ ملکیت کے اندر ذات مشیت انیہ دی عصبیاں کے مشائبہ سے منزہ ہے لیکن انسان کو فرشتگی سے بھی گزر کر اوپر کے درجات میں جانا ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں "باز دیگر از ملک پراں شوم"

مادی اور حسّی سائنس اور ڈاروِن یا برگساں کے انداز کا نظریۂ ارتقا یا نطشے کا فوق الانسان سب اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارنے کے مترادف ہے ان سب

کو احساس ہُوا کہ انسان ارتقائ سے یہاں تک پہنچا ہے، اور اسے اور آگے بڑھنا چاہیئے۔ لیکن وہ حقیقت میں کدھر سے آرہا ہے اور کدھر جا رہا ہے اور آگے کی منزل کی کیا کیفیت ہے وہ اسی تشریح اور تجربہ حیات سے معلوم ہو سکتی ہے جو عارف رومی کے ہاں ملتا ہے، اور جسے آدم کے متعلق قرآن کریم کی تعلیم سے اخذ کر سکتے ہیں۔

صورت و معنی :- مثنوی کا ایک خاص مضمون جو حقیقت میں مثنوی کے جواہر الحکیم میں سب سے زیادہ قیمتی جوہر ہے۔ صورت اور معنی کا باہمی رابطہ ہے۔ مولانا کی مثنوی۔ مثنوی معنوی کہلاتی ہے۔ اسی سے اس کے خاص موضوع کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مثنوی میں مولانا نے اس عقیدے کو کئی جگہ دہرایا ہے کہ عالم میں ہر چیز کا ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ ارتقائے روحانی ظاہر سے باطن کی طرف آنے کا نام ہے۔ لیکن جس طرح ہر ہے اسی طرح ہر باطن کا ایک ظاہر بھی ہوتا ہے اس لئے عالم خلق میں صورت سے گریز نہیں۔ عبادت ایک معنوی چیز ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ افعال و اعمال ظاہری میں اس کا اظہار ہو مولانا نے اس کو کئی قسم کی مثالوں سے واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں دیکھو کوئی ثمر بغیر پوست کے نہیں ہوتا۔ فطرت جہاں مغز پیدا کرتی ہے وہاں اس کے اوپر چھلکے کا غلاف ضرور چڑھا دیتی ہے۔ مغز سے لطف اُٹھانے والا مغز نکال لیتا ہے اور چھلکا گاؤ خر کے لئے پھینک دیتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں یہی حال دینی تعلیم کا ہے۔ یہ تعلیم الفاظ میں دی جاتی ہے صحیفۂ آسمانی الفاظ پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔ قرآن کریم کا مغز بھی الفاظ کے پوست کے اندر ہے۔

ادنیٰ ذہنیت کے لوگ آیات و روایات کے حافظ بن جاتے ہیں لیکن چونکہ قشر خوار ہیں اس لئے جسمانیات سے اوپر پرواز نہیں کر سکتے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ مادیت اور جسمانیت پر نظر جمانے والا سب سے پہلے ابلیس تھا۔ ابلیس کا علم جو معنوی چیز تھی اس کو نظر نہ آسکتا تھا

مولانا کا صورت و معنی کا فلسفہ تمام تر ماہیتِ روح پر مبنی ہے۔ ان کے نزدیک روح کی حقیقت نورِ شعور ہے۔ یہ شعور نور اپنے ارتقا میں مختلف قالب اختیار کرتا ہے مولانا کے عقیدے کے مطابق روح رجعت الی اللہ کے سفر میں جماد سے گزری۔ اور پھر نباتات سے گزری۔ ارتقائے حیات نورِ شعور کی ترقی کا نام ہے۔ زندگی کا ارتقاء

لطیف سے لطیف تر معانی کی طرف ہے۔ خود روح حیوانی جسم حیوانی کے مقابلے میں کثیف ہے اور لبطور جسم ہے پھر روحِ عقلی روحِ نبوی کے مقابلے میں لطیف تر ہے۔ تمام تصورات اور صورتوں کا وجود خدا ہی کی بدولت ظہور میں آتا ہے تمام عالموں میں کم و بیش صورت اور جسم کا دخل ہے۔ خدائے تعالیٰ جو معنیٔ مطلق ہے وہ کسی عالم میں اور کسی صورت میں نہیں سماتا اور نہ اس سے خارج ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

مسجد حرام پیش اہلِ ظاہر کعبہ است پیش عاشقاں و خاصاں وصالِ حق است

فرماتے ہیں کہ خالص صورت پرست عقل اور احساس کا ادراک اتنا ضعیف ہے کہ ادنیٰ معانی تک بھی اس کی رسائی مشکل ہوتی ہے۔

دنیا میں ہر صورت ایک علامت یا ایک رمز ہے جو معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے، جس طرح ہر صورت کسی معنی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اسی طرح ہر شے کا وجود اور اس کی طلب کسی مقصد کے ماتحت ہے۔

سلسلۂ مقاصد کے متعلق مولانا فرماتے ہیں کہ یہ تسلسل خدا پر ختم ہوتا ہے۔

اسی طلب سے جنّت کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے۔ نعیم جنّت کی ایک ظاہری تاویل ہے اور ایک معنوی۔

تمام مثنوی اس مضمون سے بھری پڑی ہے کہ صورت کی طرف نہ جاؤ اور اسی کو حقیقت وجود نہ سمجھ لو۔ کیونکہ صورت معنی کی مظہر ہے۔ اور معنی روحی چیز ہے۔ روح ہی کی وساطت سے عالم صورت وجود میں آتا ہے۔ حقیقت اور عالم معنوی کی طرف آؤ جو کمال درجے کی صورت گری کے باوجود بے صورت ہے بے جسم ہے بے جہت ہے۔ اور زمان و مکان سے بھی بے نیاز ہے۔ عالم صور و محسوسات کا روح انسانی کی پیداوار یا اس کا پرتو ہونا ایک نہایت عسیر الفہم مسئلہ ہے، لیکن بڑے بڑے حکماء کا یہی مذہب رہا ہے۔ عارف رومیؒ اس معاملے میں ان کے ہم نوا ہیں، اور اپنے روحانی وجدان سے اس کی تصدیق کرتے ہیں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عالم مادی پشتِ آئینہ ہے اور روئے آئینہ خود قلب ہے ؎

آئینہ کردم عیاں رو لیش دل و پشتش جہاں

مثنوی میں ایک مقام پر مولانا افسوس کرتے ہیں کہ لوگ پشتِ آئینہ کی زیبائش میں محو ہو جاتے ہیں اور اس میں زر و جواہر جڑنے لگ جاتے ہیں لیکن روئے آئینہ جو اصل مقصود ہے اس کی طرف سے لاعلم اور غافل ہوتے ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ صورت اور بے صورتی یا عالم ظاہر اور عالم معنی کا تعلق اسی عارف کی سمجھ میں آ سکتا ہے، جو حقیقت شناسی میں خود سراپا معرز ہو گیا ہے۔ عرفانِ حقیقت میں صور نقوش ناپید نہیں ہوتے بلکہ اس آب و خاک کی صورتوں کے علاوہ اور نقوش بھی نظر آتے ہیں لیکن نقش و نقاش کا باہمی رابطہ معلوم ہو جاتا ہے۔ اصلِ حیات صورت گر بھی ہے، اور بُت شکن بھی۔

عالم اسباب

سلسلۂ علت و معلول:۔ حکمائے سائنس۔ فلاسفہ اہلِ دین اور صوفیہ سب کے ہاں سلسلۂ علت و معلول کی توجیہات ملتی ہیں۔ لیکن توجیہات میں بے حد اختلاف نظر آتا ہے۔ کسی نظریۂ حیات میں یہ امر نہایت اہم اور اساسی ہوتا ہے کہ دنیا میں جو سلسلۂ علت و معلول کا نظر آتا ہے اس کی ماہیت کیا ہے۔

مولانا کے زمانے میں مذہبی عقاید کے سلسلے میں قانونِ تعلیل کی بابت مختلف گروہوں نے مختلف نظریات اختیار کر رکھے تھے۔ مثنوی میں علت و معلول کے متعلق جو بحثیں ملتی ہیں وہ زیادہ تر انہی عقاید اور نظریات سے متعلق ہیں۔ لیکن اس مسئلہ کے متعلق مولانا کی تعلیم پیش کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ قرآن حکیم کی اس بارے میں تعلیم کیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں پہلے انبیائؑ کے بارے میں ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جنہیں خرقِ عادت یا معجزہ کہہ سکتے ہیں، لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں نبی آخرالزمانؐ کا بھی کوئی معجزہ درج ہے یا نہیں۔ قرآنِ حکیم معجزات کا منکر نہیں لیکن قرآن کا اصلی رجحان یہ ہے کہ وہ خارجی فطرت میں خرقِ حالات کے مظاہر کو حقیقی ایمان کے پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں سمجھتا۔ جب لوگ معجزات طلب کرتے تو ان کو یہی جواب دیا جاتا کہ جو خدا کو منظور ہو گا تمہیں دکھا دیا جائے گا۔ قرآنِ کریم، بعثتِ نبویؐ اور اسلامی انقلاب خود سراپا اعجاز تھے، اس کے علاوہ قرآن تمام

فطرت کو معجزہ قرار دیتا ہے۔
صحیح اسلامی عقیدہ یہی ہے کہ خدا خالق و ناظم کائنات ہے۔ محدود عقل کے حکمران جب کوئی قاعدہ بناتے ہیں تو کبھی تغیّر حالات اور کبھی محض متلون خواہشات سے قاعدے کو بدل دیتے ہیں۔ لیکن جو خالق حلیم و حکیم اور عالم کل ہے، وہ ایسے قواعد نہیں بناتا۔ جنہیں بار بار بدلنے کی ضرورت پڑے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے۔
خدا کی مشیت کہیں بے حکمت نہیں اور حکمت کبھی متلون اور بے اصول نہیں۔ خدا کا کوئی فعل عبث نہیں ہو سکتا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ہر فعل کی کوئی نہ کوئی علت ہے۔
کچھ طبقات وجود انسان کے سامنے اس کے اندر اور اس کے باہر موجود ہیں اور ہر طبقے میں علت و معلول کا ایک الگ قسم کا سلسلہ ہے۔ جمادات کو ان کی جمادی کیفیت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ انہیں قوانین پر عمل کریں گے جو ان کے لئے فطرت کی طرف سے متعین ہو چکے ہیں لیکن جمادات سے اوپر نباتات کا درجہ ہے اور نباتات کے قوانین جمادات سے الگ ہیں اور بالاتر ہیں۔ جب نشو و نما پذیر بیج زمین میں ڈالا جاتا ہے تو زمین کے جمادی عناصر پہ نباتی قوانین کا عمل جاری ہوتا ہے۔ جماد کے عالم اسباب پر نبات کا سلسلہ علت و معلول دخل انداز ہو کر نتیجے کی صورت بدل دیتا ہے۔ گویا ہر پودے کی آفرینش خرقِ عادت ہے اسی طرح قرآنِ کریم معجزہ طلب کرنے والوں کو بار بار کہتا ہے کہ دیکھو جمادی زمین میں سے نباتی زندگی کس طرح پیدا ہوئی۔
عارفِ رومیؒ کے ہاں علت و معلول کا یہی نظریہ ملتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ موجودات میں اسباب کو قائم کرنا اللہ کی سُنت ہے۔ جس کیفیتّ وجود پر سلسلہ علت و معلول قائم کر دیا گیا ہے زیادہ تر نتائج اسی کے مطابق پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن قدرت کسی ایک کیفیتِ وجود میں محصور نہیں۔ اِس لئے خود قدرت بالاتر اسباب کے عمل سے کبھی کبھی خارق عادت ہوتی ہے
مولانا کا اس بارے میں اصل فیصلہ یہ ہے کہ اسباب کے گونا گوں مدارج اور سلسلے ہیں۔ اگر کبھی ایک سبب کے مطابق معیّنہ اور عادی اثر پیدا نہیں ہوا۔ تو یہ مت خیال کرو کہ بے سبب کوئی غیر متوقع نتیجہ نکل آیا ہے۔ اس قسم کا تلون اور بے اصولی خدا کی مقرر کردہ

فطرت میں نہیں۔ انبیاءؑ کے اعمال بھی اسباب کے ماتحت ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اسباب معمولی محسوسات و معقولات سے بالاتر ہوتے ہیں۔

مسببات کو اسباب کے ساتھ وابستہ کرنا خدا کی سُنّت اور حکمت ہے۔ اثر یا نتیجہ سبب کے متعاقب وجود میں آئے گا۔ بشرطیکہ سبب کے تمام شرائط سبب اور ایک دوسرے کے اسباب سے ہیں۔ تم خداوند کریم سے اس بات کا انتظار کرو گے کہ خداوند روٹی کے بغیر تمہاری بھوک کو رفع کر دے یا روٹی میں حرکت پیدا کر دے کہ خود بخود تم تک چلی آئے۔ یا ایک فرشتہ مقرر کر دے کہ روٹی کو چبا کر تمہارے معدے تک پہنچا دے۔ تو تم سُنت اللہ یعنی خدا کے طریقہ اور عادت سے بالکل جاہل ہو سہ

باقضا پنجہ زدن بنود جہاد ۔۔۔ زاں کہ آں را خود قضا بر ما نہاد

انسان کو جو اعضائے جسمانی اور توانائے نفسی عطا کئے گئے ہیں وہ زندگی میں جدوجہد سے موجودہ اسباب کو بدلنے اور بہتر اسباب سے کام لینے کے لئے ہیں۔ شاہ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ خدا نے انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی مشیت کے ساتھ جنگ کرے۔ اس طرز بیان میں بڑی جرأت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے کہ خدا کے پیدا کردہ حوادث بھی مشیت کا نتیجہ ہیں۔ مگر ان حوادث کے نتائج سے بچنا اور حفاظت کے سامان مہیا کرنا بھی خود مشیت ہی کا تقاضا ہے مشیت کا ایک پہلو مشیت کے دوسرے پہلو کے منافی نہیں۔ دونوں پہلو مل کر تکمیل حیات کا باعث ہوتے ہیں۔ فطرت غروب آفتاب سے دنیا میں اندھیرا کر دیتی ہے۔ لیکن انسان چراغ جلا کر اس اندھیرے کو شکست دیتا ہے۔

علت و معلول کے سلسلوں کو اگر مادیات اور جسمانیات تک محدود سمجھ لیا جائے تو نفس کی غیر معمولی قوتیں احاطۂ ادراک سے باہر رہتی ہیں۔ انسان کی ترقی یہ ہے کہ وہ بالاتر علتوں کے سرچشمے تک رسائی حاصل کرے اور یہ نہ سمجھے کہ اب تک جو حکماء کی عقل اور تجربے میں آچکا ہے اس سے آگے اسباب کا کوئی سلسلہ نہیں

"ہست بر اسباب اسبابے دگر"

جبر و قدر :- جبر و قدر کا مسئلہ دین و دانش کے اہم مسائل میں سے ہے۔ انسانی سوچ بچار کے ابتدائی مراحل میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ انسان فطرت کی قوتوں کو شخصی تصوّر کرتا تھا۔ قوانین فطرت اور علت و معلول کے لزوم کا انسان کو کوئی احساس نہ تھا۔ جس طرح نفسِ انسانی متلون ہے کبھی کچھ اور کبھی کچھ اور اس کی خواہشیں پابند آئین معلوم نہیں ہوتیں اسی طرح فطرت کے مظاہر کو بھی اس نے صاحبِ ارادہ ہستیاں تصوّر کر لیا تھا۔ ہر ہستی متلون تھی، اور ان مختلف ہستیوں میں کوئی تعاون بھی نہیں تھا۔ وہ عقل و اخلاق کے کسی اصول پر پابند نہ تھیں۔

وحدت وجود کی بحث کی طرح جبر و قدر کی بحث بھی آغازِ اسلام میں پیدا نہیں ہوئی۔ اسلام کی بنیادوں کو استوار کرنے والے عمل کی درستی میں اس قدر منہمک تھے کہ ان کو منطقی موشگافیوں کی ضرورت نہ تھی۔ جب عمل میں ضعف آیا تو خرد کی گتھیاں سلجھانے کا شغل پیدا ہوا۔ مومن کا ایمان جبر و قدر کے منطقی افتاد سے ماورائی تھا۔ لیکن متکلمین میں سے ہر گروہ ایک شق کو لے کر دوسری کو رد کرنا چاہتا تھا۔ جن کے لئے جبر صحیح تھا ان کے لئے اختیار موہوم تھا۔ اور جن کے لئے اختیار درست عقیدہ تھا۔ انہوں نے جبر کو باطل قرار دیا اور اس طرح جبریہ قدریہ دو گروہ ہو گئے۔

مولانا کے زمانے میں کثرت سے فقہا اور متکلمین میں جبر کا عقیدہ عام تھا اور اس کی وہ صورت جو دین اور اخلاق کو سوخت کر دینے والی ہے۔ نظری طور پر عام لوگوں نے قبول کر لی تھی۔ مولانا نے دین کی بڑی خدمت کی کہ اس کے خلاف پُر زور احتجاج کیا۔ جبر و قدر کی جو بحثیں مثنوی میں ملتی ہیں ان سے زیادہ دلکش انداز میں کسی حکیم نے آج تک اس مسئلے کو پیش نہیں کیا۔ مولانا کے نزدیک مصدرِ ہستی خدا کی ذات اور اس کی مشیت ہی ہے، وہی ہر آئین کا بنانے والا اور چلانے والا اور ہر تقدیر کا مقدر کرنے والا ہے لیکن اختیار انسان کی تقدیر کا ایک جزو لاینفک ہے اپنے اختیار سے زندگی کو جد و جہد کے ساتھ بدلنے کی کوشش تقدیر انسانی ہے جو مقدرِ الٰہی ہے۔ یہ قضا سے کشتی لڑنا نہیں، بلکہ قضائے الٰہی کے مطابق ہے ؎

باقضا پنجہ زدن نبود جہاد　　　زانکہ آں را خود قضا بر ما نہاد

عام خیال یہ ہے کہ تقدیر کا عقیدہ انسانوں کو اپاہج بنا دیتا ہے اور ان کو جدوجہد سے باز رکھتا ہے۔ مغربی اقوام موجودہ مسلمان اقوام کی پستی سے ان پر یہ الزام عائد کرتی ہیں کہ تقدیر اور راضی باقضا ہونے کے عقیدے نے ان کے دست و پا شل کر دیئے ہیں۔ لیکن اس الزام کو تاریخ جھٹلاتی ہے۔ اسلام دنیا میں غیر معمولی جدوجہد سے قائم ہوا۔ اور صدیوں تک جدوجہد کی بدولت مسلمان دنیا کے فرمانروا رہے۔

مثنوی میں مولانا نے جبریوں کے تمام دلائل کی مدلل تردید کی ہے۔ علاوہ قرآنی آیات کے جبری بعض احادیث کو بھی پیش کرتے ہیں چنانچہ یہ حدیث پیش کی جاتی ہے "مَا شَاءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَا لَمْ یَشَأْ لَمْ یَکُنْ" یعنی خدا جو چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حقیقتاً میں جدوجہد کی ترغیب ہے۔ جب تم کو کوئی کہے کہ انعام و اکرام اور انتظام سب فلاں وزیر کے ہاتھ میں ہے۔ امور سلطنت میں جو کچھ وہ چاہتا ہے ہوتا ہے تو ایک عقل مند آدمی جہاں تک ہو سکے گا اس وزیر کو خوش کرنے کی کوشش کرے گا اور اس کے احکام کے مطابق عمل کرنے میں ساعی ہوگا۔ یہ تو کوئی بیوقوف ہی کرے گا کہ اس وزیر سے بھاگنا شروع کر دے۔

مثنوی میں جبر و قدر کے اختیار کے متعلق لطیف بحثیں جا بجا ملتی ہیں۔ لیکن زیادہ تر یہ بحث شیر اور خرگوش کے قصے سے ملتی ہے جہاں خرگوش شیر کو جدوجہد سے باز رکھنا چاہتا ہے اور عدم سعی کی تلقین کرتا ہے اور شیر اس کے مقابلے میں جہد و اختیار کے حق میں دلائل دیتا ہے۔ مولانا کو اس بارے میں جو کچھ کہنا ہے وہ شیر کی زبانی بیان فرماتے ہیں۔ مولانا جو ارتقائے حیات کو زندگی کا ایک عالمگیر قانون سمجھتے ہیں فرماتے ہیں زندگی ایک سیڑھی ہے وہاں مقصد کوشی ہے کوشش شکر نعمت ہے اور اپنے آپ کو مجبور محض سمجھ لینا نعمت کا انکار ہے۔ فطرت اللہ کا آئین انعام یہ ہے کہ شکر سے

نعمت میں اضافہ ہوتا ہے اور ناشکری سے یہ نعمت زائل ہو جاتی ہے۔

ایک مقید طوطے کا ہندوستان کے طوطیوں کو پیغام بھیجنا

ایک سوداگر کے پاس ہندوستان کا خوبصورت طوطا تھا۔ ایک مرتبہ سوداگر نے سامان سفر تیار کر کے ہندوستان جانے کا فیصلہ کیا۔ رخصت ہوتے وقت گھر کے نوکروں تک پوچھا کہ وہ ان کے لئے کیا کیا تحفے لائے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی فرمائش پیش کی اس نے سب سے وعدہ کیا اور طوطے سے بھی اس کی فرمائش پوچھی۔ طوطے نے کہا کہ جب تو ہندوستان میں وہاں طوطیوں کو دیکھے تو میرا حال یوں بیان کرنا کہ تمہاری قوم کا فلاں طوطا جو تمہاری ملاقات کا مشتاق ہے۔ گردش آسمانی کے سبب ہماری قید میں ہے۔ اس نے تمہیں سلام بھیجا اور اپنی خلاصی کا مشورہ طلب کیا ہے اور کہا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ میں تمہارے اشتیاق ہی میں ختم ہو جاؤں اور فراق میں جان دے دوں۔ کیا یہ انصاف ہے کہ میں تو قید سخت میں گرفتار رہوں اور تم کبھی سبزے اور کبھی درختوں پر مزے اڑاتے پھرو۔ کیا دوستوں کے آئین وفا ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کہ میں اس قید میں گرفتار ہوں اور تم خوشبو کے باغوں میں آزاد پھرو۔!

سوداگر نے اس کا پیام و سلام ان تک پہنچانے کا وعدہ کیا۔ جب ہندوستان کی حدود میں پہنچا تو جنگل میں چند طوطیوں کو دیکھا۔ گھوڑا روک کر آواز دی اور اپنے طوطے کا سلام اور وہ پیغام جو امانت تھا انہیں پہنچا دیا۔ ان میں سے ایک طوطا تھر تھر کانپ کر زمین پر گر پڑا۔ اور اس کا سانس اکھڑ گیا۔ سوداگر طوطے کو یہ خبر دے کر بہت پشیمان ہوا۔ اور جی میں کہنے لگا کہ میں نے ناحق ایک جان لے لی۔

القصہ جب سوداگر کاروبار تجارت سے فارغ ہو کر اپنے وطن واپس آیا تو ہر غلام کے لئے تحفہ لایا اور ہر لونڈی کو ہدیہ دیا۔ طوطے نے پوچھا میری فرمائش بھی پوری کی کیا کہا اور کیا دیکھا بیان کر۔ سوداگر نے کہا کہ نہیں میرا جی نہیں چاہتا کہ میں خود کہہ کر پشیمان

ہوں۔ اپنا ہاتھ چباتا اور انگلیاں کاٹتا ہوں کہ بیہودگی سے ایسا بُرا پیغام بالکل بے سمجھی اور بھولے پن سے کیوں لے گیا طوطے نے کہا اے میرے مالک پشیمانی کا ہے کی! وہ ایسی پشیمانی ہے جس نے اس قدر غصہ اور غم پیدا کر دیا ہے۔ سوداگر نے کہا کہ تیرے ہم جنس طوطیوں کے گروہ سے میں نے تیری داستان پیش کی۔ ان میں سے ایک طوطا تیرا درد آشنا تھا۔ پیغام سنتے ہی اس کا پتا پھٹ گیا۔ کانپ کر گرا اور مر گیا میں از حد پشیمان ہوا کہ پیغام ہی کیوں دیا لیکن جب منہ سے نکل چکا تو پشیمانی بے فائدہ ہے۔ سوداگر کے طوطے نے جب یہ واقعہ سنا تو وہ بھی تھر تھرا کر گرا اور ٹھنڈا ہو گیا۔ مالک نے طوطے کو اس حال میں گرا ہوا پایا تو کھڑا ہو گیا اور ٹوپی زمین پر پٹخ دی۔ رنج و غم کے مارے اپنا بھی گریبان چاک کر دیا۔ بین میں کہتا تھا کہ اے خوب صورت اور خوش آواز طوطے! ارے یہ تجھے کیا ہو گیا۔ تو ایسا کیوں ہو گیا۔ ہائے ہائے تو ایسا تھا تو ویسا تھا۔ آخر جب رو پیٹ چکا تو اس کو پنجرے سے باہر پھینک دیا۔ فوراً ہی طوطا اڑ کر ایک بلند شاخ پر جا بیٹھا۔ اس مردہ طوطے نے اس طرح کی پرواز کی جیسے آفتاب مشرق سے دھاوا کرتا ہے۔ مالک پرندے کی اس حرکت پر حیران رہ گیا۔ بھلاوے میں پڑا ہوا تھا یکایک پرندے کے چلتر جو دیکھے تو سر اونچا کر کے اس سے مخاطب ہوا اور یہ کہا کہ اے میرے بلبل! اپنے حال کی تفصیل میں سے کچھ حصہ ہم کو بھی دے۔ ہندوستان کے طوطے کی وہ کیا رمز تھی جس کو تو بھانپ گیا اور ہماری آنکھوں پر اپنے مکر سے پردہ ڈال دیا۔ تو نے وہ چال کھیلی کہ ہم کو جلایا اور خود روشن ہو گیا۔ طوطے نے کہا کہ اس نے اپنے عمل سے مجھے یہ نصیحت کی نغمہ آواز اور خوشدلی کو ترک کر۔ کیونکہ تو اپنی صدا کے باعث ہی گرفتار ہوا ہے صرف نصیحت کی غرض سے اس نے اپنے آپ کو مردہ بنا لیا۔

یعنی اے پرندے! تو جو عام و خاص کا دل بہلانے والا گویا ہے تو مردہ بن جا۔ تا کہ قید سے خلاصی پائے۔ پھر طوطے نے سلام کر کے کہا۔ بس اب خدا حافظ اے میرے مالک! الوداع۔ تو نے بڑی مہربانی کی کہ مجھے اندھیری قید سے آزاد کر دیا مالک (سوداگر) نے کہا۔ خدا کی امان جا تو نے جاتے جاتے مجھے ایک نئی راہ دکھائی

ہے یہ میرے لئے نصیحت ہے۔ آئندہ میں اسی کا راستہ اختیار کروں گا کیونکہ یہ سیدھا اور واضح راستہ ہے میری روح ایک طوطے سے کم تر نہیں ہے۔ جان تو ایسی ہونی چاہیئے جو حق کے راستے میں دوڑ دھوپ کرنے کے لئے آمادہ ہو

ایک تاجر کا قصہ جسے ہندوستان تجارت کیلئے آتے وقت ایک طوطے نے ہند کے طوطوں کو پیغام دیا

ص ۱۰۳

نمبرا بازرگان۔ تاجر محبوس: مقید۔ قید میں پھنسا ہوا۔

زیبا۔ خوبصورت

منظوم ترجمہ۔ ایک طوطی پاس اک تاجر کے تھی، اور قفس میں بند وہ مدت سے تھی

ایک تاجر کے پاس طوطا تھا اور یہ خوبصورت طوطا پنجرے میں بند تھا۔ یعنی ایک تاجر کے پاس ہندوستان کا ایک پیارا سا طوطا تھا۔

تشریح۔ اس حصہ میں مولانا نے چند اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ یہاں مولانا روم نے طوطی سے مراد جان اور تاجر سے مراد "مرشد کامل" ہندوستان سے مراد "عالم قدس" اور طوطیوں سے مراد "اولیا و انبیا کی ارواح مقدسہ" لی ہیں۔

نمبر۲۔ ساز کرد تیار کیا

منظوم ترجمہ جو سفر کا عزم تاجر نے کیا اور سوئے ہندوستان جانے لگا

جب سوداگر نے سفر کا سامان باندھا۔ اور ہندوستان جانے کے لئے آمادہ ہوگیا۔

تشریح:۔ جب اس مرشد کامل نے تمام کثافتوں کو دھو ڈالا۔ اور اپنے دل میں صفا و جلا پیدا کرکے اس عالم قدس کا رخ کیا۔ جہاں گناہوں کے اندوہناک سائے نہیں جہاں کثافتوں کی تاریکیاں نہیں بلکہ پاکیزگی اور تقدس کا دور دورہ ہے۔

نمبر ۴۳ : جود :- سخاوت۔ از جود۔ از راہ کرم۔ کرم نوازی کی بنا پر۔
منظوم ترجمہ ہر غلام و لونڈی سے وہ پوچھتا
واسطے تیرے میں لاؤں کیا ؟ بتا ؟

اپنی کرم نوازی کی بنا پر ہر غلام، ہر کنیز سے کہا کہ آپ سب جلد بتائیں کہ آپ کیلئے کیا کیا تحفہ لاؤں۔

تشریح :- غلام اور کنیز سے مراد یہاں عام لوگ لئے جا سکتے ہیں۔ جو خواہشات کے غلام ہوتے ہیں اور جنہیں دنیاوی خواہشات اپنا اسیر بنائے رکھتی ہیں۔ ان کی روح کچل جاتی ہے اور وہ دنیا کے پرستار، مادیت کے خواہاں بن جاتے ہیں۔ ان کی روح کبھی بھی بالیدگی نہیں پاتی۔ چنانچہ اس مرشد کامل نے جو لوگوں سے جو کہ اس کے حلقۂ اثر میں تھے۔ ان سے پوچھا کہ ان کی خواہشات کیا ہیں۔ کیا ان کی روح میں بھی کبھی تڑپ اور کسک پیدا ہوئی ہے ؟

نمبر ۴۴ ہر کسی نے اپنی عرضوں کو کہا۔
منظوم ترجمہ اس نے وعدہ سب کے لانے کا کیا

نثر ترجمہ :- ہر ایک نے اس سے اپنی اپنی پسند اور خواہش کا اظہار کیا اور سب کے ساتھ اس نیک دل نے وعدہ کر لیا۔

تشریح :- اس مرشد کامل کے کرم اور وسیع ظرفی کا یہ تقاضا تھا کہ وہ سب سے وعدہ کر لے کہ وہ ان کی ان خواہشات کو پورا کرے گا جو انہوں نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق کی ہیں۔

نمبر ۵۔ ارمغان۔ تحفہ کار مست کہ آرم برای تو
خطہ۔ مراد ملک۔ علاقہ

منظوم ترجمہ۔ بولا طوطی سے تیری خواہش ہے کیا۔ لاؤں ہندوستان سے کچھ تو بتا
پھر طوطے سے پوچھا۔ تیری کیا فرمائش ہے کہ میں تیرے لئے سرزمین ہند سے کیا لاؤں ؟

تشریح :۔ طوطی جان سے بھی یہی سوال کیا کہ اس کی کیا خواہش ہے اور عالم قدس سے وہ کس چیز کی خواہاں ہے۔

نمبر ۶ گفتش. گفت باو

منظوم ترجمہ۔ بولی طوطی کہ وہاں ہیں طوطیاں توجو دیکھے حال میرا کر بیان

ترجمہ :۔ اس طوطے نے کہا جب تم وہاں طوطوں کا جھنڈ دیکھو تو میرا حال ان سے بیان کرنا۔

تشریح :۔ یہ ایک نفسیاتی امر ہے کہ جب کسی کو کوئی مشکل درپیش ہو۔ اور وہ اپنے ساتھیوں سے حال بیان کر دے تو غم کا بوجھ ایک خاص حد تک ہلکا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ طوطا جو کہ طالب حق ہے وہ ان ارواح کو پیغام بھیجتا ہے جو کہ مادی دنیا سے بہت دور عالم قدس میں ہیں۔ جہاں ان کو کوئی خلش نہیں اور نہ اضطراب کیونکہ جب قطرہ دریا میں مل جاوے تو اپنی منزل پا لیتا ہے۔ اسی طرح وہ ارواح بھی اپنی کل میں مل چکی ہیں گویا منزل سے ہمکنار ہیں۔

نمبر ۷ قضائے آسمان :۔ آسمان سے نازل کردہ حکم الٰہی۔ عام طور پر جب کوئی مصیبت نازل ہوا کرتی ہے تو وہ آسمان کی جانب سے ہی آتی ہے۔ شاعروں نے سے چرخ گردوں اور سپہر واژگون کا ہی فعل قرار دیا ہے مسعود سعد مسلمان نے تو آسمان کے سامنے یوں اپنے عجز کا اظہار کیا ہے۔

نرسد دستِ من بچرخ بلند ورنہ بگشادمش بند از بند

منظوم ترجمہ :۔ کہ تمہاری طوطی اک مشتاق ہے اور قضا سے قید میں وہ میری ہے

ترجمہ :۔ فلاں طوطا جو تم سب سے ملنے کا متمنی ہے وہ قضائے آسمانی سے ہماری قید میں ہے۔

تشریح :۔ قضا کے معنی ہیں حکم الٰہی۔ حجۃ اللہ البالغہ میں ایک روایت درج ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کوئی حکم دیتا ہے تو عرش کے اٹھانے والے فرشتے تسبیح پڑھتے ہیں یہاں تک کہ وہ تسبیح اسے نیچے کے آسمان والوں تک پہنچ جاتی ہے چونکہ اہلِ ارض کے محاورے میں نزول وصعود کا اطلاق آسمان کے ... مخصوص ہے۔ اس

لئے فضا کو آسمان سے منسوب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ روح جو کہ اپنی اصل سے عبدا ہے وہ برضائے ایزدی جدا ہے۔ لیکن اس میں یہ تڑپ بدستور رہتی ہے کہ وہ کل میں مل جائے گا۔

نمبر ۱۰ مانگتی ہے داد کہتی ہے سلام
منظوم ترجمہ چاہتی ہے وہ علاج اور لطف عام

ترجمہ :۔ اس نے تمہیں سلام کہا ہے اور تم سے داد خواہی کرتا ہے اور تم سے کوئی تدبیر اور ہدایت کی راہ طلب کی ہے۔

تشریح :۔ وطن سے بچھڑا ہوا، اپنے ہمنواؤں سے ملنے کے لئے بے قرار طوطا ان سے ملتمس ہے کہ وہ کوئی چارہ گری کریں۔ کوئی راہبری کریں جو اس کے درد کا درماں ہو۔ اصطلاح تصوف میں ارشاد سے مراد راہ تلقین ہے جس کی مدد سے راہ سلوک طے ہوتی ہے۔ انسان اگر چاہے بھی تو اس وقت تک وہ کچھ نہیں کر سکتا جب تک کہ مشیتِ ایزدی ممد و معاون نہ ہو۔ روح اسی وقت ہی کثافتوں سے پاک ہو سکتی ہے جبکہ خدا کی مدد شامل حال ہو۔ اور اس وقت ہی راہ سلوک پر کامیابی سے مختلف مدارج و مراحل طے کر سکتا ہے جب خدا کی امانت ہو۔ چنانچہ روح بھی مدد کی بھیک مانگ رہی ہے۔

نمبر ۹ چاہتی ہوں یہ ز روئے اشتیاق
منظوم ترجمہ : میں یہاں دوں جان بہ دردِ فراق

ترجمہ :۔ اس نے پھر کہا کہ کیا یہ ان ساتھیوں کے شایانِ شان ہے کہ میں یہاں فراق میں تڑپتا رہوں اور فراق میں گھل گھل کر مروں کہ "ذالموت صعب و فراق اصعب من الموت"

تشریح :۔ اس شعر میں روح اپنی کیفیات و واردات کو بیان کر رہی ہے کہ دوستی اسے نہیں کہتے کہ میں تو فرقت کی آگ میں جلتی رہوں۔ ہجر کی سہمگین کیفیات کا

سامنا کروں۔ مولانا روم انہی کیفیات کو بانسری کی زبان سے یوں ادا کرتے ہیں ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند — وز جدائی ہا شکایت می کند

ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

فراقِ دوستان دیدن نشانی باشد از دوزخ
معاذ اللہ غلط کردم کہ دوزخ زاں نشاں باشد

نمبر ۱۰۔ تم کو زیبا ہے کہ میں قیدی رہوں
منظوم ترجمہ:۔ تم مزے لوٹو تو میں مرتی رہوں

ترجمہ:۔ کیا یہ ان کے لئے مناسب ہے کہ میں تو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کروں۔ اور وہ کبھی سبزے پر اٹھکیلیاں کریں اور کبھی خوشی سے درختوں پر جھولیں۔

تشریح:۔ گویا طوطا پوچھتا ہے کہ انہیں چین کس طرح ہے اور وہ اپنی زندگی خوشیوں میں کس طرح بسر کرتے ہیں۔ جبکہ ان کا ایک ساتھی مقید ہے۔ بند سخت سے مراد ہے۔ رُوحِ عنصری یہ جسم روح کے لئے ایک قید خانہ ہے جہاں کئی مرتبہ روح مسلی جاتی ہے جسم کے تقاضے اس قسم کے ہوتے ہیں کہ بسا اوقات دل بہک جاتا ہے۔ وہ خواہشات کی دل فریبیوں میں اس طرح کھو جاتا ہے کہ روحانی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ بچھڑی ہوئی روح بھی یہی فریاد کر رہی ہے کہ میں تو اس قید خانہ میں مقید ہوں اور تم عالم بالا میں پرواز کر رہے ہو۔

نمبر ۱۱:۔ دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشان حالی و درماندگی!!

منظوم ترجمہ:۔ کیا یہی ہے بس وفائے دوستاں، میں رہوں زنداں میں تم در بوستاں

ترجمہ:۔ کیا یہی دوستوں کی وفا ہے کہ میں قید ہوں اور وہ باغ و بہار کے مزے لوٹیں۔

تشریح:۔ دوست تو وہ ہے جو غموں کو ہلکا کرنے والا ہو۔ جو دکھوں کو بانٹنے والا ہو اور جو دوست کے تمام غموں کو اپنی وفا سے دھو ڈالتا ہے لیکن دوستی

بہ نہیں کہ دوست تو زندان عنصری میں نت نئی الجھنوں کا شکار ہو رہا ہو لیکن دوست اس کے غم سے بالکل غافل باغ و لاغ میں اٹھکیلیاں کرتے پھریں۔

نمبر ۱۲ مرغ زار۔ دل شکستہ پرندہ مرغ: گھاس۔ مرغزار۔ سبزہ زار۔ دونوں لفظوں میں صفت تجنیس ہے صبوحی: صبح کی شراب

مہمان: جمع مہہ۔ سردار۔ یہاں مراد ہے خوش قسمت طوطے۔

منظوم ترجمہ: یاد تم یارو کرو اس مرغ کو صبح کو جب جام نوشی تم کرو

ترجمہ: اے آزاد اور فارغ البال ساتھیو! سبزہ زار میں صبح کے چھپنے کے وقت اس دل شکستہ کو بھی یاد کر لیا کرو۔

تشریح:۔ یہاں بھی پہلے والے مضمون کو جاری رکھتے ہوئے طوطا اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ اے میرے دوستو! تمہیں آزادی نصیب ہے اور تم لطف اندوز ہو رہے ہو۔ لیکن تم اس خوشی کے سمے اپنے اس حرماں نصیب دوست کو بھی یاد کر لیا کرو۔ جس کی زندگی تلخیوں اور ناکامیوں کا مرقع ہے۔ حافظ ایک جگہ کہتے ہیں۔

نگرش صحبت دیرین من از یاد بشد رفت
اے نسیم سحری یاد دہش عہد قدیم
اے نسیم سحری بندگی ما برسان!
کہ فراموش مکن وقت دعائے سحرم

نمبر ۱۳

منظوم ترجمہ:۔ یاد یاروں کی ہے نافع یار کو خاص کر وہ لیلیٰ اور مجنوں یہ ہو۔

ترجمہ:۔ دوست کا دوست کو یاد کرنا بہت مبارک ہے جبکہ دونوں میں اس قدر الفت و محبت ہو کہ وہ ایک دوسرے کے لئے بیقرار ہوں۔ ایک مثل لیلےٰ کے اور دوسرا مانند مجنوں ایک دوسرے کے جویا ہوں۔

تشریح:۔ بابا طاہر نے اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے۔

چہ خوش بی مہربانی ہر دو سر بی | کہ یکسر مہربانی درد سر بی
اگر مجنوں دل شوریدہ داشت | دل لیلیٰ از و شوریدہ تر بی

کتنا مبارک ہے وہ غم جو کہ محبوب کے لئے ہو۔ کتنی فرحت بخش ہے وہ خلش جو محبوب کی محبت میں ہو۔ اس بے قراری میں کتنی لذت ہے جو محبوب کی فرقت میں ہوتی ہے محبت میں ہر چیز کیف آور ہوتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ جس کے ساتھ محبت کی جارہی ہو وہ بھی متاثر ہو۔ اور اس پر بھی اضطراب کا اثر ہو۔ اگر ایک مجنوں ہے تو دوسری لیلیٰ ہو۔ بقول شاعر

الفت کا جب مزا ہے کہ ہوں وہ بھی بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

نمبر۱۴ حریف دوست، دشمن قدح، پیالہ

منظوم ترجمہ یارو تم ہمراہ ہو معشوق کے میں پیوں یاں جام خون آشام کے

ترجمہ:۔ اے دوستو جب تم اپنے خوش اندام اور حسین محبوب کے ساتھ بزم آرا ہو تو مجھے بھی یاد کرنا کہ میں اپنے خون جگر کے پیالوں پر پیالے لنڈھائے جارہا ہوں۔

تشریح:۔ اے میرے دوستو! تم جو کہ وصل کی دولت سے سرفراز ہو۔ اور محبوب کا قرب بھی تمہیں نصیب ہے لیکن میری کیفیت دوسرے ہے میں محبوب کی فرقت میں سوز جگر میں جل رہا ہوں مگر اس سوز میں بھی ایک مزہ ہے اور ایک خاص قسم کا لطف ہے لیکن تم جب وصل سے بہرہ ور ہو۔ تو مجھے یاد کر لینا۔ لیکن اس شخص کو فرقت کی تڑپ کا اندازہ نہیں ہو سکتا جو کہ ان حالات سے دوچار نہ ہو۔ عیش میں مخمور رہنے والا گرفتاران بلا کی مصیبت کو کیا جانے

تو اے کبوتر بام حرم چہ می دانی | طپیدنِ دل مرغانِ رشتہ بر پا را

سعدیؒ کہتے ہیں:۔

مرغانِ قفس را المی باشد و شوقی | کاں مرغ نداند کہ گرفتار نباشد

نمبر ۱۵۔ ایک پیالہ یاد میری میں پیو

منظوم ترجمہ:۔ چاہتی ہوں داد گر تم داد دو

ترجمہ:۔ اگر تم میری بات کا انصاف کرنا چاہتے ہو تو شراب کا ایک جام میری یاد میں بھی نوش فرماؤ۔

تشریح:۔ اپنی محفل میں اس غریب الدیار وطن سے دور افتادہ اور دوستوں سے مہجور کو یاد کرو۔ بقول حافظ ؎

چو با حریف نشینی و بادہ پیمائی بیاد آر حریفانِ بادہ پیما را

غنی لکھتے ہیں۔ ؎

گر شوی واصل بمنزل مگسل از پسماندگان در طریقی ہمرہی پہلو نشینِ جادہ باش

نمبر ۱۶ باد بیار اس خاک بر سر کے لئے

منظوم ترجمہ:۔ جب پیو تو ڈالو قطرے خاک پہ

ترجمہ:۔ اور جب تم شراب نوشی کر رہے ہو تو واماندہ و دور افتادہ کی یاد میں ایک گھونٹ شراب زمین پر گرا دیا کرو۔

تشریح:۔ اگر خود میری یاد میں نہیں پی سکتے تو مے کشوں کے آئین کے مطابق دو گھونٹ میری یاد میں زمین پر گرا دیا کرو۔ دوست کو یاد کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ کہ جب مے نوشی کی جا رہی ہو تو اگر کوئی عزیز دوست قریب نہ ہو تو اس کی یاد میں شراب زمین پر گرا دیتے ہیں۔ اس شعر میں طوطی مہجور بھی یہی درخواست کر رہی ہے کہ اے میرے دوستو! اگر میں تمہارے پاس نہیں تو تمہیں میری دوری و بُعد کا احساس تو ہونا چاہیئے یہی امر میرے لئے باعثِ تسکین ہو گا۔

نمبر ۱۷:۔ سوگند قسم کوتہ کہاں

قند۔ میٹھا۔ شریں

منظوم ترجمہ:۔ اے عجب، وہ عہد وہ قسمیں کہاں؟ وہ لب شریں کے وعدے ہیں کہاں

ترجمہ:۔ تعجب ہے کہ وہ وعدہ و پیمان اور قسمیں کیا ہوئیں اور لب شکر خا کے

دلا سے کدھر گئے ؟
تشریح :۔ اس شعر میں رومی اب مناجات ایزدی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس میں فرطِ عشق اور محویت کے عالم میں بعض ایسے الفاظ کہے گئے ہیں جو کہ سوءِ ادب ہیں لیکن اس امر کو قابل گرفت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ سرشادی جذبات میں لکھا گیا یعنی اے میرے محبوب تیرے وہ وصل کے وعدے کیا ہوئے۔ تو نے اپنے عہد کو فراموش کیوں کیا ہے یہ ایک عاشقِ حقیقی کا اپنے محبوب سے تقاضا ہے۔

نمبر ۱۸

منظوم ترجمہ :۔ بندہ بد گر بندگی سے ہو جدا جو کرے تو بد، بدوں سے فرق کیا؟

ترجمہ :۔ اگر بندے کا فراق اس کے عمل زشت کی بنا پر ہے تو جب تو برے کے ساتھ برائی کرے تو اس میں اور تجھ میں فرق ہی کیا ہے۔

تشریح :۔ یہاں پر مولانا مجاز سے حقیقت کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ اگر مہجور انسان ذاتِ حقیقی سے سرمدی فراق میں مبتلا ہے تو یہ اس کے گناہوں کی سزا ہے کہ دل بے حضور ہو گیا ہے۔ دنیاوی آلائشوں میں پھنس گیا ہے اور اگر الطاف ایزدی شامل حال ہوتا تو انسان کا دل فراق کی اذیت ناک سزا میں مبتلا نہ کیا جاتا۔ اب غلبۂ حال جذب میں مولانا بیان کرتے ہیں کہ میں تو گنہگار و بدکار ہوں ہی۔ لیکن اگر تو اس کی سزا دے تو پھر عبد و معبود میں فرق ہی کیا ہوا۔ تجھ سے تو میں مغفرت کی امید کرتا ہوں۔ اس سوالیہ انداز میں غفران کے لئے حسن طلب ہے بقول شاعر ؎

من بد کنم و تو بد مکافات دہی پس فرق میان من و تو چیست بگو!

یہ تو حقیقت ہے کہ ہر برے امر کی سزا ضروری نہیں کہ سخت ہو۔ لیکن خدا کے اس ارشاد سے (جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا) کسی حد تک شبہ ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خدا تو رحیم و کریم بھی ہے اور رحمان بھی۔ معاف کر دینا اس کی شانِ رحیمی کے عین مطابق ہے اور بدلہ دینا بھی رحمت سے عاری نہیں ہوتا۔ اس شعر سے پہلے تو فرقت کی شکایت کرتے تھے۔ لیکن اب رضا و تسلیم

کا اظہار کریں گے مگر غلبۂ حال کی وجہ سے خطاب کا لہجہ کسی حد تک ترک آداب کا انداز دکھتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ میں تو عبد ہوں اور سراپا غلطی۔ لیکن اے محبوب حقیقی! تو معبود ہے تیری شان اس سے ارفع ہے کہ برائی کا بدلہ برائی سے ہی دے تو تو رحیم ہے۔

نمبر ۱۹۔ خشم۔ غصہ   چنگ۔ ساز
سماع۔ سننا   بانگ۔ آواز

منظوم ترجمہ: وہ برائی جو کرے تو خشم سے
نغمۂ ہائے چنگ سے بہتر ہے وہ

ترجمہ:۔ ہر وہ برائی جو غصہ اور خفگی میں تو مجھ پر کرتا ہے میرے لئے تو وہ ساز کے سروں کے سننے سے بھی زیادہ دلکش ہے۔

تشریح:۔ سابقہ شعر میں جو سوال کیا ہے برائی کی سزا دینے سے تجھ میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ اب اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

یہ ایک حدیث ہے کہ جب کوئی نیک انسان کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور خداوند کریم اس گناہ کو دھونے کے لیے اس بندہ پر کسی رنج کسی بیماری یا دکھ کو طاری کر دیتے ہیں تاکہ اس کی اذیت سے اس دنیا ہی میں وہ گناہوں کا کفارہ کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے نیک بندے ہمیشہ اور ہر حال میں اللہ کے شکر گزار ہوتے ہیں کہ عجباً لامر المومن ان امرہ کلہ لہ خیر۔

مومن کی عجیب کیفیت ہے۔ ہر حال میں اس کے لئے خیر ہی خیر ہے۔ اسی لئے مولانا کہتے ہیں کہ تیری طرف سے نازل کردہ غم واندوہ میرے لئے بہت طربناک ہیں کیونکہ وہ بھی میری ہی بہتری کے لئے ہیں۔ محبوب حقیقی کا قہر بھی انسان کیلئے رحمت لئے ہوتا ہے اور یہاں "بدی" کا لفظ بطور استعارہ استعمال

کیا   یہ طرب و خوشی ایک عارف کو ہوتی ہے کیونکہ اس پر سب کچھ منکشف ہو جاتا ہے کہ اس سختی میں اس کے لئے کون کونسی رحمتیں منتظر ہیں۔ لیکن ایک عام دنیادار شخص کی کیفیت اس سے جداگانہ ہے کیونکہ اس سے سب حقیقتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ وہ زحمت میں اس کی رحمت کا وقوف نہیں پا سکتا لیکن وہ جب زحمت خوشگوار نتیجے پر منتج ہوتی ہے۔ تو پھر اسے پتہ چلتا ہے اور احساس ہوتا ہے۔ اس شعر میں ایک عاشق حقیقی کے جذبات کو بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح وہ محبت کے غم ہنس ہنس کر سہتا ہے کیونکہ نتیجہ اس کے سامنے ہوتا ہے۔ شیخ اکبر نے "فتوحات مکیہ" میں لکھا ہے کہ جہنم میں مجرموں کو قرب حاصل ہوگا۔ لیکن اس قرب کو محسوس کرنے والے عاشقانِ حقیقی ہی ہیں۔ کیونکہ محبوب کو تو عذاب میں قطعاً کوئی خوشی و مسرت حاصل نہیں ہوگی۔

نمبر ۲۰

منظوم ترجمہ: اے جفا بہتر تیری دولت سے ہے
انتقام افضل ہے تیرا جان سے

ترجمہ:۔ تیری طرف سے کی گئی جفائیں دنیوی دولت سے بہترین اور تیری بابت کیا گیا انتقام جان سے عزیز ہے۔

تشریح:۔ گذشتہ شعر کے مضمون کی مزید تشریح ہے کہ رحمت بصورت بالا اندا ختی کہ جو کچھ مجھ پہ وارد ہوتا ہے اس میں کوئی مصلحت، راز اور کوئی حکمت ہے اس لئے وہ مال دنیوی سے بدرجہا پسند و مقبول ہے۔ ایک عاشق کے لئے اپنے محبوب کے جور کو جفا بھی بہت عزیز ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ جور و جفا کسی خوش قسمتی کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ اس خلش اور اندرونی کرب میں بھی ایک سرمدی سکون ہوتا ہے۔

نمبر ۲۱   سورت:۔ سوزش۔ تیری طرف سے نازل کردہ سوزش۔

منظوم ترجمہ:۔   ہے یہ تیری نار تو کیا کچھ ہو نور
ہے اگر یہ غم تو کیسا ہو سرور!

ترجمہ :۔ جب تیری جدائی کی آگ ایسی روح پرور ہے تو پھر تیرا نور کیسا ہوگا۔

تشریح :۔ یعنی تیرے وصال میں کس طرح روح کو نوازا جائے گا۔ تیرے ہجران کا غم اس قدر لطیف ہے تو تیرے وصال قرب کی مسرتیں کتنی جان نواز ہوں گی۔ عاشق حقیقی ہجر کی سہمگیں کیفیات میں ایک گونہ لذت محسوس کرتا ہے اور اسے وہ تڑپ اور کسک بہت ہی عزیز ہوتی ہے کیونکہ وہ اس کے محبوب کی دی ہوئی چیز ہوتی ہے۔ اس لئے رومی کہتے ہیں کہ اے محبوب تیرے ہجر میں اتنا کیف اور کیفیات مضمر ہیں تو تیرا وصل کس قدر محبت خیز ہوگا۔ شاعر یہ تصور کر کے کہ وصل میں وہ کس قدر خوش ہوگا ایک لذت محسوس کرتا ہے۔

نمبر ۲۲۔ غور، گہرائی

منظوم ترجمہ۔ اس مزے کو جو تیرا رکھتا ہے جور بس لطافت سے کرے نہ کوئی غور

ترجمہ :۔ تیری فرقت کے جور میں جو مٹھاس اور لطافت ہے کوئی شخص اس میں تیری حکمت کی گہرائی نہیں پا سکتا۔

تشریح :۔ تیرے فراق کی ستم کی حلاوتوں سے کون تیری نوازشوں کی حقیقت کہنہ کا ادراک کر سکتا ہے وہ چیزیں جو بظاہر ہمیں بری لگتی ہیں اور ہم ان کے ظاہری کڑوے پن کو ناگوار سمجھتے ہیں۔ مگر دراصل اس سے ہماری ہی بھلائی مقصود ہوتی ہے۔ عَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ۔ مگر ہم نہیں جانتے کیونکہ انسان تو ہے ہی ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ جب تیری طرف سے نازل کردہ مشکلات کو نہیں سمجھ سکتے تو پھر تیری عطا کردہ نعمتوں کے اسرار کون جان سکتا ہے۔ یہی حال محبوب حقیقی کے فراق کا ہے جس سے واردات کا انقطاع اور حالات کا انقباض مراد ہے اس کو قبض بھی کہتے ہیں۔ اس میں بھی بہت سی حکمتیں مضمر ہوتی ہیں۔ انسان کو اس کا شعور نہیں ہو سکتا۔ لیکن عاشق آتش فرقت میں بھی جل کر ایک ایسی لطافت اور ایسا سرور محسوس کرتا ہے جس کا احساس عام انسان کو نہیں ہو سکتا۔

نمبر ۲۳۔

منظوم ترجمہ:۔ روتا ڈرتا ہوں نہ کرلے وہ یقیں
رحم سے وہ جور کم کر دے کہیں

ترجمہ :۔ میں آہ وزاری کرتا ہوں اور ڈرتا بھی ہوں کہ کہیں وہ میری آہ وزاری پر یقین نہ کرلے اور ازراہ ترحم جور کو کم کر دے۔

تشریح :۔ عاشق حقیقی کے دل میں یہ خیال بھی جلوہ گر ہوتا ہے کہ میں جو محبوب حقیقی کی فرقت میں آہ وزاری کر رہا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری اس آہ وزاری کو دیکھ کر رحمت ربانی جوش میں آجائے اور اس کے سوز و گداز میں کمی آجائے۔ بقول اقبالؒ۔ ؎

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو۔ ہجر میں لذتِ طلب

ایک عاشق یہ کبھی گوارا نہیں کرتا کہ اس کے ہیجان دروتی میں کمی آجائے اور اس کی اندرونی کربناک کیفیت میں کمی یا تخفیف ہو جائے کیونکہ وہ تو عشق کی آگ میں جلنا چاہتا ہے اور اس میں کمی کو کسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایسا ہونا تو باطنی لطف کی محرومی کے مترادف ہے۔ یہ بھی عاشق فرط عشق میں بیان کر رہا ہے کیونکہ خدا تو عالم الغیب ہے اس سے انسانی دل کی کیفیات کیسے چھپی رہ سکتی ہیں لیکن عاشق کے دل میں یہ خیال آجاتا ہے کہ کہیں وہ میری آہ وزاری کی بجائے گلہ و شکوہ ہی کا مظہر نہ بن جائے۔ ایسی صورت میں خدا کی رحمت نازل ہو گی یہ کشمکش ختم ہو جائے گی لیکن عاشق اس سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔

نمبر ۱۴۴۔ جِد۔ کوشش کرنا ضِد۔ مخالف۔ متضاد
بوالعجب۔ اور تعجب ہے۔

منظوم ترجمہ:۔ اس کے قہر و لطف پر عاشق ہوا اے عجب عاشق ہوں میں اضداد کا

ترجمہ :۔ میں اس کے قہر کا متوالا بھی ہوں اور لطف کے لیے کوشاں بھی ہوں۔ تعجب ہے کہ میں ان دو متضاد باتوں کو چاہتا ہوں۔

تشریح :۔ ذاتِ حق متضاد صفات کا مجموعہ ہے ایک طرف تو لطف و کرم کا مظہر ہے اور دوسری طرف قہر و جبر ہوگا۔ اس لیے کبھی اسے قہار، جبار اور کبھی اسے لطیف ورحیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کو مجازاً ایک دوسرے کی ضد کہہ دیا ہے۔ ورنہ منطقی ضد دوسری کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔ ایک عاشق حقیقی کا مقصود و مدعا تو صرف پیار کرنا ہوتا ہے۔ منبع و سرچشمۂ حقیقت کا دلدادہ ہے۔ لیکن اسے اس سے کوئی غرض نہیں کہ اس منبع سے کیا نکلتا ہے چنانچہ اگر قہر وقوع پذیر ہوتا ہے تو وہ متوالا و مفتون ہوتا ہے اور اسے اپنے محبوب کی چیز سمجھ کر اس سے والہانہ محبت کرتا ہے لیکن اگر قہر ہے تو اسے بھی وہ اپنے لئے یک گونہ سامانِ راحت سمجھتا ہے اس کے نزدیک قہر و مہر برابر ہے وہ تو محبت کرنا جانتا ہے اور صرف محبت۔

نمبر ۲۵ ۔ واللہ ۔ خدا کی قسم ۔

منظوم کا ترجمہ :۔ واللہ اس غم سے میں بستان کو چلوں
مثلِ بلبل اس سبب نالہ کروں

ترجمہ :۔ بخدا اگر مجھے یہ غموں کا کانٹا چھوڑ کر باغ میں جانا پڑے تو میں اس سبب سے بلبل کی مانند آہ و فغاں کروں۔

تشریح ۔ تیری طرف سے میرے دل کو جو چبھن ہوتی ہے اگر وہ چھوڑ کر مجھے کوئی بے غم و بے فکر زندگی دے تو میں اس کے لئے یونہی تڑپوں اور آہ و زاری کروں جس طرح بلبل پھول کی طلب میں کرتی ہے۔ کہ اے گل میرا مقصود تو ہی ہے اس میں پہلا مضمون ہی بیان کیا گیا ہے کہ اگر محبوب قہر کو مہر میں بدل دے تو اور فرقت کی صعوبتیں رحم میں بدل جائیں تو عاشق صادق زیادہ مضطرب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس تڑپ میں جو لذت ہے وہ سکون میں نہیں۔ اس لیے عاشق دردِ عشق کے سرد پڑ جانے پر ایسا ہی بے کل و بے قرار ہوگا جیسا کہ بلبل باغ کے بغیر ہوتی ہے حافظ لکھتے ہیں ؎

لذت داغ غمت بر دلِ ما باد حرام
اگر زجور غم عشق تو دادی طلبیم

نمبر ۲۶ یہ عجب بلبل ہے کہ کھولے ہے دہان
منظوم ترجمہ تا کہ کھالے خار غم یہ گلستان

ترجمہ :۔ یہ بلبل عجیب ہے کہ جب منہ کھولتا ہے تو کانٹے کو پھول سمیت کھالیتا ہے. (یعنی اس کے لطف وکرم کے ساتھ ساتھ قہر کو بھی برداشت کرلیتا ہے اس کی نوازشوں کے ساتھ ساتھ مصیبتوں کا بھی متحمل ہوتا ہے۔

تشریح : یہ محبوب حقیقی کا عاشق عشق کے درد کو ہنس ہنس کر پیتا ہے۔ یہ ساری تلخیوں کا خیر مقدم خندہ پیشانی سے کرتا ہے۔

نمبر ۲۷ - نہنگ - مگر مچھ ۔

منظوم ترجمہ : نے یہ بلبل ہے نہنگ آتشیں
عشق کی سب ناخوشی اس کی خوشی

ترجمہ :۔ یہ بُلبل نہیں بلکہ یہ تو آگ کا مگرمچھ ہے جسے سب ناگوار چیزیں عشق کے سب گوارا ہیں۔

تشریح :۔ عاشق کو پہلے بلبل سے تشبیہ دی تھی لیکن اب کہتے ہیں. نہیں اسے بلبل نہیں کہا جاسکتا۔ اسے اگر ایسے مگرمچھ سے تشبیہ دی جائے جس کی زندگی کا ہی دار و مدار آگ پر ہے - تو یہ بیجا نہیں ہوگا - کیونکہ سوزِ عشق ہی اس کی زندگی کی روح ہے اور اسے کتنی ہی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کتنی صعوبتوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ جذبۂ عشق ہی ہے جو ہر چیز کی تلخی کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ عشق ہی ہے جو احساس ناکامی کو مٹا دیتا ہے اور عشق کو برقرار رکھنے کیلئے عاشق ہر ناگوار چیز کو برداشت کرلیتا ہے کیونکہ کوئی تلخی تلخی نہیں رہتی محبت کا مقدس جذبہ ہر چیز میں ایک نیا رنگ بھر دیتا ہے۔

نمبر ۲۸

منظوم ترجمہ عاشق کل ہے وہ خود کل آپ ہے
عاشق اپنا ہے کرے عشق آپ سے

ترجمہ :۔ یہ تو ذات کل کا عاشق ہے چونکہ خود ہی تو کل ہے اپنے آپ کا ہی عاشق ہے وہ اپنا ہی عشق تلاش کرتا ہے۔

تشریح :۔ دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

انسان ذات کل کا طالب ہے حالانکہ وہ خود اس سے جدا نہیں بلکہ اسی ذات ہی کا ایک حصہ ہے۔ ایک قطرہ ہے جو اس بحر بیکراں سے جدا ہوا۔ اس قطرے کو اپنے سمندر کی تلاش ہے۔ یہاں مولانا روم وحدت الوجود کے جذبہ سے سرشار نظر آتے ہیں حالانکہ وہ اس عقیدہ کے حامی نہ تھے کہ ہمہ اوست ہر ذرہ کائنات کی ہر چیز اسی کا ایک حصہ ہے اور انسان جو موجودات ہی سے اشرف ہے وہ اسی کا ایک شمہ ہے۔ اسی لیے جب ذات الٰہی کا خواہاں ہوتا ہے تو اپنے آپ کو ڈھونڈتا ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔ جس نے اپنی ذات کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا۔ جب عشق الٰہی کے جذبہ سے عاشق کی ہستی اور اسکی ذات مضمحل ہو جاتی ہے۔ صفات الٰہیہ کا مشاہدہ اور غلبہ کا استحضار رہنے لگتا ہے۔ اسی وقت وہ اپنی ذات کو ذات الٰہیہ کے مطالعہ کا آئینہ دیکھتا ہے۔ یہاں کل سے مراد حقیقت جامعہ ہے۔ جس حق کا عاشق گویا کہ حقیقت جامعہ کا عاشق ہے اور اس طرح عاشق سے بھی عین کل ہے جب وہ معشوق تک پہنچتا ہے اور اسے دیکھتا ہے تو یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ اپنا ہی عاشق ہے اور خود ہی معشوق ہے۔ یہ فلسفہ عطار نے اپنی مثنوی منطق الطیر میں بھی بیان کیا ہے۔ حضرت امام غزالی اپنی کتاب المقصد الاسنیٰ فی شرح اسماء الحسنیٰ میں لکھتے ہیں۔

فرض کیا کہ ایک شخص دنیا میں صرف آفتاب عالمتاب اور اس کی طلائی کرنوں کو دیکھ رہا ہے چنانچہ وہ اگر یہ سمجھے کہ میں سورج کے سوا کسی چیز کو نہیں دیکھ رہا تو

وہ ٹھیک کہے گا کیونکہ جو نور اس سے پھیلتا ہے اس کا منبع تو ایک ہی ہے یعنی خورشید جہانتاب پس تمام موجودات کائنات قدرت ازلی کے انوار میں سے ایک نور ہے جس طرح سورج تمام عالم میں پھیلنے والے نُور کا منبع ہے

ص ۱۰۶

عقول الٰہی کے باہمت پرندوں کا حال

جنحہ ۔ جناح ۔ پر کی جمع ۔ بازو طیور ۔ جمع طائر ۔ پرندے

عقول :۔ حکما کی اصطلاح میں عقول ملائکہ کو کہا گیا ہے ۔ عقل اکثر و بیشتر جبرائیل کو کہتے ہیں اور بعض اس سے حضرت سرورِ کائنات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات بھی مراد لیتے ہیں ۔

عقول سے مراد یہاں ارواح مجردہ ہیں ۔ حکماء عقول کو ایسی ہستیوں کی صورت میں تسلیم کرتے ہیں جن کو شریعت اسلام کی زبان میں ملائکہ اور ہنود کی زبان میں دیوتا کہتے ہیں ۔ مگر حکماء کی عقول ان کے اختیار فعل اور استقلالِ قدرت کے عقیدہ فاسدہ کے اعتبار سے ہندوؤں کے دیوتاؤں سے زیادہ ملتی جلتی ہے مولانا روم نے یہاں پر قدیمی اندازِ کلام پر ارواح مجردہ کو عقول سے تعبیر کیا ہے ۔

نمبرا ہے یونہی بس قصہ طوطی جاں

منظوم ترجمہ محرم راز طیوراں ہے کہاں ؟

ترجمہ :۔ جان کے طوطے (یعنی روح) کا قصہ اسی قسم کا ہے ! ایسا (شخص) کہاں ہے جو ان پرندوں کا راز دار ہے ۔

تشریح :۔ جان کے طوطے یعنی طائر روح کی بھی یہی کیفیت ہے کہ وہ ذات باکمال جو اس پرندے کا واقف راز ہو ۔ روح جو اپنی اصل سے جدا ہو کر اس دنیا میں آئی ہے اس طوطے کی طرح تڑپتی اور بے قرار رہتی ہے ۔ شروع میں مولانا نے روح کو

نَے سے تشبیہ دے کر اس کی آہ و فغاں کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ سے

بشنو از نے چوں حکایت می کند　　　　وز جدائیہا شکایت می کند

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند　　　　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

یہ مہجور روح جو ذاتِ الٰہیہ تک پہنچنے کی متلاشی رہتی ہے۔ ایسا شخص کہاں ہے جو اس کی ذات سے آگاہ ہو۔ اور اس کی رہبری کر سکے۔ اس کے بعد مولانا بیانِ حقیقت لکھتے ہیں اور انسان کامل کے حالات کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس کی روحانی کیفیات کے بارے میں بڑے بلیغ انداز میں لکھتے ہیں۔

نمبر۲　　　　وہ ہے اک مرغ ضعیف بے گناہ

منظوم ترجمہ　　　　اس کے اندر ہے سلیمان با سپاہ

ترجمہ: کہ وہ تو ایک ایسا کمزور پرندہ ہے جو آب و دانہ سے بے نیاز ہے اور اس کے اندر روح کا سلیمان اپنی جاہ و حشم کے ساتھ متمکن ہے۔

تشریح ا۔ پرندے سے مراد یہاں انسان کامل ہے۔ اس کی تعریف اس کی کمزوری کی کی وجہ سے اس لئے کی ہے کہ اس کا حلقہ عنصری کمزور ہو چکا ہے چنانچہ اس کی کمزوری اس طرح ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا شیخ اکبرؒ نے "فصوص الحکم" میں اس طرح سے لکھا ہے کہ انسان کامل عرفان کے حصول سے پیشتر ضعیف و ناتوان تھا۔ اور اس کی ہمت کا کوئی اثر بھی نہ تھا کیونکہ ہمت کا اثر پذیر ہونا عرفان کی وجہ سے ہے اور جب اسے عرفان حاصل ہو گیا اور وہ فنا فی اللہ اور باقی باللہ ہو گیا تو وہ قوی ہوا۔ اور اسے قوتِ نصرت بھی حاصل ہو گئی۔ اس کے بعد وہ اعلیٰ مقام پر پہنچا اور اس کے بعد پھر اس کی طاقت بیکار ہو گئی۔ کیونکہ ایک تو اس لئے کہ ساری کائنات میں وہ ذات خداوندی کو دیکھتا ہے اور اس کا یہ راسخ ایمان ہوتا ہے کہ طاقت صرف خدا ہی کے لیے ہے چنانچہ وہ اپنی طاقت سے دست بردار ہو جاتا ہے اور دوسرا یہ کہ اسے عبدیت کا مقام بھی حاصل ہوتا ہے اور عبد قوی نہیں ہوتا۔ اور یہ مقام بہت ارفع و اعلیٰ ہے اور یہ رسول صلعم کا مقام

ہے۔ ان کی بدولت سب رسل و انبیاء مقام عبدیت میں ہیں اور وہ کوئی طاقت بھی نہیں رکھتے کیونکہ وہ اپنی رضا و منشا کے مطابق کچھ بھی نہیں کرتے۔ ان کے تمام افعال یہاں تک کہ معجزات بھی رضائے ایزدی کے مطابق ہوتے ہیں۔ وہ طاقت رکھتے ہوتے بھی کچھ نہیں کرتے۔ کیونکہ مقامِ عبدیت کا تقاضا یہی ہے پھر اس پرندے کو بے گناہ اس لئے کہا ہے کہ انسان کامل تو نبی و رسول ہوتے ہیں اور یہ معصوم و بے گناہ ہوتے ہیں۔ اگر اس سے مراد اولیاء ہوں تو اولیاء بھی معصوم و محفوظ ہوتے ہیں۔ دوسرے مصرع میں سلیمان سے مراد نبی حضرت سلیمانؑ مراد ہیں۔ جو روحانی برتری کے ساتھ ساتھ دنیاوی شان و شوکت کے بھی مالک تھے اور تاجدار دین و دنیا تھے۔ تمام چرند و پرند۔ جن و انس ان کے مطیع و فرمانبردار تھے بلکہ یہاں سلیمان سے مراد بادشاہِ مطلق یعنی ذات خداوندی ہے۔ اور سلیمان با سپاہ کنایہ ہے ذاتِ حق اور اس کی صفات و اسماء اور حقائق کائنات سے مختصر یہ کہ انسان کامل بے گناہ بھی ہے اور ظاہرہ صورت میں مقامِ عبدیت میں ہونے کی وجہ سے کمزور بھی۔ اور پھر اس میں ذاتِ خداوندی پوری طرح سے کارفرما ہے اور یہ حقائقِ کونیہ حقائقِ اسماء و صفات کا مظہر ہے۔

نمبر ۳۔ ہفت گردوں

منظوم ترجمہ:

جب وہ روئے رازِ بے شکوہ گلہ
ہفت گردوں پر پڑے اک غلغلہ

ترجمہ:۔ جب بغیر کسی شکوہ شکایت کے زار زار روتا ہے تو سات آسمانوں میں ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے۔

تشریح:۔ جب انسان کامل نالہ و زاری کرتا ہے اور اس کی وجہ پر خلوص و بے لوث محبت ہوتی ہے۔ صرف جذبۂ عشق کی وجہ سے زمین و آسمان میں ایک ہیجان سا پیدا ہو جاتا ہے لیکن اس جوش و ہیجان کو ایک غیر کامل انسان سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اور اس چیز کی صراحت کی ہے کہ ایک کامل انسان

کی آہ وزاری نہ تو نعمت کے ملنے پر اظہار تشکر کے لئے ہوتی ہے اور نہ نعمت کے ختم ہونے پر اظہار افسوس کے لئے کیونکہ اس کا مطلوب و مقصود تو سوائے ذات حق کی جستجو کے اور کچھ بھی نہیں۔ غیر حق کی طرف وہ کبھی مائل نہیں ہوتا اس لئے اس کا عشق بھی جاودانی ہوتا ہے۔ بقول حافظؒ

گفت درعین وصال این نالہ وفریاد چیست ؟
گفت ! مارا جلوۂ معشوق دریں کار داشت

عاشق کی آہ وزاری کا سبب یہ ہے کہ اس کا محبوب مرئی و مشہود نہیں (ہر تجلی سے پہلے مشہود ہوتا ہے۔ یا تجلی اسمار کے ساتھ مشہود ہوتا ہے۔ لیکن اسمار کا مشہود بہ تفصیل ممکن نہیں اور جب ایک تجلی کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ تو وہ مطمئن نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی بے قراری واضطراب میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اس سے اہل زمین تو اہل زمیں، اہل افلاک تک بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔)

نمبر ۴ - ہر دم۔ ہر وقت شصت۔ ساٹھ
لبیک۔ میں حاضر ہوں۔ میں متوجہ ہوں۔

منظوم ترجمہ
حق سے سو نامہ و پیام آئیں اسے
ساٹھ لبیک اک وہ یارب گر کہے

ترجمہ :۔ اس کو ہر لمحہ خدا کی جانب سے سینکڑوں نامہ و پیام ملتے رہتے ہیں۔ اس کی ایک پکار پر خدا کی جانب سے ساٹھ بار لبیک ہوتی ہے۔

تشریح :۔ مومن کبھی بھی الطاف ایزدی سے محروم نہیں ہوتا۔ ہر لمحہ ہر لحظہ افضال ربانی اس پر نازل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ مومن بموجب حدیث نور الٰہی سے دیکھتا ہے۔

اور جب کبھی وہ ذکر کرتا ہے۔ یارب یارب کہتا ہے۔ خداوند کریم کے نزدیک یارب، یارب کہنا اس قدر مقبول ہوتا ہے کہ وہ اسے اپنی رحمتوں سے

نوازتا ہے۔ مشکواۃ شریف میں رسول کریمؐ سے روایت ہے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ جو بندہ مجھ سے ایک بالشت قریب ہو، میں دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کے قریب جاتا ہوں اور جو چل کر میری طرف آتے ہیں دوڑ کر اس کے قریب آتا ہوں۔ اتقوا من فراست المومن ھو ینظر بنور اللہ۔

انسان کامل کو خدا کی طرف سے پیغام پہنچتے ہیں کبھی فرشتہ کے توسط کے بغیر ہی پیغام ایزدی اس تک پہنچتا ہے اور سوائے کلام کے اور بھی حجاب نہیں ہوتا۔ اور کبھی فرشتہ کے توسط سے یعنی پیغمبروں اور اولیا اللہ کو حضرت جبریل کے ذریعے سے پیغام ربانی ملتا ہے اور کبھی پیغام حق صور خیالیہ کی مدد سے انسان تک پہنچتا ہے اور اس سے مراد نامہ انواح ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں پیغام حق ہوتا ہے۔ اولیاء کی ایک قسم کو اہل اللیل کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ وہ خدا سے کلام کرتے ہیں۔ اور خدا ان سے۔

دوسرے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ انسان کامل جب اپنے رب کو پکارتا ہے تو وہ بھی لبیک کہتا ہے۔ اسی طرح سے انسان ناقص کی دعا پر بھی خدا لبیک کہتا ہے۔ لیکن وہ سنتا نہیں۔ لیکن اس کے برعکس انسان کامل کو لبیک کا شعور ہو جاتا ہے۔

نمبر۵۔ ذلت۔ لغزش   خَلَق۔ پرانا۔ بوسیدہ

منظوم ترجمہ   اس کی ذلت نزدِ حق طاعت سے خوب
کفر اس کا جملہ ایماں سے ہے خوب

ترجمہ:۔ اس کی ذلت خدا کے ہاں طاعت سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس کے کفر کے مقابلہ پر تمام ایمان حدیث کہنہ ہیں۔

تشریح:۔ چونکہ خاصانِ الٰہی کے دل خلوص اور صدق سے معمور ہوتے ہیں۔ ان کی طبیعت ہی اطاعت اور فرمانبرداری پر راسخ ہوتی ہے۔ لیکن انسان خطاؤں کا پتلا ہے۔ اس سے لغزش کا سرزد ہونا ضروری ہے اس لئے ایسے انسانوں

کی لغزش بھی بارگاہِ الٰہی میں دوسروں کی ریاکار اطاعت سے بہتر ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنی اطاعت پہ نازاں رہتے ہیں۔ اور یہ اپنی لغزش سے غفران طلب رہتے ہیں۔ اس طرح ان کی لغزش بھی مزید عظمت کا موجب ہوتی ہے۔ ان کا کفر دوسروں کے ایمان سے اس لئے بہتر ہے کہ دوسروں کا ایمان تقلیدی اور روایتی ہوتا ہے جبکہ ان کا کفر بھی ایمان سے خالی نہیں ہے بلکہ عین ایمان ہے۔ شیخ اکبر قدس سرہٗ نے "فتوحات مکیہ" میں لکھا ہے کہ حضرت آدمؑ کا جنت سے نکلنا گندم کے کھانے کی بنا۔ پر نہ تھا۔ اور یہ عقوبت کے لئے نہ تھا بلکہ یہ تو خدا نے اپنی کرامت ظاہر کرنے کے لیے کیا۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ اہل اللہ سے جب کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو وہ اپنے مقام سے گر جاتے ہیں۔ لیکن یہ انحطاط ان کی شقاوت کا موجب نہیں بنتا۔ بلکہ اس لغزش سے ان میں حیا اور انکسار بدرجہا بڑھ جاتا ہے اور یہی ترقی کا زینہ ہے۔ انسان کامل کی ترقی و رفعت علم اور حال پر مبنی ہے۔ اور اس خواری و انکسار سے علم اور حال کا اضافہ ہوتا ہے اور علم جو کہ پہلے نہ تھا بڑھ جاتا ہے اور یہی خواری حال کی افزونی کا باعث بھی بنتی ہے۔ اور یہی سب سے افضل و اشرف مقام ہے اور جس شخص میں لغزش کے بعد یہ خواری و انکسار پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی علم و حال نمودار ہوتا ہے اور نہ ہی وہ رب سے ڈرتا ہے۔ یہ ہے انسانِ ناقص۔ یہ اہل طریقت میں سے نہیں۔ بلکہ جلیس ابلیس ہے۔ لیکن یہی صدور ذلت انسان کامل کے لئے عین معراج ہے۔ مولوی شیخ اکبر نے انسان کامل کی غلطی کو ذلت سے تعبیر کیا ہے۔ عصیان سے نہیں۔ کیونکہ انہوں نے تحقیق کی ہے کہ انسان کامل بے گناہ ہے۔ چنانچہ یہ فعل ذلت ہو سکتا ہے عصیان نہیں۔ ان کے مقام سے ایک لغزش ہوتی ہے۔ یعنی ایسا امر ان کے لئے مناسب نہیں ہوتا۔ لیکن اگر ایک ایسا ہی فعل ناقص انسان سے ہوتا تو وہ گناہ کبیرہ ہوتا۔ کیونکہ انسان کامل قصداً ایسا نہیں کرتا اور نہ ہی اس

سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اور پھر دوسرے مصرعہ میں کہا ہے کہ اس کا کفر ایمان عامہ سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے کیونکہ ایمان عامہ تو تقلید محض ہے۔ اور انسان کامل کا کفر یہ ہے کہ جب وہ فنافی اللہ ہوتا ہے تو وہ انا الحق پکار اٹھتا ہے اور کہتا ہے سبحانی ما اعظم شانی اور یہ کفر ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ عین ایمان ہے۔ اور ایمان عامہ سے بہتر ہے۔ جو کہ تقلید محض ہے۔ حافظ لکھتے ہیں :-

ترسم آں قوم کہ بردردکشاں می خندند
برسرکارِ خرابات کنند ایماں را

نمبر ۶۔

منظوم ترجمہ

خاص اس کو ہر دم اک معراج ہے
تاج پر اس کے رکھے حق تاج ہے

ترجمہ :۔ ہر لحظہ ایک خاص معراج یعنی ترقی حاصل ہوتی ہے۔ اور اس کے تاج پر خداوند تعالیٰ ایک خاص تاج رکھ دیتا ہے۔

تشریح :۔ یوں تو ہر مومن کے لئے کہا ہے۔ "الصّلوٰۃ معراج المومنین"۔ نماز مومنوں کی معراج ہے۔ مگر بزرگان خاص کو یہ معراج ہر لحظہ حاصل ہوتی رہتی ہے۔ اس کے مراتب حضورِ الٰہی میں ہمیشہ ترقی پذیر رہتے ہیں وہ قریب سے قریب تر ہوتا جاتا ہے اور مخصوص سے مخصوص تر بنتا جاتا ہے۔ اس کے منصب کو عظیم سے عظیم تر کیا جاتا ہے۔ یعنی ہر لحہ انسان کامل کے لئے قرب کے اعتبار سے ایک خاص معراج ہے۔ اور مراتب علم باللہ کی کوئی انتہا نہیں۔ خدا اس کے سر پر اپنا تاج رکھتا ہے یعنی اسے اپنا خلیفہ بناتا ہے۔ پس انسان کامل اگرچہ بصورت عبد ذلیل ہے۔ لیکن باطنی اعتبار سے وہ فرشتوں سے بھی بڑھ جاتا ہے اور اس معراج کو پانے والے۔ انبیاء و رسل اور اولیاء ہیں۔ دعویٰ تو خلافت کا بھی انسان کرتے ہیں۔ لیکن عام انسان تو خلیفہ کے خاکِ پا

بھی نہیں۔

نمبر ۷۔

منظوم ترجمہ
خاک پر ہے جسم و جان در لامکان
لامکاں ہے فوق وہم سالکان

ترجمہ:۔ اس کا ظاہری جسم تو زمین پر ہے۔ مگر روح لامکان میں ہے جو سالک کے وہم و گمان سے ماوراء ہے۔

تشریح:
باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

ذات المعنی لامکان ہے کسی کی تفہیم اور قوت درک اس تک نہیں پہنچ سکتی مگر یہاں مولانا روم کہتے ہیں کہ صرف وہ ذات ہی لامکان نہیں بلکہ جو اس سے وابستہ ہو جاتا ہے وہ بھی مکانی قیود اور زمانی حدود سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ محض افضال الٰہی سے ان مقامات کو پاتا ہے۔ تمکن یا مکانی ہونا اجسام سے مخصوص ہے یہ مادے کا ایک پیکر ہے جسے کہ ہم جسم کا نام دیتے ہیں۔ یہ ایک دنیا میں متمکن ہوتا ہے اور یہ دنیا جو کہ مشہود و مرئی ہے جسے چھوا جا سکتا ہے جس کی حدود مقرر ہیں۔ لیکن روح کا تعلق عالم بالا سے ہے۔ ارواح جواہر مجردہ ہیں۔ اس لیے وہ متمکن نہیں ہیں۔ اس پر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ ہر انسان کے جسم میں ایک روح ہے۔ اور روح کا تعلق لامکان سے ہے تو پھر مقربین حق میں اور ایک عام انسان میں کیا فرق ہوا۔ اگلے ہی مصرعہ میں اس کا جواب ہے۔ یعنی وہ ایسا لامکان ہے جو کہ علمائے رسوم کے وہم و فکر سے بہت بالاتر ہے۔ وہ ایسا لامکان ہے جس کے بارے میں شہباز فکر اپنی ہزارہا اڑانوں کے باوجود نہیں پہنچ سکتا جس طرح کنہ حقیقت کا ادراک انسان کے لیے ازبس دشوار ہے۔ اسی طرح یہ لامکان چونکہ ذات حقانی سے متعلق ہے اس لیے اس کے متعلق انسان کچھ قیاس آرائی نہیں کر سکتا۔

نمبر ۳

منظوم ترجمہ
وہم میں کب تیرے آتے لامکان
اور خیال اس میں کرے تو ہر زمان

ترجمہ:۔ وہ ایسا لامکان ہے جو تیرے وہم میں آئے۔ اس کے متعلق تیرے دل میں لحظہ بہ لحظہ نئے نئے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔

تشریح:۔ کیونکہ ہر وہ چیز جو انسان نہیں جانتا اس کے بارے میں طرح طرح کے توہم اور نظریات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بارے میں مختلف تصورات باندھتا ہے اسے نئے رنگوں سے دیکھتا ہے اور عجیب تاویلوں سے پیش کرتا ہے۔

وہ لامکان جو انسان کامل کی روح کا مقام ہے اس کے بارے میں ایک عام سالک سوچ بھی نہیں کر سکتا۔ انسا تخیل تو مافوق الفطرت اور ناممکن چیزوں کو بھی اپنے سامنے مجسم کر لیتا ہے لیکن لامکان کے بارے میں اس کی قوت فکر بھی عاجز آجاتی ہے اور وہ کچھ بھی نہیں کہہ جاسکتا۔

نمبر ۴:۔ چار جو= بہشت کی چار نہریں۔ پانی، دودھ، شراب اور شہد

منظوم ترجمہ
اس کے قبضے میں مکان و لامکان
جیسے نہروں پر محیط اہل جناں

ترجمہ:۔ مکان و لامکان سب اس کے فرمان کے تحت ہیں اسی طرح جیسے بہشت کی چار نہریں اہل جنت کے تصرف میں ہوں گی۔

تشریح:۔ وہ مردان خاص اور نائب الٰہی صرف مادی عالم پر ہی فائق نہیں بلکہ ان کا حکم عالم علوی پر بھی جاری ہے۔ ان کا فیض دونوں جہانوں کو پہنچ رہا ہے۔ وہ اہل زمین کو بھی اپنی روحانی قوتوں سے فیضیاب کرتے ہیں۔ اور آسمانوں کو بھی اپنی اطاعت سے متحیر کئے ہوئے ہیں۔ وہ اعلیٰ لامکان جو کہ حق تعالیٰ کی صفت ہے قدامت کے ساتھ متصف ہے وہ مکان و لامکان دونوں پر حادی ہے اور وہ

قادر مطلق ہے جو اپنے آپ کو صحیح خلیفتہ اللہ ثابت کرتا ہے خدا اسے اپنی صفات کے پرتو کی آماجگا بنا دیتا ہے اور چونکہ وہ بھی روحانی اعتبار سے لامکان سے منطبق ہوتا ہے۔ اس لئے وہ گوشت پوست کی دنیا پر بھی قادر ہوتا ہے اور لامکان پر بھی اسی کا غلبہ ہوتا ہے۔

نمبر ۱۰

منظوم ترجمہ: منت بیاں کر اس کی ہے اب کس کو تاب
چپ رہو! واللہ اعلم بالصواب

ترجمہ:۔ اس دنیا کے بیانات کو اب یہیں ختم کر دو۔ اور اسے کو اب نظر انداز ہی کر دو۔

تشریح:۔ زیادہ قیل و قال نہ کرو۔ کیونکہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ انساں آخر کب تک حقیقت کے بارے میں بحث مباحثہ کر سکتا ہے بالآخر اسے یہ کہہ کر خاموش ہونا پڑتا ہے کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے اور یہ اس کی بے اختیاری اور مجبور محض ہونے کا بین ثبوت ہے۔

نمبر ۱۱

منظوم ترجمہ اس سے میں پھرتا ہوں پھر اے دوستان
سوئے مرغ و تاجرِ ہندوستان

ترجمہ:۔ اس بحث سے دوستو! ہم پھر طوطے اور ہندوستان کے تاجر کی طرف لوٹتے ہیں۔

——— ⁖ ———

سوداگر کا جنگل میں طوطوں کو دیکھنا اور پیغام پہنچانا !

نمبر ا

منظوم ترجمہ :۔ لے کے سوداگر چلا اس کا پیام
تاکہ ہم جنسوں کو پہنچا دے سلام

ترجمہ :۔ تاجر نے یہ پیغام قبول کیا کہ وہ اس کے ہم جنسوں کو طوطے کا سلام پہنچا دے گا ۔

نمبر ۲

منظوم ترجمہ : وہ ہوا جب داخل ہندوستان
دیکھیں اک صحرا کے اندر طوطیاں

ترجمہ :۔ جب ہندوستان کی حدود میں پہنچا تو جنگل کے اندر چند طوطے نظر پڑے ۔

نمبر ۳

منظوم ترجمہ گھوڑا ٹھہرایا دلبس آواز دی
وہ سلام اور وہ امانت دی سبھی

ترجمہ :۔ سواری کو ٹھہرایا پھر آواز دی ۔طوطے کا سلام کہا اور پیغام دیا ۔ گویا پیغام ایک امانت تھی جو سوداگر نے ادا کر دی ۔

نمبر ۴ ۔ بگستش نفس ۔ اس کا دم ٹوٹ گیا ۔

منظوم ترجمہ : ایک طوطی طوطیوں سے کانپ کر
مرگئی اور گر پڑی بس خاک پر

ترجمہ :۔ ان طوطوں میں سے ایک طوطے پر رعشہ طاری ہوا پھر گرا اور گرتے ہی اس کی سانس رک گئی ۔

نمبر ۵ ۔

منظوم ترجمہ — تاجر اس کہنے سے بس نادم ہوا
بولا کیوں میں نے ہلاک اس کو کیا

ترجمہ :۔ تاجر اس خبر کے بیان کرنے سے پریشان و پشیمان ہوا۔ اور کہنے لگا کہ میں ایک جاندار کے مار ڈالنے کا مرتکب ہوا ہوں۔

نمبر ۶۔ طوطیک :۔ اسم تصغیر۔ بے چارہ طوطی۔

منظوم ترجمہ — دوست اس طوطی کی تھی شاید یہ بس
یہ مگر دو جسم تھی اور اک نفس

ترجمہ :۔ یہ طوطا غالباً اس طوطے کا عزیز تھا اور صرف عزیز ہی نہیں بلکہ قلبی تعلق اس طرح ہے کہ روح ایک اور دو قالب ہیں۔

صفحہ ۱۰ نمبر ۷

منظوم ترجمہ — کس لئے میں نے کہا اس سے سلام
کیوں جلایا میں نے اس کو کہہ کے خام

ترجمہ :۔ اب سوداگر اس پیام رسانی کی بنا پر شرمندہ ہوا اور کہا کہ میں نے ایسا کیوں کیا اور کیوں یہ پیغام پہنچایا اور اس فضول گفتگو سے دل کو جلایا۔

نمبر ۸۔ تم : منہ وش مانند جہد نکلے

منظوم ترجمہ — یہ زبان مانند سنگ آہن کے ہے
اس سے جو نکلے ہے مانند آگ کے

سنگ : پتھر یہاں اس سے مراد چقماق پتھر ہے

ترجمہ :۔ یہ زبان گویا ایک چقماق کا پتھر ہے اور منہ لوہے کی مانند ہے کہ اس سے آگ نکلتی ہے۔

تشریح :۔ چقماق پتھر کو جب لوہے پر ماریں تو اس سے آگ نکلتی ہے۔ اور زبان میں بھی گویا وہی خاصیت ہے۔ وہ منہ کے لوہے پر جب پڑتی ہے۔ تو آگ سی دل سوز گفتگو کا اظہار ہوتا ہے۔ آگ کی دو خصوصیتیں ہیں۔ ایک نور روشنی

دنیا ہو ر گرمی پہنچاتا ہے اور دوسرے سب کچھ جلا کر رکھ دیتا۔ یہ خاصیت انسان کی زبان میں بھی ہے جو کسی کی منفعت کا باعث بنتی ہے اور کبھی کسی کے لیے مصیبت و آلام کا ذریعہ ہوتی ہے۔ کسی کے لیے تو باعث راحت وسکون ہو جاتی ہے اور کسی کے دل کو جلا کر رکھ دیتی ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث ہے کہ ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ آپؐ کے خیال مبارک میں کون سی چیز میرے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہے تو آپؐ نے اپنی زبان کو پکڑ لیا۔ زبان ہی انسان کے لیے منفعت بخش ہوتی ہے اور بعض اوقات یہی زبان مضرت رساں۔

نمبر ۸۔ گزاف :۔ بیہودہ۔ بے کار لاف۔ شیخی بگھارنا

منظوم ترجمہ :۔ پتھر اور لوہے کو آپس میں نہ مل
نقل اور شیخی سے مت کر یہ عمل

ترجمہ :۔ آگ اور لوہے کو آپس میں خواہ مخواہ نہ ٹکراؤ۔ نہ ہی نقل کے طور پر اور نہ ہی شیخی بگھارنے کے لیے۔

تشریح :۔ گزاف ہرزہ سے مراد سخن بے فائدہ ہے اور اس سے مراد صوفیاً کی اسرار توحید سے بھرپور باتیں ہیں۔ یعنی تم کسی انسان کامل کی باتیں نہ کرو نہ ہی انسان کامل کا حوالہ دے کر اور نہ ہی اپنی طرف سے۔ کیونکہ تمہاری یہی باتیں کسی گمراہی کا موجب بن سکتی ہیں کیونکہ ہر ایک کا ذہن اتنا رسا نہیں ہوتا کہ وہ تصوف کے اسرار ورموز کو سمجھ سکے۔

نمبر ۹

منظوم ترجمہ کیونکہ تاریکی و ہر جا روئی ہے
روئی میں کیونکہ شرر آ کر رہے

ترجمہ :۔ کیونکہ تاریکی ہے اور ہر طرف روئی ہی روئی پھیلی ہوئی ہے اور روئی

کے درمیان آگ کی چنگاری کیسے رہے گی۔

تشریح :۔ یعنی ایک تولا علمی ہے جہالت ہی جہالت ہے طبیعتوں کی استعداد کی تمیز محال ہے۔ خدا جانے ایک بات کا اثر دوسری پر کیا ہو۔ اگر کسی کی دل خراشی کی گئی۔ کسی کے جذبات کو ٹھیس لگی۔ کوئی برانگیختہ ہوگیا تو سنبھالنا مشکل ہے۔ وہی کیفیت ہوگی کہ روئی میں آگ کی چنگاری چھوڑ دیں تو آگ بھڑک اٹھے گی۔ شعلوں کا روکنا ناممکن ہو جائے گا اسی طرح زبان سے جو فتنے پیدا ہوں گے ان کا نتیجہ نقصان و زیاں ہی ہوگا۔ اس سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس دنیا میں لوگ کج فہم ہیں۔ وہ ایک صوفی کی باتوں کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ وہ گمراہ ہو جائیں گے۔ عوام الناس میں روحانی صلاحیتوں کی کمی کو رومی نے "تاریکی" سے تعبیر کیا ہے کہ ان میں نورِ بصیرت نہیں اور وہ پنبہ زار کی مانند ہیں۔ اور ایک صوفی کی باتیں انھیں پنبہ زار میں آگ کا سا کام کرتی ہیں۔ آگ سے مراد ان کی نورانی باتیں بھی لی جا سکتی ہیں۔ یہ باتیں ان کی اصلاح تو نہیں کر سکتیں بلکہ انہیں الحاد کی ہی طرف لے کر جائیں گی۔ جامی لکھتے ہیں :۔

پیش اربابِ خرد شرح مکن مشکلِ عشق
نکتۂ خاص مگو مجلسِ عام است ایں جا

حافظ کہتے ہیں :۔

گفت آں یار کزو گشت سرِ دار بلند
جرمش آں بود کہ اسرار ہویدا می کرد

نمبر ۱۰

منظوم ترجمہ

قوم وہ ظالم کہ آنکھیں بند کر
قال سے عالم کریں زیر و زبر

ترجمہ :۔ وہ قوم ظالم ہے جو اپنی آنکھیں بند کیے ہوئے ہے (آنکھوں پر تو انہوں نے پٹی باندھی ہوئی ہے) اور اپنی باتوں سے دنیا کو جلا رہے ہیں۔ مگر

وہ حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ علم سے نابلد۔ اندھا دھند حقائق پر غور کیے بغیر ہی اسرار طریقت بیان کرتا ہے۔ اور نا اہل لوگوں کے سامنے خدا شناسی پر بحث کرتا ہے۔ وہ اپنی الٹی سیدھی باتوں سے عوام کو بھٹکاتا ہے۔ کجروی پر آمادہ کرتا ہے اور اس طرح دنیا میں فتنہ و فساد کو پھیلا دیتا ہے۔ اس سے مراد وہ صوفی ہیں جو کہ آداب شریعت سے بے نیاز ہیں۔ اور ان کا جذبہ محبت مجذوبیت کی حد تک پہنچ چکا ہوتا ہے۔ اسے اس چیز کا شعور ہی نہیں ہوتا کہ ان کا مخاطب اس درجے تک نہیں پہنچا ہوتا۔ لیکن ان کی اس قسم کی باتوں کا نتیجہ صحت مند نہیں ہوتا۔ وہ لوگوں کو الحاد کی طرف مائل کرتا ہے۔ کیونکہ ایک شخص جو منصور کے مقام پر نہیں پہنچا ہوتا اگر وہ انا الحق کہے گا تو وہ نمرود اور فرعون سے بڑھ کر نہیں ہو گا۔ اس لیے مولانا روم کہتے ہیں کہ یہ قوم ظالم ہے اور بجائے فلاح کے وہ شر ہی کا موجب بنتی ہے۔

سوداگر کا طوطے سے اس کیفیت کا دہرانا

نمبرا

ص نمبر ۱۰۸

منظوم ترجمہ
جبکہ تاجر نے تجارت کی تمام
لوٹا اپنے گھر کو وہ پھر شاد کام

ترجمہ: تاجر نے اپنی تجارت کو مکمل کیا اور گھر کی طرف خوش و خرم لوٹا۔

نمبر ۲۔ ارمغان۔ تحفہ۔

منظوم ترجمہ
ہر غلام اپنے کو تحفہ بس دیا
اور ہر لونڈی کو جو بخشا کہا

ترجمہ:۔ ہر غلام کے لیے سوغات لایا اور ہر کنیز کو کوئی نہ کوئی تحفہ دیا۔

نمبر ۳
منظوم ترجمہ
بولی طوطی میرا تحفہ ہے کہاں؟
جو کہ دیکھا اور کہا ہو، کر بیاں!

ترجمہ:- طوطے نے پوچھا۔ اس غلام کی فرمائش کیا ہوئی۔ جو کچھ آپ نے کہا اور سنا ہو۔ سب سنائیے۔

۴، ۵، ۶ خایاں:۔ از خائیدن۔ چباتا ہوا۔ گزاں۔ از گزیدن۔ کاٹتا
نشاف۔ کم عقلی۔ بیوقوفی۔

منظوم ترجمہ
بولا از حد میں پشیماں اس سے ہوں
ہاتھ اپنا چاٹتا ہوں کیا کہوں!
کس لئے پیغام بے ہودہ تیرا
بے وقوفی سے میں اس تک لے گیا

ترجمہ:- تاجر نے جواب دیا کہ نہیں (میں نہیں کہنا چاہتا)، میں خود شرمندہ ہوں اس سے اپنی انگلی کاٹتا ہوں۔ ہاتھ ملتا ہوں۔ یعنی سخت پشیمان ہوں کیوں اپنی حماقت اور بے عقلی سے ایسا لغو پیغام پہنچایا۔

نمبر ۶:۔ کین۔ کہ این خشم: غصہ مقتضی۔ باعث۔ موجب

منظوم ترجمہ
بولی اے خواجہ پریشانی ہے کیوں؟
یہ غم و رنج و پشیمانی ہے کیوں؟

ترجمہ:- طوطا بولا۔ اے آقا! کس وجہ سے پشیمانی ہے۔ وہ کون سی بات ہے جو رنج و الم کا موجب بنی ہے۔

نمبر ۷۔ ہمتا۔ برابر۔ مثل۔ ہم جنس۔

منظوم ترجمہ:
بولا تیری اس شکایت کو کہا
اس گروہ طوطیاں سے برملا

ترجمہ:- سوداگر نے بتایا کہ میں نے تیرے ہم جنس طوطوں کے ایک گروہ کو تیری وہ شکایتیں سنائیں۔

نمبر۸۔ بوی بردن ۔معلوم کرنا۔ پتہ لگانا۔ زہرہ۔ پتہ۔ مراد جگر۔

منظوم ترجمہ ایک طوطی درد تیرا سنتے ہی

دل پھٹا اس کا وہ کانپی مر گئی

ترجمہ :۔ ان پرندوں میں سے ایک طوطے نے تیرا درد محسوس کیا۔ جس سے اسکا کلیجہ پھٹ گیا اور وہ پھڑپھڑا کر مر گیا۔

تشریح :۔ تاجر بتاتا ہے کہ جب میں نے تیری کیفیت کو بیان کیا تو تیرے ایک ساتھی نے تیرے درد کی شدت کو محسوس کر لیا اور اس پر اس پیغام کا اس قدر اثر ہوا کہ وہ پھڑپھڑایا اور مر گیا۔

نمبر۹ :

منظوم ترجمہ ہوں پشیماں کس لئے میں نے کہا

پر کہا جب تو پشیمانی ہے کیا

ترجمہ (کہنے کے بعد) میں بہت پچھتایا کہ میں کیا کہہ چکا ہوں۔ لیکن جب کہہ چکا تو پشیمان ہونے سے کیا فائدہ؟

نمبر۱۰

منظوم ترجمہ :۔ بھید کہ نکلے زباں سے ناگہاں

ہے کماں کا تیر وہ پھر بے گماں

ترجمہ :۔ جو بات زبان سے نکل جائے اسے کمان سے نکلے ہوئے تیر کی مانند گردانو۔ جس طرح وہ تیر نہیں لوٹتا۔ بلکہ پوری تیزی سے آگے بڑھتا ہے۔ اور اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی طرح زبان سے ادا کئے ہوئے کلمات واپس نہیں لئے جا سکتے۔ اس لئے کلام کرنے سے پہلے غور و خوض کر لینا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کو نشتر کی مانند لگیں۔ صائب لکھتے ہیں۔

تا نہ سازی راست در دل حرف را بر لب میار

تیر تا بیرون نرفت است از کماں غافل مباش

نمبر ۱۱۔ سیل۔ سیلاب   زسر۔ شروع ہی سے

منظوم ترجمہ   چھوٹ کر تیر کب واپس آسکے

رہ کو بند اول سے کرنا چاہیئے

ترجمہ:۔ اے فرزند! پھر وہ تیر کسی طریقے سے واپس نہیں آتا۔ سیلاب کو شروع ہی میں روکنا چاہیئے۔ بڑھتے ہوئے سیلاب کی مدافعت کرنا انسانی بس کا روگ نہیں۔ اس لیے کوئی غلطی یا لغزش سرزد ہو تو اس کا ازالہ شروع ہی سے کرنا چاہیئے۔

اگر کسی خامی کا سدباب شروع ہی سے کر دیا جائے۔ تو پھر وہ ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وہ جڑ پکڑ لیتی ہے اور بڑھ کر تناور درخت کی صورت دھار لیتی ہے تو پھر سدباب کرنا از بس دشوار ہے۔ سعدیؒ بڑے احسن انداز میں اظہار کرتے ہیں ؎

خامشی بہ کہ ضمیر دل خویش   باکسی گفتن و گفتن کہ مگوی

اے سلیم! آب ز سرچشمہ ببند   کہ چو پر شد نتواں بستن جوی

نمبر ۱۲

منظوم ترجمہ   سر سے گزرے تو جہاں گھیرے وہ سب

گر جہاں ویراں کرے تو کیا عجب!

ترجمہ:۔ جب سیلاب سر سے گزر جائے تو دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے اور جہان کو ویران کر دے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

تشریح:۔ اگر ایک چیز پوری طرح مسلط ہو جاتی ہے اور اپنے اثرات بھی چھوڑ دیتی ہے تو پھر اس کو دور کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

طوطے کا اُس طوطے کی حرکت سُن کر پنجرے میں مرجانا

نمبر۱

منظوم ترجمہ　جو سنا طوطی نے اس طوطی کا حال
کانپی اور وہ مرگئی اس کی مثال!

ترجمہ:۔ جب اس پرندے نے سنا کہ طوطے نے کیا کیا ہے۔ تو وہ بھی تھر تھرا کر گرا۔ اور مرگیا۔

نمبر۲۔ برجہد۔ اُچھل پڑا۔

منظوم ترجمہ　دیکھا تاجر نے جو وہ ہے ماجرا
تڑپا اور ماری زمین پر بس کلاہ

ترجمہ:۔ خواجہ نے جب اسے زمین پر گرا ہوا پایا۔ تو وہ بھی تڑپ اٹھا اور اپنی ٹوپی (شدت غم سے) دے ماری

نمبر۳

منظوم ترجمہ　دیکھا جو اس رنگ اور اس حال پر
خواجہ کود البس گریباں پھاڑ کر

ترجمہ:۔ جب اس حالت اور اس کیفیت میں دیکھا تو خواجہ بے تاب ہو گیا اس نے اپنا گریباں چاک کیا۔ گریباں چاک کرنا انتہائی غم کی حالت ہے ویسے بھی غم کے عالم میں انسان اپنا گریباں پھاڑ دیتا ہے۔

نمبر۴۔ جبین۔ پیشانی

منظوم ترجمہ:　بولا اے طوطی خوش الحان میری
ہائے کیا آفت ہے کیوں ایسی ہوئی

ترجمہ :۔ اس نے کہا۔ اے خوبصورت و دل پسند پرندے یہ کیا ہوگیا ہے۔ ہائے تیری یہ حالت کیوں ہوگئی۔

نمبر ۵

منظوم ترجمہ
حسرتا! اے مرغ دفعِ غم میرے
حسرتا! اے محرم و ہمدم میرے

ترجمہ :۔ ہائے افسوس! میرے خوش آواز پرندے ہائے میرے ساتھی اور میرے ہمراز

نمبر ۶ ریحان ۔ ناز ۔ بو راح ۔ خوشبو
روضہ (جمع ریاض) باغ

منظوم ترجمہ
حسرتا اے مرغِ خوش الحان میرے
راحتِ جان روضۂ رضوان میرے

ترجمہ :۔ ہائے افسوس! میرے خوش گلو پرندے۔ میری روح کی تسکین۔ میرے باغِ بہشت۔

تشریح :۔ مرغ جاں جب قفسِ تن سے پرواز کرتا ہے تو یہی قفس بحسرت وافسوس اسے یاد کرتا ہے۔ انسانی جسم میں روح ہی سب کچھ ہے۔ اس کے بغیر تو جسم مٹی کے ڈھیر سے زیادہ نہیں۔ روح کے ہوتے ہوئے کوئی اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں کرتا اور جب یہ روح پرواز کر جاتی ہے تو سوائے کفِ افسوس ملنے کے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

نمبر ۷

منظوم ترجمہ:
گر سلیماں پاتا ایسے مرغ کو
پھر نہ مرغوں سے وہ ہوتا راز جو

ترجمہ :۔ اگر حضرت سلیمان کے پاس ایسا پرندہ ہوتا۔ تو وہ کب دوسرے پرندوں میں مشغول ہوتا تو اتنا دلکش و خوبصورت پرندہ تھا کہ حضرت سلیمان کے پاس بھی ایسا خوبصورت پرندہ نہ تھا اور اگر ان کے پاس ہوتا وہ تجھ ہی میں مصروف رہتے

دیگر پرندے انہیں ہیچ نظر آتے۔

تشریح :۔ اس شعر میں غلبۂ عشق اور غلبۂ ماتم ہے۔ اس طرح سے کہ وہ عقل سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ اب عاشق مغلوب و معذور ہے اب آداب سے بھی عاری ہو گیا ہے۔ اس سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ اگر حضرت سلیمان منطق الطیر سمجھتے تھے۔ اگر ان کے پاس ایسا مرغ ہوتا تو وہ کبھی بھی دوسروں کی طرف رجوع نہ کرتے۔

نمبر ۸

منظوم ترجمہ

ہائے مرغ ایسا مجھے ارزاں ملا!
جلد میں نے اس سے روگرداں کیا

ترجمہ :۔ افسوس جس پرندے کو سستے داموں پایا تھا جلد ہی اس سے ہاتھ دھونے پڑے۔

نمبر ۹

منظوم ترجمہ

اے زباں تو ہی تو میری ہے زباں
تو ہے گویا کیا کروں تجھ سے بیان

ترجمہ :۔ اے زباں! تو میرے لئے بہت سی ضرر رساں ہے جبکہ تو ہی میری قوتِ نطق ہے تو میں تجھے کیا کہہ سکتا ہوں۔

تشریح :۔ اے زباں میں تجھ سے کیا کہوں۔ تجھ سے کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ تو ہی قوتِ ناطقہ ہے۔ لیکن اس قوت ناطقہ کی بدولت انسان کو بعض دفعہ بہت نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور یہی زباں بعض اوقات نصیحت کرتی ہے۔ اور کبھی فضیحت بن جاتی ہے۔ پس اسے کیا کہا جائے اور اس پر کیا اعتماد کیا جائے۔

(وَانظُر اِلٰی مَا قَالَ وَلَا تَنظُر اِلٰی مَن قَالَ)

شیخ ولی محمد نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ چگویم مر ترا اس چیز پر کچھ دلالت

نہیں کرتا کہ مجھے تیری بات پر اعتماد نہیں۔ یہ ساقط ہے۔ کیونکہ اس شخص کے بارے میں جس کے قول و فعل میں فرق ہو تعجب سے کہا جاتا ہے کہ کیا کہنا چاہیئے حضرت علیؓ کا کہنا ہے کہ تو اس چیز کی طرف توجہ نہ کر جس نے کہ کہا ہے اور کوئی چیز بھی قابل اعتماد نہیں۔ اقوال کو دیکھنا چاہیئے اگر واقعی فی نفسہ نیک ہوں تو اپنا لینا چاہیئے۔ ورنہ ترک کر دینا چاہیئے۔ تو اس میں بھی مولانا روم کہتے ہیں کہ اے زبان میں تجھ پر کس حد تک اعتماد کروں تو نے مجھے نقصان پہنچایا ہے پہلے تو ہندوستان میں ایک پرندہ تیری وجہ سے مرا۔ اور اب بھی تیری وجہ سے ہی میرا طوطا چل بسا۔

نمبر۱

منظوم ترجمہ

اے زباں ہم آگ و ہم خرمن ہے تو
کب تلک یہ آگ تو خرمن میں دے

ترجمہ:۔ اے زبان تو آگ بھی ہے اور کھلیان بھی۔ تو اس خرمن میں کب تک آتش زنی کرتی رہے گی۔

تشریح:۔ اس سے قبل بھی مولانا زبان کو آگ سے تشبیہ دے چکے ہیں۔ لسان انسانی ہے تو مختصر اور چھوٹی سی چیز مگر اس کے فوائد و نقصانات بہت ہی دور رس ہیں۔ انسان کا حاصل اور سرمایہ اس کے دل و دماغ میں مضمر ہے۔ یہ قلبی صلاحیتیں اور دماغی استعدادیں اکثر و بیشتر زبان ہی کی بدولت رونما ہوتی ہیں۔ زبان کو آگ اس لحاظ سے کہا کہ کلمات قبیحہ بول کر موجب فساد ہوتی ہے۔ اور خرمن اس اعتبار سے کہ وعظ و نصیحت اذکار و اوراد وغیرہ کلمات حسنہ اسی سے ادا ہوتے ہیں۔ جو عاقبت کا سامان ہیں۔ دوسرا مصرعہ یہ معنی لئے ہوتے ہے کہ اے زبان تو ہی نیکیوں کو جمع کرتی ہے۔ لیکن تو ہی چغلی، غیبت اور بدگوئی کی بنا پر خود ہی ان نیکیوں کو زائل کرتی ہے لیکن کب تک تو ایسا کرتی رہے گی۔ مشکواۃ شریف میں ایک حدیث

ہے کہ آدمی جب کوئی برا کلمہ بول لیتا ہے جس کو وہ نہیں جانتا کہ کہاں تک پہنچے گا اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے قیامت تک اپنی خفگی مثبت کر دیتا ہے۔

نمبر ۱۱۱

منظوم ترجمہ

اے زباں اک گنج بے پایاں ہے تو
اے زباں اک رنج بے درماں ہے تو

ترجمہ :- اے زبان تو لا انتہا خزانہ بھی ہے اور ایک دردِ بے دوا بھی ہے۔

تشریح :- اپنی خوبیوں اور صفات کی بنا پر زبان ایک گنجینہ ہے اور اپنی برائیوں کی بنا پر ایسی بیماری کی مانند ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ یہ شعر بھی پہلے ہی موضوع کو بیان کرتا ہے کہ زبان ہی ہے جو انسان کی عاقبت کو سنوار دیتی ہے اور زبان ایک لا انتہا خزانہ ہے کیونکہ انسانی خلوص و جذبات کا انحصار زبان ہی سے ہوتا ہے لیکن یہ ایک بیماری ہے۔ یعنی جس زبان کو چغلی، غیبت یا کلماتِ قبیحہ ادا کرنے کی بیماری ہو جاتی ہے وہ کبھی دور نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اسے درد بے دوا کہا ہے۔

صفحہ ۱۱۱ ۔ خدعہ، مکر۔ دھوکا۔ جال انیس۔ ساتھی

صفیر۔ آواز

منظوم ترجمہ

ہم صفیر و مکر مرغان ہے تو
ہم انیس وحشتِ ہجران ہے تو

ترجمہ :- تو پرندوں کو جال میں پھانسنے والی سیٹی اور جال بھی ہے اور جدائی کی وحشت میں ساتھی بھی ہے۔

تشریح :- اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ہی انسان دوسروں کو رام کرتا ہے اور اگر کبھی تنہا ہو تو اپنی زبان کو ہی ساتھی بناتا ہے۔ انسان اپنی خوش کلامی کی بنا پر بڑے بڑوں کو اپنا اسیر بنا لیتا ہے اور جب اسے ہجر و فراق کی سہمگین کیفیات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو یہی زبان دمساز و ہمدم بن جاتی ہے۔ انسان اپنے آپ

سے باتیں کر کے اپنا دل بہلا لیتا ہے۔

نمبر ۱۳۔ تک۔ دیکھ   چرا۔ چرنا

منظوم ترجمہ   اب اڑایا تو نے میرے مرغ کو
اس قدر مجھ پر ستم مت کر یہ تو

ترجمہ :۔ تو نے ہی میرے پرندے کو اڑایا۔ خدا کے لئے ظلم کی چراگاہ میں چرنا کم کر دے۔

تشریح :۔ ناجر زبان سے درخواست کرتا ہے کہ اے زبان تیری ہی وجہ سے میرا ساتھی مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔ اب خدا کے لئے تو ظلم و ستم کم کر۔ زبان انسانی زندگی میں ایک اہم رکن ہے۔ زبان ہی کی وجہ سے دشمن دوست بن جاتے ہیں۔ اور زبان ہی کی بنا پر یار غار بچھڑ جاتے ہیں۔

نمبر ۱۴

منظوم ترجمہ   حسرتا اے نور ظلمت گش میرے
حسرتا اے صبح روشن وش میرے

ترجمہ :۔ ہائے (وہ پرندہ) میری تاریکیوں کو دور کرنے والا نور تھا اور میرے دن کو منور کرنے والی صبح تھا۔

نمبر ۱۵

منظوم ترجمہ   ہائے میرے مرغ خوش پرواز تو
انتہا سے اڑ گیا آغاز کو

ترجمہ :۔ ہائے وہ اچھی اڑان والا پرندہ جو انتہا سے آغاز کو اڑ گیا۔

تشریح :۔ شیخ افضل نے انتہا سے قوس عالم شہادت اور آغاز سے مقام احدیت اور تعین اول مراد لی ہے۔ اور خلاصہ یہ کہ میرے خوش پرواز پرندے نے عالم شہادت سے مقام احدیت تک پرواز کی ہے اور یہ کہا ہے کہ سالک

شہادت سے مثال کی طرف اور مثال سے ارواح تک اور ارواح سے اسماء تک اور پھر مرتبہ احدیت تک پہنچ جاتا ہے اس کی شرح اسطرح ہو سکتی ہے کہ پرندہ کمال دانش و ادراک سے آخر تک آغاز کی طرف پرواز کرتا ہے۔
محمد رضا نے لکھا ہے کہ تاجر تضرع و فریاد کرتا ہے کہ میرا پرندہ میری آغاز و انتہا کے ساتھ اڑ گیا ہے اور اس پرندے کے ساتھ آغاز و انتہا بھی ختم ہو گئے اور اب کسی قسم کا بھی آرام و آسائش میسر نہیں۔
نمبر ۱۶۔ حنین۔ غم و اندوہ۔ گریہ زاری
منظوم ترجمہ خواجہ تاجر درد و سوز و رنج کی
باتیں کرتا تھا پریشاں ایسی ہی
ترجمہ:۔ سوداگر غم و حزن میں اس قسم کی سینکڑوں بے سر و پا باتیں کہہ رہا تھا۔
تشریح:۔ اس سے پہلے چند اشعار شامل نصاب نہیں کئے گئے۔ ان میں تاجر کی پریشانی کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس شعر میں اسی طرف اشارہ ہے۔
نمبر ۱۷۔ تناقض۔ ایک دوسرے کی ضد۔
منظوم ترجمہ گاہ جنگ و گاہ ناز و گاہ نیاز
گاہ خواہانِ حقیقت گاہ مجاز
ترجمہ:۔ اس طرح متضاد باتیں کرتا تھا۔ کبھی ناز و نیاز سے سر جھکاتا۔ کبھی سچ مچ دیوانہ ہوتا۔ کبھی صرف دیوانہ پن کا اظہار کرتا۔
تشریح:۔ پریشانی و پراگندگی میں انسان کو اپنے اوپر قابو نہیں رہتا اور اس کی کیفیات کبھی کچھ ہوتی ہیں اور کبھی کچھ۔ چنانچہ اس شعر میں بھی اس کی کیفیات و واردات کے تضاد کا اظہار ہے کہ وہ اس طوطی کو یاد کر کے کبھی ناز اور کبھی نیاز کا اظہار کرتا اور کبھی ان پر دیوانگی اور جنون کا عالم طاری ہوتا۔

نمبر ۱۸

منظوم ترجمہ
ڈوبتا اپنی خلاصی جان کر
مارتا ہے ہاتھ ہر تنکے پہ وہ

ترجمہ :۔ ڈوبتا آدمی جان توڑتا ہے تو ہر تنکے کا سہارا لیتا ہے جس طرح ڈوبتا آدمی جانکنی کی حالت میں ہوتا ہے اور ہر ذرا سے سہارے کو تھام لیتا ہے۔

تشریح :۔ بالکل یہی حالت اس خواجہ کی تھی اور وہ بھی اپنے غم کو غلط کرنے کے لئے چھوٹے چھوٹے سہارے ڈھونڈتا تھا۔

نمبر ۱۹

منظوم ترجمہ
تاکہ پکڑے اس خطر میں کوئی ہاتھ
ہاتھ پاؤں مارتا ہے ڈر کے ساتھ

ترجمہ :۔ وہ جان کے خوف سے ہاتھ پاؤں مارتا ہے تاکہ کوئی اس خطرے میں اس کی مدد کرے۔

تشریح :۔ ڈوبتا ہوا آدمی جان کے خوف سے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ موت کی وحشت سے کسی نہ کسی چارہ سازی کے درپے ہوتا ہے۔ وہ اپنی بے قراری اور تڑپ کا اظہار کرتا ہے کہ شاید کوئی دستگیری کرے مولانا نے اس شعر میں تاجر کی قلبی کیفیات کو بیان کیا ہے کہ اس پر اسی طرح وحشت وسراسیمگی کا عالم طاری تھا۔ اضطراب و بے قراری کی وجہ طوطے سے شدید محبت تھی چنانچہ وہ جھوٹے سہارے تلاش کر رہا تھا۔

تاجر کا طوطے کو پنجرے سے نکال کر پھینکنا اور اُس کا پرواز کرنا

نمبر ۱

منظوم ترجمہ
پھر رکھا باہر قفس کے جو اُسے
اُڑ گئی طوطی وہ جانب شاخ کے

ترجمہ:۔ اس کے بعد اسے پنجرے سے نکال باہر پھینکا۔ وہ (بیچارہ مقید) طوطا ایک اونچی شاخ پر جا بیٹھا۔

نمبر ۲ ترکی تاز۔ ترکتاز۔ لوٹ مار کرنا۔ چونکہ ترکان قدیم اور موجودہ زمانہ کے بعض غیر متمدن ترک قبائل اس وصف میں شہرہ آفاق ہیں۔ اس لئے سخت لوٹ مار کو ترکتاز کہتے ہیں۔

منظوم ترجمہ
طوطیٔ مردہ وہ ایسی اُڑ گئی
شمس نے جو شرق سے پرواز کی

ترجمہ:۔ وہ مردہ طوطی اس طرح پرواز کر گیا۔ جس طرح آفتاب شرق سے پرواز کرتا ہے۔

تشریح:۔ جس طرح آفتاب مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ تو کرنوں سے اندھیرا چھٹ جاتا ہے۔ تاریکی کافور ہو جاتی ہے۔ وہ طوطا جو بے سدھ پڑا تھا۔ جونہی تاجر نے اسے قفس سے باہر پھینکا تو وہ انتہائی پھرتی سے اُڑ گیا۔ اس کی اڑان میں پھرتی کو رومی نے ترکتاز لکھا ہے بحر العلوم میں یوں لکھا ہے کہ طوطے کی پرواز میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ حیات کاملہ اس دارِ فنا کو چھوڑنے ہی سے میسر ہو سکتی ہے

نمبر ۳ منظوم ترجمہ
دیکھ تاجر دنگ تھا اندازِ مرغ
بے خبر نے دیکھا ناگاہ رازِ مرغ

ترجمہ:۔ خواجہ پرندے کی اس حرکت پر ہکا بکا رہ گیا۔ اور بے خبری میں اسے پرندے کے اسرار و رموز معلوم ہو گئے۔

تشریح:۔ مولانا اب اس کہانی سے ایک نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ چنانچہ طوطے کی اس اڑان کے فعل سے ہی انہوں نے حقائق کے بیان کا دروازہ کھول دیا ہے اور پند و موعظمت کے دریا بہا دیئے ہیں۔ اسرار و رموز کی تشریح مولانا نے اگلے اشعار میں کی ہے۔

نمبر ۴

منظوم ترجمہ

منہ اٹھا کہنے لگا بلبل مرے
حال سے کچھ آگہی اپنی تو دے

ترجمہ:۔ تاجر نے منہ اوپر اٹھایا اور کہا! اے عندلیب کی مانند خوش آواز پرندے اپنے اظہار خیال سے ہمیں بھی مستفید کر۔

نمبر ۵

منظوم ترجمہ

کیا کیا اس نے وہاں سیکھی جو تو
خود کیا مکر اور جلائی جان مری

ترجمہ

اس نے کیا کرشمہ کیا جو تو نے جو سیکھا
تو نے چالبازی کی اور ہمارا دل جلایا

تشریح:۔ اب تاجر مختلف سوال کر کے اپنے جذبۂ تجسس کا اظہار کرتا ہے کہ اے طوطے! تو بتا کہ ہندوستان والے طوطے اور تیرے اس فعل میں بہت مطابقت ہے اس کی کیا وجہ ہے اور تیرے اس فعل سے میرا دل بہت دکھا ہے ایک ایک لفظ سے خواجہ کے پُر خلوص جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

نمبر ۶

منظوم ترجمہ

مکر سے کی بند جو آنکھ میری
جلا کر مجھ کو خود روشن ہوئی

ترجمہ:۔ اپنے مکروہ فریب سے تو نے ہماری آنکھیں بند کر دیں۔ جدائی کی آگ میں ہمیں جلایا اور اپنے آپ کو خوشی اور مسرت سے روشن کیا۔

تشریح:۔ خواجہ اب حیران ہو رہا ہے کہ اتنی سوجھ بوجھ ہونے کے باوجود طوطے کے اس مکر کو نہ بھانپ سکا اور اسے احساس تک نہ ہوا کہ طوطا اس کی عقل پر پردہ ڈال رہا ہے اور اس نے مکر و فریب سے خوشی حاصل کی ہے کیونکہ اس نے اس فریب کاری سے قید و بند کی صعوبتوں سے رہائی پالی ہے اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالا ہے۔

نمبر ۷

منظوم ترجمہ
بولی طوطی فعل سے پند اس نے دی
کہ تو باتیں چھوڑ اور آواز بھی

ترجمہ:۔ طوطی نے جواب دیا کہ اس طوطے نے اپنے عمل سے مجھے نصیحت کی کہ اپنی قوت گویائی کو ختم کر اور نغمہ سرائی چھوڑ دے

تشریح:۔ اس شعر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ کاملین کے افعال میں ایک بہت اہم نصیحت ہوتی ہے کہ ان افعال کی طرح کیا جائے تاکہ سالک اپنے کمال سے ہمکنار ہو سکے۔ اسی لئے اتباع سنت کو بہت اہم سمجھا گیا ہے اور اخلاقِ محمدی کو پیشوا سمجھا گیا ہے کیونکہ یہ کمال اعظم ہے۔ اس میں مولانا روم طوطے کی زبان سے ایک ٹھوس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ طوطے کی گرفتاری کا موجب اس کی خوش الحانی تھی اور اس کا مرشد کامل عملی طور پر اس کو ختم کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

نمبر ۸

منظوم ترجمہ
کیونکہ اس آواز سے تو ہے پھنسی
اس نصیحت کے لئے وہ خود مری!

ترجمہ:۔ کیونکہ تیری آواز ہی نے تجھے مقید کروایا۔ اب اس نصیحت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو مردہ بنایا۔

تشریح :۔ اس جنگل طوطے نے اپنے عمل سے بے آواز پیغام پہنچایا اور اس کو یہ سبق سکھایا ہے کہ وہ دوسروں کے نزدیک زیادہ مقبول ہونے کی کوشش نہ کرے کیونکہ یہی مقبولیت جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ طوطا جو کہ آزادی سے محروم ہو گیا تھا۔ چمن کی کھلی فضاؤں اور رنگینیوں سے دور کر دیا گیا تھا اس کی وجہ اس کی خوش گلوئی تھی۔ اس کا مرشد کامل اسے اس سے منع کرتا ہے کہ اسے عوام و خاص کو خوش کرنے والے پرندے میری طرح مردہ ہو کر آزاد ہو جا۔

ہندوستان کے آزاد طوطے نے یہ پیغام دیا ہے کہ اے طوطے تو جو کہ سب کے نزدیک محبوبیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی خوش الحانی سے سب کو اپنی طرف مائل کرتا ہے یہی تیری غلامی کی وجہ ہے تو اپنی خوبیوں کو چھپا لے۔ اپنی استعدادوں کو لوگوں سے اوجھل کر دے تاکہ تو آزادی کی نعمت کو پا لے۔

نمبر ۱۰

منظوم ترجمہ

دانہ ہو تو مرغ سب تجھ کو چگیں
غنچہ ہو تو لڑکے تجھ کو توڑ لیں

ترجمہ :۔ اگر تو دانہ بن جائے تو پرندے کھا لیتے ہیں اور اگر غنچہ ہوتا ہے تو لڑکے توڑ لیتے ہیں۔ دانہ و غنچہ سے مراد لوگوں کے لئے مقبول و مرغوب ہونا ہے۔ اپنی صفات کو خواہ مخواہ ظاہر نہ کرو۔ تاکہ عوام الناس سے محفوظ رہو اور وہ تمہارے لئے دردِ سر نہ بن جائیں۔

تشریح :۔ اس دنیا میں وجود کا ہونا بھی گناہ ہے دانہ جو کہ ادنےٰ سی چیز ہے لیکن دنیا اسے بھی معاف نہیں کرتی جانور چن چن کر اس کا وجود ختم کر دیتے ہیں غنچہ جو کہ بند ہوتا ہے اور ابھی کھل بھی نہیں پاتا۔ بچے اسے نوچ ڈالتے ہیں۔ خیام لکھتے ہیں۔

جرم دل آنکسی کہ بمعروف نہ شد | در جبہ و دراعہ در صوف نہ شد
سیمرغ صفت بعرش پرواز کردی | در کنج خرابہ جہاں بوف نہ شد

نمبر ۱۱

منظوم ترجمہ

کر نہاں دانہ و بالکل دام ہو
کہ نہاں غنچہ گیاہِ بام ہو

ترجمہ :۔ داغ کو چھپا کر تو کلی طور پر جال بن جا۔ غنچے کو پنہاں کر کے تو چھت کا سبزہ بن جا۔

تشریح :۔ اس شعر میں بھی سابقہ نفس مضمون ہے کہ تم اپنے امتیاز وانفرادیت کو ختم کر دو۔ اس صورت میں تم سکون و راحت حاصل کر سکو گے اور پھر دوسری چیز یہ بتاتے ہیں کہ یا تو تم کسی چھت کے سبزے کی طرح نظروں سے اوجھل ہو جاؤ تاکہ تمام آفات سے محفوظ رہو۔ تم اپنی صفات محمودہ اور محاسنِ اخلاق کو ظاہر کرنے کی کبھی بھی کوشش نہ کرو۔ یہی ایک راز ہے جس سے تم لوگوں کی طعن و تشنیع سے محفوظ رہ سکتے ہو۔

خطِ پاکیست گمنامی ز کلفت گوشہ گیراں را
سیاہی در نگاہ نامداراں خانہ می سازد
شہرت و نام آوری سرمایۂ آرام نیست
جز فراشِ دل نگیں را حاصلے از نام نیست

اس میں مولانا روم کے پیش نظر یہ مصلحت بھی ہے کہ شہرت سے پہلو تہی کرنا چاہیئے تاکہ غرور اور طلب جاہ جاگزین نہ ہو۔ شہرت حاصل کرنے کی تمنا پر ہر وقت خلق خدا کی طرف توجہ رہتی ہے لیکن وہ شخص جو دنیا سے بے نیاز ہوتا ہے وہ ہر جگہ خدا ہی کو دیکھتا ہے وہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جس سے لوگوں کو اس کے خدارسیدہ ہونے کا یقین ہو جاتا ہے پھر وہ شہرت اس کے لئے نقصان دہ نہیں ہوتی۔ بحر العلوم میں شہرت سے گریز کے لئے یہ طریقہ بتایا ہے کہ لوگوں سے بداخلاقی سے پیش آیا جائے۔ اگرچہ یہ مذموم ہے لیکن اس میں کئی مصلحتیں پنہاں ہیں یا کوئی ایسا عمل کیا جائے جو لوگوں کی نظروں میں تو مذموم ہو۔ لیکن شرعی اعتبار سے وہ حرام

ومکروہ نہ ہو۔ تاکہ عوام کو اس سے نفرت ہو جائے۔ ابویزید قدس سرہٗ کے بارے میں منقول ہے کہ ماہ رمضان میں انہوں نے ایک نانبائی کی دکان سے مفت روٹی لے کر کھائی تاکہ لوگوں کو ان یہ حرکت ناگوار گزرے لیکن درحقیقت وہ بیمار تھے۔ اور روزہ نہیں رکھا تھا۔ ان کے اس فعل کا مقصد لوگوں کو اپنی طرف سے بدظن کرنا تھا۔

نمبر ۱۲

منظوم ترجمہ

جس نے اپنے حسن کو ظاہر کیا
سو بلا کو اس نے اپنے سر لیا

ترجمہ۔ جس آدمی نے اپنی خوبی کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ اس پر سو بلائیں ٹوٹ پڑتی ہیں۔

تشریح:۔ جس شخص نے اپنی خوبیوں کو منظر عام پر لانا چاہا تو اس کے نتیجہ کے طور پر اسے ایسی مصیبتیں جھیلنا پڑیں جو کہ بے جا تھیں۔ وجہ لوگوں کا حسد و بغض تھا۔

نمبر ۱۳

منظوم ترجمہ

چشم بد اور خشم وکینہ اور رشک
سر پہ برسیں اس کے مثلِ آبِ مشک

ترجمہ:۔ نکتہ چین نگاہیں، غصہ اور رشک اس کے سر پر اس طرح نازل ہوتے ہیں جیسے مشکوں سے پانی۔

تشریح:۔ جب وہ اپنی صفات کا اظہار کرے گا تو لوگ اس پر تنقید کریں گے۔ اس کی عیب جوئی میں مصروف ہوں گے وہ ان کے غم و غصہ کا نشانہ بنے گا۔ اس کے برابر اور ہمعصر لوگ اس کے مدارج کو برداشت نہ کریں گے بلکہ اس کی ایذارسانی آزار دہی اور مصیبت کے درپے ہوں گے۔ حافظ لکھتے ہیں۔

در شاہراہ جاہ و بزرگی خطر بسی است
آں بہ کزیں گریوہ سبکسار بگزری

نمبر ۱۴

منظوم ترجمہ

دشمن اس کے رشک سے ٹکڑے کریں
دوست اس کے وقت کو ضائع رکھیں!

ترجمہ :۔ دشمن اسے اپنی غیرت کی بناء پر قتل کریں گے۔ دوست اس کی زندگی حرام کریں گے۔

تشریح :۔ زیادہ میل جول اس کے اتلافِ مال اور تضیع اوقات کا باعث ہوگا۔ ایک نامور اور مشہور شخص کی زندگی بھی قابل رحم ہو گی۔ دشمن اس کی شہرت و اقتدار کو کسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکیں گے۔ شہرت کے ساتھ ساتھ اس کے دوستوں کا دائرہ بھی وسیع ہوگا جو اس کے وقت کو ضائع کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کریں گے۔

عمر خیام لکھتے ہیں۔

شد دعویٰ دوستی دریں دیر حرام
الفت ز کہ؟ مروی کجا؟ دوست کدام!
دامن زہمہ کشیدن اولیٰ باشد
از دور بہر یکی سلام است سلام

نمبر ۱۵

منظوم ترجمہ

جو بہار و سیر سے غافل ہوا
اس زمانے کی وہ قیمت جانے کیا

ترجمہ :۔ جو فصل بہار کی کھیتی سے غافل ہوتا ہے وہ اس زمانہ کی قدر و قیمت کیا جانے

تشریح :۔ کاشت کار اور زراعت پیشہ لوگ جانتے ہیں کہ فصل ربیع کی کاشت کے لئے موسم بہار موزوں ہوتا ہے اگر وہ دن غفلت سے گزار دیں تو سال بھر عسرت و تنگ دستی اور فقر و فاقہ میں لبسر ہو اسی طرح دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ آخرت کی شادابی و رونق دنیا کی بہار سے زیادہ دل کش ہے جو اسے بھولا ہوا ہے اسے دنیا کی کیا پرواہ۔ کشت بہار سے مراد فوائد عمر ہیں۔ یہ تمتعات دوستوں کی صحبت کو ترک کرنے سے ہی میسر آسکتے ہیں اور بہار سے غافل ہونے سے مراد ایسا شخص

ہے جو کہ گوشۂ عجلت میں بیٹھنا نہیں جانتا جو کہ نام حق کو وردِ زبان نہیں بناتا گویا اپنی زندگی کو صحیح طور پر نہیں گذارتا اور مقصد حیات کو نہیں سمجھتا۔ بقول شاعر

موسم بھی پایا تخم بھی دامن میں تھا مگر
بونے کا وقت خواب تغافل میں کھو دیا

نمبر ۱۶

منظوم ترجمہ

چاہیئے تجھ کو پناہ حق میں جا
لطف رکھتا ہے وہ روحوں پر سدا

ترجمہ :۔ خدا کی مہربانیوں میں پناہ طلب کرنی چاہیئے کہ جس نے اپنے بندوں پر ہزاروں نعمتیں نازل فرمائیں۔

تشریح :۔ دنیا میں اِدھر اُدھر کے سہارے ڈھونڈنے کی بجائے خدا کی مدد طلب کرنی چاہیئے کہ وہی اپنے بندوں پر رحم کرتا ہے اور وہی سب کا یاور و ناصر ہے وہ محبوبِ خالق جس نے اس کائنات کے ذرے ذرے کو پیدا کیا۔ ہر ذرے کے ساتھ اس کی ہمدردیاں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس لیے رومی دنیا سے گریز کا سبق دینے کے بعد یہ تدبیر بتاتے ہیں کہ دنیاوی تعلقات و رشتے تو کچے دھاگے ہیں۔ اگر تم اس کی دائمی و باقی سہارے کی آغوش میں پناہ لو گے تو گویا کہ سکون سرمدی پاؤ گے۔

نمبر ۱۷

منظوم ترجمہ

تا پناہ اک پائیے تو کیا ہے بادشاہ
آب و آتش ہو وے سب تیری سپاہ

ترجمہ :۔ تاکہ اس وقت تمہیں حقیقی و کامل پناہ حاصل ہو جائے بلکہ ایسی پناہ کہ آگ اور پانی تیرے فرمانبردار ہوں۔

تشریح :۔ خدا کی رحمتوں سے وابستہ رہنے سے فیضان الٰہی اس حد تک مدد فرماتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز انسانی اقتدار اور فرمان کے تابع و مطیع ہو جاتی ہے۔ جس طرح آگ حضرت ابراہیمؑ کے لیے گلزار بنی تھی۔ اور دریائے نیل کا پانی حضرت موسیٰؑ

کے لیے باعث آرام ہوا تھا۔ بنی نوعِ انسان کی مضرت رسان دوستی کا ذکر کرنے کے بعد بتاتے ہیں کہ اے انسان تیرا ضمیر اس قدر سویا ہوا ہے تو کیوں ایسے سہاروں کو ڈھونڈتا ہے جو کسی صورت میں بھی تیرا ساتھ نہیں دے سکتے۔ تو خدا کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا جس کی دوستی عناصر تک کو اس کا دوست بنا دیتی ہے بقول رومی

بزیر کنگرہ کبریا علیش مردانند   فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

ایسے تو ہی لوگ وہی ہوتے ہیں جن کو محبوبِ حقیقی کی اعانت میسر آجاتی ہے۔ اس کائنات کا ذرہ ذرہ ان کا مطیع و محکوم ہوتا ہے۔

نمبر ۱۸

منظوم ترجمہ   نوح و موسیٰ کا نہ دریا یار تھا؟
نے عدو پر کیں سے وہ قاصر ہوا

ترجمہ :۔ کیا موسےٰ اور نوح کے سمندر معاون نہیں ہوئے تھے؟ اور ان کے دشمنوں سے انتقام لینے کے لئے جابر و قاہر نہیں ہوئے تھے۔

تشریح :۔ اس شعر میں تلمیح ہے کہ جب حضرت نوح کی قوم کی نافرمانی حد سے گزری تو ان کے لئے پانی ایک تباہ کن طوفان کی صورت میں رونما ہوا۔ مگر حکم ایزدی سے حضرت نوح نے جو کشتی بنائی تھی۔ آپ اپنے مومنین کے ہمراہ اس میں سوار ہوئے اور کوہ جودی کے متمکن رہے اور پوری قوم تباہ و برباد ہو گئی۔

اسی طرح حضرت موسیٰ نے ہر چند فرعون اور اس کے مصاحبوں کو ہدایت کی مگر ان میں سے چند لوگ ایمان لائے باقی حضرت موسیٰ اور ان کے مومنین کی جان کے لاگو ہو گئے۔ آپ اپنی قوم سمیت خود دریائے نیل کی طرف چلے۔ فرعون نے اپنے لشکر سمیت پیچھا کیا۔ حضرت موسیٰؑ کے لئے دریا میں رستہ بنا اور آپ اپنے ہمراہیوں سمیت دریا پار کر گئے۔ فرعون بھی ہمراہیوں سمیت اسی راستے پر چلا مگر عین درمیان میں پہنچا تو غرق ہو گیا۔ پانی جس میں کہ بہنے کی صلاحیت ہے اور وہ ہر چیز کو اپنے ساتھ ہی بہا لے جاتا ہے۔ لیکن خدا کے مقربین کے لیے اس کی یہ طبعی خصوصیت

بھی ختم ہو کے رہ جاتی ہے اس کی وجہ محبوب حقیقی کے ساتھ قرب و محبت ہے
شیخ عطار لکھتے ہیں۔ ؎

آنکہ در آدم دمیدہ روح را — داد از طوفان نجات او نوح را

نمبر ۱۹

منظوم ترجمہ — قلعہ تھی آتش نہ ابراہیم پر
ہو گیا غالب دل نمرود پر

ترجمہ :۔ کیا آگ حضرت ابراہیم کے لیے امن و سلامتی کا اس طرح سے قلعہ نہ بنی تھی کہ اس سے نمرود کا دل کڑھ گیا تھا۔

تشریح :۔ نمرود کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تلقین ایمان کی مگر وہ ایمان لانے کی بجائے آپ کا دشمن بن گیا تھا اور بالآخر ایک بہت بڑے میدان میں آگ تیار کروائی اور آپ کو اس میں ڈالا۔ مگر عناصر اربعہ بھی خدا کے دوستوں کو آزار نہیں دیتے بلکہ ان کی راحت و آرام کا موجب بنتے ہیں چنانچہ آگ گلزار بن گئی اور نمرود اپنی اس تذلیل پر جل گیا۔ مولانا روم کہتے ہیں کہ یہ محض اس لئے ہوا کہ آپ دوست خدا اور مرد مومن تھے خدا کی دوستی ہی میں انہیں آگ میں کودنے سے ہچکچاہٹ محسوس نہ ہوئی۔ اور آگ نے بھی اپنی جلانے کی خاصیت کو ختم کر دیا۔ ظالم و جفا کار آگ جو کہ ہر اس چیز کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے جو کہ اس کے سامنے آجائے لیکن خدا کے دوستوں کے لئے وہ اپنی عادت کو بھی چھوڑ دیتی ہے۔ مولانا روم اپنے ہی خیال کی مزید وضاحت کے لئے تمثیلات و تلمیحات کا سہارا لیتے ہیں کہ خدا کی محبت میں اگر کوئی حقیقی معنوں میں سرشار ہوتا ہے تو کوئی چیز اس کیلئے مضرت رساں نہیں رہتی بلکہ دوسروں کے لئے نقصان دہ چیزیں اس کے لئے حصار بن جاتی ہیں۔

نمبر ۲۰

منظوم ترجمہ — کوہ نے یحییٰ کو خود کھینچا نہیں؟
دشمنوں کو سنگ سے مارا نہیں؟

ترجمہ:- کیا پہاڑ نے حضرت یحییٰ کو پناہ نہ دی تھی اور ان کے قتل کرنے والوں کو پتھر نہیں مارے تھے۔

تشریح:- اس شعر میں بھی ایک تلمیح کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت یحییٰؑ جو کہ چھوٹی عمر میں ہی منصب نبوت پر فائز ہو گئے تھے اور خوف خدا سے بے حد گریہ زاری کرتے تھے ان کا ہمعصر بادشاہ ہیرودوس تھا جس کی ملکہ چاہتی تھی کہ بادشاہ اس کے پہلے خاوند کی لڑکی سے شادی کرلے۔ بادشاہ نے جواز نکاح کے لئے حضرت یحییٰؑ سے استفسار کیا تو انہوں نے اسے جائز قرار نہ دیا۔ اس پر ملکہ جو پہلے ہی ان کے خلاف تھی اور بھی درپے آزاد ہو گئی اور بادشاہ کو ان کے قتل پر اکسایا اور بالآخر شہید کر دیئے گئے۔

مولانا احمد حسن کانپوری اپنے حاشیہ میں یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ جب یہود حضرت یحییٰؑ کے درپے آزار ہوتے تو آپ بھاگ کر جانے لگے۔ اسوقت ایک پہاڑ نے آپ کو آواز دی کہ "میری غار میں آجایئے" اور اس کے بعد کفار پر جو کہ پیچھا کر رہے تھے پتھر برسانا شروع کر دیئے اس شعر میں اس تلمیح کی طرف اشارہ ہے۔

نمبر ۲۱

منظوم ترجمہ
بولا اے یحییٰؑ تو مجھ میں بھاگ آ
تا کروں تیغوں سے میں تیری پناہ

ترجمہ:- پہاڑ نے کہا۔ اے یحییٰؑ آ! دوڑ کر میرے اندر چلے آؤ۔ تاکہ دشمنوں کی تیز تلواروں سے آپ کو بچاؤں۔

تشریح:- وہ بے حس اور ساکت وجامد پہاڑ، بول بھی نہیں سکتا تھا اور نہ ہی ہل سکتا تھا لیکن جب خدا کے دوست پر مصیبت آن پڑی تو اس بے جان چیز نے انہیں اپنی آغوش میں پناہ دی اور دشمن کو مار بھگایا۔

طوطے کا تاجر کو وداع کرنا

صفحہ ۱۱۲

نمبر ۱۔ الفراق :۔

منظوم ترجمہ
پند کی طوطی نے اس کو پر مذاق
پھر کیا اس کو سلام والفراق

ترجمہ :۔ اس باذوق طوطی نے اسے کچھ نصیحتیں کہیں۔ اور پھر کہا۔ ہمارا سلام قبول فرمایئے۔ ہم جاتے ہیں۔

نمبر ۲

فی امان اللہ :۔ اللہ کی پناہ میں۔

منظوم ترجمہ
خواجہ بولا فی امان اللہ تو جا
راستہ مجھ کو نیا بتلا دیا

ترجمہ :۔ اس نے کہا کہ اچھا۔ خدا حافظ! کہ اب آپ نے مجھے زندگی کی نئی ڈگر پر ڈال دیا ہے۔

تشریح :۔ طوطے کی اس حکایت سے تاجر کی زندگی کا پانسہ ہی پلٹ گیا وہ شخص جوکہ دنیا دار تھا اور دنیا پرست تھا طوطے کی باتیں سن کر اس نے اپنی زندگی کو بدلنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ وہ دنیا داری کے جذبات اور حرص و آز سے مغلوب تھا۔ طوطے کی ان باتوں کو سن کر اس کی روح بیدار ہوئی۔ ضمیر نے اسے جھنجھوڑا۔ اب وہ ایسی روحانیت کی طرف مائل ہوا جوکہ مادے کی کثافتوں سے بالاتر تھی۔

نمبر ۳

منظوم ترجمہ
فکر کی خواجہ نے ہے مجھ کو یہ پند
تاکہ میں ہوں اس کی راہ کا پائے بند

ترجمہ :۔ تاجر نے کہا کہ یہ میرے لئے پند و موعظت ہے کہ آئندہ اسی کے عمل کو

اپناؤں گا کہ یہ واضح اور روشن راہ ہے۔

تشریح :۔ یعنی اس نے موت سے قبل ہی مر کر قید و بند کی مصیبت سے نجات حاصل کی۔ اس طرح میں بھی موتو قبل ان تموتو، مرنے سے پہلے اپنی شہوت وغضب کو ختم کر کے مرد آزاد بنوں گا۔ اب تاجر کے دل کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ اور وہ طوطے کی باتوں پر غور و خوض کرنے کے بعد کہتا ہے کہ تمہارا بتایا ہوا راستہ زیادہ روشن و واضح ہے۔ اس لئے میں اب دنیا داری کی ظلمتوں سے نکل کر تمہارے کہے پر عمل کروں گا۔ اسی صورت میں روحانی جلا پیدا ہو سکتی ہے۔

نمبر ۴

منظوم ترجمہ

کیا میری جان کم بھلا طوطی سے ہے
جان وہ جو در پے نیکی کے رہے

ترجمہ :۔ میری روح طوطی کی روح سے کم تو نہیں ہے جان تو ایسی ہونی چاہیئے جو اچھائیوں اور نیکیوں کے ساتھ بسر ہو سکے۔

تشریح :۔ جس طرح طوطے نے اپنے دل و جان کو سکون بخشا۔ اسی طرح میں اپنی روح کی عظمت کو پانے اور زندگی کی اقدار اعلیٰ کے حصول کے لئے کوشش کروں گا۔ چونکہ میں اس سے تو کم نہیں ہوں۔

اس شعر میں بھی مولانا نے راہِ حق پر چلنے کے لئے تاجر کا ہوش و تردد بیان کیا ہے۔

سعدی لکھتے ہیں ؎

دانی چہ گفت مرا آں بلبل سحری
تو خود چہ آدمی کز عشق بی خبری

اشتر بشعر عرب در حالت است طرب
گر ذوق نیست ترا کژ طبع جانوری

خاقانی شیروانی

پرانے تذکرہ نویس خاقانی کا نام ابراہیم رقم کرتے ہیں۔ مگر یہ غلط ہے۔ غالباً یہ اشتباہ خاقانی کے اس شعر کی بنا پر کیا گیا ہوگا۔

بخوان معنی آرائی ابراہیمی پدید آید　　زلپشت آذر صفت علی بجار شیروانی

مگر محققین نے تحقیق کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ لفظ ابراہیمی محض محاورہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ بلکہ اس عظیم شاعر کا نام خود اس کے اپنے قول کے مطابق بدیل ہے جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں۔

بدل من آمدم اندر جہاں سنائی را　　بدیں دلیل پدر نام من بدیل نہاد

خاقانی کا نام بدیل اور لقب افضل الدین تھا۔ ابوالعلا گنجوی خاقانی کے بارے یوں لکھتے ہیں۔

تو ای افضل الدین اگر راست پرسی　　بجان عزیزت کہ از تو نہ شادم
در دگر لپسر بود نامت لشروان!　　بخاقانیت من لقب بر نہادم

کہا جاتا ہے کہ خاقانی نے پہلے خقائقی تخلص اختیار کیا تھا۔ لیکن جب ابوالعلاء گنجوی نے اسے اپنے زیر سایہ تربیت دے کر خاقانِ اکبر منوچہر بن فریدون شیروان شاہ سے متعارف کرایا تو اسی مناسبت سے خقائقی کی بجائے خاقانی تخلص کرایا۔ جیسا کہ خود اعتراف کرتے ہیں۔

چو شاعر شدم بردمت نزد خاقان　　بخاقانیت من لقب بر نہادم

خاقانی ۵۲۰ھ میں بمقام شروان پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھی اسی جگہ حاصل کی۔ اور اس سرزمین میں شاعر کی حیثیت سے شہرت عظیم حاصل کی۔

پردہ فقرم مشیمہ دست نطقم قابلہ
خاکِ شروان مولد و دار لادب منشائے من

خاقانی اپنی جائے پیدائش کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اسی سرزمین میں انہوں نے مروجہ علوم کی تعلیم حاصل کی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی جائے پیدائش کو لوگ تقدس کی نگاہ سے دیکھیں۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

عیب شروان مکن کہ خاقانی ہست ازآں شہر کے ابتدائش شراست
عیب شہری چرا کنی بدو حرف کاول شرع و آخر بشر است

خاقانی کے باپ کا نام علی تھا۔ وہ پیشہ کے لحاظ سے نجار تھے۔ ایک قصیدہ میں باپ کی مدح میں لکھتے ہیں۔

شیخ مہندس لقب پیرداز گر علی کازرد اقلید سند عاجز برہانِ او

تحفۃ العراقین میں بھی یوں بیان کرتے ہیں۔

از سوئے پدر درد گرم دان استادِ سخن تراشِ دوران

خاقانی کے والد ہر دور رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اطاعت و عبادت میں بھی بہت فائق تھے۔ مگر جب شراب پیتے تو اپنی کمائی ہوئی آمدنی خرچ کر ڈالتے۔

چوں مجلس عیش سازی استاد علی جان تو قطرہ نے قطر بلے
چوں باز بہ طاعت آئی از پاک دلی یحیٰی بن معاذی و معاذ جبلی

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خاقانی کو اپنے باپ کی شراب نوشی پسند نہ تھی۔ چونکہ خاقانی کا رجحان طبع زہد و تقوے کی طرف تھا۔ اس لئے باپ کی محبت جلد ہی نفرت میں تبدیل ہو گئی اور کھلم کھلا باپ کی اس عادتِ بد کے خلاف احتجاج کرنے لگے۔ اس طرح بچپن ہی سے باپ اور بیٹے کے درمیان عدم موافقت نے بیج بو یا۔ علی یہ چاہتا تھا کہ خاقانی شعر و سخن، علم و فضل کو ترک کر کے صناعی کا پیشہ اختیار کرے۔ مگر خاقانی کو شہرہ آفاق ہونا تھا۔

جہاں تک خاقانی کی ماں کا تعلق ہے وہ نسلاً مجوسی، اور ابتدا میں مذہباً "نصرانی" تھی اور نصرانیوں کے فرقہ نسطوری سے تعلق رکھتی تھی۔ بعد میں اس نے دین اسلام قبول کر لیا۔ خاقانی تحفۃ العراقین میں یوں پیش کر رہے ہیں۔ جس سے ماں کی

اعلیٰ تربیت کا بھی علم ہو جاتا ہے کہ خاقانی کو عالمگیر شہرت دلانے والی خود ان کی ماں تھیں۔

کارم ز مزاج بد نہ رستی ‏ ‏ ‏ ‏ گر نہ دعواتِ مادر ستی
نسطوری و سوبدی نژادش ‏ ‏ ‏ ‏ اسلامی و ایزدی نہادش
پس کردہ گزیں بعقل و الہام ‏ ‏ ‏ ‏ بر کیش کششِ دینِ اسلام

خاقانی کی زندگی بڑی تنگ دستی میں بسر ہوئی۔ پہلے تو اُن کی روزی کا باعث خود والد ماجد تھے، مگر والد کی ناگہانی موت نے شیرازہ بکھیر دیا۔ اب خاقانی کی زندگی کا مدار ان کی ماں کی کمائی پر ٹھہرا۔ وہ طباخی کے ذریعے جو کچھ کمائی۔ اس سے اپنا اور اپنے بیٹے کا پیٹ پالتی تھی۔

از بہر خلائقم سبک بار ‏ ‏ ‏ ‏ بر مائدہ علی نجار
ہستم ز پئی غذائی جان در ‏ ‏ ‏ ‏ طباخ نسب ز سوی مادر

اس طرح سے وہ ماں کے ہمیشہ شکر گزار رہے ہیں۔ ایک پر درد قصیدہ میں ماں سے خطاب کرتے ہوئے ان کی نوازشوں کو یوں گناتے ہیں۔

ای ریزہ روزی تو بودہ ‏ ‏ ‏ ‏ از ریزشِ ریشمانِ مادر
خو کردہ بہ تنگنای شروان ‏ ‏ ‏ ‏ با تنگی آب و نانِ مادر
زیر حلف کسی نہ رفتہ ‏ ‏ ‏ ‏ جز آں خدای و آنِ مادر
افسردہ چو سایہ نشستہ ‏ ‏ ‏ ‏ در سایہ دوکدانِ مادر
شرمت ناید کہ چوں کبوتر ‏ ‏ ‏ ‏ روزی خوری از دہانِ مادر
تاکہ چو مسیح بر تو بینید ‏ ‏ ‏ ‏ ادبی پدری نشانِ مادر

شروان کی سرزمین میں خاقانی کو آرام و سکون نصیب نہ ہوا۔ یہاں انہیں کوئی غمخوار و مونس اور رفیق نظر نہ آتا تھا۔ اس طرح ان کے دل پر بے ثباتی و بے وفائی جہان کا نقش روز بروز گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

باکہ گرمم انس کز اہلِ وفائی بوزیم ‏ ‏ ‏ ‏ روزی من نیست ناخود نیست در عالم وفا
در ہمہ شروان مرا حاصل نیامد نیم دوست ‏ ‏ ‏ ‏ دوست خود ناممکن ای کاش بودی آشنا

خاقانی کو سب سے بڑی سر پرستی ان کے چچا کافی الدین عمر بن عثمان سے نصیب ہوئی۔ کافی الدین متقی اور پرہیز گار تھے اور خاقانی نے ایسے ماحول میں پرورش پائی کہ سلاطین کی بزم عشرت میں شریک ہونے کے باوصف اور فسق و فجور میں شریک ہونے کے بعد جلد ہی تائب ہو گئے۔ یقینی طور پر وہ وعظ اور تلقین اخلاق جو کہ خاقانی کے کلام کی زینت ہے وہ اسی تربیت کا ہی ثمرہ تھی۔ اس کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں:

من ناپدہ جوی وا دمفیدم   عم بودہ مدرس و معیدم

خاقانی کے چچا فقہ۔ حدیث، طب۔ منطق۔ فلسفہ۔ ریاضی اور ہندسہ میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ خاقانی نے ان ہی سے اکتساب فیض کیا۔

اپنے چچا اور دیگر اساتذہ کی سر پرستی کے علاوہ انہوں نے زمانے کے مشہور شاعر ابوالعلا گنجوی سے بھی شرف تلمذ حاصل کیا۔ ابوالعلا گنجوی نے اپنی بیٹی بھی خاقانی کے ساتھ بیاہ دی۔ فن شعر سے روشناس کروانے کے بعد ابوالعلا، خاقانی کو بادشاہ کے پاس لے گیا۔ بعد میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے کہ خسر اور داماد، استاد اور شاگرد میں تنازع ہو گیا اور دونوں نے ایک دوسرے کی ہجو لکھی۔

خاقانی نے ادب، فلسفہ۔ علوم دینی اور اداب قرآن کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور ان علوم میں انہیں کامل دستگاہ تھی۔ یہ حقیقت خود ان کے کلام سے بھی واضح ہے۔ خاقانی کو سیر و سیاحت سے طبعی لگاؤ تھا۔ مگر وہ دربار سے وابستہ ہو چکے تھے۔ خاقانی جب خاقان منوچہر کے پاس گئے۔ تو ان کی درباری کو قبول کر لیا۔ ۵۴۰ھ اور ۵۵۰ھ کے درمیان بقول فروزان فر خاقانی نے دربار قبول کیا۔ چونکہ خاقانی کا کلام پختگی اور متانت میں بے مثل تھا۔ اس لئے ان کے آتے ہی یہاں سازشوں کا جال بچھ گیا۔ شروان شاہ کی تمام تر توجہ دوسروں کی نسبت خاقانی پر مرکوز ہو گئی۔ فلکی شروانی کی جب دربار میں پہلی سی

قدر و منزلت نہ رہی تو اس نے ابو العلا گنجوی کو خاقانی کے خلاف بھڑکایا۔ خاقانی جب اس قدر کشیدگی دیکھی تو انہوں نے دربار ترک کر کے ہجرت کر لینی چاہی۔

خاقانی آزاد منش انسان تھے۔ دربار کی عاجزانہ اور اندھی تقلید سے متنفر تھے۔ سفر کرنے کی خواہش ان کے دل میں تھی۔ وہ دنیا اور اہل دنیا کو دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب خاقانی کے خلاف لوگوں نے خاقانِ اکبر اور اس کے بیٹے خاقان کبیر المظفر کے کان بھرے تو ممدوح ہی خاص عتاب بن کر خاقانی کے سر پہ نازل ہوئے۔ خاقانی کے دل میں حج بیت اللہ اور خراسان کے سفر کا بڑا اشتیاق تھا۔ جس کی ممانعت کر دی گئی۔ اور یہ عتاب بھی خاقانی کو سہنا پڑا۔ اسی چیز کا وہ یوں ذکر کرتے ہیں۔

چہ سبب سوی خراسان نگزارند — عندلیبم بہ گلستان شدنم نگزارند

آخر کار کسی طرح خاقانی کو سفر کی اجازت مل گئی۔ ابھی مشکل سے ساتک ہی پہنچ پائے تھے کہ ایک نئی افتاد پڑی۔ خراسان میں چند ترکوں نے فتنہ فساد برپا کر رکھا تھا۔ اور رے کے والی نے بھی اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ مجبوراً واپس لوٹ آئے۔ رے کی شکایت میں انہوں نے یہ قصیدہ لکھا ہے اس میں اس طرح سے بیان ہے۔

چوں نیست رہ سوی خراسان شد بسوی — ہم باز پس شوم نکشم من ئے ری
گر باز فلتم سوی تبریز اجازت است — شکرانہ گویم از کرم بادشاہ ری

جب خاقانی سفر خراسان سے ناکام ہو کر واپس لوٹ آئے تو بہت مایوس و نادم تھے۔ اب ان کی خواہش صرف حج تھی۔ ۵۵۱ھ میں خاقانی نے اپنا پہلا حج کیا اور مکے کی صفت میں ایک قصیدہ کیا۔ خاقانی ۵۵۲ھ میں واپس ہوئے۔ عباسی خلیفہ مقتفی باللہ ان دنوں حکمران تھے۔ انہوں نے خاقانی کو دبیر اعلیٰ کا عہدہ پیش کیا۔ مگر خاقانی غیور تھے اور دربار سے کتراتے تھے۔ انہوں

نے یہ عہدہ قبول نہ کیا۔ خاقانی کے کلام پر سفر حج کا بہت بڑا اثر پڑا۔ یوں بھی ان کی طبیعت میں زہد کا رنگ غالب تھا۔ حج کے بعد یہ اور بھی گہرا ہو گیا۔ واپسی پر ہی ایوانِ مدائن نے دل پر چرکہ لگایا اور انہوں نے اپنا مشہور قصیدہ لکھا۔ اب خاقانی مجبور تھے کہ اپنی روزی کمانے کے لیے سلاطین اور امراء کی مدح کریں۔ مگر انہوں نے اس چیز کو خیرباد کہتے ہوئے نعتیہ کلام لکھنا شروع کیا۔ اب انہیں یہ احساس ہوا کہ ان کا بے نظیر شعور شعر گوئی، مدح سرائی میں ختم ہو گیا ہے اس چیز کا اظہار نہایت موثر انداز میں کرتے ہیں۔

اس اثر کی بناء پر خاقانی کے کلام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ حصہ جو کہ موشگافیوں کی وجہ سے معمہ بنا ہوا ہے۔ دوسرا حصہ ہے جو کہ روانی سلاست میں اپنا جواب آپ ہے۔

خاقانی کی مشکلات ختم نہ ہوئی تھیں مگر ان میں ہمہ گیر فرق رونما ہو چکا تھا۔ خاقانی رخشاں بن منوچہر کے حکم سے ۵۷۰ھ یا ۵۶۹ھ میں گرفتار کر لئے گئے۔ چنانچہ وہ اس واقعہ کا یوں ذکر کرتے ہیں۔

مرا ز بعد پنجاہ سال اسلام　　　　تزبید چوں صلیبی بند برپا

اب زمانے کے تفکرات نے خاقانی کو عمر سے پیشتر ہی بوڑھا کر دیا تھا۔ مگر قدرت نے ایک بار ان کا امتحان لیا۔ ۵۷۱ھ میں جب کہ وہ ابھی زندان ہی میں تھے ان کا نوجوان بیٹا رشید الدین فوت ہو گیا۔ اس وقت خاقانی کے بیٹے کی عمر بیس برس کی تھی۔

دریغ میوہ عمرم رشید کز سرپائی　　　　بہ بیست سال برآمد بیک نفس بگذشت
مرا ز خیرہ ہمیں یک رشید بود از عمر　　　　نتیجہ شب و روزی کر در ہوس بگذشت

بہرحال ۵۷۱ھ کے بعد خاقانی کی زندگی میں خلل سا آگیا۔ طبیعت زیادہ مضطرب رہنے لگی۔ ۵۷۱ھ سے ۵۸۰ھ تک وہ لکھنے پڑھنے میں مشغول رہے مگر اس کے بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

آخر خاقانی نے بھی رختِ سفر باندھا۔ مگر ان کی تاریخ وفات کے متعلق تاریخ میں تضاد پیدا ہو گیا ہے۔ عبدالرشید بن صالح سنہ ۵۸۲ھ قلمبند کرتا ہے علامہ عبدالوہاب قزوینی نے چہار مقالہ کے حاشیہ میں تحریر کیا ہے کہ سنہ ۵۹۱ھ میں وفات پائی۔ رضازادہ شفق اپنی تاریخ ادبیات ایران میں تاریخ وفات سنہ ۵۹۵ھ تحریر کرتے ہیں۔

خاقانی کی زندگی اتنی کامیاب نہیں رہی۔ انہیں فراغت کے ساتھ جینا نصیب نہ ہوا۔ جوانی میں وہ مفلسی اور تنگ دستی کے مصائب برداشت کرتے رہے۔ تمام عمر دوستوں کی خواہش رہی۔ لڑکپن میں ہی سایہ پدری سے محروم ہونا پڑا۔ اور آخری عمر میں زندان کی تکلیف کے بعد جوان بیٹا قدرت نے چھین لیا۔ اپنی زندگی کے ایام میں ان کو لوگوں کے حسد کی شکایت تھی۔ عمر بھر ان کی ہمت بلند رہی۔ خاقانی اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی باری تعالیٰ سے یوں شکوہ کرتے ہیں۔

نہ ہمت من بپایہ راضی است   نہ پایہ ہمزای ہستم ہمت
یارب چو ز ہمت و ز پایہ !   نگشاید کار و نگذرد دست
پا پایہ جو ہستم برافراز   پا ہمت من چو پایہ کن لپست

گو خاقانی اس دارِ فانی سے چل بسے مگر جب تک ان کی مثنوی تحفۃ العراقین اور دیوان قائم ہے۔ شاعری کے چمنستان میں ان کی خوشبو مدھم نہیں پڑ سکتی۔

خاقانی بحیثیت شاعر

خاقانی کا شمار ایران کے درجہ اول کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ بعض لوگ خاقانی کو ایران کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ خاقانی شروان میں پیدا ہوئے۔ ان کی شہرت اس بات کی شاہد ہے کہ ایران کی سرزمین اس قدر ادبی صلاحیت رکھتی ہے کہ اس مادر گیتی کے ہر حصہ سے ادیب، شاعر اور عالم پیدا ہو سکتے ہیں۔ خاقانی کی یادگار ایک مثنوی تحفۃ العراقین اور ایک دیوان ہے مثنوی بھی عالمگیر شہرت کی مالک ہے۔ اس کے پانچ حصے ہیں۔

۱۔ توحید و ثنا ۲۔ سوانح حیات۔
۳۔ عراق و عجم کا حال ۴۔ مکہ کے حالات۔
۵۔ مدینہ کا ذکر

ایک دیوان قصائد کے علاوہ، قطعات، رباعیات اور ترجیع بند پر بھی مشتمل ہے۔ خاقانی کے قطعات اعلیٰ اخلاقی اصولوں کے حامل ہیں۔ انہوں نے مستقل طور پر اخلاقی مضامین پر قطعات لکھے ہیں۔ خاقانی اپنے پیغام کے ذریعے انسان کو ناامیدی کے اندھیاروں سے بچاتے ہیں۔ اور برائی سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ معائب و محاسن اخلاق بیان کرتے ہوئے نیکی اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ خاقانی مسلمان تھے اور دین کے اس پاکیزہ جذبہ نے ان کی باطنی صفائی میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی دینداری کی بدولت ان میں درگذر، نیکوکاری اور فداکاری کے اعلیٰ مقاصد پیدا ہو گئے اور انہی باتوں نے ان کو ایک باعمل اور نیک انسان بنا دیا۔ چنانچہ یہ قطعہ اس بات کی دلیل ہے۔

من کہ خاقانیم این صفا یافتہ ام
کہ بدل در حق بدخواہ شرح نیکی خواہ

چوں شوم سوختہ از خامی گفتار بدن
نیکوکار پناہ آرم داد ہست پناہ
کہ نگویم کہ مکافات بدلیشاں بدکن
لیک گویم کہ مرا از بد شاں دار نگاہ

خاقانی کی حقیقی شہرت اور بزرگی ان کے قصائد کی وجہ سے ہے۔ ان کی عزت بڑے بڑے شاعروں نے کی۔ عرفی اور نظیری نے نہ صرف ان کی مدح میں شعر کہے۔ بلکہ قصائد کے جواب میں قصائد لکھنا اپنے لئے باعث فخر سمجھا۔ علامہ اقبال نے بھی خاقانی کا ذکر خیر کیا ہے اور ان کو "محرم عالم مکافات" اور ارباب نظر کا "قرۃ العین" کہا ہے۔

خاقانی کی شاعری نہایت مستحکم اور دشوار ہے۔ الفاظ اور معنی کے لئے غیر معمولی اور نہایت بلند اور لطیف ہے۔ ان کی شاعری کے بنیادی محاسن میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ ان کا کلام عام سطح ادب سے بلند اور عام روش شعر سے الگ ہے۔ خاقانی کے اشعار میں جدت، تازہ پردازی اور ابتکار ہے۔ ان کو نئی بات کہنے پر ناز ہے۔ اور اسی لئے عنصری سے اپنا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مرا شیوہ خاص تازہ است و داشت — ہماں شیوہ باستان عنصری

خاقانی کی جدت فن معانی اور بیان کے لحاظ سے ہے۔ یعنی اس نے دقیق اور گہرے معانی جو ہر شخص کے دماغ میں نہیں آسکتے۔ نہایت جامع اور فصیح الفاظ میں ادا کئے ہیں۔ اور ان کی شاعری کا بہت بڑا حصہ اسی قسم کی شاعری پر مشتمل ہے جدت کے لئے وسعت معانی اور ابتکار فن لازمی ہی اور خاقانی کے ہاں یہ چیز بدرجہ اتم موجود ہے۔ خاقانی کی جدت طرازی۔ تشبیہات، استعارات سے بھی نمایاں ہے۔ مگر یہ چیز خاقانی کی انفرادیت میں کافی حد تک ساتھ دیتی ہے۔

خاقانی نہ صرف شاعر ہیں بلکہ علم دوست بھی ہیں - انہوں نے عربی زبان کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ خاقانی فارسی کی طرح عربی زبان پر بھی کامل عبور رکھتے ہیں۔ اور انہیں دونوں زبانوں کے الفاظ اور ادبی تراکیب پر اس قدر عبور حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہتے ہیں - انہیں شعر کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ الفاظ اور تراکیب کے استعمال میں ان کی استادی مسلم ہے۔ تراکیب و الفاظ تو گویا ان کے فرمانبردار غلام ہیں اور خاقانی جس طرح چاہتے ہیں - ان کو استعمال کرتے ہیں - وہ محنت سے نئی تراکیب اختراع کرتے ہیں۔ یہ مہارت فارسی کے کسی اور استاد کے ہاں نہیں ملتی - البتہ ہندوستان میں عرفی۔ غالب اور اقبال اس مہارت کے حامل ہیں۔ خاقانی تراکیب سے آرائشِ جمال اور حسن آفرینی کا کام لیتے ہیں ان کی تراکیب ان کے تخیل کی رفعت اور توانائی کی شاہد ہیں۔ ذیل کے قصیدہ میں ان کی یہ خوبی ہے -

نیست اقلیم سخن را بہتر از من پادشاہ — در جہان ملک سخن رانی مسلم شد مرا

مریم بکر معانی را منم روح القدس — عالم ذکر معانی را منم فرمانروا

شہ طغانِ عقل را نایب منم نعم الوکیل — نو عروسِ فضل را صاحب منم نعم الفتی

درعِ حکمت پوشم و بی سترس گویم القتال — خوان فکرت سازم و بی بخل گویم الصلا

نکتۂ دوشیزہ من حینداو صفت آر صنعت — خاطر آبستن من نورِ عقلت از صفا

عقدِ نظامانِ سحر از من ستاند واسطہ — قلب خرابان شعر از من پذیرد کیمیا

اگر ان اشعار کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا "شہ طغان عقل" "درع حکمت" "نکتہ دوشیزہ" "نظامان سحر" "خرابان شعر" جیسی تراکیب جو خاقانی کے دوسرے قصیدوں میں بھی پائی جاتی ہیں - دوسرے شعرا کے ہاں یا تو سرے سے ملتی ہی نہیں اور اگر ملتی ہیں تو شاذ و نادر ہیں۔ یہ تو ظاہر اور بدیہی ہے کہ ان تراکیب اور ان کے باہم اتصال سے جو ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور جو معانی جنم لیتے ہیں۔ وہ ان میں تازگی و جدت پیدا کر دیتے ہیں -

خاقانی کی شاعری میں نہایت مشکل مضامین بھی ملتے ہیں۔ مضامین میں یہ اشکال اس وجہ سے ہیں، کہ انہوں نے اپنے کلام میں قرآن پاک کی آیات، ضرب الامثال۔ تلمیحات اور علمی اصلاحات کو بے دریغ استعمال کیا ہے۔ علاوہ ازیں استعارات وکنایات۔ تجنیس۔ ایہام۔ تشبیہ اور استعارہ وغیرہ بھی شعری صنائع کثرت سے شامل ہیں۔ اس چیز نے ان کی شاعری کو دقیق بنا دیا ہے مگر اس چیز کے باوجود ایک بڑا وصف یہ ہے کہ ان سب میں جدت پیدا کی ہے یہی خوبی ان کی تراکیب کے علاوہ الفاظ کے انتخاب میں پائی جاتی ہے۔ خاقانی کے ہاں علم وفضل کی نمود ونمائش کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے کلام میں مشکل اور ثقیل عربی الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ ان الفاظ کے علاوہ مختلف علوم کی اصطلاحیں بھی بیان کرتے ہیں۔ جن سے قاری اس وقت تک آگاہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ خود ان چیزوں کو نہ جانتا ہو۔ ان کا کلام سمجھنے کے لئے اسلامی تاریخ اسلامی ادب اور روایات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ مشکل پسندی کا یہ رجحان انوری کے ہاں بھی پایا جاتا ہے لیکن انوری سے صرف ناگزیر حالات میں ایسا ہوا ہے۔ جب کہ خاقانی جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں۔ یہی چیز خاقانی کے لئے اس اسلوب کی ابتدا کا باعث بنتی ہے جو سبک خراسانی اور سبک عراقی کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ سبک سبک آذربائیجان کے نام سے مشہور ہے۔ خاقانی کا ذیل کا قصیدہ جو انہوں نے مکہ معظمہ کی تعریف میں قلم بند کیا ہے۔ اسی نادر نمونہ کی تمثیل ہے۔

تا خیال کعبہ نقش دیدہ جان دیدہ اند!
دیدہ را از شوقِ کعبہ زمزم افشاں دیدہ اند
عشق بر کردہ بکہ آتشی کز شرق وغرب
کعبہ را ہر ہفت کردہ ہفت مردان دیدہ اند

ماہِ نورِ ابینہ قندیل عیسیٰ یافتہ
دجلہ راپر حلقۂ زنجیروطراں دیدہ اند
برسر دجلہ گذشتہ نامدایں قصر دار
قصر کسریٰ و زیارت گاہ سلمان دیدہ اند
طاق ایوانِ جہانگیر وثاق پیسہ زن
ازنجو نامی طراز فرش ایواں دیدہ اند

اس قصیدہ کو سمجھنے کے لئے تاریخی - ادبی - دینی معلومات اور مناسک اور نجوم وغیرہ سے قاری کا واقف ہونا لازمی ہے۔ مثلاً قاری کے ذہن میں یہ ہونا چاہیئے کہ ہفت کردہ سے مراد دلہن کے سات سنگار ہیں اور ہفت مردان سے مراد اصحاب کہف یا عارفوں کے سات طبقے اور یا اشکانیوں کے سات قدیم خانوادے ہیں۔ انہی اشکال کی وجہ سے خاقانی کے قصائد کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں۔

خاقانی ایک ایسے علاقہ کے باشندے تھے جہاں کی مقامی زبان فارسی تھی۔ چنانچہ ان کے قصائد میں بعض الفاظ ایسے بھی ملتے ہیں جو مقامی بولی سے تعلق رکھتے ہیں۔ خاقانی کے بعض الفاظ اہل خراسان کو کھٹکتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی بری بات نہیں۔ خاقانی نے مقامی زبان کے الفاظ ادب میں شامل کر کے زبان کو اور زیادہ وسعت دی ہے۔ آذربائیجان فارسی زبان کا گہوارہ نہ تھا یہاں کے شاعر کی زبان میں اس کی مادری زبان کا شامل ہونا ناگزیر تھا مثلاً اس شعر میں اکنوں کے معانی کا کوئی اور ہی لفظ متحمل ہے۔

امیہ نہ لبغداد جای شیشہ گرالست
ہر کلاب طرب فزای صفاہان!

اس طرح خاقانی دوسری زبانوں کے الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ مثلاً ذیل کے شعر میں تاجر کی کا لفظ گرجی زبان کا ہے۔

من ونا چہ کلی ودیر مزان
در لبقرا طیانم جاد تلتجا!

خاقانی اپنی ماں کی طرف سے عیسائی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے مسلمان ہونے کے باوجود انہیں عیسائیت سے خاص لگاؤ تھا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں عیسائیوں کی اصطلاحات اور ان کی مذہبی روایات کا بے تکلفی سے ذکر کیا ہے۔ نصرانی عقائد سے واقفیت، انجیل کی قرأت اور اس دین کی تاریخ سے لگاؤ کی وجہ سے خاقانی دوسرے تمام ایرانی شعراء میں امتیاز رکھتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے مریم بکر۔ روح القدس، نکتہ دوشیزہ اور خاطر ثالث الثلاثین کی خالص عیسائی اصطلاحوں کو ایک ہی قصیدہ میں جمع کر دیا ہے

خاقانی کے ہاں واقعہ نگاری کا رجحان بھی ملتا ہے۔ انہوں نے بعض قصائد جو اپنے مشاہدات اور خاص سوانح و واقعات پر لکھے ہیں۔ ان قصائد میں نہایت عمدہ تصویر کشی کی ہے اور تخیل میں بھی چاشنی ہے۔ کچھ اس طرح کی تصویر کشی کی ہے کہ قاری بعینہ اس تصویر کو پالیتا ہے۔ واقعہ نگاری کے نادر نمونے وہ قصاید ہیں جو خاقانی نے حرم ترکوں کی تباہی سے متاثر ہو کر لکھے۔ چنانچہ حج کو جاتے ہوئے خاقانی جب مدائن سے گزرے اور ایوانِ مدائن جس کی شہرت کے بارے میں بہت کچھ پڑھ چکے تھے کو جب کھنڈرات کی صورت میں دیکھا تو ان کے قلب و دماغ پر ایک غم انگیز تاثر پیدا ہوا۔ انہوں نے مدائن کے ماضی کی درخشاں روایات کو یاد کرتے ہوئے اس کی تباہی و بربادی کا ایک المیہ قصیدہ لکھا جو کہ ہر قاری کو رلائے بغیر نہیں رہتا۔

ہاں اے دلِ عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں
ایوان مدائن را آئینہ عبرت دان
یکرہ ز لبِ دجلہ منزل بمدائن کن!
وز دیدہ دوم دجلہ بر خاکِ مدائن ران

خاقانی کے قصائد کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ہاں جذبات نگاری اپنے عروج پر ہے۔ ان کے اشعار میں دل کی آواز اور لطیف احساسات نمایاں طور پر جلوہ فگن نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں سوختگی اور دل کی گہرائی ہے۔ اسی قسم کے اشعار ان کے دیوان میں اکثر ملتے ہیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ خاقانی کے دیوان میں دل سے نکلے ہوئے الفاظ کی کمی نہیں۔ ان کے ایسے اشعار وہ ہیں جو انہوں نے اپنی تنہائی بے یار و مددگاری، بے لبسی اور لوگوں کی بے وفائی پر یا زندان کی شدید تکالیف سے متاثر ہو کر لکھے ہیں۔ ایک ایسے ہی قصیدے میں انہوں نے اپنے بیٹے کی موت پر جن جذبات کا اظہار کیا ہے وہ شاعری کا نادر نمونہ ہیں۔

صبحگاہان سر خونین جگر بکشائید ژالۂ صبحدم از نرگس تر بکشائید
دانہ دانہ گہر اشک بیارید چنانک گرہ رشتۂ تسبیح ز سر بکشائید
خاک لب تشنہ خونست ز سر چشمۂ دل آب آتش زدہ چوں چاہ سقر بکشائید
آتشی دیدم کو باغ مرا سوخت بخواب مر این آتش آن باغ ببر بکشائید

خاقانی عام طور پر طویل اور مفصل قصائد لکھتے ہیں۔ بحر بھی اکثر طویل ہوتی ہے۔ بہت سے قصیدوں کو وہ مطلع ثانی سے شروع کرتے ہیں مثلاً وہ قصیدہ جو انہوں نے مکہ کی تعریف میں لکھا ہے۔ اس مطلع سے شروع ہوتا ہے۔

شیرواں در صبح صادق کعبہ جان دیدہ اند
صبح را چوں محرمان کعبہ عریاں دیدہ اند

پھر تجدید خیال سے اس کو آگے بڑھاتے ہیں۔

تا خیال کعبہ نقش دیدۂ جان دیدہ اند
دیدہ ہم کہ از شوق کعبہ زمزم افشاں دیدہ اند

خاقانی کے قصائد کی بحریں طویل ہوتی ہیں اور بیشتر ردیف کی طرز پر

ہوتی ہیں۔ عام طور پر خاقانی مطلع ہی میں اپنے مقصد کو واضح کر دیتے ہیں اور کبھی تغزل اور تشبیب سے کام لیتے ہیں اور جلوہ صبح، طلوع آفتاب، عشق و محبت یا مناظر قدرت کی عکاسی سے ان کا اظہار ہوتا ہے۔

دست صبا بر فروخت شعلہ نوبہار ‏ ‏ مشعلہ داری گرفت کوکبۂ شاخسار

ز آتشِ خورشید شد نام شب نیم سوخت ‏ ‏ قوتِ ازاں یافت روز خوشدم ازاں شد بہار

خامۂ مانیست طبع چہرہ کشای جہاں ‏ ‏ نائب علیٰی است ماہ زنگرزہ شاخسار

خاقانی کے ہاں توانا تخیل پایا جاتا ہے اور انہوں نے اپنے تخیل کو رفعت دینے کے لیے خوبصورت تشبیہات۔ استعارات اور کنایات کا سہارا لیا ہے نیز خاقانی کے کلام پر خراسان کے بڑے بڑے شعراء کا بھی اثر پایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض اوقات ان کے کلام میں سبک خراسانی کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً ذیل کے قصیدہ میں انوری کا سبک نمایاں ہے۔

ضماندار سلامت تا دلِ من ‏ ‏ کہ دار الملک عزلت ساخت مسکن

اہل چوں صبح کاذب گشت عمر ‏ ‏ چوں صبح صادق دل گشت روشن

بوحدت رستم از عرقاب وحشت ‏ ‏ برستم رستہ گشت از چاہ بلیژن

خاقانی نے عنصری، رودکی اور دیگر شعراء کا جو ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان شاعروں کے کلام کا بھی کافی مطالعہ کیا ہے۔ خاص طور پر عنصری کے کلام کی ان کی نگاہ میں بڑی عزت تھی۔ چنانچہ جہاں جہاں انہوں نے اپنے کلام پر فخر کیا ہے۔ وہاں عنصری کو بھی ایک زبردست حریف اور رقیب کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔

بدیہہ ہمی بارم زخاطر این در ‏ ‏ کز وسمعہا بجز عمان نماید

ازیں شعر خجلت رسد عنصری را ‏ ‏ دگر عنصری جان جاناں نماید

خاقانی کے ہاں استغنائ۔ بے نیازی اور قناعت کا رجحان نمایاں ہے اس چیز سے وہ سنائی سے بہت متاثر ہوئے ہیں

گفتی نکنی خدمت سلطان نکنم — یک لحظہ فراغت بدو عالم نفروشم

زہد و دینداری کی طرف خاقانی کا خاص رجحان ہے جو کعبہ کی تعریف اور رسولِ اکرمؐ کے نعتیہ قصیدوں وغیرہ سے نمایاں ہے۔ انہوں نے ہر جگہ روحانیت اور ایمان کی بنیادی اہمیت پر زور دیا ہے اور حکمتِ یزداں کو حکمت یونان پر ترجیح دی ہے

فقیہی بہ ز افلاطوں کہ آں کش چشم درد آمد
یکے کحال کابل بہ ز صد عطار کرمانش

خاقانی مدحیہ قصائد میں اپنے ممدوح کو انصاف، سخاوت اور دانش پروری کی دعوت دیتے ہیں۔ نہ صرف عدل و انصاف اور سخاوت کی ترغیب دیتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے مستقل طور پر اخلاقی مضامین پر قطعات بھی لکھے ہیں اور زندگی کے اعلیٰ اخلاقی اصولوں کا پرچار کیا ہے چونکہ انہوں نے ہمیشہ لوگوں سے زک اٹھائی۔ اس لیے وہ ہمیشہ برائی سے بچنے اور نیکی کی تلقین کا درس دیتے ہیں۔

بترس زہد خلق خاقانیا ! — ولیکن زہد وہ اماں خلق را
وفا طبع گرداں و امین باش — ز عذری کہ طبیعت آں خلق را
دروغی مداں بر زبان دبداں — کہ صدقی بود بر زبان خلق را
دو افکار خلق آشکارا شود — قضائی کہ آید نہاں خلق را
بد خلق ہر چت فزوں تر رسد — نکوئی فزوں تر رساں خلق را

خاقانی نے تمام عمر ابنائے روزگار کے ہاتھوں ستم سہے۔ اسی لئے ان کی بدگمانیاں بے وجہ اور بے بنیاد نہ تھیں حتیٰ کہ دوستوں کی دوستی پر بھی ان کو شبہ ہے۔

کیست از اہل زمانہ خاقانی — کہ تو اہل وفاش پنداری
دوستی کز سر غرض شد دوست — ہاں وہاں تا کہ دوست نشماری
خواجہ گوید کہ دوستدار توام — پاسخش وہ کہ دوست چوں داری
تا عزیزم مرا عزیز کنی — چوں شدم خوار خوار انگاری

جہاں تک ہجو کا تعلق ہے خاقانی ہجو نگار نہیں تھے۔ تاہم عام انسان ہوتے ہوئے

اسی معاشرہ کا باسی ہوتے ہوئے وہ کئی دفعہ مجبور ہو گئے کہ ہجو کہیں۔ ابوالعلا گنجوی کی ہجو کہی۔ بعض اوقات خاقانی۔ خواہ مخواہ دوسروں کی وجہ سے ہجو گو مشہور ہو گئے۔ مگر انہوں نے اس غلط فہمی کا ازالہ اصفہان کی مدح لکھ کر دیا جو کلام خاقانی کا ایام قید میں لکھا گیا وہ "حبسیہ" کے نام سے مشہور ہے اور اس میں نہایت ہی سوز و گداز اور دردِ پنہاں ہے۔

خاقانی کے ہم عصر شعراء کا موازنہ و تقابل کرنے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ وہ حالات زندگی اور کلام کی حیثیت سے بعض پہلوؤں میں انوری سے ملتے جلتے ہیں اور بعض میں منفرد ہیں۔ زبان کے اعتبار سے دونوں مختلف ہیں۔ لیکن اپنا اپنا مستقل انداز رکھتے ہیں۔ انوری کی زبان عوام کے قریب ہے لیکن خاقانی مشکل تراکیب بروئے کار لاتے ہیں۔ خاقانی کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے تاریخ اسلام کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ خاقانی کے ہاں تصوف، عرفان نصب العین ہے انوری روزینۂ دربار نہ چھوڑ سکا۔ لیکن خاقانی نے ایسا کیا نہیں۔ لیکن خاقانی اور انوری میں مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔ دونوں نے تخلص تبدیل کئے۔ دونوں نے اپنی زندگی میں ہجو کہیں اور دونوں نے اپنی بیویوں کی ہجو لکھیں علمی رجحانات میں دونوں کی مناسبت سے دونوں نے علم و فضل کی نمود و نمائش کی۔ دونوں اپنے اپنے ماحول سے غیر مطمئن ہیں۔ دونوں کو اپنی اپنی قصیدہ نگاری پر ناز ہے دونوں کے ساتھ اس دنیا میں تلخ واقعات و حادثات پیش آئے۔ دونوں نے استغنا کی زندگی بسر کی۔ آخری عمر میں دونوں نے قصیدہ گوئی ترک کر دی۔

خاقانی ایران کے عظیم المرتبت شاعر ہیں ان کا کلام اخلاق کی اعلیٰ اقدار کا حامل ہے اور فنی اعتبار سے بھی یہ کلام خاصا پختہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاقانی کا کلام آج بھی ایران کے علاوہ دیگر یونیورسٹیوں میں بھی شامل نصاب ہے۔

"کیا سبب ہے کہ مجھے خراسان نہیں جانے دیتے"

صفحہ ۱۲۶

۱۔ عندلیب : بلبل

ترجمہ : کیا سبب ہے کہ مجھے خراسان کی طرف نہیں جاتے۔ میں بلبل ہوں (اس کے باوجود) مجھے باغ کی طرف نہیں جانے دیتے۔

تشریح : خاقانی کے زمانے میں خراسان علم و ادب، شعر و سخن کے قدر دانوں کا مرکز تھا۔ خاقانی کی شاعری کی عراق میں قدر نہ تھی۔ اس لیے اس کی دلی آرزو تھی کہ وہ عراق سے خراسان جائے تاکہ اس کے شعر و سخن کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جا سکے۔ لیکن اس کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ اس قصیدے میں وہ شکوہ سنج ہے کہ اسے خراسان کیوں نہیں جانے دیتے۔ فرماتے ہیں۔ شیریں نوا بلبل کے چہکنے کی جگہ تو باغ ہے لیکن مجھ پر یہ ظلم ہے کہ مجھے باغ (خراسان) میں جانے سے روک رہے ہیں۔ اس شعر میں خاقانی نے اپنے آپ کو بلبل اور خراسان کو گلستان سے تشبیہہ دی ہے۔

۲۔ مرغ : پرندہ — بستان : بوستان کا مخفف۔ خوشبو کی جگہ۔

آوخ کلمۂ افسوس — باغ : چمن

ترجمہ : خراسان کے باغ میں مجھ جیسا کوئی پرندہ نہیں ہے۔ میں پرندہ ہوں۔ لیکن مجھے باغ میں نہیں جانے دیتے۔

تشریح : خاقانی نے اس شعر میں خود کو خوشنوا پرندہ کہا۔ اور خراسان کو باغ تصور کر کے کہتا ہے کہ خراسان میں اس جیسا کوئی خوش بیان شاعر نہیں ہے۔ خاقانی کو اپنی قادر الکلامی کا احساس ہے وہ سمجھتا ہے کہ خراسان میں اس جیسا کوئی شاعر نہیں ہے کہ اہل عراق اسے خراسان نہیں جانے دیتے۔

۳۔ گنج : خزانہ — دُر : موتی

ترجمہ: اگر مجھے خراسان کے بازار میں نہیں جانے دیتے تو بھی موتیوں کے خزانے کو عراق کے بازار میں نہیں لے جایا جا سکتا۔

تشریح: خاقانی نے اس شعر میں اپنے کلام کو قیمتی موتیوں سے تشبیہ دی ہے۔ خاقانی سمجھتا ہے کہ صرف اہلِ خراسان ہی ان بے بہا موتیوں کے خزانے کی قدر کر سکتے ہیں۔ عراق تو ایک ایسا بازار ہے جہاں شعر و سخن کی سرد بازاری ہے۔ اگر اہلِ عراق مجھے یہ گنجِ بے بہا خراسان نہیں لے جانے دیتے تو کیا میں اپنی متاعِ شعر و سخن کو عراق ہی میں پڑے رہنے دوں۔ جہاں اس کا کوئی قدر شناس نہیں۔ خاقانی عراق میں اپنی قصیدہ گوئی کی شایانِ شان قدر نہ ہونے کے سبب خراسان جانے کے لیے بے چین ہے۔

۴۔ **سر چشمۂ حیوان**: آبِ حیات کا سرچشمہ

ترجمہ: نہیں نہیں خراسان میں آبِ حیات کا چشمہ اُبلتا ہے میں چونکہ خضر نہیں ہوں۔ اس لیے مجھے اس (چشمے) تک نہیں جانے دیتے۔

تشریح: فرماتے ہیں جس طرح حضرت خضر علیہ السلام نے چشمۂ آبِ حیات سے آبِ حیات پی کر ہمیشہ کی زندگی حاصل کی تھی۔ اسی طرح خراسان بھی اہلِ فن کے لیے چشمۂ آبِ حیات کی مانند ہے۔ اہلِ فن خراسان جا کر اہلِ خراسان جا کر اہلِ خراسان کی قدر دانی کے ذریعے ہمیشہ کی زندگی حاصل کرتے ہیں۔ خاقانی بھی خراسان جا کر اپنے کلام کی مقبولیت اور شہرت کے ذریعے بقائے دوام حاصل کرنے کا متمنی ہے لیکن اسے علم و ادب کے اس چشمۂ زندگی (یعنی خراسان) سے مستفید ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ خاقانی سمجھتا ہے۔ جس طرح چشمۂ حیوان تک خضر کے سوا کوئی نہیں پہنچ سکا۔ شاید اسی طرح علم و ادب کے چشمۂ حیوان (یعنی خراسان) تک پہنچنا اس کی قسمت میں نہیں ہے۔

۵۔ **تحویل**: حوالہ

ترجمہ: میں سکندر کی مانند ہوں لیکن مجھے بحرِ ظلمات کے سپرد کر دیا ہے (اور) مجھے چشمہ آبِ حیات کی طرف نہیں جانے دیتے۔

تشریح: خاقانی نے اس سے پہلے شعر میں خراسان کو آبِ حیات سے تشبیہ دی تھی۔ اور علم و ادب کے چشمۂ آبِ حیات تک اپنے نہ پہنچنے کی وجہ یہ بیان کی تھی۔ وہ خضر نہیں ہے۔ چونکہ خضر کے سوا کسی کو بھی چشمۂ آبِ حیات پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔ سکندر بھی خضر کی معیت میں آبِ حیات کی تلاش میں روانہ ہوا تھا، لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ خاقانی کی نظر میں عراق کی سرزمین قدر دانوں کے فقدان کے سبب بحرِ ظلمات سے کم نہیں ہے اور اہلِ عراق اسے علم و ادب کی سرپرستی اور قدر دانی کے مرکز خراسان جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ خاقانی کہتا ہے کہ وہ بھی سکندر کی طرح (خراسان کے چشمۂ آبِ حیات سے دُور رہ کر لطفِ دوام حاصل کرنے سے محروم ہے)

۶۔ **عیسیٰیم:** میں عیسیٰ ہوں۔ **منظر:** جائے نظر۔ جائے نظارہ
رضوان: بہشت۔ دربانِ بہشت۔ خوشنودی

ترجمہ: میں حضرت عیسیٰ کی مانند ہوں۔ میرے نظارے کی جگہ تو چوتھے آسمان کی چھت ہے مجھے رضوان یعنی بہشت کے آٹھویں دروازے میں داخل نہیں ہونے دیتے۔

تشریح: روایت ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ ہی آسمان پر اُٹھا لیا گیا اب ان کا قیام چوتھے آسمان پہ ہے۔ خاقانی اپنے آپ کو حضرت عیسیٰؑ کا ہم مرتبہ قرار دیتا ہے۔ جس طرح حضرت عیسیٰؑ اپنے معجزہ سے مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے اسی طرح خاقانی نے اپنے فضل و کمال سے فارسی شاعری کو افکار و اسلوبِ بیان کے لحاظ سے نئی زندگی بخشی۔ وہ اسی احساس کی بنا پر خود کو حضرت عیسیٰؑ کا درجہ دیتا ہے۔ روایت ہے کہ راستے میں سُوئی کی رکاوٹ کے سبب حضرت عیسیٰؑ بہشت کے آٹھویں دروازے

میں داخل نہ ہو سکے تھے۔ خاقانی کی نظر میں خراسان بھی بہشت کی مانند ہے لیکن اہل عراق اسے اس بہشت کے آٹھویں دروازے میں داخل نہیں ہونے دیتے

۷۔ **اسائت**: برائی کرنا۔ بدی کرنا **احسان**: بخشش۔ نیکی

مشرب: پانی پینے کی جگہ۔ مراد چشمہ

ترجمہ: مجھ سے کیا برائی ہو گئی۔ جو اس تشنہ دل کے باوجود مجھے بخشش کا پانی پینے کی جگہ (خراسان) کی طرف جانے نہیں دیتے۔

تشریح: جس طرح ایک پیاسے کی دلی آرزو ہوتی ہے کہ وہ جلد از جلد کسی چشمے کے کنارے پہنچ کر اپنی پیاس بجھائے خاقانی کی نظر میں خراسان احسان و بخشش کا سرچشمہ ہے لیکن اہلِ عراق علمی سرپرستی کے اس پیاسے کو بخشش کے اس چشمے سے شادکام ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ سمجھتا ہے کہ نہ جانے اس سے ایسا کون سا گناہ کبیرہ ہو گیا ہے جس کی پاداش میں اسے اس بخشش کا مستحق نہیں سمجھتے۔ اور خراسان سے دور رکھا جا رہا ہے۔

صفحہ ۱۲۶ ۸۔ **آرے**: ہاں **افلاک**: فلک کی جمع۔ آسمان

معالی: معلاۃ کی جمع۔ بزرگی و بلندی

ترجمہ: ہاں خراساں بلند آسمانوں کی (مانند ہے) پھر اس میں کیا تعجب ہے، کہ مجھے شیطان کی طرح آسمانوں پر نہیں جانے دیتے۔

تشریح: شیطان۔ حکم الٰہی کی نافرمانی کے سبب اللہ کی بارگاہ سے دور ہوا۔ اب ارشاد باری کے مطابق اس کا گزر آسمانوں تک نہیں ہو سکتا۔ شیطان کو بھی فرشتوں کا معلم ہونے کے سبب تمام فرشتوں پر فضیلت حاصل تھی۔ اب خاقانی کو بھی دوسرے شعراء پر اپنی فضیلت کا احساس ہے۔ اس کی نظر میں خراسان بلند آسمانوں کی مانند ہے۔ شیطان تو خدا کی نافرمانی کے سبب آسمانوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن خاقانی سے نہ جانے ایسی کون سی نافرمانی ہو گئی ہے جس کے سبب اہلِ عراق اسے علم و ادب کے بلند آسمان (خراسان) تک

جانے سے روک رہے ہیں۔

۹۔ خوش فرو خندم : میں خوشی سے ہنس پڑتا ہوں۔

ترجمہ : میں وہ صبح اول ہوں کہ جب میں لب کشائی کرتا ہوں تو مارے خوشی کے ہنس پڑتا ہوں۔ لیکن (لوگ) مجھے ہنسنے نہیں دیتے۔

تشریح : اس شعر میں خاقانی خود کو صبح اول یعنی صبح کاذب سے تشبیہ دیتے ہیں۔ طلوع سحر کے ساتھ ہزاروں فطری مناظر جلوہ گر ہو کر مردہ دلوں میں زندگی پیدا کر دیتے ہیں۔ خاقانی فرماتے ہیں کہ طلوع سحر کی مانند میرا کلام بھی مردہ اور افسردہ دلوں کے لیے زندگی بخش ہے۔ میرے کلام کی لطافت کو اہل عراق کیا سمجھ سکتے ہیں

۱۰۔ درمان : علاج　　**سران** : سر کی جمع۔ سردار

پی درمان : علاج کے لیے

ترجمہ : میں دل کا درد رکھتا ہوں۔ اور اس (درد) کا علاج خراسان ہے سرداروں کو کیسے زیب دیتا ہے کہ وہ مجھے علاج کے لیے نہیں جانے دیتے۔

تشریح : ہر فنکار کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کا فن قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جائے۔ خاقانی بھی اپنے شعر و سخن کی قدر و منزلت کے لیے قدر دانوں کا متلاشی ہے عراق کی سرزمین میں متاع سخن کی سرد بازاری اور قدر دانوں کے فقدان کے باعث اس کی یہ آرزو پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ اس کے دل کو اس بات کا دکھ ہے اور اس دکھ کا علاج صرف خراسان میں ہو سکتا ہے لیکن اس کو علاج کے لیے بھی خراسان نہیں جانے دیتے۔ خراسان کے امراء کو یہ بداخلاقی زیب نہیں دیتی کہ وہ ایک بیمار کو علاج سے روک رہے ہیں۔

۱۱۔ اشک : آنسو　　**غیورہ** : غیرت مند

ترجمہ : میں غیرت مندوں کے آنسو کی طرح آنکھ سے پلٹ جاتا ہوں۔ کیونکہ غیرت کے مارے مجھے پلکوں کی طرف سے نہیں جانے دیتے۔

تشریح : انسان کا دل احساسات کا سرچشمہ ہے۔ جب بھی دل کسی واقع سے متاثر ہوتا ہے تو آنکھوں کے آنسوؤں کا ایک سیلاب اُمڈ آتا ہے لیکن غیرت مند لوگ شدتِ غم کے باوجود آنسوؤں کے اس سیلاب کو آنکھوں میں روک لیتے ہیں۔ اور آنسو بہا کر غم کا اظہار کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ایسے آدمیوں کی اکثر اوقات قابلِ رحم حالت ہوتی ہے۔ خاقانی فرماتے ہیں کہ خراسان تک رسائی نہ ہونے میں میری حالت بھی غیرت مندوں کے آنسوؤں سے مختلف نہیں ہے۔ میں خراسان جانا چاہتا ہوں لیکن مجھے غیرت مندوں کے آنسوؤں کی طرح عراق سے باہر نہیں جانے دیتے۔

۱۲۔ روضہ : مزار مزار طغیان : نافرمانی

روضہ پاک رضا : امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کا پاک مزار جو مشہد خراسان میں واقع ہے۔

ترجمہ : (خراسان) میں امام علی بن موسیٰؑ کے پاک روضہ کی زیارت) اگر سرکشی اور نافرمانی ہے تو شاید (یہی وجہ ہے کہ) کہ مجھے نافرمانی کے راستے پر نہیں جانے دیتے۔

تشریح : مشہد (خراسان) میں امام ہشتم علی بن موسیٰ رضاؑ کا مزار مقدس ہے۔ لوگ حصولِ سعادت کے لیے اس مزار کی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔ خاقانی بھی خراسان جا کر مزار مقدس کی زیارت کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن عراق کے کوتاہ اندیش لوگ حصولِ سعادت کے اس مقدس نام کو بھی گویا سرکشی اور نافرمانی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ خاقانی دنیوی فوائد کی خاطر خراسان جانے کا آرزو مند ہے۔ اسی لیے یہ ناعاقبت اندیش لوگ امام ہشتم کے روضہ مبارک کی زیارت جیسے نیک نام کو بھی نافرمانی اور سرکشی خیال کرتے ہیں۔

۱۳۔ عصمت : پاک دامنی منصب دیوان : منصب وزارت

ترجمہ : عقل و دانش اور پاک دامنی کہ جنھوں نے مجھے فراغت کا تاج عطا کیا

ہے وہ وزارت کے منصب پہ نہیں پہنچنے دیتے۔

تشریح: خاقانی کو اپنی عقل و دانش اور فضل و کمال کا پورا پورا احساس ہے اسی لیے وہ اپنی استعداد و فضیلت کے سبب خود وزارت جیسے اعلیٰ ترین منصب کا مستحق سمجھتا ہے۔ لیکن وہ صبر و قناعت اور دنیاوی رنج والم کی فراغت کے سبب دنیاوی جاہ و مقام کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ خاقانی کو یہ احساس ہے کہ اگر وہ خراسان گیا تو اس کے فضل و کمال کے پیش نظر اسے منصبِ وزارت عطا کیا جائے گا۔ لیکن صبر و قناعت اسے خراسان نہیں جانے دیتے تاکہ اسے روحانی طور پر سکون قلب میسر ہے وہ اس سے محروم نہ ہو جائے۔

۱۴۔ **کاوہ:** ایک لوہار کا نام ہے جس نے ضحاک کے ظلم و ستم کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا۔

فریدوں: ایک بادشاہ کا نام جسے ضحاک کے قتل کے بعد ایران کی حکومت سپرد کی گئی تھی۔

تایید: مدد

ترجمہ: میں وہ کاوہ (لوہار) ہوں جسے خوش نصیبی کے فریدوں ہونے کی مدد بھی کی اور آہرن کی طالب نہیں بننے دیتی۔

تشریح: خاقانی ایک لوہار کے فرزند تھے لیکن اس کے باوجود وہ کاوہ لوہار کی مثال دے کر اپنی عظمت کو اس طرح واضح کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں اگرچہ میں پیشے کے لحاظ سے لوہار ہوں لیکن قدرت نے علم و دانش کی فضیلت دے کر میری قسمت میں بادشاہ گری کا بلند مقام لکھ دیا ہے۔ واضح رہے کہ کاوہ لوہار نے ضحاک کے ظلم و ستم کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے عوام کو اس کے ظلم و ستم سے نجات دلائی تھی۔ اور فریدوں کو دوبارہ بادشاہ بنوایا تھا۔ خاقانی فرماتے ہیں۔ کہ لوہار ہوتے ہوئے بھی مجھے اللہ تعالیٰ نے عقل و دانش کی اس قوتِ عظیم سے سرفراز کیا ہے جس سے میں دنیا میں عظیم کام انجام دے سکتا ہوں۔ اور اپنے پیشے سے قطع نظر فضل و کمال میں اہم خدمات انجام دے رہا ہوں۔

۱۵۔ **ترجمہ:** مجھے کنوئیں کا خوف اور جان کا غم ہے اور ان دو اسباب کی بنا پر مجھے خراسان میں بھائیوں کی طرف نہیں جانے دیتے۔

تشریح: خاقانی فرماتے ہیں کہ اہلِ عراق مجھے خراسان جانے سے روک رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ خراسانی میرے ساتھ برادرانِ یوسف جیسا نازیبا سلوک کریں گے۔ جس طرح برادرانِ یوسف نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں ڈال کر گوناگوں تکلیف پہنچائیں تھیں اسی طرح خراسانی بھی خاقانی کو تکلیف دیں گے۔ اس شعر میں تاکید بالازم بمایشبہ باعلاج کا التزام ہے۔ ظاہراً تو اہل عراق کی تعریف کی گئی ہے لیکن حقیقت میں اہلِ عراق کو نہایت ہی سنگدل کہا گیا ہے۔ جو خاقانی کو اس کے بھائیوں سے بھی نہیں ملنے دیتے۔۔

۱۶۔ **شرار:** شر کی جمع۔ چنگاریاں **اثیر:** کرۂ نار
اختر: ستارہ **شہاب:** ٹوٹنے والا ستارہ۔
رخشاں: چمکدار۔ روشن۔ چمکنے والا

ترجمہ: میں وہ چنگاری ہوں جو اپنے بل بوتے پر کرۂ نار تک پہنچ سکتی ہے۔ لیکن مجھے شہابِ ثاقب کی طرح چمکنے والا ستارہ نہیں بننے دیتے۔

تشریح: فرماتے ہیں۔ میں تو اس چنگاری کی مانند ہوں جو اپنے بل بوتے پر زمین کی پستی سے اٹھ کر کرۂ نار کی بلندی تک پہنچ سکتی ہے اور اس دوران میں شہابِ ثاقب کی مانند روشن ستارہ بن سکتی ہے لیکن یہ میری بدنصیبی ہے کہ میں بلندی تک پہنچنے سے محروم ہوں اور پستی میں پڑا ہوا ہوں۔ اس شعر میں خراسان کو کرۂ نار اور خود کو چنگاری کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خاقانی کی فطری قابلیت کے جوہر صرف خراسان میں اُجاگر ہو سکتے ہیں۔ اہلِ عراق اس کے فضل و کمال کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

شمس الدین محمد حافظ شیرازی،

۷۲۶ھ ——— ۷۹۱ھ

آپ شیراز میں سلطان ابوسعید کے زمانۂ حکومت میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش قطعی طور پر معلوم نہیں مگر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ۷۰۰ ہجری سے قبل نہیں۔ سعید نفیسی نے ۷۲۶ ہجری سے ۷۲۹ ہجری کے بین بین لکھی ہے۔ ڈاکٹر محمد معین نے ۷۲۶ ہجری بتائی ہے۔ آپ کا نام محمد ہے جو اس شعر سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

یگانہ سعدی ثانی، محمد حافظ این سراچہ فانی بدار آخرت رفت

شمس الدین لقب اور حافظ تخلص ہے۔ بچپن ہی میں انکے والد بہاؤالدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے دو بڑے بھائی بھی تھے، جب تک مل کر رہے زندگی آرام سے گزری مگر جب وہ بھائی علیٰحدہ ہو گئے تو عُسرت فقر و فاقہ کا سامنا کرنا پڑا۔ طالب علمی کا زمانہ بڑی مشکلات میں گزرا۔ تنگیٔ معاش کی بنا پہ اپنے محلہ کازرون ہی میں خمیر گری پر مامور ہوئے لیکن اس کے باوجود تعلیمی مشاغل سے غافل نہیں رہے۔ حتی الامکان کوشش سے تحصیل علم میں مصروف رہے۔ حاجی قوام الدین کے مکتب میں قرآن مجید حفظ کیا۔ اسی مناسبت سے حافظ تخلص کیا۔ حفظِ قرآن پر خود بھی نازاں تھے۔

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ بقرآنی کہ اندر سینہ داری

حکمت و فلسفہ کی تدریس شمس الدین شیرازی سے کی۔ سید شریف جرجانی اور قاضی عضد الدین عبد الرحمٰن یحییٰ سے بھی تلمذ کیا۔ مسلماً کسی پیر طریقت تک بھی رسائی حاصل کی مگر بقول صاحب ریاض العارفین اس کا نام نہیں ملتا۔ اس طرح مصنف میخانہ کا یہ بیان ناقابل اعتبار رہ جاتا ہے کہ "حافظ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ پروفیسر بدیع الزمان فروزانفر تو حافظ کا زمانۂ تدریس چالیس سال بتاتے ہیں اور اس کی تائید میں یہ شعر پیش کیا ہے۔

علم و فضل کہ بہ چل سال دلم جمع آورد
ترسم آن نرگس مستانہ بیک جا ببرد

لیکن یہ بات کہ حافظ چالیس برس صرف تعلیم پاتے رہے محل نظر ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ عربی و فارسی علوم و ادبیات سے کما حقّہٗ بہرہ ور تھے اور علامۂ زمخشری کی تفسیر کشاف پر حاشیہ لکھنا اس بات کی بین دلیل ہے۔

ملّا عبدالنبی لکھتے ہیں کہ محلے میں ایک بزاز رہتا تھا جو شعر کہتا تھا۔ اور صاحب ذوق تھا، اس وجہ سے اکثر اہل ذوق اس کی دکان پر آ بیٹھتے تھے اور شعر سنتے سناتے تھے، حافظ بھی اس صحبت میں شریک ہوتے مگر بے تکے شعر کہنے کی وجہ سے دوسروں کے مذاق و تضحیک کا نشانہ بنتے تھے۔

عبدالنبی مزید لکھتا ہے کہ آپ کو "شاخ نبات" نامی عورت سے عشق ہوا مگر وصال یار کی امید نظر نہ آئی۔ آخر آپ نے باباکوہی کے مزار پر چلّہ کشی کی، چالیسویں روز نیند آگئی تو دیکھا امیرالمومنین علی المرتضیٰ فرما رہے ہیں، جا اب تم پر علوم کے دروازے کھل گئے، چنانچہ دوسرے دن جب حافظ اُٹھے تو

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند   وندران ظلمت شب آب حیاتم دادند

لیکن ایک ہی رات میں خواب کے بعد کسی شخص کا صاحب علم و عرفان ہو جانا محال ہے۔ علمی، تاریخی لحاظ سے یہ امر نا قابل قبول ہے۔ دوسرے اس غزل میں مجاہدہ و ریاضت کے ان فیضان کی طرف اشارہ ہے جو سالکان راہ حقیقت کو سالہا سال کی سخت قسم کی ریاضتوں کے بعد نصیب ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہ شاخ نبات سے یہاں مراد "شیریں سخن قلم" ہے کہ شاخ نبات اگر واقعی حافظ کی محبوبہ ہوتی تو اس کا ذکر دیوان میں اکثر آنا چاہیے تھا۔

حافظ نے اپنی تمام زندگی اپنے مولد شیراز ہی میں گزار دی۔ سیر و سیاحت کی بجائے گوشہ نشینی ہی پسند تھی۔ کچھ گلگشت مصلّیٰ اور کنارہ کناباد کے سوا اور کچھ بھاتا نہیں، ۷۷۱ ہجری سے ۷۷۶ ہجری کے کسی سال یزد پہنچے مگر آپ نے

"ملک سلیمان" یعنی شیراز کے مقابلے میں اسے "یزدان سکندر" اور "منزل ویران" کہتے ہوئے لوٹ آئے۔ اس کے علاوہ محمود شاہ والی دکن نے حافظ کو زاد راہ بھیج کر دربار میں آنے دعوت دی۔ مگر حافظ نے بادشاہ کے فرستادہ توشۂ راہ سے کچھ قرض ادا کیا۔ کچھ غریب دوستوں میں بانٹ دیئے، تو حافظ کے دو تاجر دوستوں زین الدین ہمدانی خواجہ کازرونی نے کرایہ ادا کرنے کی حامی بھری۔ مگر بندرگاہ ہرمز میں پہنچ کر سمندر میں بادِ مخالف کے چلنے سے تلاطم بپا ہوا تو حافظ نے جانے سے انکار کر دیا اور غزل لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں بھیج دی۔ اس کا مطلع ہے۔

دمی باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد　　　　بمی بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد

حافظ کا زمانہ ایک ہنگامہ و شورش کا زمانہ تھا۔ سب سے پہلا تاجدار جس نے حافظ کی قدردانی کی ابو اسحٰق انیجو ہے جو شاعر دوست اور شعر نواز تھا۔ اس کی حکومت کا مبارز الدین نے ۷۵۸ ہجری میں خاتمہ کر کے خود حاکم بنا، یہ بہت سخت گیر فرمانروا تھا اس نے شیراز کے شراب خانے بند کر دیئے تھے، اسی لیے صاحبانِ دل اسے محتسب کے نام سے یاد کرنے لگے، مبارز الدین کی حکومت کا خاتمہ اس کے بیٹے شاہ شجاع نے کیا اور ۷۶۰ سے ۷۸۶ ہجری تک حکومت کی۔ یہ صاحب ذوق حکمران تھا، شعرا کا دلدادہ تھا، معاشرتی پابندیوں کو ختم کیا۔ چنانچہ حافظ نے اس مژدۂ جانفزا کو یوں سنایا۔

سحر ز ہاتف غیبم رسیدہ مژدہ بگوش　　　　کہ دورِ شاہ شجاع است می دلیر بنوش

۷۸۶ ہجری میں شاہ شجاع کے انتقال کے بعد اسکا بیٹا زین العابدین حکمران بنا مگر اس کے زمانے میں ملک میں قتل و غارت اور بدامنی کا دور دورہ رہا۔ ۷۸۹ھ میں امیر تیمور نے فارس پر قبضہ کیا۔ لیکن دو ماہ کے بعد اپنے وطن لوٹ گیا۔ مگر فارس کی حکومت شاہ یحییٰ کو تفویض کر دی۔ شاہ منصور نے جب یہ سنا تو ۷۹۰ھ میں شیراز پر قبضہ کر لیا۔ پانچ سال بعد جب امیر تیمور واپس ایران آیا اور شاہ یحییٰ کی بجائے شاہ منصور کو حاکم بنا دیکھا تو شیراز پر فوج کشی کی

شاہ منصور مردانہ وار مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا۔

تیمور اور حافظ کی ملاقات ہوئی یا نہ، ڈاکٹر قاسم غنی لکھتے ہیں کہ بعض اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ غلبہ تیمور اور فارس پر اس کا تسلط حافظ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ دولت شاہ اور سر جان میلکم، رضا قلی ہدایت کا بھی خیال ہے کہ امیر تیمور اور حافظ کی ملاقات ہوئی تھی۔ اور اگرچہ عبدالرحیم خلخالی اور ہم قافیہ پنہمان کو یہ ملاقات ایک افسانوی اختراع معلوم ہوتی ہے مگر اس فاتح اور سخنسرائے عظیم کی ملاقات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

حافظ شیرازی کی وفات ۷۹۱ھ میں ہوئی۔ اسی گلگشت مصلّےٰ میں دفن کیئے گئے۔ آپ کی تاریخ وفات بھی رد خاک مصلّےٰ سے نکالی گئی ہے۔

حافظ صاحب نے بھی اسی انداز میں گفتم گفتا کی مشق ایک سے زیادہ غزلوں میں فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک غزل کا مطلع ہے ؎

گفتم غم تو دارم گفتا غمت سر آید گفتم کہ ماہِ من شو گفتا اگر برآید!!

مطلع کو مطلع سے یہاں اور باقی اشعار کو دیوان میں مابقی غزل سے مقابلہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حافظ صاحب امیر خسرو کو نہیں چھو سکتے۔

حضرت امیر خسرو کی ایک دوسری مقبول غزل کا مطلع ہے ؎

کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست ہر رگ من تار گشتہ حاجب زنار نیست

جواب حافظ صاحب کی یہ غزل سمجھی جا سکتی ہے ۔ ؎

عاشق جاناں مرا با کفر و با ایمان چہ کار تشنۂ دردم مرا با وصل و با ہجراں چہ کار

مطلعوں ہی کے مقابلہ سے حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے مطلع کی فوقیت مذاق صحیح اور طبع سلیم پر روشن ہو گی۔ بعض تو ان غزلوں کو جو حضرت امیر خسرو کے مقابلے میں آئی ہیں اس قدر گھٹیا پاتے ہیں کہ ان کو حافظ کا کلام ہی نہیں سمجھتے، مگر حضرت کی وفات کے قریب ہی جو نسخہ دیوان خاص شیراز میں تحریر ہوا ہے اور آصفیہ کتب خانے میں موجود ہے اس تک میں تو ان غزلوں کو ہم موجود

پلٹتے ہیں۔

خسرو کی دیگر مشہور غزلوں پر حضرت حافظ نے بہ تبدیل بحر و قافیہ بھی غزل لکھنے اور قلم اٹھانے کی جرأت نہیں فرمائی ہے۔ علی الخصوص ذیل کی غزلوں پر جن کے مصراع اول یہ ہیں:

اے چہرۂ زیبائے تو رشک بتان آذری
خرم رسیدا مشب بربار خواہی آمد
نمیدانم چہ محفل بود شب جائے کہ من بودم
بخوبی ہمچو مہ تابندہ باشی وغیرہ وغیرہ

حافظ صاحب کے دیوان میں ان کی طرز پر کوئی غزل نہیں گو بجائے خود بہت سا عمدہ اور بے مثل کلام موجود ہے۔ حضرت امیر خسرو کے ان اعتراضات کے صلہ میں مبداء فیاض نے حافظ صاحب کو شیرینی بھی عطا فرمائی اور اس پر ایک مستثنیٰ خاص اضافہ کی جو اس طرح جیسے شیرینی حضرت امیر خسرو کی خاص صفت ہے۔ حافظ صاحب کا خاص وصف قرار پائی جس سے کوئی نہ بڑھ سکا۔ اسی طرح جیسے شیرینی میں کوئی خسرو سے آگے نہ نکل سکا۔

فی الجملہ آپ کا کلام لطیف و دلکش موثر و حسین ہوتا ہے۔ دل میں گھر بناتا ہے۔ ترتیب الفاظ میں موسیقی سناتا ہے۔ حافظے پر زور نہیں پڑتا۔ سن کر یاد رہ جاتا ہے۔ صنائع لفظی و معنوی سے آراستہ اور ڈھلا ہوا گویا آسمان طبیعت سے نازل ہوتا ہے۔ صنائع اس پر بار نہیں معلوم ہوتے نہ ان کے معانی کا پہلو دبنے پاتا ہے۔ بلکہ رنگ برنگ لطف دو لطف دکھاتا ہے۔ آسانی اور روانی سے گمان نہیں ہوتا کہ اس کے موزوں کرنے میں شاعر کو کچھ کاوش ہوئی۔ معانی ضرور بضرور کسی نکتہ نادر یا ظرافت کو لیے ہوتے ہیں۔ جو اشعار اوپر مثالوں میں گزرے سب ان دعاوی کی دلیل ہیں۔

جو شہرت اور مقبولیت حضرت خواجہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کو

نصیب ہوئی کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔

حضرت کے کلام کو ان کی زندگی میں ہی لوگ تحفے کے طور پر لے جاتے تھے۔

؎ زبان کلک تو حافظ چہ شکر آن گوید کہ تحفۂ سخنت می برند دست بدست

یہ قدر دانی ملک وطن تک ہی محدود نہ تھی، دیگر اوطان و ممالک میں بھی

آپ کا کلام نہ صرف پہنچتا تھا بلکہ اس کی دھوم سے محفلیں گونج رہی تھیں ؎

فگند زمزمۂ عشق در حجاز و عراق نوائے بانگ غزلہائے حافظ شیراز!

سخن آپ کا ایک فاتح کی طرح فتوحات میں مصروف تھا ؎

عراق و پارس گرفتی بشعر خود حافظ بیا کہ نوبت بغداد و وقت تبریز است

کشمیر و ختا و ختن میں آپ کے کلام پر رقص و سرود ہوتے تھے ؎

بشعر حافظ شیراز می گویند و می رقصند سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

غرض ایشیا کے تمام ممالک میں جہاں فارسی زبان کی پہنچ تھی اور ایسے ممالک

کم تھے جہاں اس کی پہنچ نہ ہو۔ حافظ صاحب کے کلام کا آپ کی حیات میں نہ صرف

وہاں پہنچنا بلکہ وہاں کے نغموں پر غالب آجانا بخوبی ثابت ہے ؎

حافظ حدیث سحر فریب خوشت رسید تا حد چین و شام و با قصائے روم و رے

بنگال میں آپ کا کلام آپ کی زندگی میں پہنچ گیا تھا۔ ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

سلطان محمود بہمنی نے آپ کے کلام کے ملاحظہ سے مشتاق ہو کر آپ کو دکن

آنے کی دعوت دی تھی جس کے جواب میں آپ بھی جہاز میں بیٹھ کر روانہ ہونے

کو تھے کہ طوفان آگیا اور قصد ترک کر دینا پڑا

صدیوں پہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی آپ کے کلام کی شہرت اور ہر دلعزیزی

میں فرق نہیں آیا بلکہ اس کے حدود وسیع ہوتے رہے آخر اس نے یورپ اور

نئی دنیا میں بھی قدم رکھا۔ کم شائستہ زبانیں ایسی ہیں جن میں اُن کا کلام ترجمہ ہو

کر طبع نہ ہو چکا ہو بلکہ اس کو دیکھ کر یورپ کے نامور شاعر گوئٹے نے آپ کی تقلید

میں دیوان لکھا اور اس کو دیوان ہی کے نام سے موسوم بھی کیا۔ غالب کا یہ مصرعہ اسی پر صادق ہے:

بلبلیں سن کر مرے نالے غزلخوان ہو گئیں

فارسی کا کوئی ادیب و شاعر آپ کے بعد نہیں گزرا جو آپ کے خرمن کا خوشہ چین اور معترف نہ رہا ہو بلکہ آپ کے معاصرین میں سلمان ساوجی اور قاسم انوار جو بڑے بڑے شاعر گزرے ہیں آپ کے معترف کہے جاتے ہیں۔ اس حد تک کہ قاسم انوار کی مجلسوں میں دیوان حافظ ہمیشہ پڑھا جاتا تھا۔

مولانا جامیؒ نے آپ کو ترجمان الاسرار اور آپ کی زبان کو لسان الغیب کا لقب دیا ہے اور نظیری نیشاپوری نے فخر سے کہا ہے ؎

تا اقتدا بحافظ شیراز کردہ ایم　　گردید معتقد لئے دو علم کلام ما (نظیری)

صائب کا مصرعہ ہے کہ ؎　بجو شعر حافظ شیراز انتخاب ندارد

یعنی حافظ کے کلام سے کوئی برا شعر چھانٹ کر نکالنا غیر ممکن ہے۔

ایک اور موقع پر کہتا ہے ؎

کمال حافظ شیراز راز صائب پرس　　کہ قدر گوہر شہوار جوہری داند (صائب)

عرفی بھی جو کسی شاعر کو خاطر میں نہیں لاتا یا اُستاد کہہ کر یہاں کان ٹیک دیتا ہے اور آپ کو قبلہ و کعبہ سخن تسلیم کر کے آپ کے مزار کے گرد طواف کرنے لگتا ہے ؎۔

بر گرد مرقد حافظ کہ کعبہ سخن است　　درآمدیم بعزم طواف در پرواز (عرفی)

سوال ہو سکتا ہے کہ یہ لطف و لطافت حضرت کے کلام میں کہاں سے آئی جو ایسے ایسے ادباء و شعراء کو کان پکڑنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس کا صرف ایک ہی سراغ آپ کے کلام میں ملتا ہے یعنی آپ حافظ کلام اللہ تھے۔ بلفحوائے ؎

جمال ہم نشین در من اثر کرد

کلام پاک کے ورد سے یہ لطف و لطافت آپ کے کلام میں پیدا

ہوئی ہے۔ کلام پاک کی تلاوت مدۃ العمر آپ کا عزیز ترین مشغلہ رہی۔ آپ کے کلام سے ثابت ہے ؎

حافظا در کنج فقر و خلوت شبہائے تار
تا بود وردت دعا و درس قرآں غم مخور

صبح خیزی و سلامت طلبی چوں حافظ
ہر چہ کردم ہمہ از دولت قرآں کردم

غرض آپ قرآن شریف کے اس قدر شیفتہ و شائق اپنے کلام میں پائے جاتے ہیں کہ اگر ایک طرف اپنی کامیابیوں کی نسبت فرماتے ہیں کہ ؎

بر منتہائے مقصد دل کامران شدم
تو دوسری جانب اپنی انتہائی کامیابی کا سہرا قرآن شریف کو دیتے ہیں ؎

ہر چہ کردم ہمہ از دولت قرآں کردم

بلاغت اور فصاحت اور حسن الفاظ و معانی کا جو قرآن پاک کے اخیل کے مسلمہ اوصاف ہیں اور مسلمان تو ان کو اعجاز و معجزہ ہی ثابت کرتے ہیں۔ ایک شمہ حافظ جیسے ذہین و ذکی انسان کو اس کے مدۃ العمر ورد و مزاولت میں ملنا ضرور تھا۔

قرآن شریف کی یہ صفت مسلم ہے کہ از اول تا آخر نصیحت ہے جہاں سے کھول کر دیکھو نصیحت ہی نصیحت نکلتی ہے۔ آپ کے کلام میں بھی بلا مبالغہ صدہا نصائح اصول اخلاق آداب معاشرت رموز شریعت اور اسرار طریقت لطیف و دلکش پیرایوں میں جا بجا بکھرے نظر آتے ہیں۔ جس طرح آپ کے پیشرو سعدی علیہ الرحمۃ نے اپنے ملکہ شاعری کو ضائع نہیں کیا۔ گلستان و بوستان میں اس کو صرف کیا۔ حضرت کے کلام میں بھی مفید و سود مند اشعار و مطالب کی کثرت اور بہتات دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ آپ نے بھی اس عطیہ فطرت کو بیکار نہیں جانے دیا۔ اس سے کام لیا اور مفید خلق بنانے میں سعی کی لیکن بطرز دیگر۔ حضرت سعدی کا ناصحانہ انداز اختیار کرتے تو وہ کچھ بات نہ ہوتی۔ علاوہ ازیں شیخ موصوف اس طرز کو ختم کر چکے تھے۔ نیز گلستان و بوستان کی پہنچ زیادہ

نغمی مکتب میں ہی بالائے طاق چھوٹ جاتی ہیں لیکن حضرت کی دلکش اور دلفریب بحور و قوافی میں ساز موسیقی پر بجتی ہوئی رواں غزلیں اپنی مستی سے ہر محفل کی جان ہوتی ہیں اور شاہد و نے کے لب د آواز اور سرود و ساز کے ذریعے اپنے پند و نصائح ان موقعوں پر بھی جہاں کھلم کھلا نصیحت بے محل بلکہ موجب سرزنش ہوتی ہے بے تکلف پہنچا دیتی ہیں اور عیش کے بندوں کو لطف سے سُنا ہی دیتی ہیں کہ ؎

خمار شب نشیناں را دوا کن! خدا را گر مے دوشینہ داری

قرآن کے اس حکم سے کہ "تمہاری ضرورتوں کے بعد جو بچے وہ (مفلسوں محتاجوں کو) خدا کی راہ میں دے دو۔" اس شعر کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ زائد از ضرورت مال سے دوشینہ ہے یعنی رات کی بچی ہوئی شراب اور مفلسوں محتاجوں کی گرسنگی اور بینائی کا خمار شب نشیناں میں اشارہ ہے۔ غرض زائد از ضرورت مال خدا کی راہ میں دے دینے کے مشورہ قرآنی کو جتانے کا پیرایہ اس سے بہتر ایسے مواقع کے لیے نہیں ہو سکتا۔ جہاں دولت شرابوں میں لنڈھ رہی ہو اور ضرورتوں سے بے تاب حاجت مندوں کی فریاد گوش گزار کرنے کا ذریعہ نغمہ و راگ ہی بتائے جا سکتے ہیں۔ سعدی کی اس مصلحانہ نصیحت سے کہ ؎

نیم نانے گر خورد مرد خدا بذل درویشاں کند نیمے دگر

حافظ کی اس رندانہ نصیحت کا مقابلہ کر کے دیکھنا چاہیئے۔ سعدی کی نصیحت خشک روٹی کے نوالے کی طرح حلق میں پھنستی ہے تو حافظ کی نصیحت شربت کا گھونٹ بن کر حلق سے اترتی جاتی ہے۔ وجہ اس فرق کی شیخ سعدی کی نصیحت کا مبالغہ بھی ہے۔ ایک ہی روٹی ہو تو اس کا نصف کر دینے پر کوئی شرعی مجبوری نہیں زائد از ضرورت کو دے دینے کا مشورہ اپنے اندر ایک قطعی استدلال رکھتا ہے جس سے فقط ایک ہی اللہ امین کی روٹی کو آدھا کر دینے کی نصیحت سعدی خالی معلوم ہوتی ہے ؎

دِل اندر زلفِ لیلیٰ بند و کارِ عشق مجنوں کُن ۔۔۔ کہ عاشق را زیاں دارد خیالاتِ خردمندی

بظاہر اس شعر میں شاہد پرستی اور عقل کو طلاق دے دینے کا مشورہ ہے۔ لیکن غور کیجئے تو انسان کو زندگی میں اپنے لیے کوئی فرض اور نصب العین مقرر کرنے اور اور اس کی دھن میں مجنوں ہو جانے کسی کی نہ سننے کی وہ گراں بہا نصیحت ہے جس پر عمل مسلمانوں کی دو تین پشت ہیں فی زمانہ مانا صرف سید احمد خاں کی ذات واحد نے کیا کہ وہ اپنی مجنونانہ کوششوں سے وہ کام کر گئے جس کے منصوبوں کو سُن کر لوگ ان پر ہنستے اور اس سے باز رہنے کے مشورے دیا کرتے تھے۔ سر سید اگر ان خیالات خردمندی میں پڑتے تو علی گڑھ اور جو کچھ اس نے کام کیا کبھی ظہور میں نہ آتا۔

گر دہ بگر ان بجان غم جاناں خریدہ اند ۔۔۔ اے دِل تو این معاملہ بارے نمے کنی؟

یہ بھی کسی معشوق مجازی پر جان نثار کر دینے کا مشورہ نہیں ہے بلکہ یاد دلایا ہے کہ انسان کو جان سے بھی دین یعنی اپنی قوم و ملت کی خدمت بجالانا ضروری ہے۔ بزرگوں نے اس کے لیے بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں۔ کبھی تم نے بھی جان پر کھیل کر کوئی ایسی خدمت انجام دی یا عمر بھر کھاتے اور ڈکارتے ہی رہے ہو؟ ؎

چہ شکر ہاست دریں شہر کہ فانع شدہ اند ۔۔۔ شاہبازانِ طریقت بہ شکارِ مگسے؟

اہل اور قابل لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے کاموں کی وسعت و قابلیت رکھنے کے باوجود کوئی بڑا کام نہیں کرتے۔ خرافات میں تضیع اوقات کرتے ہیں۔ حافظ صاحب تعجب فرماتے ہیں کہ شاہباز ہو کر یہ لوگ مکھیاں مارنے پر قناعت کیے بیٹھے ہیں ؎

عاقبت منزل ما وادی خاموشان است ۔۔۔ حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز!!

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ۔۔۔ ورنہ در محفل رنداں خبرے نیست کہ نیست

ایک اور شعر میں آیات رحمت و تخویف کے تضاد و کشمکش اور ان کے صحیح مفہوم کی نزاکت کو کس خوبی سے آشکارا کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

گرچہ میگفت کہ زارت بکشم می دیدم   کہ نہانش نظرے با من دل سوختہ بود

حسن ظن جو علم و انسانیت کا اصلی زیور ہے، اگر طبیعت میں موجود ہو تو حضرت کے کلام کی ان بلیغ معانی میں تشریح کو تسلیم کرنے میں کوئی دشواری نہیں بلکہ مجاز سے گزر کر حقیقت پر ان کی تطبیق میں زیادہ لطف ملتا ہے۔ فی الحقیقت آپ کے کلام کا اعجاز و خوبی اس میں مضمر ہے کہ اس کا مفہوم و مدعا دونوں طرف چسپاں اور منطبق ہوتا ہے۔ اپنی بابت اس خیال کے حضرت اپنے اس شعر میں خود شاعر نظر آتے ہیں۔

حافظم در مجلسے دردی کشم در محفلے   بنگر این شوخی کہ چوں با خلق صنعت میکنم

حسن ظن کا عالی وصف اگر کسی طبیعت کو علم و انسانیت نے عطا نہ کیا ہو تو صاف اشعار بھی آپ کے بہت سے موجود ہیں جن سے حضرت کی اصطلاحات مے کشی وغیرہ کے معنی مقرر و معین کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً

سر نہاں کو عارف سالک بہ کس نگفت   در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

کون انکار کر سکتا ہے کہ اس شعر میں صبح شب معراج کو معراج کی تمام کیفیت ایک مجذوب کی زبانی سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعجب فرمانے کی مشہور روایت کی طرف اشارہ نہیں ہے۔ پس اس شعر میں بادہ فروش کے معنی متعین کیے جا سکتے ہیں۔ حافظ صاحب کی اصطلاح یا حافظ اللغات میں بہت جگہ بادہ فروش قلندر و مجذوب کو کہا گیا ہے۔ ضمناً بادہ کے معنی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ایسے اور بھی اشعار دیوان سے برآمد کیے جا سکتے ہیں جن سے بیشتر حصہ دیوان کی جو ایک خمخانہ ہے اصطلاحات کے معنی متعین ہو جاتے ہیں۔ گویا حافظ صاحب کے میخانے کی کنجی ہاتھ آ جاتی ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں۔ ؎

نگار ما کہ بمکتب نہ رفت و خط نہ نوشت   بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بالا از صفات پر دنیا میں یہ تعریف صادق آ سکتی ہے کہ آپ کو کبھی لکھنے پڑھنے۔ مکتب مدرسے میں بیٹھنے کا اتفاق

نہیں ہوا۔ تاہم آپ کے ایک ایک قول و فعل اور عادات اخلاق و انداز بلکہ خاموشی تک سے صدہا مسائل شریعت اور اصول فقہ پیدا اور متفرع ہو گئے جن کی بحث و گفتگو میں فقہا اور محدثین کی عمریں صرف ہو گئی ہیں۔ لہٰذا اس شعر میں نگار کا لفظ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے اور آپ کے اسوہ حسنہ کے لیے لفظ غمزہ سے کام لیکر حضرت نے گستاخی کو تنبیہ کر دی ہے کہ انکے نگار کو عام معشوق اور اس کے غمزے کو معشوق بازاری کا نخرہ سمجھ کر آپ کی نسبت رندی کے خیالات سے پرہیز کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایک مقطع میں اس کو صاف صاف بھی کہہ دیا ہے ؎

دوستان عیب نظربازی حافظ مکنید　　که من او را ز محبان خدا می بینم

حضرت کا مشہور و معروف مطلع ہے ؎

غلام نرگس مست تو تاجدارانند　　خراب بادہ لعل تو ہوشیارانند

اس میں اگرچہ کوئی ایسا صاف و تصریح اشارہ نہیں جیسا کہ "بمکتب نرفت و خط ننوشت" میں پیدا ہوا تھا لیکن غور کیا جائے تو ایسی ہستی جس کے غلام تاجدار بھی ہوں اور ایسی تعلیم (بادہ لعل) جس کے مست حکیم و ہوشیار بھی ہو اور ہر زمانے میں متواتر ہوتے چلے آئے ہوں۔ تاریخ اسلام میں سوائے پیغمبر اسلام صلعم اور ان کی تعلیم و ہدایت کے کوئی اور قرار نہیں پا سکتی ——

—— اس قسم کے عاشقانہ استعارات اور شاعرانہ طرز ادا میں حضرت کے صدہا اشعار حمد و نعت میں بلا اظہار اسم ممدوح موجود ہیں۔

حضرت کے نصائح اور مدح و ذم اور نکتہ چینی کے مخاطب خلق کے تمام طبقات ہیں۔ اوّل بادشاہ اور امراء جن کے اخلاق سے خلق کے اخلاق ہر زمانے میں اثر پذیر ہوتے رہے ہیں۔ اکثر کلام آپ کا بادشاہوں اور امیروں وزیروں ہی سے خطاب میں ہے۔ بادشاہوں کو آپ کا انداز نصیحت بھی شاہانہ ہے۔ مثلاً خوشخوئی کی تعلیم و نصیحت حضرت شیخ سعدی کے کلام میں اس سادگی کے ساتھ ہے ؎

به شیریں زبانی و لطف و خوشی   توانی که پیلے به موئے کشی

اس نصیحت کا انداز شاہانہ بادشاہوں۔ حضرت کے شاہوار اشعار میں قابل دید ہے. مثلاً فرماتے ہیں. ؎

یک طرہ کہ ہر موئیش صد نافہ چین ارزد   خوش بودے اگر بودے بوئیش ز خوشخوئی

کہتے ہیں کہ طرّہ کس قدر بانکا اور طرہ کے بالوں کی سیاہی کیسی رشک مشک ختن ہے لیکن اینٹھ مروڑ کے سوا۔ اس میں مشک کا فقط رنگ ہی رنگ ہے۔ خوشبو نام کو نہیں۔ کیا اچھا ہوتا اگر اس میں کچھ مہک یعنی خوشخوئی بھی ہوتی کہ مشک سے اس کی نسبت پوری ہو جاتی۔

مطلق العنان بادشاہوں کے غیظ و غضب سے ایک تھلکہ کاروبار حکومت میں پڑ جاتا تھا۔ حضرت نصیحت فرماتے ہیں کہ لطف سے بھی وہی کام نکل سکتا ہے جو غیظ و غضب ڈھانے سے۔ اس نصیحت کا انداز یہ ہے۔ ؎

دلِ عالمے بسوزی چو عذار برفروزی   تو ازیں چہ سود داری کہ نمی کنی مدارا؟

اہل قدرت و حکومت اپنے دوستوں وفاداروں سے ادنیٰ بات پر خفا ہو کر ان کو سخت معتوب کر دیتے ہیں اور مدۃ العمر کی خدمات صرف ایک خطا و فرو گذاشت پر فراموش کر دی جاتی ہیں۔ حضرت خواجہ حافظ ایسے مظلوم معتوبوں کی ان ناقدرے آقاؤں سے کس دردمندی کے ساتھ سفارش فرماتے ہیں۔

حافظ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ اس نے علم و فلسفے کی راہ کو ترک کر دینے کی ترغیب دی ہے اور کہا ہے کہ ان کی مدد سے حقیقت آشکار نہیں ہو سکتی۔ بادی النظر میں یہ بات غلط اور ناقابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے ہمیں حافظ کا مفہوم سمجھ لینا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس قسم کے علم اور کس طرح کی حکمت کو ناقص تصور کرتا ہے۔

حافظ کو علم وخرد، ہنر و حکمت پر عام اعتراض نہیں ہے وہ خود ایک عالم ہنرمند اور جفاکش انسان تھا اور ان کے کلام کو پڑھنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے عہد کے ایک خاص قسم کے علماء اور ان کی عقل اور ان کی حکمت کو ناکارہ اور گمراہ کن سمجھتا تھا۔ اور خود حافظ نے کہا ہے ؎

حافظا گر معنی داری بیار

ورنہ دعویٰ نیست غیر از قیل و قال

(حافظ اگر ٹھوس اور بامعنی بات کرنی ہو تو اسے پیش کرو ورنہ تمہارا دعویٰ صرف زبانی جمع ہوگا)

حافظ کے ہی عہد میں نہیں بلکہ کئی صدی پہلے سے تمام دنیائے اسلام کے روشن خیال خردمند اور دانشور مولوی کے اس "علم" کے خلاف ہو چکے تھے۔ اس علم کی دقیانوسیت ظاہر بینی اور سطحی منطق اور پھر اس کی بنیادی دنیاداری یعنی اہل اقتدار اور اہل زر کے ساتھ اس کا اتحاد و اتفاق عام آزادی خواہ لوگوں کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔ حافظ کا حملہ ایسے علم اور اس قسم کے علماء پر ہے۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ حافظ نے اپنے زمانے کے فقیہوں۔ قاضیوں مفتیوں مدرسوں۔ زہاد اور مشائخ پر جتنے سخت اور موثر حملے کیے ہیں کسی دوسرے فارسی یا اردو کے شاعر نے نہیں کیے ہیں۔

اس گروہ کی جس خصلت پر حافظ کو سب سے زیادہ غصہ آتا ہے وہ اس کی ریاکاری تھی یعنی علم دین اور فقہ کا مقدس لبادہ اوڑھ کر اور زہد و عبادت کی نقاب اپنے چہروں پر ڈال کر، یہ حضرات حافظ کے نزدیک دراصل خود پرستی، خود بینی اور شکم پروری میں غرق تھے اور انہوں نے اپنے علم و حکمت اور تقدس کو عوام الناس کو دھوکا دینے اور انہیں لوٹنے کا ایک وسیلہ بنا لیا تھا۔ حافظ نے کہا یہ حضرات تو

ریا حلال شمارند و جام بادہ حرام

زہے طریقت و ملت زہے شریعت و کیش

ریا کو حلال سمجھتے ہیں اور شراب کے پیالے کو حرام، کیا خوب طریقت و ملت ہے، اور کیا خوب شریعت و مذہب ہے)۔

فقیہہ کی کیفیت یہ ہے کہ ہوش و حواس کی حالت میں وہ عام طور سے ایسی باتیں کرتا ہے جو ٹھیک نہیں ہوتیں یا ان میں سچائی نہیں ہوتی یا وہ احمقانہ ہوتی ہیں۔

فقیہہ مدرسہ دی مست بود و فتویٰ داد

کہ می حرام ولے بہ ز مالِ اوقاف است

(کل مدرسہ کا فقیہہ مست تھا اور اس حالت میں اس نے یہ فتویٰ دے دیا کہ شراب حرام ہے لیکن اوقاف کا مال غصب کرنے سے بہتر ہے۔)

مولانا شبلیؒ تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس طرزِ ادا کی بلاغت پر لحاظ کرو اوّل تو اس امر کا اعتراف کہ شراب حرام سہی لیکن مال وقف سے بہرحال اچھی ہے خود فقیہہ کی زبان سے کرلیا ہے۔ اس کے ساتھ مست کی قید لگا دی ہے جس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ فقیہہ سچی بات کا اظہار یوں کب ہے کو کرتا مست تھا اس لیے پس و پیش کا خیال نہ آیا اور جو دل میں تھا زبان سے کہہ گئے"۔ شعر العجم جلد دوم صفحہ ۲۲۶)

حافظ کے نزدیک علماء عام طور سے جو کچھ کہتے اور لکھتے ہیں وہ لوگوں کو مغالطے میں ڈالنے کے لیے اور سچائی کو چھپانے کے لیے ہوتا ہے۔

لیکن اپنے بارے میں حافظ کا دعویٰ ہے۔

رقم مغلط بر دفتر دانش نکشیم

سر حق با ورق شعبدہ ملحق نہ کنیم

(میں مغالطے یا شک و شبہ میں ڈالنے والی بات عقل کے کاغذات پر نہ لکھوں اور سچائی کے راز کو شعبدہ کے ورق کے ساتھ ملحق نہ کروں گا۔

یہاں پر حافظ نے سچے علم اور حق پرستی کو مغالطہ ڈالنے والوں اور حق کو شعبدہ کے طور پر استعمال کرنے والوں کے علم و دانش سے علیحدہ کر کے

اور کہا ہے کہ دانش کو مغالطے میں ڈالنے اور سچائی کو ذہنی شعبدہ بازی کے لیے استعمال نہ کرنا چاہیے۔ ایذا رسانی اور عام لوگوں کی سادہ اور بے لوث زندگی میں خواہ مخواہ مداخلت اہل تقویٰ کی خود پرستی اور ان کے کبر و غرور کی نشانی ہے۔ حافظ ان کی اس خصلت سے بھی اپنی بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔

نہ قاضیم نہ مدرس نہ محتسب نہ فقیہہ
مرا چہ کار کہ منع شراب خوارہ کنم

(میں نہ قاضی ہوں نہ مدرس نہ محتسب ہوں اور نہ فقیہہ۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ میں لوگوں کو شراب پینے سے روکوں؟)

زہد و تقویٰ کی مسلسل تلقین کرنے والوں کو حافظ کم عقل بھی سمجھتا ہے اور دھوکے باز بھی۔ کم عقل اس لیے کہ وہ لوگوں کو خواہ مخواہ ان کی جائز اور بے ضرر خوشیوں سے محروم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور دھوکے باز اس وجہ سے کہ وہ خود تمام وہ باتیں چھپ کر کرتے ہیں جن سے وہ عام لوگوں کو منع کرتے ہیں۔

شیخم بہ طنز گفت حرام است مے مخور "گفتم" مگو کہ گوش بہ ہر خر نمی کنم
این تقویٰ ام بس است کہ چون زاہدان شہر ناز و کرشمہ بر سر منبر نمی کنم

(شیخ نے طنز کے ساتھ مجھ سے کہا کہ شراب مت پیو حرام ہے میں نے کہا کہ ایسی باتیں مجھ سے مت کرو۔ اس لیے کہ میں ہر گدھے کی بات نہیں سنتا۔ میرے لیے یہی تقویٰ کافی ہے کہ میں شہر کے زاہدوں کی طرح منبر پر بیٹھ کر (وعظ دیتے وقت) غرور نہیں کرتا اور اپنی آنکھوں اور بھنوؤں کو مٹکاتا نہیں ہوں۔)

حافظ دینی امور میں حکم لگانے والوں اور دنیوی معاملات میں فیصلہ اور سزا دینے والوں کے اخلاق پر جب نظر ڈالتا ہے تو اسے ان دونوں گروہوں میں ایک بات مشترک نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ دونوں جھوٹے اور فریبی ہیں۔

مے خور کہ شیخ و حافظ و مفتی و محتسب چون نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند

(شراب پیو اس لیے کہ شیخ اور حافظ مفتی اور محتسب، اگر اچھی طرح

دیکھو تو سب کے سب جھوٹے اور مکّار ہیں)

یہ کہا گیا ہے کہ اس قسم کا سخت طنز اور استہزا ایک منفی رویہ ہے اس سے محض عام بیزاری اور اپنے ماحول سے فرار کا جذبہ ظاہر ہوتا ہے۔ حافظ سماج کی خرابیوں پر نکتہ چینی تو کرتا ہے لیکن ان خرابیوں سے نجات کی جو راہ بتاتا ہے وہ دراصل ان خرابیوں سے آنکھیں موڑ کر یا تو جذب و وجد و کرامات کی اندرونی اور داخلی دنیا کی راہ ہے یا پھر "عیش پرستی" اور "لذت کوشی" کی راہ اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں راہیں ناقص ہیں۔

حافظ تصوف کے اس عام عقیدے کو قبول کرتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ ہی حقیقت مطلق اور حسن مطلق ہے جو تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔ کائنات کی تخلیق کے پہلے دن (روزِ ازل) اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات میں سے انسان ہی کو اپنے بارِ امانت سے سرافراز کیا۔ انسان تمام کائنات میں افضل ترین ہے اس لیے کہ روز اول اس کے علاوہ سب نے محبت کے اس عظیم پیمان کو اٹھانے سے اپنی معذوری ظاہر کی تھی۔ حافظ بعض دوسرے صوفیا کی طرح اس عقیدے سے ایک ہمہ گیر محبت کا نظریہ اخذ کرتا ہے۔ اس کے نزدیک چونکہ تمام دوسرے مظاہر فطرت اور انسانی یعنی تصوف کی اصطلاح میں تمام مجازی مظاہرات فی الحقیقت اللہ یا ازلی اور حقیقت ابدی کا ہی پرتو ہیں (جو ان تمام میں اس طرح موجود ہے جس طرح جسم میں جان) اس لیے تمام مخلوقِ خدا سے محبت اللہ سے ہی محبت کرنے کا دوسرا نام ہے۔ خلقِ خدا کی خدمت ہی بہترین عبادت ہے۔ یہی تصور حافظ کو اس نتیجے پر بھی پہنچاتا ہے کہ دنیا کو اسلام اور کفر یعنی دو ایسے حصّوں میں تقسیم کر دینا جن میں سے ایک کو روشنی اور دوسرے کو تاریکی کا خط سمجھا جائے غلط ہے۔ اللہ کا جلوہ جب ہر جگہ اور ہر چیز میں ہے تو کعبہ اور بت خانے میں فرق کیسے ہو سکتا ہے؟

در عشق و خانقاہ و خرابات شرط نیست
ہر کہ جا ہست پرتوِ روئے حبیب ہست

(عشق میں خانقاہ اور خرابات (شراب خانے) کی شرط نہیں ہے۔ جو بھی جگہ ہے وہاں حبیب (اللہ) کے ہی چہرے کی روشنی ہے) پھر کہا ہے۔

در خرابات مغان نور خدا می بینم
وین عجب بین کہ چہ نورے زکجا می بینم

(خرافات مغاں میں میں خدا کا نور دیکھتا ہوں۔ کیسے تعجب کی بات ہے کہ کیسا نور مجھے کہاں سے نظر آرہا ہے۔

اس طرح حافظ عشق و محبت کو تمام کائنات کے وجود وارتقا کا محرک اور بنیادی اصول سمجھتا ہے اور نوعِ انسانی کو اس کا امین سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک مودت کا یہ جذبہ ہی انسانی سرشت کا سب سے قیمتی اور لطیف جوہر ہے جو آب و گل کی اس تعمیر میں تمام اخلاقی اور روحانی خوبیاں پیدا کرتا ہے

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند
گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

(کل میں نے دیکھا کہ فرشتے میخانہ (عشق) کا دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے اور وہاں وہ آدم کی مٹی گوندھ کر اس سے جام شراب بنا رہے تھے)

انسان کی سرشت میں محبت کا وجود اللہ کی ودیعت اور امانت ہے یہ ایک نعمت ہے جس کی فراوانی اور پہنائی انسان کو اس کی تمام پستیوں سے اونچا کر کے خیر و برکت کی طرف لے جاتی ہے۔

عشق و محبت کے اس الوہی ما بعد الطبیعاتی ماخذ کو قبول کرنے اور اس الوہی اصول کو تمام موجودات میں کارفرما تسلیم کرنے کے بعد (وحدت وجود کا عقیدہ) جو صوفیا کے اکثر گروہوں کا عقیدہ تھا۔ حافظ کے سامنے کئی راستے کھلے ہوئے تھے۔ ایک تو ترک دنیا اور ترک لذات کا راہبانہ راستہ، یعنی نفس اور شہوانی خواہشات کے ساتھ صوفی درویشوں کی طرح "مجاہدہ" کر کے نفس کشی اور اس طرح "باطنی" پاکیزگی پیدا کر کے معرفتِ الٰہی حاصل کرنا اور بالآخر فنا فی اللہ

ہو جانا۔ صحیح معنوں میں اس قسم کے تصوف کو "انفعال تصوف" کہا جاتا ہے۔
حافظ طریقت کو اس طرح مسترد کرتا ہے جس طرح علماء ظاہر کی بنائی ہوئی راہ کو اس نے ناقابل قبول سمجھ کر اس کا مذاق اڑایا۔ اس نے جس طرح علماء ظاہر کی علم کی سطحیت اور ان کی اخلاقی پستی پر نکتہ چینی کی، اسی شدت کے ساتھ اس نے اپنے زمانے کے خرقہ پوشوں اور تارک دنیا صوفیوں پر طنز و استہزاء کے تیر و نشتر چلائے اور ان کے طریقے کو غلط اور گمراہ کن قرار دیا۔

حافظ این خرقہ بینداز مگر جان بہ بری!
کاتش از خرمن سالوس و کرامت برخاست

(حافظ اس خرقے (صوفی درویشوں کا لبادہ) کو پھینک دے شاید جان بچ جائے، اس لیے کہ فریب اور کرامت کے کھلیان سے آگ بھڑک اٹھی ہے۔
حافظ کے کلام میں درویشوں کا خرقہ یا دلق کا بار بار ذکر آتا ہے اور اسے ہر جگہ فریب دورنگی اور ریاکاری کی علامت بتایا گیا ہے۔ اس طرح درویشوں کی خانقاہیں اور صومعے زندگی سے فرار کی پناہ گاہوں اور عیوب کے مرکزوں کے نشان کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ صوفی کو مخاطب کر کے خواجہ صاحب کہتے ہیں۔

در سماع آئی ز سر خرقہ بر انداز برقص
ورنہ در گوشہ نشین دلق ریا در برگیر

(مست ہو کر گانا سنو اور اپنی گدڑی اتار پھینکو اور رقص کرو، اگر ایسا نہیں کرتے تو اپنے گوشے میں بیٹھے ریائی کے لبادے سے چمٹے رہو)۔
خواجہ صاحب صوفیوں کی پاکبازی اور معرفت کے دعووں کو ناقابل اعتنا سمجھتے ہیں۔

خیز تا خرقہ صوفی بہ خرابات بریم
زرق و طامات بہ بازار خرافات بریم

جن خیالات کا اظہار متذکرہ بالا اشعار میں کیا گیا ہے۔ ان کو حافظ نے بار بار اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے اور یہ اس کی امتیازی خصوصیت میں سے ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خیالات اس کی اساسی فکر کا ایک حصّہ ہیں۔

ایسی صورت میں یہ کہنا کہ حافظ اس قسم کی داخلیت کا معتقد تھا جس پر اس کے عہد کے بیشتر صوفیاء کا عمل تھا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ حافظ مدرسوں میں حاصل کیے ہوئے علم (جن کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں) اور خانقاہ کے زہد و ریاضت دونوں کو دریافت حقیقت کا غلط طریقہ سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک معاشرتی زندگی میں اپنے ہوش و حواس عقل و احساسات کو پوری طرح بروئے کار لا کر اور زندگی کا تجربہ حاصل کر کے ہی انسان کو معرفت حق حاصل ہو سکتی ہے۔

ز کنج مدرسہ حافظ مجوئے گوہر عشق
قدم برون بنہ اگر میل جستجو داری

(حافظ گوہرِ عشق کو کنج مدرسہ میں مت تلاش کر، اگر تجھے جستجو کی تمنا ہے تو مدرسہ سے باہر قدم رکھ)

اور مدرسے اور خانقاہ سے باہر نکلنے کے بعد وہ زندگی میں علم کی بنیاد پر عمل کا مطالعہ کرتا ہے، رنج و ملال سے بچنے کا یہی طریقہ ہے۔

نہ من ز بے عملی در جہان ملولم و بس
ملامت علماء ہم ز علم بے عمل است

(اکیلا میں ہی نہیں ہوں جو دنیا میں بے عملی کی وجہ سے ملول ہوں۔ علماء کی ملامت بھی اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ عالم بے عمل ہیں۔

حافظ کس قسم کی زندگی اور معاشرت کو لائق تحسین سمجھتا ہے؟ حافظ کے دیوان کے بیشتر حصے میں اس سوال کا نہایت صاف اور واضح جواب مل جاتا ہے۔ حافظ کی شاعری کے وہ پہلو بھی جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے

(علمائے ظاہر اور صوفیائے باطن پر اس کی نکتہ چینی) زندگی کے متعلق اس کے مثبت اور ایجابی نقطۂ نظر کے ایک جزو کی حیثیت سے ہی اگر دیکھے جائیں تب ان کی صحیح اہمیت سمجھی جا سکتی ہے اور اس لحاظ سے انہیں منفی نقطۂ نظر کہنا غالباً ٹھیک نہیں ہوگا۔

حافظ کی شاعری کا مرکزی نکتہ انسان کی طبیعیاتی حیاتی دنیا دی زندگی ہے جسے وہ حسن و لطافت خلوص اور پاکیزگی ہنرمندی اور آسودگی عشق اور محبت سے لبریز دیکھنا چاہتا ہے۔ حافظ اپنے معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی حیات سے اپنی شاعری کا آغاز کرتا ہے۔ وہ اس زندگی میں اور اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے فطری مظاہر میں حسن کی جستجو کرتا ہے۔ انسانوں کے جسم میں ان کے رہن سہن، ان کے اعمال حرکات اور ان کے باہمی خلوت و جلوت کے رشتوں میں۔

حافظ کے نزدیک وہ قوت اور تحریک جو انسانوں کو اخلاقی، روحانی اور جیاتی طور سے سرور و انبساط بخشتی ہے اور اس طرح ان کے باہمی تعلقات کو حسین اور پُر لطف بناتی ہے، محبت و انس ہے۔ وہ محبت اور رفاقت کی فراوانی اور شدت کا مطالبہ کرتا ہے۔ تمام وہ چیزیں، ادارے افراد اور اخلاقی و فلسفیانہ تصورات اور عقیدے جو شعلۂ عشق کی حدت کو کم کرتے ہیں، جو انسان سے انسان کی رفاقت کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں یا اسے مکدر اور آلودہ کرتے ہیں۔ حافظ کے نزدیک قبیح اور مذموم ہیں۔ زاہد اور تارک الدنیا صوفی، طماع علماء اور ایذا رساں محتسب خود پرست ارباب اختیار اور ممسک اور اس گروہ کے عائد کیے ہوئے سخت گیر احکامات اور ناکارانہ اخلاقی اصول اور قوانین جو معمولی انسانوں کو ان کی معمولی خوشیوں اور آسودگیوں سے محروم کرتے ہیں۔ حافظ ان کا مخالف ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ اگر آزاد اور خوش رہنا چاہتے ہیں تو مذکورہ بالا گروہ کے ناروا احکامات اور ان کی عائد کی ہوئی چند در چند پابندیوں کو ہرگز قبول نہ کریں۔

اس کے برخلاف تمام وہ چیزیں اور حالات جو محبت و مودت میں اضافہ کرتے ہیں جن سے حسیات اور ان سے حاصل ہونے والی لذتوں کی پاکیزہ اور حسین تکمیل ہوتی ہے جو انسانی تعلقات میں لطف و سرود پیدا کرتے ہیں۔ حافظ ان کا پرجوش حامی اور طرف دار ہے۔

حافظ کے کلام میں شراب اور میخانہ پیر مغاں اور ساقی، عشق و محبت کے جذبے کو ابھارنے احساس حسن اور نشاط حیات کو تیز کرنے اور بڑھانے کے وسیلے ہیں۔ حافظ انسان کو بے کیف، سطحی ریاکارانہ، بے مقصد اور حیوانوں کی طرح پابند اور خود پرستانہ شعور کے نور سے عاری زندگی کی چار دیواری سے باہر کھینچ کر زیادہ آزاد زیادہ متمازن اور مسرت سے بھری ہوئی رنگین فضاؤں میں لے جانا چاہتا ہے۔

برگ گل خوش رنگ اور موسم بہار کی عطر بیز ہوائیں، درختوں پر نئے نکلے ہوئے سبز پتے۔ صوت ہزار اور رقص و سرود، سرو سمن و بنفشہ اور لالے کے ارغوانی جام، نرگس کی چشم نگراں اور سوسن کی زبان، حافظ انہیں اور فطرت کے تمام دلکش مظاہر کو زندگی کے اس انبساط و لطف کا پیامبر اور شریک بناتا ہے جس کا وہ متلاشی ہے۔

رات کو شمع فانوس کے گرد حریفاں "نیک نام" اور ہم نشیناں "نیک کردار" کی مجلس انس برپا ہوتی ہے۔ ساقی شکر دہاں بادہ گل رنگ کے یاقوتی جام پیش کرتا ہے اور دلبر کی زلف معنبر دلوں کو اپنا شکار بنا لیتی ہے۔ ایسے میں بزم گاہ قصر فردوس معلوم ہوتی ہے اور اس کا گلشن روضہ دار السلام اور حافظ بے ساختہ کہتا ہے۔

ہر کہ ایں صحبت بجوید خوشدلی بروے حلال
وآنکہ ایں عشرت نخواہد زندگی بروے حرام

(جو کوئی ایسی صحبت کی تلاش کرے خوشدلی (مسرت) اس پر حلال ہو

(اور جو اس عشرت کو نہ چاہے زندگی اس پر حرام ہو)

حافظ کی بیشتر شاعری محبت اور اُمید، خوشی اور حسن کا ایک ایسا کیف آور اور پُر سحر نغمہ ہے جس کے ذریعے سے اس نے انسانوں کی زندگی میں "خوشدلی" پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح ان کے سرمایہ مسرت میں اضافہ کیا ہے۔ حافظ کی شاعری کی عظمت یہ ہے کہ اس نے محض ایک نکتۂ نظر پیش کر کے زندگی کی تنقید ہی نہیں کی اور زندگی کو ایک خاص طریقے سے بسر کرنے کی ترغیب ہی نہیں دی بلکہ جس نظریہ اور زندگی کے اسلوب کا وہ پیامبر تھا، اس کے کلام میں اس زندگی کا رس اور اس کا آہنگ اس طرح رچا اور بسا ہوا ہے کہ پڑھنے والے کے حیات میں وہی شیریں اصوات وہی نغمے اور ان کے سر گونجنے لگتے ہیں۔

حافظ اپنے شبستان کیف و سرور میں جو شمعیں جلاتا ہے۔ وہ ہماری رُوح میں یک بیک جگمگا اُٹھتی ہیں۔ پھولوں کی پنکھڑیوں کی نزاکت و نکہت، بہار کی ہواؤں کی پُرامید جاں پروری اور آب رکنا باد کی خنک تسکین سے حافظ ہمارے جسم و جان کو معطر اور شاداب کر دیتا ہے۔

اوپر یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خواجہ حافظ اپنے عہد کے فقہا و زہاد کے بتائے ہوئے متشرع راستے کو اختیار نہیں کرتا۔ وہ مشائخ اور صوفیا کے ترک دنیا اور گوشہ نشینی کے طریقے کو بھی مسترد کرتا ہے اور نیز یہ کہتا ہے کہ امراء اور اہلِ اقتدار کے ساتھ مل کر یہ سب انسان کو اس کی جائز خوشیوں سے محروم کرتے ہیں۔ وہ ان سب کو زرق و نفاق، طامات و سالوس، ناز و کرشمے کا مجرم ٹھیرتا ہے۔ اس کے بجائے انسانوں کو عشق و محبت اور پاکیزہ حیاتی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کے نزدیک فطرت کا یہی تقاضہ ہے اور خوشی کی کامیاب زندگی بسر کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ اس موقع پر معترضین یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ یہ راہ عیش پرستی اور لذت کوشی کی راہ ہے اور یہ بھی فی الحقیقت زندگی سے فرار ہے۔ وہ

کہتے ہیں کہ حافظ زندگی کے ٹھوس حقائق اور تقاضوں کو جام شراب میں ڈبو کر انہیں محو کر دینا چاہتا ہے۔

حافظ پر یہ اعتراض بھی میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ حافظ بنیادی طور پر (جیسا کہ کہا گیا ہے) انسان کی حیاتی لذات کو تیز اور گہرا اور لطیف بنا کر ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو مسرور اور دلچسپ اور حسین بنانے کی کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی نظم ایک ایسا سدابہار، معطر، رنگین اور شاداب باغ ہے جس کی مجموعی فضا جس کی نہروں کی روانی اور جس کے آبشاروں کی آواز جس کے پھولوں کی تازگی اور مہک اور جس کے درختوں کے ٹھنڈے سائے۔ انسان کے مجروح دل اور تھکے ہوئے جسم کے تر و تازہ کر کے اس کی روح کو پاک اور مصفا کرتے ہیں اور اسے تجدید حیات کا پیغام دیتے ہیں۔ یعنی حافظ اپنے اس باغ کے حسن پر والہانہ طور سے فدا ہے۔ اسے اس کے ایک ایک سبز پتے اور اس کے پھولوں کی ہر ایک نازک پنکھڑی سے عشق ہے۔

حافظ کی عشقیہ شاعری کی ایک ممتاز خصوصیت اس کی پاکیزگی ہے۔ یہاں پاکیزہ محبت سے مراد وہ محبت نہیں ہے جسے افلاطونی عشق کہا جاتا ہے اور جہاں "پاکیزگی" محبت کی جنسی اور جسمانی نوعیت سے بالکل منقطع ہونے کے بعد محض ایک ذہنی ریاکاری بن جاتی ہے۔ ایسا عشق حافظ کے یہاں نہیں ملتا۔ حافظ اپنے خلوص اپنی محبت کی جذباتی اور نفسیاتی سچائی اور اس کی گہری انسانیت سے پاکیزگی کی فضا پیدا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے:۔

صبح دولت می دمد کہ ہمچوں جام آفتاب
فرصتے زین بہ کجا باشد بدہ جام شراب
خانہ بے تشویش و ساقی یار و مطرب بذلہ گو
موسم عیش است و دور ساغر و عہد شباب
شاہد و ساقی بدست افشاں و مطرب پائے کوب
غمزہ ساقی ز چشم مے پرستاں بردہ خواب

خلوت خاص است و جائے امن و نزہت گاہ اُنس
ایں کہ می بینم بہ بیداریست یا رب یا بخواب

یہاں حافظ اپنی خلوت خاص میں ہے۔ عہد شباب ہے اور دور ساغر شاہد مطرب کے نغمے اور رقص اور ساقی کے ناز و غمزے نے مے پرستوں کی آنکھوں سے نیند اڑا دی ہے لیکن عیش کی اس محفل کو جب حافظ "خانہ بے تشویش" اور "جائے امن" کہتا ہے۔ ساقی کے "یار" اور مطرب کے "بذلہ گو" ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور نغمے "رقص اور سرود کے تمام ساز و سامان کو نزہت گاہ اُنس" سے تعبیر کرتا ہے تو کیا وہ یہ واضح نہیں کر دیتا کہ دُنیا میں ہر عیش اور مسرت کی اصل روح انسانوں کی رفاقت اور دوستی ہے، اور وہ چیز جس کے سبب سے ان کی مجلس "جائے امن" بنتی ہے اور اس میں شادابی پیدا ہوتی ہے وہ انسانوں کے باہمی اُنس کی نزہت ہے؟

یہ مضمون کہ محبت، دوستی اور رفاقت انسانی مسرت کی رُوح رواں ہے۔ حافظ کے کلام میں جابجا مختلف انداز سے بکھرا ہوا ہے۔

در مذہب ما بادہ حلال است ولیکن
بے روئے تو اے سرو گل اندام حرام است

(ہمارے مذہب میں شراب حلال ہے لیکن اے پھول ایسے جسم والے سرو جب تک تیرا چہرہ میرے پاس نہ ہو میرے لیے شراب پینا حرام ہے)

اور بغیر عشق کے وصل کی خواہش کرنا ایسا ہے جیسے بغیر وضو یا طہارت کے طواف کعبہ کا احرام باندھنا۔

حافظ ہر آنکہ عشق نورزید و وصل خواست
احرام طوف خانۂ دل بے وضو بہ بست

محبت کی تکمیل، دلوں کا ملن، بغیر دل کی پاکیزگی، بے غرضی اور طہارت کے کیسے ممکن ہے؟ اس سے بھی آگے بڑھ کر کہا ہے۔

نماز در خمِ آن ابروان محرابی
کسے کند کہ بخونِ جگر طہارت کرد

(اس محرابی آبروؤں میں وہی نماز ادا سکتا ہے جس نے اپنے خونِ جگر سے طہارت کی ہو)

اپنے محبوب کے ساتھ خلوت کے مضمون کو حافظ نے کئی جگہ اس طرح بیان کیا ہے جس سے جسمانی محبت کی یہ واردات ذہن اور رُوح کا بھی ایک مصفا تجربہ بن جاتی ہے۔ اس طرح حیاتی لذت کو وُہ ایک بلند تر اور لطیف تر سطح پر لیجا کر گویا جسم و رُوح دونوں کا تزکیہ کرتا ہے۔ اس پوری غزل میں یہی کیفیت ہے۔

تعالی اللہ چہ دولت دارم امشب | کہ آمد ناگہان دلدارم امشب
نہال عیشم از وصلش بر آورد | نہ بخت خویش برخوردارم امشب

اور اپنی محبوبہ کے ساتھ بسر ہونے والی رات کو "عزیز" اور "شریف" "شبِ قدر" سے تعبیر کیا ہے۔

شبِ قدرے چنیں عزیز و شریف | با تو تا روز خفتنم ہوس است
وہ کہ در دانہ چنیں نازک | در شبِ تار سفتنم ہوس است

حافظ کو ضرور اس کا احساس رہا ہوگا کہ اس پہ دو سمت سے حملے ہوں گے ایک "تارکِ دُنیا زہاد اور صوفیوں کی جانب سے جو کلیتہً "حیاتی لذات کے ترک کو انسان کی نجات کا واحد ذریعہ بتاتے تھے۔ لیکن حافظ جنہیں ریاکار سمجھتا تھا اور دُوسرے سفلہ اور رذیل عیش پرستوں کی جانب سے جو عشق و محبت میں طہارت اور پاکیزگی کے تصور کو ہی سمجھنے سے قاصر تھے۔ چنانچہ اسی قسم کے بداندیشوں کو شاید ذہن میں رکھ کر اس نے کہا ہوگا۔

کرا رسد کہ کند عیب دامنِ پاکت
کہ ہمچو قطرہ کہ بر برگِ گل چکد پاکی

(کس کا منہ ہے کہ تیرے پاک دامن کی بُرائی کرے؟ تو تو اس قطرے کی طرح

پاک ہے جو گلاب کی پنکھڑی پر ٹپکتا ہے۔)

حافظ کے کلام میں عشق و محبت کے ہمہ گیر جذبے کی سرخوشی اور معاشرت اور فطرت میں حسن و لطافت سے پیدا ہونے والے احساسات کے کیف و سرور کا ہم پہلے ذکر چکے ہیں۔

اسی تصویر کا دوسرا رُخ وہ المناکی اور دل کو پگھلا دینے والی بے چینی ہے جو شعر حافظ میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب مختلف اسباب کی بنا پر محبت اور دوستی یعنی نشاط حیات کے بنیادی محرکات کی راہیں اسے مسدود نظر آتی ہیں۔ اس کے فراق و محرومی کے نغمے بعض مرتبہ محض اس کی ذاتی کلفت و کوفت کا اظہار نہیں کرتے بلکہ تمام مجبور اور محروم انسانوں کی غمزدہ رُوح کی پکار معلوم ہوتے ہیں لیکن حافظ کی ان غمناک نداؤں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ یاسیت کی فضا نہیں پیدا کر دیتی۔ مثلاً اگر حافظ دوستوں کے بچھڑ جانے پر خون کے آنسو روتا ہے (اور اسی موضوع پر اس نے بار بار لکھا ہے) تو اس کی یہ خون فشانی جذبہ دوستی کی گراں مائگی کو بڑھاتی ہے اور ہمارے دلوں میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ ہم جنس رفیقوں کا ساتھ اور دوست داری زندگی کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ہے۔

حافظ زندگی میں غم کے پہلو کو دلوں کو پژمردہ یا آزردہ کرنے کے مقصد سے نہیں نمایاں کرتا۔ اس کا غم محبت کے سوز و ساز میں اضافہ کرتا ہے۔ اور اس کے ذریعے سے زندگی کی خوبصورتی اور تابانی جیسے بڑھ جاتی ہے۔

مثلاً اس غزل میں بچھڑے ہوئے دوستوں کی یاد کی غم گینی کے ساتھ رفاقت کی خوش گواریوں اور مسرتوں کا اتنے لطیف پیرایہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے پڑھنے والے کے دل پر دوستی کے حسن اور اس کی خوبیوں کا نقشہ ثبت ہو جاتا ہے۔

روز وصل دوست داراں یاد باد　　　　یاد باد آں روزگاراں یاد باد!!

ایں زمان کو کس وفاداری نماند — زاں وفاداران و یاران یاد باد
کامم از تلخی غم چوں زہر گشت — بانگ نوش بادہ خواران یاد باد
من کہ در تدبیر غم بیچارہ ام — چارہ آن غم گساراں یاد باد
گرچہ یاران فارغ اند از یاد من — با زمن ایشان ہزاراں یاد باد

اور نیچے لکھے ہوئے شعر میں جملوں کی تکرار اگر ایک طرف دوست کے بغیر زندگی کی المناک بے کیفی کا اظہار کرتی ہے تو دوسری طرف یہی تکرار ایک مضطرب دل کا پیہم مطالبہ بھی ہے جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک وہ پورا نہ ہو جائے۔

ذوق چناں ندارد بے دوست زندگی
بے دوست زندگانی ذوق چناں نہ دارد

اور بر آستان تو بس حق خدمت ست — اے خواجہ باز بیں بترحم غلام را!

بادشاہ نصیحت نیوشی سے گریز کرتا ہے یا اس تک نصیحت کے لیے پہنچ اور رسائی ناممکن ہوتی ہے تو اس کی مجلس میں گانے کے لیے ایک غزل تیار کر کے اکثر اس میں دو ایک شعر پند و نصیحت کے ٹانک دیتے ہیں۔ ذیل کے شعر میں کس ندرت کے ساتھ چنگ کو اس کی وضع و ساخت کے لحاظ سے پیر خمیدہ قامت قرار دیکر اس کی زبان حال سے بادشاہ کو نصیحت نیوشی کی (جو سو نصیحتوں کی ایک نصیحت ہے) تعلیم دیتے ہیں ؎

چنگ خمیدہ قامت میخواندت بعشرت — بشنو کہ پند پیراں ہیچت زیان ندارد

ظاہری معنی یہ ہیں کہ چنگ بجنا شروع ہوا وہ تجھ کو بزم عشرت کی طرف پکار رہا ہے۔ اگر اس کی بات مان لی جائے یعنی بزم عشرت میں آپ تشریف لے آئیں تو کچھ نقصان نہیں ہے یعنی بزم سرود کوئی نقصان نہ دے گی۔ دوسرے یہ معنی ہیں کہ چنگ خمیدہ قامت سمجھے عین عشرت میں پکار پکار کر یہ سنا رہے کہ ؎ بشنو کہ پند پیراں ہیچت زیاں ندارد

اس مصرعے کی آواز چنگ کے سروں کی گونج سے بہت مماثل ہے۔ یہ مزید لطف ہے۔
انتظام ملک میں ایک ایسا وقت آجاتا ہے کہ اہل و قابل لوگ خانہ نشین اور نا قابل و نا اہل لوگ امور سلطنت میں ان کے جانشین بن جاتے ہیں۔ ان کی نا زیبا حرکات سے خلق کا ناک میں دم ہو جاتا ہے۔ حضرت شعر ذیل کے ذریعہ اس حالت کی اصلاح کی طرف بادشاہ کو توجہ دلاتے ہیں: ؎

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ و ناز ۔ دلم بسوخت زحیرت کہ این چہ بوالعجبی است

ایک بادشاہ جنگجو مزاج معلوم ہوتا ہے خواہ مخواہ لڑائی نکالتا ہے ایک معرکے سے ابھی بال بال بچ کر آیا ہے۔ دوسرے کی شاید تیاری میں ہے۔ حضرت کو سمجھاتے ہیں۔
ایک نو عمر بادشاہ "زین العابدین پسر شاہ شجاع) جو تیرہ برس کی عمر میں باپ کا جانشین ہو گیا تھا امیر تیمور کو نو دولت اور صاحبقرانی کو اپنا حق سمجھ کر خاطر میں نہیں لاتا۔ سمرقند و بخارا کو جو امیر کے پایہ تخت اور اس عہد کے گویا پیرس و لندن تھے بہ یک حملہ امیر سے چھین کر اس کی جگہ آدھی دنیا کا بادشاہ ہو جانا چاہتا ہے" چنانچہ اس حملے کی تیاری اور منصوبوں پر مصروف ہے۔ ترک نژاد مگر شیرازی پیدائش ہے۔ حضرت ایک پیر کہن سال اور نو عمر کے خیر خواہ خاندان ہیں۔ بخوبی سمجھتے ہیں کہ امیر تیمور جیسے فاتح اعظم کے ساتھ الجھنے کا انجام کیا ہوگا۔ سمرقند و بخارا کو جن کی دھن میں وہ نو عمر غرقاب ہے اس کے صرف خال رخسار کا صدقہ بنا کر اس کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس حملے سے باز آنے کی نصیحت اس عظیم الشان مطلع اور حسن مطلع میں فرماتے ہیں ؎

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل ما را ۔ بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را!
نصیحت گوش کن جانا کہ از جان دوست تر دارند ۔ جوانان سعادت مند پند پیر دانا را

مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ترک شیرازی ہمارا دل مٹھی میں لے تو ہماری نصیحت مانے تو اس کی جان تو بہت بڑی چیز ہے۔ سمرقند و بخارا اس کے صرف خال رخسار پہ تصدق کر دینے کے قابل ہیں۔ غالباً زبانی نصیحت اس کان کو اس

کان اڑادی گئی تھی کہ حضرت کو غزل کے ذریعہ اس کے کانوں میں ڈھول پیٹنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ سخن فہموں پر مخفی نہیں کہ یہ مطلع اور تمام غزل کس عظمت و شان کی ہے۔ حضرت کے قلم سے نکلتے ہی شیراز کے گلی کوچے اور بادشاہ و امراء کی محفلیں اس کے نغمے سے گونج اُٹھی ہوں گی اور بادشاہ اور اس کے مشیروں کو ہر طرف سے آوازیں آنے لگی ہوں گی۔ شاعری کے ذریعہ سیاسیاتِ عہد کو متاثر کرنے کی اور بہت سی مثالیں دیوان میں جابجا بکھری ہوئی ملتی ہیں۔ ایک ابھی مذکور ہو چکی ہے ؎

اے نورِ دیدہ صلح بہ از جنگ و داوری

فیقروں سرمدوں سے اُلجھ جانا کبھی بادشاہوں اور نگہبوں سے ظہور میں آجاتا ہے۔ آپ اس سے حذر کرنے اور باز رہنے کی تنبیہہ فرماتے ہیں۔ ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیرِ مکافات ‏ ‏ ‏ ‏ با دُردکشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد

اس تفصیل اور ان مثالوں سے جو حضرت کے اس حصہ کلام سے نقل ہوئی ہیں جن میں بادشاہ سے مخاطبت کا خاص اشارہ موجود ہے۔ بخوبی ظاہر ہے کہ حضرت اپنی غزلیات سے صرف ان کا دِل ہی نہیں بہلاتے بلکہ ان کو نہایت کارآمد نصیحتیں اور مشورے بھی دلکش ترین پیرایوں میں موقعہ بموقعہ سناتے رہتے ہیں اور مطلق العنانوں کی روک تھام کے لیے نصیحت آمیز اشعار کی مرصع متسام کے لیے اکثر بتا ر رہتے ہیں۔ فی الجملہ حضرت بادشاہوں کے تمام امور و معاملات سلطنت مشورہ صلح جنگ، حکم احکام، نیز ذاتی اطوار و عادات غرض ہر امر میں ناصح نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات صاف جھڑک بھی دیتے ہیں۔

آبروئے فقر و قناعت نمی بریم ‏ ‏ ‏ ‏ با بادشاہ بگوئے کہ روزی مقدر است

حضرت بذاتِ خود اپنے کلام میں ایسی دلچسپ صورتوں اور حلیوں میں نمایاں اور پیش نظر رہتے ہیں کہ بہت بڑی دلکشی آپ کے کلام کی آپ دلآویز شخصیت سے منسوب ہو سکتی ہے، لیکن اس خود نمائی میں وصف یہ رہتے

کہ اس میں عُرفی، فیضی اور غالب جیسے تعلّی باز شعرا کی سی انانیت نہیں۔ عُرفی کا نام لے دینا کافی ہے۔ مثال دینے کی ضرورت نہیں۔ فیضی فیاضی کی بڑ مارتے ہیں ؂

حریف خلوت من عقل ذو فنون من است
یقین منتہیاں اولین ظنون من است

غالب اپنا ڈول پیٹتے ہیں ؂

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس
ہم اسداللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم

حضرت کی تعلّیاں اس قسم کی نہیں ہوتیں۔ بڑی سے بڑی اپنی تعریف فرماتے ہیں۔ مگر وہ خلاف واقعہ اور ناگوار نہیں ہوتی۔ عدم ناگواری کی وجہ اپنی نسبت ادعا واقعی اور واجبی ہوتا ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں ؂

چہ جائے گفتہ و گفتہ سلمان
کہ شعر حافظ شیراز بہ ز شعر ظہیر

یہ ظہیر وہ مشہور شاعر ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ ؂

دیوان ظہیر فاریابی
در کعبہ بدزد اگر بیابی

یعنی اس کے کلام کی چوری خانہ کعبہ میں بھی جائز ہے۔

تاہم حافظ صاحب کا دعویٰ ذرا بھی خلاف واقعہ نہیں۔ آپ کا کلام ظہیر سے بہتر ہی نہیں ہے بلکہ (بقول صاحب شعر العجم) ظہیر کے کلام کو آپ کے کلام سے کچھ نسبت نہیں۔

سلطان غیاث الدین سلطان بنگالہ کو ایک فرمائشی غزل ارسال کی ہے۔ اس کی بھی ایک شعر سے حضرت امیر خسرو کی شیریں سخنی کا اعترافی اشارہ پیدا ہوا ہے ؂

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

حضرت کی یہ دعا یا پیش گوئی جو کچھ سمجھو پوری ہوئی۔ ہندوستان میں فارسی کے نامی شاعر ہوئے۔ فیضی، قتیل، بیدل، خان آرزو، وغیرہ مسلمانوں میں گزرے جن کے کلام کی اہل زبان نے بھی داد دی اور شکر دہنی ان کی مسلّم ہوئی۔ آخر میں ایک پتھر دہن بھی پیدا ہوئے جو اپنے اس ہندی نژاد

فارسی شعر سے شناخت ہوں گے۔

کاوکاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ ‏ ‏ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

ان کے ذہن میں قند پارسی ہضم کر سخت ثقیل ہو گیا تھا۔

حضرت امیر خسرو کی شیریں سخن کا اعتراف محض عقیدت و انکسار پر مبنی نہیں معلوم ہوتا بلکہ کلام سے ثبوت ملتا ہے کہ حضرت امیر خسرو کی بعض مشہور طرحوں پر غزل لکھنے کی آپ نے کوشش فرمائی تاہم اگرچہ سعدی، ظہیر، خواجہ سلمان وغیرہ کی غزلوں پر ان ہی بحروں میں قافیہ بقافیہ غزل لکھنے میں حضرت کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن حضرت امیر خسرو کے بحر و قافیہ کو بدل کر بھی اس رنگ و مرتبہ کی غزل لکھنے میں حضرت کو کامیابی نہیں ہوئی مثلاً امیر خسرو کی غزل ہے۔

گفتم کہ روشن از قمر گفتا کہ رخسار من است
گفتم کہ شیریں از شکر گفتا کہ گفتار من است

حافظ کی غزلیات کی خصوصیات

۱. حافظ نے حسنِ بیان. روانی، برجستگی، صفائی اور شستگی کو بے انتہا ترقی دی ہے. روزمرہ اور بول چال کو بھی بہت وسیع کیا ہے۔ حافظ کی غزلوں کی مقبولیت کا بھی ایک خاص سبب ہے.

۲. حافظ نے غزل کو مجموعۂ شاعری بنا دیا ہے۔ یعنی جس قسم کا خیال چاہیں غزل میں ادا کر سکتے ہیں۔ اور غزل کی شان میں فرق نہیں آتا اور انہی کی تقلید سے عرفی، نظیری، صائب اور کلیم نے غزل میں تمدن اور اخلاق، موعظت و پند، معاشرت ہر قسم کے مضامین ادا کیے ہیں اور غزل کی شان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

۳. **تنوع مضامین:** حافظ فلسفیانہ، اخلاقی، علمی، سیاسی، قومی، ملکی، تمدنی، معاشرتی مضامین اور حقائق و تعارف۔ پند و موعظت کو غزل کی خاص زبان میں ادا کرتے ہیں۔ جس میں نزاکت، لطافت اور لوچ ہوتا ہے اور اس زبان کو ایک خاص شیرینی اور رنگینی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بااین ہمہ غزل کی شان میں ذرا بھی فرق نہیں آتا.

خواجہ نے جن مضامین کو مرکز قرار دیا ہے ان کا ایک ایک نقطہ اس طرح ادا کیا ہے کہ کوئی پہلو باقی نہیں رہتا۔ شاعری کا اصلی معیارِ کمال یہ ہے کہ جو مضامین ادا کیے جائیں اس سے زیادہ کوئی موثر اور بلیغ طریقہ پیدا نہ ہو سکے.

۴. **عشقیہ مضامین:** حافظ کی شاعری کا اصلی خمیر عشق اور سرمستی ہے، اسی خصوصیت میں وہ تمام شعرائے فارس میں نمایاں اور ممتاز ہیں۔ خواجہ فطرتاً شگفتہ مزاج اور رنگین طبع تھے. اس لیے عشق و عاشقی سے وہیں تک تعلق ہے جہاں تک لطفِ طبع اور شگفتگیِ خاطر باقی رہے اس وجہ سے وہ شوق۔ ناز و نیاز، بزم آرائی اور مجلس افروزی کے جذبات اچھی طرح ادا کرتے ہیں اور ناامیدی، حسرت و یاس وغیرہ پر جو کچھ لکھتے ہیں۔ وہ

محض تقلیداً لکھتے ہیں۔ باایں ہمہ عشق و محبت میں جو واردات گزرتے ہیں۔ وہ ہر ایک سے باخبر ہیں۔ اور عشق کے تمام جذبات کو نہایت آزادی سے ادا کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے دل میں جب کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ تب تک وہ کوئی بات نہیں کہتے۔ ان کے جذبات نہایت پاکیزہ ہوتے ہیں جن سے وہ خود بھی مست ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی مست کر دیتے ہیں۔ مثلاً ان کی یہ غزل جس کا مطلع درج ذیل ہے:۔

بیاتا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم!
فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم

۵۔ خواجہ کیفیات اور جذبات کا نقشہ خوب کھینچتے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سر درس عشق دارد و دل دردمند حافظ
کہ نہ خاطر تماشا نہ ہوائے باغ دارد

ہزار بار شود آشنا و دیگر بار مرا بہ بیند و گوید کہ ایں چہ کس باشد۔

ہزار دیدہ بروی تو ناظر اند و تو خود
نظر بروئے کسے بر نمے کنی از ناز!

۶۔ **جدّتِ ادا**: خواجہ صاحب ان مضامین کو جو مدت سے بندھتے چلے آتے تھے معمولی حسن اسلوب، جدّت ادا سے نہایت دلآویز اور لطیف بنا دیا ہے۔ مثلاً معشوق کی آنکھ کو سب سے مست اور مخمور و سرشار کہتے ہیں۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں:۔ ؎

ہر کس کہ بدید چشم او گفت
کہ محتسبی کہ مست گیرد

محبوب کی زلف کو بنفشہ پر ترجیح دینا معمولی بات ہے خواجہ صاحب بھی فرماتے ہیں: ؎

بنفشہ طرۂ مفتول خود گرہ می زد
صبا حکایت زلف تو در میان انداخت

شعراء قلقل اور مینا کی آواز سن کر اور کالی گھٹا دیکھ کر توبہ توڑتے ہیں۔ حافظ صاحب کی جدت دیکھئے۔

بتِ چوں ماہ زانو زد، مئے چوں لعل پیش آورد
تو گوئی تائبم حافظ ز ساقی شرم دار آخر!

اس بات کو کہ واعظ دوسروں کو جس بات سے منع کرتا ہے خود اس کو کیوں کرتا ہے وہ اسے لطیف پیرائے میں ادا کرتے ہیں۔

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس
توبہ فرمایان چہرہ خود توبہ کمتر می کنند

معشوق کا انتخاب۔ شاہد بازی۔ خدا کی مہربانی کے بھروسے پر شراب خوری۔ شاہد مطلق کی جلوہ گری اگرچہ ہر ذرّے میں ہے۔ مگر اس کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں۔ ان مضامین کو کس خوبی سے بیان کیا ہے ؎

ہر کس کہ دید روئے تو بوسید چشم من
کارے کہ کرد دیدۂ من بے صبر نہ کرد

گر کنند میل بخوبانِ دلِ من خورده مگیر
کیں گنا ہے ست کہ در شہر شما نیز کنند

اے کہ در ہیچ جا نداری جا
و العجب ماندہ ام کہ ہر جائی

شوخی و ظرافت: خواجہ صاحب نے جابجا نہایت لطف و ظرافت و نزاکت سے واعظ، محتسب، ناصح اور زاہد وغیرہ کی پردہ دری کی ہے۔

واعظاں کیں جلوہ در محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

واعظِ شہر کہ مردم ملکش می خوانند
قول ما نیز ہمیں است کہ او آدم نیست

من نہ آں رندم کہ ترک شاہد و ساغر کنم
محتسب داند کہ من ایں کار کمتر می کنم

۸۔ **بلندیٔ مضامین اور خوش بیانی**:۔ خواجہ کے اشعار میں جو خیال ادا ہوا ہے نہایت خوش اسلوبی سے ادا ہوا ہے کہ زبان اس کا ذائقہ لیتی رہتی ہے اور معانی کی طرف پہلے توجہ نہیں ہوتی۔ جب معانی پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بے انتہا بلند مضامین ہیں جیسے:

تا ز میخانہ و مے نام و نشاں خواہد بود
سرِ ما خاکِ رہِ پیرِ مغاں خواہد بود

۹۔ **فلسفۂ اخلاق**: ان کی اخلاقی تعلیم ہی اعلیٰ درجہ کی انسانیت کی تعلیم ہے

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم!
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

تو بندگی چو گدایاں بشرطِ مزد مکن
کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند

تکیہ بر جائے بزرگاں نتواں زد بگزاف
مگر اسبابِ بزرگی ہمہ آمادہ کنی!

۱۰۔ **صنائع و بدائع**: تمام شاعروں نے اس طرف توجہ کی مگر صنائع کے خیال میں نفسِ شاعری میں بہت کمزوری آ جاتی ہے۔ خواجہ صاحب کے کلام میں صنائع بدائع بہت کثرت سے ہیں مگر ان کی شاعری کا زیور بن گئے ہیں۔ مثلاً

گدائے کوئے تو از ہشت خلد مستغنی است
اسیرِ بند تو از ہر دو عالم آزاد است

اس شعر میں صنعتِ تضاد ہے۔ گدا و مستغنی۔ اسیر و آزاد متضاد ہیں۔

احرام چہ بندیم کہ آں قبلہ نہ ایں جاست
در سعی چہ کوشیم کہ از مروہ صفا رفت

اس میں صنعت مرعات النظیر ہے۔ احرام۔ قبلہ۔ سعی۔ صفا۔ مروہ یہ سب الفاظ حج کے متعلق ہیں۔

۱۱۔ **عربیت**: حافظ کے دیوان میں کئی سو اشعار خالص عربی کے ہیں۔ ان سے ان کے کمال عربیت کا ثبوت ملتا ہے۔ قرآن کی آیتوں۔ مثلوں۔ حدیثوں کو اس خوبی سے شعر میں داخل کرتے ہیں کہ شعر کا زیور بن جاتے ہیں۔ جیسے

بحُسنِ عارض و قد تو بردہ اند پناہ
بہشت و طوبیٰ۔ طوبےٰ لہم و حسن ما

شب وصل است و طے شد نامۂ ہجر
سلامٌ ہِیَ حتّٰی مطلع الفجر

ہر چند آزمودم از وے نبود سودم
مَن جَرَّبَ المُجَرَّبْ حلّت بہ الندامۃ

۱۲۔ خواجہ کے کلام میں فحش، ہزل، ہجو بالکل نہیں:

غزلیاتِ حافظ رح

غزل نمبر ۱

صفحہ ۱۳۷

خم: خم سے مراد ابرو ہے۔ بقصدِ خونِ من: میرا خون بہانے یا مجھے قتل کرنے کے ارادے سے۔

ترجمہ: (۱) وہ خم جو تیرے شوخ ابرو نے کمان میں ڈالا ہے۔ مجھ زار و ناتواں کی جان لینے کے ارادے سے ڈالا ہے۔

تشریح: خواجہ صاحب معشوق سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے محبوب تُو نے اپنے خوبصورت اور شوخ آبرو کی کمان میں جو خم ڈالا ہے وہ مجھ زار و ناتوان عاشق کو قتل کرنے کے ارادے سے ڈالا ہے۔ اس شوخ ابرو نے معشوق کو خمدار ہونے کے سبب کمان سے اور ابرو کو اُوپر چڑھانے کو کمان میں خم دینے سے تعبیر کیا ہے۔ عام طور پر تیر انداز تیر چلاتے وقت کمان کو خم دیتے ہیں۔ تاکہ ان کا تیر زیادہ دُور تک جا سکے اور اس کا وار بھی کاری ہو۔ معشوق نے اپنے ابروؤں کو اوپر چڑھایا ہے۔ خواجہ صاحب خیال کرتے ہیں کہ معشوق نے کمان ابرو کو اگر خم دیا ہے تو اس کا مجھ زار و ناتوان کو قتل کرنے کا ارادہ ہے۔ اس شعر میں حُسنِ تعلیل ہے۔

۲۔ نقش: نقش سے مراد صورت ہے۔ **طرح:** بنیاد۔ رسم۔ قانون۔

ترجمہ: دونوں جہاں کا نقش نہ تھا جبکہ محبت کا رنگ موجود تھا۔ زمانے نے محبت کی بنیاد آج نہیں ڈالی۔

تشریح: فرماتے ہیں کہ ابھی کائنات اور دونوں جہاں وجود میں بھی نہیں آئے تھے کہ عشق موجود تھا۔ یعنی دو عالم کے وجود میں آنے سے پہلے رُوحیں موجود تھیں اور ان رُوحوں میں باہمی اُنس و محبت کا رشتہ قائم تھا اور جب کائنات وجود میں آئی اور رُوحیں ہمارے جسم میں داخل ہو کر اس دُنیا میں آئیں تب بھی اُنس و محبت کا وہ ازلی رشتہ برقرار رہا۔ اگر آج عاشق و معشوق میں باہمی اُنس و محبت کا تعلق ہے تو یہ رشتہ محبت ہے جو ازل سے رُوحوں میں قائم تھا اس لیے یہ خیال کرنا غلط ہے کہ زمانے نے اس دنیا میں الفت و محبت کی بنیاد ڈالی ہے یا الفت و محبت کوئی نئی چیز ہے۔ رنگِ محبت کوئی نئی چیز ہے۔ رنگِ محبت دُنیا کے ہر گوشہ میں طاری ہے اس کے بغیر زندگی برقرار نہیں رہ سکتی۔

۳۔ خود فروشی: لُغوی معنی ہیں اپنے آپ کو فروخت کرنا لیکن مجازی معنی ہیں خود نمائی۔ غرور۔ **کرشمہ:** چشم و ابرُو کا اشارہ۔ ناز و ادا۔

نرگس: ایک پھُول کا نام۔

ترجمہ: نرگس کے پھول نے صرف ایک کرشمہ دکھا کر خود نمائی کی تھی۔ لیکن تیری آنکھ کے فریب نے تو دنیا میں سینکڑوں فتنے برپا کر دیئے۔

تشریح: خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ نرگس کے پھول نے چشمِ معشوق سے مشابہت رکھنے کے سبب صرف ایک مرتبہ کرشمہ دکھا کر خود نمائی کا اظہار کیا تھا۔ مگر اے معشوق تجھے نرگس کے پھول کی یہ گستاخی پسند نہ آئی۔ اور تو نے تعصب کے طور سے اپنی آنکھ کے فریب و مکر سے تمام دُنیا میں سینکڑوں فتنے برپا کر دیئے۔ یعنی چشمِ معشوق نے نرگس کے پھول کو یہ بتا دیا کہ جہاں میں ہوں وہاں کرشمہ تیرا کام نہیں ہے۔

۴. **خوی**: پسینہ **خوی کردہ**: پسینہ میں شرابور ہو کر
شدن: یعنی رفتی **ارغوان**: ایک سرخ رنگ کا پھول

ترجمہ: تو شراب پی کر اور پسینے میں شرابور ہو کر باغ میں جا رہا ہے تیرے چہرے کی آب و تاب نے ارغوان کے پھول میں آگ ڈال دی ہے۔

تشریح: خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ اے معشوق ایسی حالت میں جبکہ تو نے شراب پی رکھی تھی۔ اور شراب کی گرمی کے سبب تو پسینہ میں شرابور تھا۔ تو جب چمن میں گیا تو تیرے چہرے کی سُرخی اور اس پر پسینے کے قطروں کی آب و تاب دیکھ کر ارغوان کا پھول بھی رشک کی آگ میں جلنے لگا۔ واضح ہو کہ ارغوان ایک سرخ رنگ کا پھول ہوتا ہے۔ معشوق کے چمکدار سُرخ چہرے کو عام طور پر ارغوان سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ اس شعر میں حُسنِ تعلیل ہے

۵. **بزم گاہ**: مجلس آراستہ ہونے کی جگہ **دوش**: کل رات۔
از دہان توام: میں تیرے منہ کے سبب ہوں۔

ترجمہ: کل رات میں بزمِ چمن سے مست ہو کر گزرا تو اس کا سبب یہ تھا کہ مجھے غنچہ پر تیرے دہن کا شبہ ہوا تھا۔

تشریح: فرماتے ہیں کہ کل رات میں مستی کے عالم میں چمن کی محفل میں گیا۔ غنچہ

سے ہوبہو ملتا جلتا تھا۔ مجھے تعجب ہُوا کہ کیا غنچہ بھی معشوق کے دہن سے مشابہت پیدا کر سکتا ہے۔ پس اپنا شک دُور کرنے کے لیے دوبارہ چمن میں گیا۔ غنچے کو بغور دیکھا تو وہ واقعی دہن معشوق کی مانند تھا لیکن وُہ دہن معشوق کی برابری کب کر سکتا ہے؟

۶۔ بنفشہ: ایک مشہور گھاس ۔ گرہ میزد: گرہ لگا رہا ہے۔
اور اس کے پھول کا نام مفتول :۔ تابدار۔ پیچ دار۔
طرّہ: زلف

ترجمہ: بنفشہ اپنی تابدار زلف میں گرہ لگا رہا تھا کہ اتنے میں بادِ صبا نے تیری زلف کی داستان چھیڑ دی۔

تشریح: فرماتے ہیں کہ بنفشہ کی گھاس نہایت باریک ہوتی ہے۔ زُلف کو عام طور پر خوشبو اور باریکی کی وجہ سے بنفشہ سے تشبیہ دی جاتی ہے فرماتے ہیں کہ بنفشہ کو اپنی ذات پر بڑا فخر و ناز تھا۔ اور اپنی زلفوں کو پیچ دار بنا کر اور زیادہ حسین بنا رہا تھا کہ اتنے میں بادِ صبا نے اس کے سامنے تیری عنبریں سیاہ زلفوں کی داستان چھیڑ دی۔ بادِ صبا کی زبان سے زلف محبوب کے پیچ و خم کے بارے میں سُن کر وہ بیحد شرمندہ ہُوا۔ چونکہ معشوق کی خوشبودار اور خوبصورت دلکش زلفوں کی داستان بنفشہ کو صرف بادِ صبا ہی کہہ سکتی ہے۔ ندرتِ بیان ملاحظہ ہو۔

۷۔ سمن: ایک قسم کا سفید رنگ کا پھُول۔ چنبیلی کا پھُول۔

ترجمہ: اس شرم کے مارے کہ میں نے چنبیلی کے پھول کو تیرے چہرے سے نسبت دی۔ اس نے بادِ صبا کے ہاتھ سے اپنے منہ میں خاک ڈالی۔

تشریح: رُخِ محبوب کو عام طور پر سمن سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ جب میں نے تیرے چہرے کو سمن سے تشبیہ دی تو چنبیلی کا پھُول شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اس نے کہا مجھ میں یہ قابلیت کہاں کہ

نے مجھے تیرے دہن کے شک میں ڈال دیا۔ چونکہ غنچہ تیرے مُنہ
رُخِ معشوق کا مقابلہ کر سکوں۔

چہ نسبت خاک را بعالم پاک

بادِ صبا کے ساتھ خاک اڑی اور چنبیلی کے پھولوں پر جم گئی۔ شاعر کہتا ہے کہ مُنہ پر خاک ڈالنے کا اصل سبب اس کی شرمندگی ہے۔ اس میں صنعتِ حُسنِ تعلیل ہے۔ بادِ صبا کے ساتھ خاک کا اڑنا طبیعی ہے اور پھولوں پر جم جانا بھی طبیعی ہے۔ مگر شاعر اس کو شرمندگی و خجالت پر محمول کر رہا ہے

غزل نمبر ۲

۱. قصرِ امل: امید کا محل

اَمل: اُمید۔ انسان کی خواہشات
قصرِ امل میں اضافتِ استعارہ یا اضافتِ مجازی ہے۔

قصر: محل

سست بنیاد: جس کی بنیاد کمزور یا بودی ہو۔ وہ جس کے برباد ہو جانے کا ہر وقت خطرہ ہو۔ بادہ۔ اور باد میں تجنیس مزید ہے۔

ترجمہ: آ کہ امیدوں کے محل کی بنیاد کمزور ہے۔ شراب لا۔ چونکہ زندگی کی بنیاد ہوا پر رکھی ہوئی ہے۔

تشریح: خواجہ صاحب کے دِل پر دنیا کی بے ثباتی نے گہرا اثر کر رکھا ہے۔ کلامِ خواجہ کے مطالعہ نے اس اثر کو اور تقویت دی۔ چنانچہ خواجہ اپنے اکثر اشعار میں فنا اور ناپائیداری عالم کی یاد دلاتے ہوئے عیش و نشاط کی تلقین کرتے ہیں۔ تعیش کا یہ فلسفہ یونان کے مشہور فلسفی اپیکورس کے نام سے منسوب ہے اور فارسی زبان میں اس کا سب سے بڑا علمبردار حکیم عمرِ خیام ہے اور خواجہ حافظ بھی اسی میدان کے شہسوار ہیں۔ آپ نے غم غلط کرنے کی غرض سے اور دنیا کی بیوفائی کو بھول جانے کے لیے بزمِ نائے و نوش گرم کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس شعر میں فرماتے ہیں کہ امیدوں کے محل کی بنیاد تو نہایت کمزور ہے

اس لیے دنیا میں بڑی بڑی اور غیر محدود تمنائیں رکھنے اور ان کے حصول کی خاطر زندگی کو پریشانی میں گزارنا دانشمندی نہیں ہے چونکہ انسان کی زندگی بہت مختصر ہے اس لیے جو تھوڑے سے بہت زندگی کے لمحات میسر ہیں انھیں رنج و غم میں ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ موجودہ موقع سے فائدہ اٹھا کر انہیں عیش و نشاط میں صرف کرنا چاہیے۔ اگر اس شعر میں شراب سے مُراد شراب معرفت لی جائے تو یہ معنی ہونگے۔ زندگی مختصر ہے اسے دنیوی خواہشات کے حصول میں ضائع کرنے کی بجائے شراب عشقِ الٰہی پی کر اس کے نشہ میں بسر کرنی چاہیے۔ چونکہ اسی صورت میں یہ مختصر زندگی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

صفحہ ۱۳۸

۲۔ ہمت: قصد، ارادہ **کبود:** نیلا، نیل رنگ، نیلگوں آسمان

ارادہ کا بلند ہونا۔ **رنگِ تعلق پذیرفتن:** تعلق کا رنگ قبول کرنا۔

ترجمہ: میں ایسے شخص کے بلند ارادوں کا غلام ہوں۔ جو نیلے آسمان کے نیچے ہر ایسی شے سے آزاد ہے۔ جس میں تعلق کی بُو ہو۔

تشریح: خواجہ صاحب کا یہ شعر اہلِ عرفان میں ضرب المثل بن گیا ہے۔ فرماتے ہیں میں ایسے انسان کی ہمت کا غلام ہوں جو امورِ دنیوی میں ہر قابلِ تعلق چیز کا پابند نہ ہو۔ تمام تعلقات دنیا سے آزاد ہو جانا ایک بہت ہی مشکل کام ہے۔ خواجہ صاحب کی نظر میں ایسا انسان جو دنیوی تعلقات سے آزاد نہ ہو۔ ایک عظیم اور قابلِ احترام ہستی ہے۔ سعدیؔ بھی اس مفہوم کو درج ذیل شعر میں اس طرح ادا کرتے ہیں۔

جہاں بر آب نہادست و زندگی بر باد
غلامِ ہمت آنم کہ دِل برو نہ نہاد

۳۔ مستِ خراب: نشے میں بری طرح چُور۔ بدمست **سروشِ فرشتہ:** عالم غیب

مژدہ ہا: خوشخبریاں

ترجمہ: میں تجھے کیا بتاؤں کہ کل رات میں میکدہ میں بدمست پڑا تھا۔ تو فرشتۂ عالمِ غیب نے مجھے کیا کیا خوشخبریاں سنائیں۔

تشریح: بعض خوش اعتقاد لوگوں کا یقین ہے کہ خواجہ صاحب پر غیب سے خیالات نازل ہوا کرتے تھے۔ اس حقیقت میں کسی کو شک نہیں ہونا چاہیئے کہ بڑے شاعر کو الہام ہوا کرتا ہے جیسا کہ خود غالب کہتے ہیں۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اس شعر میں خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں کل رات میخانے میں بدمست پڑا تھا کہ فرشتۂ غیب نے مجھے کیا کیا خوشخبریاں سنائیں۔ وہ خوشخبریاں کیا تھیں ان کا ذکر اگلے اشعار میں کیا ہے۔

۴، ۵، **سدرہ**: ساتویں آسمان پر بیری کا درخت، جسے سدرۃ المنتہیٰ بھی کہتے ہیں۔
سدرہ نشین: مقرب فرشتہ
نشیمن: پرندوں کا گھونسلہ
محنت آباد: محنت کی بستی مراد دنیا۔
صفیر: پرندوں کی آواز، جس سے پرندوں کو بلاتے ہیں۔
صفیر زدن: آواز دینا - دامگہ - وہ جگہ جہاں جال بچھا ہو۔

ترجمہ: ہاتفِ غیب نے (مجھے یہ خوشخبری دی کہ) اے بلند نظر اور سدرہ پر بیٹھنے والے پرندے، شہباز، تیرا آشیانہ یہ محنت کی بستی یعنی دنیا کا گوشہ نہیں ہے۔ تجھے عرش کے کنگرے (انتہائی بلندی) سے آواز دیتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اس جال بچھانے کی جگہ میں تجھے کیا چیز پسند آئی ہے۔

تشریح: ان دو اشعار میں حافظ ہاتفِ غیب کی خوشخبری کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انسان کی طائرِ روح کا آشیانہ اس دنیا میں نہیں جہاں دکھ ہی دکھ ہیں۔ بلکہ ساتویں آسمان پر بیری کا درخت ہے اس لیے اس کی نظر پستی کی بجائے بلندی کی طرف ہونی چاہیئے۔ عرش کے فرشتے تجھے پکار پکار کر بتا

رہے ہیں کہ اے انسان تیرا مقام عرشِ الٰہی ہے لیکن تو دنیا کے تعلقات میں پھنس کر اپنی حقیقی منزل سے غافل ہے۔ تو دنیاوی تعلقات اور نفسانی خواہشات ترک کر تاکہ تیرا طائر رُوح پوری آزادی کے ساتھ پرواز کر سکے۔ تیری لطیف اور پاکیزہ رُوح مادی تعلقات میں گرفتار رہ کر ترقی نہیں کر سکتی۔ اس لیے تو فرشتوں کا پیغام سُن اور اپنی روح کی ترقی کے لیے کوشش کر۔

۶۔ **یاد گیر**: یاد کر۔ سیکھ — **یاد گرفتن**: سیکھنا۔ یاد رکھنا

حدیث: بات۔ کہانی کہاوت — **پیرِ طریقت**: وہ مرشد جو اپنے مُرید کو باطن کی صفائی کا درس دے اور حقیقت اور نیکی کے راستے پر چلائے۔

ترجمہ: میں تجھے ایک نصیحت کرتا ہُوں تو اسے یاد رکھ اور اس پر عمل کر۔ کیونکہ یہ بات مجھے اپنے مرشد (پیرِ طریقت) کی بتائی ہوئی یاد ہے۔

تشریح: عالمِ غیب کے فرشتے کی بات ختم کرنے کے بعد خواجہ صاحب اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے مخاطب میں تجھے ایک نصیحت کرتا ہوں تو میری اس نصیحت پر عمل کر۔ وہ بتاتے ہیں کہ یہ نصیحت مجھے میرے پیرِ طریقت نے بتائی تھی۔ جو مجھے آج تک یاد ہے۔ میں نے ہمیشہ اس نصیحت پر عمل کیا ہے تو بھی اس نصیحت پر عمل کر۔ نصیحت کا مضمون اگلے شعر میں ہے۔

۷۔ **راہرو**: راستہ چلنے والا۔ راہِ طریقت پر چلنے والا۔ حق کو تلاش کرنے والا۔ — **لطیفہ**: لطیف نکتہ۔

پند از یاد بردن: نصیحت کو یاد سے نکال دینا۔ یعنی بھول جانا۔

ترجمہ: (مُرشد یا پیرِ طریقت کی بتائی ہوئی بات یہ ہے) کہ دُنیا کا غم نہ کر۔ اور میری نصیحت کو مت بھوُل کیونکہ (عشق کا) یہ لطیف نکتہ مجھے ایک راہِ طریقت پر چلنے والے کا بتایا ہوا یاد ہے

تشریح: خواجہ صاحب اس شعر میں اس لطیف نکتے کو بیان کرتے ہیں۔ جو

انہوں نے کسی سالک یا راہِ طریقت پر چلنے والے سے سُنا ہے۔ حافظ نے اس سینہ بسینہ یاد کے سلسلے کو ایک عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے کہ اس کی تائید یقینی ہو گئی ہے۔ وہ لطیف نکتہ یہ ہے کہ انسان کو دنیا کا غم نہیں کرنا چاہیئے۔ اور یہ نصیحت ایسی ہے جو کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے۔ اس نصیحت کا حاصل مطلب اگلے شعر میں ہے۔

۸۔ **رضا بچیزی دادن**: کسی چیز پر راضی ہونا یا قناعت کرنا

گرہ: گرہ سے مراد چینِ ابرو۔

دادہ خداوند: جو کچھ اللہ نے دیا ہے۔

دادہ: جو کچھ دیا گیا۔ مُراد تقدیر کا لکھا۔

ترجمہ: جو کچھ اللہ نے تجھے دیا ہے تو اس پر راضی رہ اور ماتھے کی شکن دُور کر۔ کیونکہ تو ہو یا میں کسی پر بھی اختیار کا دروازہ کھُلا نہیں رکھا گیا۔

تشریح: خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ تقدیر کسی کے بس میں نہیں ہے۔ قسمت کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کر لینا کسی بھی انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ اس لیے حقیقی سکون صرف اس انسان کو میسر آ سکتا ہے جو قناعت کو اپنا شعار بنا لے اور ہر حالت میں خدا کا شکر کرے۔ مایوسی۔ افسوس، غم اور رنج کی حالت میں ماتھے پر بل ڈالنے سے خوش نصیب نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ روزِ اوّل سے تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے وہی ہوگا۔ اس لیے رنج و غم کرنا بے فائدہ ہے۔

۹۔ **نہاد**: خلقت۔ طبیعت

عجوز: بہت بوڑھی عورت۔ سال خوردہ عورت۔ بڑھیا۔

درستی عہد: اپنے وعدے پر قائم رہنا۔ وعدہ پورا کرنا۔ کے عہد کو نبھانا۔

عروس: دُلہن نکاح

داماد: دُلہا۔ استعارہ ہے، دُنیادار لوگ۔

سست بنیاد: جس کی بنیاد کمزور ہو۔

ترجمہ: تو اس کمزور بنیاد رکھنے والی دنیا سے وعدہ وفائی کی اُمید نہ رکھ

کیونکہ یہ بڑھیا ہزاروں دلہاؤں کی دُلہن ہے۔

تشریح: فرماتے ہیں کہ اس بے اختیار اور فرومایہ سے وفا اور نیکی کی اُمید رکھنا فضول ہے چونکہ یہ دنیا تو ایک ایسی بُڑھیا کی مانند ہے جس نے ہزاروں دامادوں سے شادی کی ہے، لیکن کسی کے نکاح میں بھی ہمیشہ نہیں رہی۔ یہ ایک ایسی عروس ہے کہ جس نے ہزاروں دامادوں (دولہوں) کو بے کس اور بے بس کر کے چھوڑ دیا ہے۔ یہ ایک ایسی مکار عورت ہے۔ جس نے دنیا میں آج تک کسی کے ساتھ وفا نہیں کی۔ اس لیے اگر دنیا میں چند دن تیری مُراد کے مطابق گزر رہے ہوں تو یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ دُنیا ہمیشہ تیرے ساتھ ایسی ہی رہے گی۔

۱۰- **عہدِ وفا**: وفا کا عہد۔ وفا کا عہد و پیمان باندھنا **تبسّمِ گل**: پھُول کی مسکراہٹ۔ پھُول کا کھلنا۔ **نالہ**: توڑو۔

ترجمہ: پھُول کی مسکراہٹ میں محبت اور وفا کا نام نہیں ہے۔ اے عشق کے مارے بُلبُل توڑو۔ کیونکہ یہ رونے اور چلانے کا مقام ہے۔

تشریح: فرماتے ہیں پھُول کے مُسکرانے یعنی کھلنے میں عہدِ وفا کا نشان نہیں ہے۔ چونکہ تیرے معشوق یعنی پھُول کی زندگی چند روزہ ہے وُہ جلد ہی فنا ہو جائیگا۔ اور اس مختصر سے وصال کے بعد پھر تمام زندگی کا فراق ہے۔ اس لیے اے بُلبل یہ نغمہ سرائی کا وقت نہیں بلکہ آہ و زاری کا موقع ہے۔ اگر بُلبُل پھُول کے حُسن پر بھول جاتا ہے تو یہ اس کی بھُول ہے چونکہ

ریاضِ دہر میں ہیں یُوں رنگ رنگ کے پھُول
وفا کی جس میں ہو بو وُہ کلی ہی نہیں!

۱۱- **حسد**: یعنی کسی کی نعمت کا زوال چاہنا

مقبولِ خاطر: دِل جس کو قبول کرے۔ دِل کو بھانیوالا۔ دلپذیر۔ دلچسپ

لُطفِ سخن: کلام کا لطیف رنگین اور دل کش ہونا۔

سُستِ نظم: وُہ جس کے اشعار پھیکے ہوں۔ وہ جو اپنے خیالات اچھی طرح ادا نہ کر سکے۔

خُداداد: خُدا کا عطیہ

ترجمہ: اے تنگ بندیاں کرنے والے تجھے حافظ پر کیوں حسد آ رہا ہے۔ کلام کا مقبول ہونا۔ اور اشعار کا لطیف ہونا خدا کی بخشش ہے۔

تشریح: اس شعر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی شاعر نے خواجہ حافظ کے کلام کو رشک وحسد کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس کے اشعار خواجہ صاحب کے بلند پایہ اشعار کے مقابلے میں سست ہوں گے۔ چنانچہ خواجہ صاحب اپنے حاسد شاعر کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اے سست نظم! تو حافظ کی شاعری پر حسد کرتا ہے۔ یقین جان! کہ اچھے شعر کہنا کوئی جرم نہیں ہے۔ بلکہ دلوں میں اس کا اثر ہونا ایک خدائی عطیہ ہے۔ مجھے بھی یہ ذوقِ سلیم خدا کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ حافظ کا کلام نہایت دلکش، دلآویز اور بے عیب ہے۔ اس کے حریف اگر اس کی کامیابی پر کڑھتے ہیں تو یہ ان کے حوصلے کی تنگی ہے

بقول شاعر ؎

ہزاروں سے سُنے وہ لفظ لیکن لفظ تھے خالی
تمہاری بات کی شوخی تمہاری ہی زبان تک ہے۔

غزل نمبر ۳ — صفحہ ۱۳۹

۱. بادہ: شراب — **گل بیز**: گل افشانی کرنے والا
فرح بخش: فرحت بخش — خوشبو پھیلانے والا
ببانگ چنگ خوردن: کھلم کھلا پینا — **محتسب**: کوتوال۔ احتساب کرنے والا۔

ترجمہ: اگرچہ شراب فرحت بخشنے والی اور ہوا معطّر ہے (پھر بھی) آوازِ چنگ کے ساتھ اعلانیہ (کھلم کھلا) شراب نہ پی۔ کیونکہ کوتوال بہت سخت گیر ہے۔

تشریح: فرماتے ہیں کہ اگرچہ شراب فرحت بخش ہے اور ہوا گل افشانی کر رہی ہے۔ یعنی بہار کا خوشگوار موسم ہے اور ہر طرف رونق اور دل کشی کا عالم ہے۔ لیکن اس کے باوجود تو آواز چنگ کے ساتھ یعنی کھلم کھلا شراب نہ پی۔ یعنی شراب چپ چاپ پی۔ کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ چونکہ محتسب بہت سخت گیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ بادہ نوشی کا موسم ہے لیکن محتسب کی سخت گیری اور غصہ سے امن وامان میں رہنے کے لیے چوری چھپے شراب پینی چاہیئے۔

۲- **حریفی**: میں ی وحدت ہے **حریف**: ہم پیشہ۔ مصاحب بادہ۔ لیکن اس شعر میں حریف سے مراد معشوق ہے۔
فتنہ انگیز: فتنہ پیدا کرنے والا

ترجمہ: اگر تجھے (شراب کی) ایک صراحی اور معشوق مل جائیں تو ہوش میں رہ کر شراب پی۔ چونکہ زمانہ فتنہ انگیز ہے۔

تشریح: خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ اگر شراب کی ایک صراحی اور محبوب کی قربت نصیب ہو جائے تو اس صورت میں عقل وہوش کے ساتھ شراب پی۔ زمانہ بہت فتنہ انگیز ہے۔ اس لیے احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ چونکہ شراب نوشی سخت منع ہے جو شرابی پکڑا جاتا ہے اسے سنگسار کیا جاتا ہے۔ اس شعر میں بعقل نوش سے یہ معانی بھی اخذ کیے جا سکتے ہیں کہ مجلس شراب میں سے اس وقت اٹھ کر چلا جا جبکہ تو مست نہ ہو۔ بدمست ہونے کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ تو گرفتار ہو جائے۔ اس شعر کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ عارف اللہ کو قربت محبوب حقیقی حاصل ہو جائے تو بھی اسے اسرار معرفت کو کھلم کھلا بیان کرنے سے پرہیز کرنا چاہیئے چونکہ عوام ان بھیدوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ ہو سکتا ہے اس کا مفہوم غلط سمجھیں اور عارف اللہ کو کسی مصیبت میں گرفتار کر دیں۔

۳- **مرقع**: گودڑی۔ تصویر۔

خرقہ: درویشوں کا پھٹا پرانا اور پیوند لگا لباس۔ لیکن یہاں صوفیوں کا خرقہ ہے۔ اس کے ذریعے سے ریاکار صوفیوں پر تحریک کرتے ہیں۔

چشم صراحی سے مراد صراحی کا منہ ہے جس سے شراب نکلتی ہے۔

خونریز: خون بہانے والا۔

ترجمہ: خرقہ کی آستین میں پیالہ رکھ۔ کیونکہ چشم صراحی کی طرح زمانہ خونریز ہے۔

تشریح: خواجہ صاحب ریاکار صوفیوں کو کہتے ہیں کہ پیالہ کو خرقہ کی آستین میں چھپا لیں تاکہ کوئی نہ دیکھ سکے۔ چونکہ چشم صراحی کی طرح زمانہ کی آنکھ بھی خونریز ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تو اپنی بادہ نوشی کو کسی پر ظاہر نہ کر۔ اور محتاط رہ تاکہ کسی کو تیری بادہ نوشی کا علم نہ ہو۔ اس شعر میں ریاکار صوفیوں پر طنز کی گئی ہے کہ وہ زمانہ کے ڈر سے لباسِ درویشی میں جام مے پوشیدہ رکھتے ہیں کیونکہ زمانہ نازک ہے۔ چشمِ صراحی کو خونریز اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے منہ سے سُرخ شراب نکلتی ہے ؎

کہاں مے خانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

نکلے جو میکدہ سے ابھی مُنہ چھپا کے تم
دابے ہوئے بغل میں صراحی شراب کی

اس شعر میں اگر مرقع سے مُراد صبر و تحمل اور پیالے سے مُراد اسرارِ عشق لیے جائیں اور زمانہ سے مُراد قیود شرعی لی جائیں تو اس شعر کا مفہوم یہ ہوگا کہ عاشق اللہ صبر و تحمل کے جامے میں اسرارِ حق چھپا لے۔ اس لیے اگر وہ انھیں صاف صاف بیان کریگا تو شریعت کی سزا سے نہ بچ سکے گا۔

مہ بشستن: شوید مضارع۔ دھونا آبِ دیدہ: آنسو

خرقہ: گودڑی ورع: پرہیزگاری۔ زُہد۔

ترجمہ: شراب کا رنگ اپنے خرقے کے آنسوؤں سے دھو ڈالیں۔ چونکہ

زہد کا زمانہ اور پرہیزگاری کا وقت ہے۔

تشریح: گودڑیوں سے شراب کی آلائش کو دھوکر ہی دور کیا جا سکتا ہے کیونکہ لوگ پرہیزگار اور زاہد بنتے جارہے ہیں۔ ہماری گودڑی پر شراب کے جو داغ دھبے پڑے ہیں۔ انھیں آنکھوں کے آنسوؤں سے دھو ڈالیں۔ یعنی ہم نے گذشتہ ایام میں جو شراب نوشی کی ہے اس سے اب توبہ کرلیں۔ اور اس قدر آنسو بہائیں کہ خرقہ پر شراب کے جو دھبّے لگے ہوئے ہیں سب دُھل کر صاف ہو جائیں۔ چونکہ اب پرہیزگاری اور زہد کا زمانہ ہے۔ اس شعر میں بھی ریاکار صوفیوں پر طعن و تشنیع کی گئی ہے۔

یہ غزل دلشاد خاتون کی سلطنت کے زمانے میں لکھی گئی تھی۔ اس کے دورِ حکومت میں شراب نوشی اور دوسرے ممنوعہ امور کی اس قدر ممانعت تھی۔ جو احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے انھیں ہر طرح سے سزا دیکر قتل کر دیتے تھے۔

۵۔ **عیش خوش**: اچھی زندگی۔ شادمانی اور مسرت کی زندگی۔ **خم**: مٹکا **سپہر**: آسمان **واژگون**: اُلٹا۔ اوندھا **دُرد**: تلچھٹ

ترجمہ: آسمان کی اُلٹی گردش سے لطف و مسرت کی زندگی نہ ڈھونڈھ۔ کیونکہ اس مٹکے کی صاف شراب بھی تلچھٹ کی آمیزش رکھتی ہے۔

تشریح: فرماتے ہیں کہ آسمان کی کسی گردش میں خوشی و مسرت کا حصول محال ہے اس کی ہر خوشی درِ اصل کسی غم کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اس لیے اس آسمان کی اُلٹی گردش سے زندگی کی خوشحالی کی توقع رکھنا لاحاصل ہے۔ یہ آسمان تو ایک ایسے مٹکے کی مانند ہے جس کی صاف شراب میں بھی تلچھٹ ملی ہوئی ہے۔ اس کی عطا کردہ خوشی میں ہزاروں غم چھپے ہوتے ہیں۔ اس شعر میں آسمان کو اُلٹے مٹکے سے تشبیہ دی ہے۔ مٹکا اگر الٹا ہو تو اس کے سبب صاف چیزیں تہ کی کثافت مل جاتی ہیں۔ خواجہ صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں

کہ آسمان کی گردش کے سبب دنیا میں کوئی خموشی غم کے بغیر نہیں ہے کوئی مٹھاس تلخی کے بغیر اور کوئی پھول کانٹے کے بغیر نہیں ہے۔

۷۔ **سپہر**: آسمان **پرویزن**: چھلنی **خونفشاں**: خون بہانے والی۔ خون برسانے والی۔ **کسریٰ**: خسرو کا لقب۔ جس طرح روم کے بادشاہوں کو قیصر اور چین کے بادشاہوں کو فغفور کہا جاتا ہے۔ اسی طرح شاہانِ عجم کو کسریٰ کہتے ہیں لیکن یہاں کسریٰ سے مُراد پرویز پسر ہرمز بن نوشیرواں ہے۔ **پرشدہ**: بلند **کسریٰ**: شاہِ ایران کا لقب: پرویز نوشیرواں کا بیٹا۔ **ریزہ**: قطرہ۔

ترجمہ: بلند آسمان ایک خونفشاں چھلنی ہے کہ اس کا ہر قطرہ کسریٰ کا سر اور پرویز کا تاج ہے۔

تشریح: اس شعر میں خواجہ صاحب نے بلند آسمان کو ایک ایسی چھلنی سے تشبیہ دی ہے جس کا ہر قطرہ کسی کسریٰ کا سر اور کسی پرویز کا تاج ہے۔ یعنی اس دُنیا میں بڑے بڑے بادشاہ پیدا ہوئے۔ انہوں نے تمام دنیا میں اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ لیکن اس ظالم آسمان کے سامنے وہ بھی مجبور اور بے بس تھے۔ اس آسمان نے انہیں بڑی بیدردی کے ساتھ قتل کر کے خاک میں ملا دیا۔ آسمان کی نظر میں امیر و غریب اور شاہ و فقیر کا کوئی امتیاز نہیں۔ کوئی بھی آسمان کے خونریز ہاتھوں سے محفوظ نہیں ہے۔

۸۔ اس شعر میں عراق سے مُراد عراق عجم ہے جو آج کل اصفہان کہلاتا ہے اور فارس سے مُراد شیراز ہے۔

ترجمہ: اے حافظ! تو نے عراق اور فارس اپنی عمدہ شاعری سے حاصل کر لیے۔ یعنی اپنی شاعری کا سکہ بٹھا لیا) آ کہ بغداد و تبریز کی باری ہے۔

تشریح: اس شعر میں حافظ نے اپنی شاعری کی مقبولیت کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے حافظ! تو نے اپنے دِل نشین اشعار سے عراق و

فارس تو فتح کر لیے۔ آ کہ اب تبریز کو فتح کرنے کی باری ہے۔ اس شعر میں عراق، بغداد، فارس اور تبریز میں مراعات النظیر ہے۔ مُراد یہ ہے کہ تُو نے اپنے لطیف اشعار سے تمام عالم کو فتح کر لیا ہے۔

غزل نمبر ۴

۱۔ **عیش نہاں**: چھپا ہُوا عیش **ہر چہ بادا باد**: جو ہو تو ہو۔

ترجمہ: عیشِ نہانی کی شراب کیا ہے۔ ایک بے بنیاد کام ہے۔ ہم تو رندوں کی صف میں جا ملے۔ اب جو ہو سو ہو۔

تشریح: خواجہ صاحب فرماتے ہیں۔ چوری چھپے شراب پینا ایک فضول کام ہے۔ ہمیں یہ ریاکاری پسند نہ تھی۔ اس لیے ہم رندوں کے حلقے میں شامل ہو گئے ہیں۔ جو کھُلم کھُلا شراب پیتے ہیں۔ ہم بھی اب اعلانیہ شراب پئیں گے اور جو کچھ بھی ہم پر گزرے گی اس کا مردانہ وار مقابلہ کریں گے۔

۲۔ **بکشا**: کھول۔ کشودن مصدر **مہندس**: علم ہندسہ جاننے والا۔ انجینئر سے فعل امر کا صیغہ واحد حاضر **سپہر**: آسمان۔

ترجمہ:۔ دِل کی گرہ کھول اور آسمان کی باتوں کو یاد نہ کر۔ کیونکہ کسی بھی مہندس کی عقل نے یہ گرہ نہیں کھولی۔

تشریح: خواجہ فرماتے ہیں۔ اس گردش آسمانی کے نتیجہ کے طور پر ہر روز نئے سے نئے انقلابات رونما ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی حقیقت کو آج تک کوئی ماہر سے ماہر مہندس یا منجم معلوم نہیں کر سکا۔ اِس لیے انسان کو چاہیئے کہ وہ انقلابات زمانہ کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دے۔ بلکہ خوش و خرم زندگی بسر کرنے کی کوشش کرے۔

۳۔ **عجب مدار**: حیران نہ ہو۔ تعجب نہ کر۔

ترجمہ: زمانے کے انقلابات پر حیران نہ ہو۔ کیونکہ آسمان کو ایسے ہزار دل افسانے اور افسون یاد ہیں۔

تشریح : خواجہ صاحب فرماتے ہیں۔ جب دنیا قائم ہوئی ہے۔ زمانے میں گردشِ آسمانی کے سبب ہزاروں نت نئے حوادث اور انقلابات رُونما ہوتے رہے ہیں۔ اور یہ سب انقلابات اور حوادث گردشِ دوران کا نتیجہ ہیں اگر دُنیا میں کوئی نیا انقلاب رونما ہوتا ہے۔ یا کوئی نیا حادثہ پیش آتا ہے تو انسان کو حیران نہیں ہونا چاہیے۔

۴۔ قدح : پیالہ **جمشید، قباد اور بہمن** : ایران کے بادشاہوں کے نام ہیں۔

ترجمہ : پیالہ ادب کے ساتھ پکڑ۔ یہ پیالہ جو تیرے ہاتھ میں ہے خدا جانے کتنے بادشاہوں کے کاسۂ سر کی مٹی اس میں شامل ہو گی۔ اس لیے تو اس پیالہ کو ذرا ادب سے پکڑ۔ فی الحقیقت یہ عبرت کا مقام ہے کہ لاکھوں بادشاہ اور کروڑوں انسان مر کر خاک ہوئے۔ اور اب ان کی خاک سے برتن اور اینٹیں بنائی جا رہی ہیں۔

خیام اس خیال کو اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

خاکی کہ بزیر پای ہر حیوانی است
زلف صنمی و عارضِ جانانی است
ہر خشت کہ بر کنگرہٗ ایوانی است
انگشت وزیری و سرِ سلطانی است

۵۔ کہ آگہست۔ کون آگاہ ہے کی۔ کیانی بادشاہ

ترجمہ : کون جانتا ہے کہ جمشید کے کہاں گئے کسے معلوم ہے کہ جمشید کا تخت کس طرح برباد ہوا؟

تشریح : خواجہ صاحب فرماتے ہیں دُنیا میں جمشید جیسے لاکھوں عظیم المرتبت بادشاہ آئے۔ انہوں نے دُنیا کے گوشے گوشے میں اپنی حکمرانی کے جھنڈے گاڑ دیئے لیکن ان بادشاہوں کے تخت و تاج اس طرح برباد ہوئے ہیں۔

کہ آج ان کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔ بقول خیام

ایں کہنہ رباط را کہ عالم نام است
آرامگہ ابلق صبح وشام است!!
بزمی است کہ وا ماندۂ صد جمشید است
قصری است کہ تکیہ گہ صد بہرام است

۶۔ **شیریں**: ایران کے مشہور بادشاہ خسرو پرویز کی ملکہ کا نام ہے۔ فرہاد اس ملکہ کا عاشق تھا۔

ترجمہ: شیریں کے لب کی حسرت میں میں اب دیکھتا ہوں کہ فرہاد کی قبر کی مٹی سے لالہ پیدا ہوتا ہے۔

تشریح: گل لالہ کے اندر ایک داغ ہوتا ہے اس لیے اسے عاشق کے داغدار دل سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں چونکہ فرہاد شیریں کے لب لعل کی حسرت میں دل پر داغ لیے قبر میں گیا۔ اس لیے ابھی تک اس کی قبر پر لالہ کے پھول اُگتے ہیں۔ اسی مضمون کو اردو کے کسی شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔

بجھنے کی دل کی آگ نہیں زیر خاک بھی
ہوگا درخت گور پہ میرے ہی چنار کا

غنیمت کنجاہی اس کو یوں ادا کرتے ہیں۔

دل دارم خراب نرگس مستانہ ساماں ش
ز خاک من ہمہ نرگس دمد بجائی گیاہ

۷۔ **دہر**: زمانہ **بزاد**: پیدا ہوا **بشد**: چلا گیا۔

ترجمہ:

شاید لالہ زمانہ کی بیوفائی کو جانتا تھا۔ اس لیے جب سے پیدا ہوا ہے۔ مرتے دم تک جام شراب ہاتھ سے نہ رکھا۔

تشریح : گُل لالہ کو عام طور پر جام سے تشبیہ دیتے ہیں۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں۔ دنیا کی بیوفائی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ کسی کے پاس نہیں رہتی۔ گل لالہ نے دنیا کی بیوفائی کی حقیقت کو سمجھ لیا ہے۔ اس لیے اس نے ہمیشہ جام مے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے تاکہ دنیا کی بیوفائی کے اثر سے محفوظ رہ سکے۔ مطلب یہ ہے کہ لالہ کا پھول جام شراب کے ذریعے دنیا کی بیوفائی کا غم دور کرتا رہتا ہے۔

۸ - **خراب** : بدمست۔

ترجمہ : آ کہ کچھ مدت کے لیے شراب سے بدمست ہولیں۔ شاید کہ اس خراب آباد میں کسی خزانہ تک پہنچ جائیں۔

تشریح : خزینے اور دفینے ہمیشہ ویران اور غیر آباد مقامات میں پائے جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ آؤ کہ ہم اس خراب آباد یعنی دنیا میں خزانہ (یعنی خزانہ معرفت) حاصل کرنے کے لیے شراب عشق پئیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ دنیا میں گنج معرفت حاصل کرنے کے لیے شراب عشق کا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے خواجہ صاحب تلقین کرتے ہیں کہ اگر تم معرفت حق حاصل کرنا چاہتے ہو تو دل میں اللہ کی محبت پیدا کرو۔

۹ . **خاکِ مصلّا** : شیراز کی ایک سیر گاہ کا نام **آب رکنا آباد** : ایک چھوٹے سے چشمے کا نام شیراز سے ایک فرسخ کے فاصلے پر پہاڑوں میں واقع ہے۔

ترجمہ : خاک مصلّا کی نسیم اور چشمہ رکنا آباد کا پانی مجھے سیر و سفر کی اجازت نہیں دیتے۔

تشریح : خواجہ صاحب کو خاک مصلّا اور آب رکنا آباد سے اس قدر دلی محبت تھی کہ غیر ممالک کے قدر دانوں نے آپ کو زادِ راہ بھیج کر اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی۔ لیکن خواجہ صاحب حبّ الوطنی کے سبب شیراز

سے باہر نہ جا سکے۔ کہتے ہیں۔ محمود شاہ بہمنی حاکم دکن اور غیاث الدین حاکم بنگال نے آپ کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی، لیکن خواجہ صاحب شیراز کی محبت کے سبب اپنے وطن کو نہ چھوڑ سکے۔ اور معذرت لکھ بھیجی۔

۱۰- قدح گیر: پیالہ پکڑ۔ ابریشم: ریشم یا ریشم کا تار۔

ابریشم طرب: چونکہ چنگ و ساز ساز یا چنگ کا تار موجب طرب ہے اس لیے چنگ کے تار کو بھی ابریشم طرب کہہ سکتے ہیں۔ بصورتِ دیگر طرب کے تار خوشی کے تار۔

ترجمہ: دف و چنگ کی آواز سے حافظ کی طرح پیالہ پکڑ۔ یعنی شراب پی۔ کیونکہ خوش حالی کو ابریشم طرب سے باندھا گیا ہے۔

تشریح: فرماتے ہیں کہ خوش دلی کو قضا و قدر نے خوشی کے تار یا چنگ کے تار سے وابستہ کیا ہے۔ یعنی دل کی خوشی کا انحصار چنگ کے تار یا رشتۂ طرب پر ہے۔ اس لیے چنگ و دف کے ساتھ شراب پینی چاہیے۔ اور خوش حالی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنگ و ابریشم کی رعایت ظاہر ہے۔

صفحہ ۱۰۱ تا ۱۰۴

غزل نمبر ۵

۱- نرگس: ایک پھول کا نام - نرگسِ مست سے مراد معشوق کی آنکھ ہے

تاجدار: بادشاہ ، بادہ لعل: سرخ شراب، مراد معشوق کے ہونٹ۔

خراب: مست - رند - شرابی -

ترجمہ:- بادشاہ بھی تیری نرگس مست کے غلام ہیں - اور بڑے بڑے ہوشیار تیری سرخ شراب کے مست ہیں -

تشریح:- فرماتے ہیں کہ اے معشوق تیری آنکھ اس قدر خوبصورت ہے کہ بڑے بڑے تاجدار بھی اس پر عاشق ہیں - اور تیری غلامی اختیار کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں ، اور تیرے سرخ ہونٹوں میں شراب ایسی لذت ہے - اور وہ نشہ ہے کہ ہوشیار اور دانا لوگ بھی انھیں دیکھ کر مست ہیں - بادشاہ و غلام اور ہوشیار و مست کا مقابلہ لطیف ہے -

۲- زلف دوتا: تابدار گیسو - یمین :- دایاں - یسار :- بایاں -

ترجمہ: جب تو چلتا ہے تو دیکھ تیری تابدار زلفوں کے نیچے دائیں بائیں کتنے بے قرار (عاشق) ہیں -

تشریح: فرماتے ہیں کہ اے معشوق جب تو کسی رہگذر سے گزرتا ہے تو تیری پیچ دار زلفوں میں کتنے ہی عاشقوں کے دل اسیر ہو جاتے ہیں - اگر تو اپنی زلفوں کے دائیں بائیں دیکھے تو تجھے ایسے بے شمار دل نظر آئیں گے جو تیری زلفوں کے پیچ میں پھنس کر تڑپ رہے ہیں - ؎

گیسوے تابدار کو اور بھی تاب دار

ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

۳- تطاول: لوٹ مار - دست درازی -

بنفشہ زار: بنفشہ کے پھول اُگنے کی جگہ - یا - باغ -

ترجمہ: بادِ صبا کی مانند بنفشہ زار میں جا کر دیکھ کہ تیری زلف کی دست درازی سے کتنے سوگوار پڑے ہیں۔

تشریح: بنفشے کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ اور سیاہ رنگ ماتم کا نشان ہے۔ علاوہ ازیں بنفشہ کو زلفِ معشوق سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ خواجہ حافظ فرماتے ہیں کہ اے معشوق تو بنفشہ زار میں جا کر دیکھ کہ بنفشہ بھی تیری زلف کے عشق میں غمزدہ اور سوگوار دکھائی دیتا ہے۔ بنفشہ کی سیاہی فطری ہے۔ لیکن شاعر خیال کرتا ہے کہ بنفشہ نے زلفِ معشوق کے غم میں ماتمی لباس پہن لیا ہے۔ اس شعر میں حسنِ تعلیل ہے۔ ایک اور شاعر نے زلفِ معشوق کی سیاہی کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کیا ہے۔

تا چشمِ تو ریخت خونِ عشاق

زلفِ تو گرفت رنگِ ماتم!!

یعنی جب سے چشمِ معشوق نے عشاق کا خون بہایا ہے۔ زلفوں نے ماتمی رنگ اختیار کر لیا ہے۔ حالانکہ زلفوں کی سیاہی کی علت ماتمی لباس پہننا ہے۔

۴۔ حسنِ تعلیل: کسی ایسی چیز کو علت قرار دینا جو صحیح معنوں میں اس کی علت نہ

عارض: رخسار عندلیب: بلبل۔

ترجمہ: صرف میں ہی اس معشوق کے خوبصورت رخساروں پر غزل سرا نہیں ہوں۔ بلکہ تیرے (شیدائی) بلبل تو ہر طرف ہزاروں ہیں۔

تشریح: فرماتے ہیں معشوق حقیقی کے حسن و جمال کا پرتو تو کائنات کے ذرّے ذرّے میں جلوہ نما ہے۔ ایک عاشق الٰہی ان جلوؤں کو دیکھتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی مدح سرائی میں مصروف ہو جاتا ہے۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ صرف میں ہی محبوبِ حقیقی کے حسن و جمال کی تعریف کرنے والا نہیں۔ بلکہ تمام موجودات اس کی حمد و ثنا میں مصروف ہے۔ جیسا کہ

خود قرآن پاک میں مذکور ہے ۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۔

یعنی سات آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے اندر ہے ۔ خدا تعالیٰ کی حمد و تسبیح کہتے ہیں ۔ لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ۔

۵ ۔ غماز : چغل خور ۔

ترجمہ :- بادِ صبا نے تیری غمازی کی اور آنسوؤں نے میری ۔ ورنہ عاشق اور معشوق تو ایک دوسرے کے رازدار ہیں ۔

تشریح : عاشق و معشوق دونوں رازِ عشق چھپانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت کے راز دار ہوتے ہیں ۔ خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ بادِ صبا نے معشوق کی زلفوں کی خوشبو چرا کر دنیا کے تمام گوشوں میں پھیلا دی ۔ اور اس طرح اس کی محبت کا راز فاش کر دیا ۔ دوسری طرف عاشق نے ہر چند ضبط سے کام لیا ۔ لیکن پھر بھی اس کی آنکھوں سے آنسو آ گئے ۔ اور اس طرح لوگوں پر واضح ہو گیا ۔ کہ وہ کسی کی محبت میں گرفتار ہے ۔ اب اگر عاشق و معشوق کی محبت کا راز فاش ہوا ہے تو اس میں قصور بادِ صبا کا ہے یا آنکھوں کا ۔ ؎

۱ ۔ عشق کے راز نہاں شرح بیاں تک پہنچے
آنکھ سے دل میں گئے دل سے زباں تک پہنچے

۲ ۔ دل نے آنکھوں سے کہی آنکھوں نے ان سے کہہ دی
بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے ۔ (تاثیر)

۶ ۔ خجستہ پے : مبارک قدم ۔ دستگیر شدن : مدد کرنا ۔

خضر :- ایک بزرگ کا نام جو بھولے بھٹکوں کو راہ دکھاتا ہے قرآن مجید میں بھی ان کا ذکر خیر آیا ہے ۔ خضر خجستہ پے : مبارک قدم خضر ۔

ترجمہ:- اے مبارک قدم خضر تو میری مدد کر۔ کیونکہ میں پیدل جا رہا ہوں۔ اور میرے ساتھی (گھوڑوں پر) سوار ہیں۔

تشریح:- پیدل چلنے والے اور گھوڑ سوار کی رفتار میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ دونوں منزل مقصود پر یقیناً ایک وقت پر نہیں پہنچ سکتے۔ اس طرح عاشق حقیقی کی منزلِ مقصود صرف بارگاہِ محبوب حقیقی ہے۔ وہ مراحل سلوک طے کر کے معشوق حقیقی تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ اور وہ اس سلسلے میں کسی راہبر یا راہنما کی دستگیری کے محتاج ہیں۔ چونکہ اس راہنمائی کے بغیر منزلِ مقصود تک پہنچنا محال ہے۔

۷۔ کرامت: بخشش نصیب: حصّہ۔

ترجمہ:- اے خداشناس تو جا۔ بہشت تو ہمارے حصے میں ہے۔ کیونکہ بخشش کے حقدار تو گنہگار ہوتے ہیں۔

تشریح:- وہ لوگ جو عارف باللہ یا خداشناس ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کا بہشت میں کیا کام۔ اللہ تعالیٰ کی حقیقی بخشش کے مستحقِ حقیقی تو گنہگار لوگ ہیں۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت ان ہی لوگوں کے لئے جوش میں آئے گی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت تو گنہگار بندوں کے لئے مخصوص ہے۔ اس لئے خواجہ صاحب عارف اللہ یا زاہد کو دھتکارتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جا تو اپنا کام کر۔ یہ بہشت تو ہم گنہگاروں کا حصّہ ہے۔

بے گناہوں میں چلا زاہد جو اس کو ڈھونڈنے
مغفرت بولی ادھر آ! میں گنہگاروں میں ہوں!

۸۔ خلاص: رہائی۔ نجات۔ رستگار: چھٹکارا پانے والا۔
بستگان: اسیر پھنسے ہوئے۔

ترجمہ:- خدا کرے حافظ اس گیسوئے تابدار سے رہائی نہ پائے۔ کیونکہ جو

لوگ تیری کمندِ زلف میں گرفتار ہیں۔ وہی درا‌صل (تمام قیود) سے آزاد ہیں۔

خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ عاشقِ صادق کی توجہ کا مرکز صرف معشوق کی ذات ہوتی ہے۔ وہ معشوق کی کمندِ زلف میں پھنس کر تمام دنیا کے رنج و غم سے اور قیود سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اِسے زلفِ معشوق کی کمند کی اسیری میں خاص لطف محسوس ہوتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ ہمیشہ اسی کمندِ عشق میں گرفتار رہے۔ تاکہ اُسے آلامِ زمانہ پریشان نہ کر سکیں۔ خواجہ صاحب چاہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ اس کمندِ عشق میں پھنسے رہیں۔ تاکہ وہ قیود دنیوی سے آزاد رہ سکیں۔ ؎

دل بے غم ہمی خواہی، دلِ غمگین بدست آور
چو دل غمگینِ عشق آمد زغم ہا جملہ بی غم شد

—.:.—

صفحہ ۱۴۱ تا ۱۴۲

غزل نمبر ۶

۱- جامِ جم : جمشید بادشاہ کا مشہور پیالہ ، جس سے آنے والے حادثات کی خبر ملتی تھی۔ جامِ جم سے مراد شرابِ عشق یا عاشق کا دل ہے۔

بیگانہ : غیر۔

ترجمہ :- کئی برسوں سے دل ہم سے جامِ جم طلب کرتا رہا۔ اور جو کچھ اس کے پاس تھا وہ غیر سے مانگتا رہا۔

تشریح :- انسان کا دل انوارِ الٰہیہ کی جلوہ گاہ ہے۔ اس کے دل کے ذریعے انسان اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں حقائق معلوم کرتا ہے۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ دل ہم سے شرابِ عشق کی تمنا کرتا ہے۔ اور ہمارے ذریعے عشقِ الٰہی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر ہم خود اس سے محروم تھے۔ جو کچھ تھا وہ تو خود دل میں موجود تھا۔ دل اپنی اس حقیقت سے بے خبر تھا۔ حقیقت کا خزانہ تو خود اس میں موجود تھا۔ دوسروں سے خواہ مخواہ وہ چیز طلب کر رہا تھا جو خود اس میں موجود تھی۔

۲- گوہر :- موتی۔ گوہر سے مراد گوہرِ معرفت ہے۔

صدف : سیپ

گمشدگان لبِ دریا۔ دریا کے کنارے آ کر گم ہو جانے والے۔

دریا : مراد دریائے معرفت

کون و مکان : یہ دنیا۔

ترجمہ :- وہ موتی جو کون و مکان کے سیپ سے باہر تھا۔ دریا کے ساحل پر گم ہو جانے والوں سے طلب کرتا ہے۔

تشریح :- اس شعر میں گمشدگان لبِ دریا سے مراد خواجہ صاحب یا وہ انسان ہیں۔ جو دریائے معرفت کے کنارے ہیں۔ لیکن پھر بھی گم شدہ ہیں جو اپنی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وہ حقائقِ عالیہ سے کیسے باخبر ہو سکتے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السّلام روضۂ بہشت کو چھوڑ کر اس خراباتِ عالم میں آ گئے
گویا وہ دریائے مغفرت سے نکل کر ساحل پر آ گئے۔
حدیث قدسی ہے۔ لا یسعنی ارضی ولا سمائی ولکن یسعنی قلب عبدی المومن۔ (میں اپنی زمین میں سما سکا نہ آسمان میں مگر سما گیا اپنے مومن بندے کے دل میں۔

گوہر معرفت یا اللہ تعالےٰ کی معرفت کا راز تو خود انسان کے دل میں موجود ہے۔ گویا وہ موتی تو خود دل میں موجود تھا۔ لیکن وہ اسے معرفت سے بے خبر لوگوں سے طلب کرتا تھا۔

۳۔ دوش: کل رات تائید: مدد
معمّہ: پہیلی۔ پیچیدہ بات۔

ترجمہ:۔ کل رات میں اپنی مشکل پیرِ مغاں کے پاس لے گیا۔ کیونکہ وہ نظر کی مدد سے معمّہ (الجھن) کو حل کرتا تھا۔

تشریح:۔ اس شعر میں مشکل سے مراد وہ شکوک ہیں جو اکثر وقت انسان کے دل کے لئے پریشانی کا موجب بن جاتے ہیں۔ پیرِ مغاں سے مراد مرشدِ کامل ہیں۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں۔ میرے دل میں کچھ شکوک اور پریشانیاں تھیں کل رات میں پیرِ مغاں (مرشدِ کامل) کے پاس پہنچا۔ اور اپنی تمام پریشانیاں اس کے سامنے بیان کیں۔ کیونکہ وہ نظر ہی سے دلوں کی پریشانیاں دور کرتا تھا۔ خواجہ صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اہل اللہ کی نظرِ کرم سے انسان کے تمام شکوک اور پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں۔ شکوک و شبہات تو معمولی سی بات ہے، بلکہ ان کی نگاہیں تو قوموں کی تقدیریں بدل دیتی ہیں۔ ؎

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

۴۔ دیدمش: اورا دیدم
میں نے اسے دیکھا
بادہ: شراب

خرم وخنداں: خوش وخرم۔
قدح: پیالہ
قدح بادہ: شراب کا پیالہ۔ اس سے مراد عارف کا دل ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت کی شراب سے لبریز ہوتا ہے۔

ترجمہ:۔ میں نے اس کو (پیرِ مغاں) کو دیکھا کہ خوش وخرم ہے اور شراب کا پیالہ ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ اور اس آئینہ میں سو طرح کے نظارے دیکھتا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں قدح بادہ، شراب کے پیالہ سے مراد انسان کا دل ہے۔ باضمیر روشن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیرِ مغاں کا دل ایک ایسا پیالہ تھا جو عشق الٰہی کی شراب سے لبریز تھا۔ اور وہ ایسا پاک وشفاف آئینہ تھا جس میں وہ حقائق ومعارف کے کئی نظارے دیکھ رہا تھا۔

۵۔ حکیم سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔
جامِ جہاں بین سے مراد عارف یا پیرِ مغاں کا دل ہے۔

گنبدِ مینا سے مراد آسمان ہے

ترجمہ:۔ میں نے کہا یہ جامِ جہاں بین (دل) حکیم (اللہ تعالیٰ) نے تجھے کب دیا۔ کہا۔ اس دن جبکہ وہ مینا یعنی آسمان بناتا تھا۔

تشریح: خواجہ صاحب فرماتے ہیں جب میں نے پیرِ مغاں (مرشد کامل) سے یہ پوچھا کہ حکیمِ مطلق نے تجھے یہ جامِ جہاں بین یعنی ضمیر روشن کب عطا کیا تھا۔ تو اس نے جواب دیا۔ آفرینش کائنات کے وقت سے۔ مراد یہ ہے کہ اولیاء کے دل روزِ ازل ہی سے نورِ معرفت سے روشن ہوتے ہیں۔

۶۔ بیدل: عاشق۔

ترجمہ:۔ ایک بیدل (عاشق)، کہ ہر حال میں خدا اس کے ساتھ تھا۔ وہ اسے (خدا کو) نہیں دیکھتا تھا۔ اور دور سے خدا را (خدارا) پکارے جاتا تھا۔

تشریح :- یہ شعر اکثر قلمی نسخوں میں نہیں ملتا۔ مطلب یہ ہے کہ خدا تو ہر حال میں عاشق کے ساتھ ہوتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ عاشق خدا کو نہیں دیکھتا اور دُور سے پکارتا رہتا ہے "خدا مدد دے"۔ بقول شاعر

دوست نزدیک تر زمن بہ من است
ویں عجیب تر کہ من ازوی دُورم
چکنم باکہ تواں گفت کہ او
در کنار من و من مہجورم

۱۔ عصائے موسیٰ: معجزہ ید بیضا: معجزہ (روشن ہاتھ)

عصائے موسیٰ اور ید بیضا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دو معجزے ہیں۔ عصا (لاٹھی) کو جب حضرت موسیٰ زمین پر پھینکتے تھے تو وہ اژدھا بن جاتا تھا۔ اور اپنے گندم گون ہاتھ کو جب گریبان میں سے جاکر باہر نکالتے تھے تو وہ آفتاب کی طرح چمکتا تھا۔ یہ ید بیضا کا معجزہ تھا۔

سامری: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا جادوگر تھا جس نے سونے کا بچھڑا بنا کر اپنی شعبدہ بازی سے اس میں تکلم پیدا کر دیا تھا۔ اور بنی اسرائیل سے اس بچھڑے کی پرستش شروع کرا دی تھی۔

ترجمہ :- وہ تمام شعبدے جو عقل اس جگہ کرتی تھی۔ سامری بھی عصا اور ید بیضا کے سامنے کرتا تھا۔

تشریح :- فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ید بیضا اور عصا کے معجزات اللہ کی طرف سے ودیعت ہوئے تھے۔ وہ جب اپنے ہاتھ کو گریبان میں سے جاکر باہر نکالتے تھے تو ان کی ہتھیلی آفتاب کی مانند چمکتی تھی۔ ان کے اس شعبدے سے فرعون اور اس کے جادوگر حیران رہ گئے۔ اور اس طرح جب فرعون کے جادوگروں نے اپنا شعبدہ دکھانے کے لئے زمین پر رسیاں پھینکیں تو وہ سانپ بن کر چلنے لگیں،

لیکن جونہی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا زمین پر پھینکا تو وہ اژدہا بن کران تمام سانپوں کو نگل گیا۔ اس طرح سے باطل کے تمام شعبدے حق کے عطا کردہ معجزوں کے سامنے بالکل بے حقیقت ہو گئے۔ خواجہ صاحب یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ عشق کی پشت و پناہ اللہ کی ذات ہے۔ اس لیئے عاشق کو ہمیشہ باطل کے مقابلے میں فتح ہوتی ہے۔ اس کے برعکس فلسفہ و حکمت کی پشت و پناہ عقل ہوتی ہے۔ جو عشق کے ہر میدان میں مات کھاتی ہے۔

۸۔ ترجمہ: اس نے کہا کہ وہ یار جس نے دار کا سر بلند کر دیا تھا۔ اس کا جرم صرف یہ تھا۔ کہ وہ معرفت الٰہی کے اسرار ظاہر کرتا تھا۔

تشریح:۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ منصور حلاج نے رازِ معرفتِ الٰہی کو افشا کیا اور اناالحق کا نعرہ لگا کر گویا جرم کیا تھا جس کی پاداش میں اسے دار پر چڑھا دیا گیا۔ معرفت الٰہی کے راز کا علی الاعلان ظاہر کرنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔ ؎

دی گئی منصور کو سولی ادب کے ترک پر
تھا اناالحق حق مگر اک حرفِ گستاخانہ تھا

۹۔ روح القدس: حضرت جبرائیل علیہ السلام

مسیحا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب۔ آپ کو مردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ حاصل تھا۔

ترجمہ:۔ اگر روح القدس کا فیض پھر مدد فرمائے تو جو کرامات حضرت مسیحا دکھایا کرتے تھے۔ دوسرے لوگ بھی دکھا سکتے ہیں۔

تشریح:۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں۔ کہ اگر تائید غیبی اور فضلِ خدا شاملِ حال ہو تو ہر آدمی ایسے کام کر سکتا ہے۔ جو حضرت عیسیٰ ؑ کیا کرتے تھے یعنی مُردوں کو زندہ کرنا۔

اس شعر میں خواجہ صاحب نے ایک نہایت حوصلہ بخش اور امید افزاء اصول کی تلقین کی ہے۔ حقیقت میں انسان کو عظیم کارنامے انجام دینے سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔

گر حجاب از جانہا برخاستی
گفت: جانی مسیح آساستی

۱۰۔ بتان: بت کی جمع معشوق۔ سلسلہ: زنجیر، شیدا، دیوانہ۔

ترجمہ:- میں نے اس (پیر مغاں) سے پوچھا کہ معشوقوں کی زلف کا سلسلہ (زنجیر) کس لئے ہے تو اس نے جواب دیا کہ حافظ اپنے دیوانے دل کا گلہ کر رہا تھا۔

تشریح:- زلفِ معشوق کو طوالت میں زنجیر سے تشبیہ دیتے ہیں۔

خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ جب میں نے پیر مغاں سے پوچھا کہ زلفِ معشوق کا سلسلہ (زنجیر) کیا چیز ہے۔ اور یہ زنجیر کس کام آتی ہے۔ اس پہ پیر مغاں نے جواب دیا کہ چونکہ حافظ اپنے دیوانے دل کی شکایت کر رہا ہے۔ اس لئے اسے سزا دینے کے لئے زلف کی زنجیر میں جکڑ دیا ہے۔ یا یہ زلفیں اس لئے ہیں کہ عاشق کا دلِ دیوانہ ان میں پھنس جائے۔

صفحہ ۱۴۳ تا ۱۴۳

غزل نمبر ۷

۱- مژدہ : خوشخبری ۔

ترجمہ : خوشخبری پہنچی ہے کہ غم کے دن نہیں رہیں گے ۔ وہ اچھے دن (یا اچھی حالت) نہیں رہی، تو یہ بُرے دن (یا بُری حالت بھی نہیں رہے گی ۔

تشریح :- فرماتے ہیں، خوشی اور غم دونوں گزر جانے والے ہیں۔ یہ دونوں حالتیں ہمیشہ نہیں رہتیں۔ اس لئے مصیبت اور غم کی حالت میں بھی انسان کو خوشی کے دن آنے کی امید رکھنی چاہیئے۔ اور اسے سمجھنا چاہیئے کہ یہ غم کی حالت چند روزہ ہے ۔ جلد ہی یہ مصیبت کے دن ختم ہو جائیں گے ۔ اور خوشی کے دن لوٹ آئیں گے ۔ خود ارشاد خداوندی ہے ۔

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ط

(ہر آئینہ مشکل کے متصل آسانی ہے۔ البتہ مشکل کے متصل آسانی ہے)

بہار رفت و خزاں ہم بجا نخواہد ماند
چنانکہ در کف خوباں حنا نخواہد ماند

۲- ترجمہ :- میں اگر معشوق کی نظر میں خاکسار (یعنی ذلیل و خوار) ہو گیا ہوں رقیب بھی ہمیشہ محترم نہیں رہے گا ۔

تشریح :- آج میں معشوق کی نظر میں ذلیل ہوں اور رقیب محترم ہے ۔ تو یہ حالت بھی ہمیشہ ایسی ہی نہیں رہے گی۔ کبھی رقیب بھی میری طرح معشوق کی نظر میں ذلیل و خوار ہو گا ۔ اور میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاؤں گا ۔

یہ میں نے مانا کہ آج خنجر، مرا گلو بھی نہیں رہے گا
مگر میں قاتل کے او ستمگر، ہمیشہ تو بھی نہیں رہے گا

۳- حریم :- چار دیواری   حرم :- کعبہ، پردہ سرا، گھر ۔

پردہ دار : نگہبان۔

ترجمہ :- جب حرم کا پردہ دار (محافظ، پاسبان) تلوار سے سب کو مارتا ہے۔
تو کوئی شخص بھی حرم کی چار دیواری میں مقیم نہیں رہے گا۔

تشریح :- اس شعر میں دربان کی سخت گیری کی شکایت کی گئی ہے کہ وہ کسی کو بزمِ محبوب میں جانے نہیں دیتا۔ اور حریمِ راز تک بھی فی الحقیقت وہی شخص پہنچ سکتا ہے جو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ (یہ شعر مذہب کے موجودہ پہرہ داروں پر بھی صادق آتا ہے)

حباب آسا محیطِ عشق سے جو پار اترتے ہیں
گزر جاتے ہیں پہلے سر سے پیچھے پاؤں رکھتے ہیں

۴۔ صحیفہ : کتاب۔ رقم۔ تحریر۔

ترجمہ :- نیک و بد نقش کی طرف سے شکر و شکایت کا کونسا موقع ہے جب کہ ہستی کی کتاب پر کوئی تحریر باقی نہیں رہے گی۔

تشریح :- فرماتے ہیں کہ بھلائی پر خوشی کا اظہار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ برائی پر شکایت کا موقع نہیں۔ کیونکہ یہ دونوں حالتیں ہمیشہ قائم نہیں رہیں گی۔ نہ کوئی شخص ہمیشہ شادمان رہے گا۔ اور نہ کوئی شخص ہمیشہ گرفتارِ غم رہے گا۔

زرنج و راحتِ گیتی مرنجاں دل مشو خنداں
کہ آئینِ جہاں گاہی چنیں گاہی چناں باشد

۵۔ جمشید : ایران کے ایک مشہور و معروف بادشاہ کا نام۔ جس کا جامِ جم مشہور ہے۔ سرود : گیت، راگ۔

ترجمہ :- کہتے ہیں کہ جمشید بادشاہ کی مجلس میں یہ گیت گایا جاتا تھا کہ شراب کا پیالہ لاؤ کہ جمشید نہیں رہے گا۔ یعنی جمشید کی زندگی مختصر ہے۔

تشریح :- فرماتے ہیں کہ انسان کی زندگی چند روزہ ہے۔ امیر ہو یا غریب ۔ شاہ ہو یا فقیر کوئی بھی موت کے ظالم ہاتھوں سے نہیں بچ سکتا۔ اس لئے اس مختصر سی زندگی میں ضروری ہے کہ انسان اپنی زندگی عیش و نشاط میں بسر کرے ۔ اور شراب پی کر اپنی غم آلود زندگی کے لمحات کو پُر مسرت بنانے کی کوشش کرے ۔ عمر خیام نے یہی مفہوم اس طرح ادا کیا ہے ۔

آمد سحری ندا ز میخانۂ ما   کہ ای رند خراباتی دیوانۂ ما
برخیز کہ پر کنیم پیمانہ زمی   زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

ترجمہ :- اے شمع پروانہ کے وصل کو غنیمت جان کیونکہ سلسلہ صبح تک نہیں رہے گا ۔

تشریح :- پروانہ عاشق ہے اور شمع معشوق۔ شمع کا حُسن صرف ایک رات کا ہی مہمان ہے۔ صبح تک وہ جل جل اور پگھل پگھل کر اپنا وجود کھو بیٹھتی ہے۔ اس لئے شمع کو پروانے کا جو وصال نصیب ہو چکا ہے ۔ اسے غنیمت سمجھنا چاہیئے ۔

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

خواجہ صاحب معشوق سے فرماتے ہیں کہ شمع کی طرح ہماری زندگی بھی فانی ہے ۔ یہ حسن و جوانی ہمیشہ نہیں رہے گی ۔ اس لئے اگر عاشق کی قربت نصیب ہو تو اسے غنیمت سمجھنا چاہیئے ۔

۷- توانگر : امیر آدمی   توانگرا : میں الف ندائیہ ہے ۔ اے توانگر

ترجمہ :- اے امیر آدمی اپنے درویش کے دل کو اپنے ہاتھ میں لے یعنی دلجوئی کر کیونکہ سونے کا مخزن اور دولت کا خزانہ ہمیشہ نہیں رہے گا ۔

تشریح :- فرماتے ہیں مال و دولت یا دولتِ حسن و جمال زوال پذیر چیزیں

ہیں۔ ان پر فخر و ناز کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس شعر میں اگر مخزن زر و گنج درم سے مال و دولت مراد لی جائے تو خواجہ صاحب امیروں کو یہ تلقین کرتے ہیں۔ کہ یہ دولت چند روزہ ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اس سے محتاجوں کی امداد کی جائے۔ اگر مخزن زر و گنج درم سے مراد دولتِ حسن و جمال لی جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ حسن و جمال زوال پذیر چیز ہے۔ اس لئے وہ معشوق کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ اس فانی حسن و جمال پر نازاں ہونے کی بجائے اپنے عاشقوں کی دل جوئی کرے۔

۸۔ رواق: چھت پردہ — زبرجد: ایک سبز رنگ زمرد مائل جواہر زمرد کی ایک قسم۔

رواقِ زبرجد: نیلی چھت۔ مراد نیلا آسمان۔

ترجمہ:۔ اس نیلے آسمان کی چھت پر آبِ زر سے یہ لکھا گیا ہے کہ اہلِ کرم کی نیکی کے سوا کوئی چیز بھی دنیا میں باقی نہیں رہے گی۔

تشریح:۔ اس شعر میں بھی دولت مندوں یا معشوقوں کو تلقین کی گئی ہے خواجہ حافظ فرماتے ہیں کہ دنیا کی سب چیزیں فانی ہیں۔ ہر انسان ایک نہ ایک دن فنا ہو جائے گا۔ لیکن جن لوگوں نے دوسروں کے ساتھ بھلائی کی ہے صرف ان کا نیک نام دنیا میں باقی رہ جائیگا۔

نام مطلوب ہے توفیق کے اسباب بنا
پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

اسی لئے دولت مندوں کو محتاجوں پر کرم کرنا چاہیئے۔ تاکہ خدا ان سے آسمان پر خوش ہو۔ اسی طرح معشوقوں کو اپنے حسن و جمال پر نازاں ہونے کی بجائے اپنے عاشقوں پر کرم کرنا چاہیئے۔ چونکہ دنیا میں اہلِ کرم کے نیک نام کے سوا ہر چیز مٹ جائے گی۔

۹ ۔ طمع بریدن: لالچ چھوڑنا۔ اُمید منقطع نہ کن: یعنی نا امید نہ ہو۔ جاناں:

ترجمہ: اے حافظ! معشوق کی مہربانی سے اُمید منقطع نہ کر (یعنی نا امید نہ ہو) کیونکہ ظلم کا نقش اور ستم کا نشان ہمیشہ باقی نہیں رہے گا۔

تشریح:۔ معشوق کا جور و ستم ہمیشہ نہیں رہ سکتا۔ چونکہ دنیا میں کوئی چیز بھی ہمیشہ ایک حالت میں نہیں رہتی۔ کسی نہ کسی دن معشوق کا ظلم و ستم بھی لطف و کرم میں بدل جائے گا۔ اس لئے اے حافظ! مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کبھی نہ کبھی وہ معشوق جفا جو ضرور مائل بہ کرم ہوگا۔

صفحہ ۱۴۳ تا ۱۴۴

غزل نمبر ۸

۱۔ دوش: کل رات، غصہ، رنج وغم۔ ظلمت: تاریکی۔ سیاہی۔ مشہور ہے
نجاتم دادند: مجھے نجات دیدی۔ کہ آبِ حیات ظلمات میں ہے۔

ترجمہ:۔ کل رات صبح کے وقت مجھے رنج وغم سے نجات دیدی۔ اور رات کی اس تاریکی میں مجھے آبِ حیات بخش دیا۔

تشریح:۔ خواجہ حافظ کی یہ ایک مسلسل غزل ہے۔ جب آپ کو شروع شروع میں شعر و شاعری کا شوق ہوا تو طبیعت کی ناموزونی، ناکامی کا باعث ہوئی۔ بے تکے شعر کہتے۔ اور لوگوں کو تفریح کا سامان ہاتھ آجاتا، لوگ آپ کی نغو گوئی کا مذاق اڑاتے۔ جب استہزاء حد سے بڑھ گیا تو آپ کو بھی اپنی خامیوں کا احساس ہونے لگا۔ ایک دن نہایت رنجیدہ ہوئے اور بابا کوہی کے مزار پہ جاکر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ان کو لقمہ کھلاتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ جا! اب تجھ پر تمام علوم کے دروازے کھل گئے ہیں۔ نام دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ خواجہ خضر علیہ السلام ہیں۔ صبح کو اٹھے تو یہ غزل لکھی۔ شہر میں آئے تو لوگوں نے حسبِ معمول فرمائش کی۔ انہوں نے یہی غزل پڑھی۔ سب کو حیرت ہوئی کہ یہ غزل کسی سے لکھوائی ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے ایک مصرع طرح تجویز کیا۔ حافظ نے اس پر بھی ایک عمدہ غزل لکھ دی۔ پھر کیا تھا گھر گھر میں آپ کے کمال کا چرچا پھیل گیا۔
اس شعر میں حافظ اس مبارک رات کی کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔ جب کہ انہوں نے انوارِ الٰہی کا دیدار کیا۔ اس شعر میں غصہ یعنی رنج و غم سے اشارہ ہے۔ شاعر کے اس درد بھرے احساس کی طرف جو اسے اپنی سابقہ ناکامیوں کے سبب پیدا ہوا تھا۔ حضرت خضرؑ کی مناسبت سے انوارِ الٰہی

کے دیدار کو آبِ حیات کہا ہے۔

حافظ فرماتے ہیں کہ میں نے زندگی میں ایک طویل مدت ریاضت و مجاہدہ میں بسر کی۔ لیکن مجھے معرفتِ حق حاصل نہ ہو سکی۔ اور میں اس ناکامی کے احساس سے رنج و غم میں مبتلا رہا۔ لیکن کل کی رات وہ مبارک رات تھی کہ جب میری دیرینہ آرزو بر آئی۔ اور مجھے معرفتِ الٰہی کا آبِ حیات نصیب ہوا۔ انوارِ الٰہی کے دیدار سے فیضیاب ہوتے ہی میری تمام تکالیف ختم ہو گئیں۔

۲۔ شعشعہ: روشنی، چمک، آب و تاب۔ ذات سے مراد ہے ذاتِ الٰہی۔
پرتوِ ذات: سے مراد نورِ ربانی
تجلی: روشنی۔ اظہار۔ نمود۔ چمک۔

صفات: خدا کی صفتیں۔ خدا کے مختلف نام ان ہی صفات کی وجہ سے رکھے گئے ہیں۔ مثلاً (قادر۔ رحمٰن۔ رحیم) غفور و غیرہ وغیرہ۔ اس لئے خداوندِ کریم کو اس کائنات کے ذرے ذرے پر قدرت حاصل ہے۔ وہ اپنے ہر ایک بندے پر رحم کرتا ہے اور ان کی خطاؤں کو بخشنے والا ہے۔ ذات اور صفات میں تضاد ہے۔ ذات جوہر ہے اور صفات لباسِ عارضی ذات خدا کا وجود اور صفات خدا کی محتاج ہیں۔ کیونکہ اس کی ذات کے سبب ہی یہ صفات معرضِ وجود میں آئیں۔

ترجمہ:۔ مجھے ذاتِ الٰہی کے عکس کی جھلک سے بے خود بنا دیا گیا۔ اور خدا کی صفات کی روشنی کے پیالے سے شراب عطا کی گئی۔

تشریح: - خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ جس طرح نورِ خدا کے پرتو کی ایک جھلک نے حضرت موسیٰ کو کوہ طور پر بیخود کر دیا تھا۔ بعینہٖ اسی طرح سے جلوۂ حق کی ایک جھلک دیکھتے ہی مجھ پر بھی بے خودی کا عالم طاری ہو گیا۔ اور میں اپنی ذات تک کو فراموش کر بیٹھا۔

یعنی بحسب گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیئے

اور جب انسان پرتو ذات الٰہی سے بے خود ہو جاتا ہے تو اس پر تمام حقیقت کے راز کھل جاتے ہیں۔ خدا کی عنایت سے حافظ کو بھی اس بلند مقام سے نوازا گیا۔ ؎

کچھ نہیں اور یہاں جلوۂ وحدت کے سوا
کیا نظر آئے نگاہوں کو حقیقت کے سوا

اللہ تعالیٰ کی صفات کے جلوؤں نے حافظ کی نگاہوں کو خیرہ کر کے اسے مخمور و سرشار بنا دیا۔

۳۔ **شب قدر:** - طاقت۔ عزت اور بزرگی کی رات۔ جو ہر ماہ رمضان کی ستائیسویں تاریخ کو آتی ہے۔ اسے سب سے زیادہ متبرک رات خیال کیا جاتا ہے۔ اور اس ایک رات کی بندگی و عبادت ہزار وں راتوں کی اطاعت و دعا سے کہیں زیادہ وقعت رکھتی ہے۔ اسی رات کو تمام حیوانات اور نباتات تک خدا کے حضور میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ اچھی طرح سے نیت باندھ کر سر جھکاتے ہیں۔

برات: روزی، قسمت۔ حصہ۔ وہ کاغذ جس کو دکھا کر شاہی خزانہ سے رقم وصول کرتے ہیں۔

پروانہ: - یہاں مراد دربارِ الٰہی کا پروانہ ہے۔

فرخندہ: مبارک۔ بابرکت۔

ترجمہ :- وہ کیسی مبارک صبح تھی۔ اور کیسی بابرکت رات تھی۔ وہ شب قدر تھی، جبکہ مجھے یہ تازہ برات (پروانہ) دیا گیا۔

تشریح :- فرماتے ہیں وہ رات جبکہ انوار الٰہی کی جھلک دیکھنی نصیب ہوئی میرے لئے شب قدر کی مانند تھی۔ جس طرح شب قدر ایک متبرک اور بابرکت رات خیال کی جاتی ہے۔ اس طرح وہ رات میرے لئے برکتوں کے نزول کی رات تھی۔

۴ - روی : چہرہ۔

ترجمہ : اس کے بعد میرا چہرہ ہوگا اور معشوق کے وصف جمال کا آئینہ۔ چونکہ وہاں مجھے ذات حق کے جلوے کی خبر دی گئی۔

تشریح :- جب شاعر کو ایک مرتبہ حسن ربانی کی ایک جھلک نصیب ہوگئی ہے ضروری ہے کہ وہ اس جھلک کی بے خودی میں ہمیشہ کے لئے محو رہے۔ خدا کا نور اس کی آنکھوں میں اس طرح بس گیا ہے اور اس نور کا پرتو اس کے دل میں کچھ اس انداز سے بیٹھ گیا ہے کہ یہ نقوش کسی صورت میں مٹنے والے نہیں۔ گویا یار کی تصویر شاعر کے دل میں اتر گئی ہے اور جب بھی چاہے گا سر کو جھکا کر دیدارِ دوست حاصل کرے گا۔ شاعر کی ذات انوار الٰہی کے پرتو میں مکمل طور پر کھو گئی ہے۔ اور وہ اسی پرتو کے آئینہ میں اپنی حقیقت کا نظارہ کر سکتا ہے۔ اور چونکہ یہ پرتو محو ہونے والا پرتو نہیں۔ اس لئے شاعر کو تمام عمر جمالِ یار میسر ہوتا رہے گا۔ اور وہ اس دیدار سے بے خود ہوتا رہے گا۔

جسے وہ ساقی مستانہ گر تلقین فرمادے
قیامت تک اسے پھر ہوش میں آنا نہیں آتا

یہ کوئی طور کا جلوہ نہیں کہ حضرت موسیٰؑ کی تمناؤں کی خامی کے

سبب جلدی میں محو ہو جائے ؂

چھپی برق تجلی کوند کر موسیٰ نے کیا شکوہ
تماشا تھا بہ انداز تمنّا رہ گیا ہو کر

۵۔ کام روا: جس کا مقصد حل ہو جائے جس کی مراد بر آئی ہو۔

ابنہا: یہ سب کچھ، مراد یہ کامیابی، تمنّا اور یہ تمنا کیا تھی؟

بز کاتم دادند: انہوں نے مجھے زکوٰۃ کے طور پر دے دیا۔

دیدار الٰہی: کا حصول اور شعر و شاعری میں ترقی۔

زکوٰۃ: خیرات۔ مراد بخشش عنایت تحفہ۔

ترجمہ:۔ میں اگر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں اور میرا دل خوش ہے تو اس میں بھلا تعجب کی کونسی بات ہے۔ میں دراصل اس کا مستحق تھا۔ اور یہ چیزیں مجھے زکوٰۃ میں مل گئیں۔

تشریح:۔ حافظ فرماتے ہیں کہ دیدار تجلی کے اکتساب کی خاطر میں نے بہت سی تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مدتوں مارا مارا پھرتا رہا۔ تب کہیں جاکر اس کی امید بر آئی ہے۔ انوارِ الٰہی کا پرتو دیکھنے میں کامیاب ہوا ؂

طور پر چڑھنے کا کیا دے گا یدِ بیضا ثبوت
حضرت موسیٰ دکھائیں پاؤں کا چھالا مجھے

حافظ نے تو اس کی تلاش میں بہت دشت نوردی کی تھی۔ اس لئے مناسب تھا کہ خدا اس کی حالت پر رحم فرماتا۔ اس غزل کو لکھنے سے پہلے حافظ نے جو اشعار لکھے۔ خواہ وہ ناقص ہی کیوں نہ تھے۔ لیکن اپنی نظر میں تو اچھے تھے۔ اور ان پر اسے محنت بھی بہت سخت کرنی

پڑتی تھی۔ آج اسے ان قربانیوں کا اجر مل گیا ہے ؎

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
جب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

۶۔ ہاتف: غیبی فرشتہ — دولت: خوش قسمتی۔ مراد ہے وصالِ یار یا جمالِ الٰہی کا دیدار

مژدہ: خوشخبری

ثبات: ثابت قدمی۔

ترجمہ:۔ غیب کے فرشتہ نے اس نیک بختی کی خوشخبری اس وقت سنائی جبکہ (ان مصیبتوں کے جھیلنے کے لئے) مجھے صبر اور ثابت قدمی عطا کی گئی۔

تشریح:۔ اس شعر میں جور و ستم سے مراد وہ مشکلات ہیں جو حافظ کو لوگوں کے ہاتھوں اٹھانا پڑیں۔ کون تھا جو اس کا مذاق نہ اڑاتا تا۔ استہزا دنے ایک بہت ناگوار اور تلخ حقیقت اختیار کرلی تھی۔ فرماتے ہیں خدا نے ان مصیبتوں کو برداشت کرنے کے لئے جو صبر اور ثابت قدمی عنایت فرمائی تھی۔ اس کی بدولت اس مصیبت سے میری جان چھوٹ گئی اور میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ یعنی میری شاعری حسن معانی سے مالامال ہوگئی یا مجھے ذات حق کا جلوہ نصیب ہوگیا۔ میری ثابت قدمی کا اس سے بہتر صلہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

۷۔ نبات: ہریالی۔ سبزہ۔ مصری۔

شاخِ نبات: حافظ کی محبوبہ کا نام شاخِ نبات بتایا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں شاخِ نبات سے مراد شاعر کا اپنا قلم ہے۔

ترجمہ: یہ سب شہد اور کھانڈ جو میرے کلام (اشعار) سے ٹپک رہے ہیں۔ یہ اس صبر کا اجر ہے جو مجھے اس شاخِ نبات (مصری کی ڈلی) سے دیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں شاخِ نبات سے مراد شاعر کا قلم ہے۔ جس سے

حقائق و معارف کے نفیس خیالات میٹھے الفاظ میں خوشنوائی کے ساتھ وجود میں آتے ہیں۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے یہ شیوہ بیانی کا جو عطیہ نصیب ہوا ہے وہ اس صبر کا اجر ہے جو انہوں نے عوام کے آوازے برداشت کرنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ صرف آوازے ہی نہیں بلکہ خیالات کی پرواز بھی تو صبر آزما بلکہ صبر شکن ہوتی ہے بقول شاعر عرفی ؎

بال اندیشہ ز پرواز شکستم صد بار
تا بری ظن کہ بہ عرش سخن آساں رفتم

۸۔ **انفاس**: نفیس کی جمع۔ پھونکیں۔ **ہمت**: وفا۔ طاقت۔ سانسیں۔ **بند**: قید۔
سحر خیز: صبح سویرے اٹھ کر اللہ کی عبادت کرنے والا۔

ترجمہ: یہ حافظ کی دعا اور صبح سویرے اٹھ کر عبادت کرنیوالوں کی آہوں کا اثر ہے کہ مجھے زمانہ نے رنج و غم کی قید سے نجات دے دی۔

تشریح:۔ حافظ کو اگر خدا نے شعر و شاعری کا تاجدار بنایا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بزرگوں کی دعاؤں کے ساتھ ساتھ اس نے خود بھی بہت ریاضت کی ہے اور آہِ نیم شبی اور دعائے صبح گاہی میں مشغول رہا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

صفحہ ۱۴۴ تا ۱۴۵

غزل نمبر ۹

۱- کنعان: شہر کا نام۔ کلبہ: گھر۔
کلبہ احزان: غموں کا مقام۔ یوسف: حضرت یوسف علیہ السلام
ماتم کدہ۔ ماتمی گھر۔ : جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے
فرزند اور اللہ کے نبی تھے۔

ترجمہ:- گم شدہ یوسف پھر کنعان میں واپس آئے گا۔ غم نہ کھا۔ غموں کا مقام ایک دوزخ بن جائے گا۔ تو غم نہ کر۔

تشریح:- فرماتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے حاسد بھائیوں نے کنوئیں میں ڈال دیا تھا اور خود حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے ان کے خون آلود کپڑے لے جا کر یہ ظاہر کیا تھا۔ کہ انھیں بھیڑیا کھا گیا ہے۔ بیٹے کی جدائی میں رونے روتے باپ کی آنکھیں بینائی سے محروم ہو گئی تھیں۔ لیکن انھیں پھر بھی یہ امید تھی کہ یوسفؑ زندہ ہیں اور کبھی نہ کبھی وہ ضرور کنعان واپس آئیں گے۔ اور انکی آمد سے یہ ماتمی گھر پھر رشکِ چمن بن جائے گا۔ خواجہ صاحب مایوس اور ناامید انسانوں کو تسلی دیتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ ان کی امید ضرور بر آئے گی۔ انھیں ناامید نہیں ہونا چاہیے۔

۲- غم دیدہ: غم زدہ۔ سر شوریدہ: پریشان اور دیوانہ دماغ
دل بد مکن: بد دل نہ ہو۔

ترجمہ:- تیرے غمزدہ دل کی حالت اچھی ہو جائے گی۔ بد دل نہ ہو۔ اور یہ پریشان اور دیوانہ دماغ پھر باسر و سامان ہو جائے گا۔ غم نہ کھا۔

تشریح:- خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ ایک ہی حالت میں نہیں رہتی۔ کبھی دکھ ہے کبھی سکھ۔

کبھی دکھ ہے کبھی سکھ ہے ابھی کیا تھا ابھی کیا ہے
یونہی دنیا بدلتی ہے اسی کا نام دنیا ہے

جب خوشی کا زمانہ ہمیشہ نہیں رہا تو غم کا زمانہ بھی ہمیشہ نہیں رہے گا۔ اس لئے غم اور پریشانی میں بھی انسان کو ناامید ہونے کی بجائے حوصلہ اور ہمت سے کام لینا چاہیئے۔ اور اللہ تعالیٰ سے اچھائی اور خوشحالی کی امید رکھنی چاہیئے۔

۳- مرغِ خوشخوان: خوش آواز یا خوش الحان پرندہ۔ مراد بلبل۔ چتر: چھتر در سر کشی: سر پر رکھے گا۔

ترجمہ:- اگر عمر کی بہار باقی رہی، تو اے خوش آواز پرندے یعنی بلبل تو ہر گوشۂ چمن میں پھولوں کے چھتر یا تاج سر پر رکھے گا۔ غم نہ کھا۔

تشریح:- خواجہ صاحب بلبل کو تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ اے بلبل! اگر تو زندہ باقی رہی تو بہار پھر آئے گی پھول کھلیں گے اور تجھے وصلِ گل نصیب ہوگا۔ تو ناامید ہو کر آہ و زاری نہ کر۔ اور بہار کے جانے کا غم نہ کھا۔

۴- دور: گردش گردوں: آسمان
دائماً: ہمیشہ دوراں: زمانہ

ترجمہ: آسمان کی گردش اگر ایک دو روز ہماری مراد کے مطابق نہیں ہے (تو کیا ہوا) تو غم نہ کھا۔ زمانہ ہمیشہ ایک طرح نہیں رہتا۔

تشریح:- خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ زمانہ کی گردش ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی۔ کبھی دکھ ہوتا ہے تو کبھی سکھ۔ اگر کچھ روز زمانے کی گردش تیری مرادوں کے خلاف ہے۔ اور تجھے خوشیوں کی بجائے غم نصیب ہو رہے ہیں تو تو غمگین نہ ہو۔ زمانہ کبھی ایک حالت میں نہیں رہتا۔ کبھی تو بہتر ایام آئیں گے ؎

زرنج و راحتِ گیتی مرنجاں دل مشو خنداں
کہ آئینِ جہاں گاہی چنیں گاہی چناں باشد

۵- ستر: بھید- راز ہاں: خبردار- ہرگز-
پوشیدہ بازی: پوشیدہ کھیل

ترجمہ :- تو جب غیب کے راز سے واقف نہیں ہے تو ہرگز نا امید نہ ہو- کیونکہ اس پردے کے اندر پوشیدہ بازیاں یا کھیل ہوں گے- غم نہ کھا-

تشریح :- خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ اے انسان! جب تو غیب کے رازوں سے واقف نہیں ہے تو ظاہری تکالیف کو دیکھ کر غمگین کیوں ہوتا ہے- کیونکہ پردہ غیب میں بعض کام ایسے ہو رہے ہیں- جو تیری مراد کے مطابق ہوں گے- لیکن تو ان سے واقف نہیں ہے- تیری یہ تکلیفیں آنے والی کسی خوشحالی کا پیش خیمہ ہوں گی- لیکن تو خدا کی مصلحتوں سے کب واقف ہے؟

۶- سیل: سیلاب بنیاد برکند: بنیاد اکھاڑ دے
ترجمہ :- اے دل اگر فنا کا سیلاب تیری زندگی کی بنیاد کو اکھاڑ دے جب نوح تیرا کشتی بان ہے تو طوفان کا غم نہ کر-

تشریح :- خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ جب نوح مددگار ہوں تو پھر طوفان کا خوف کیسا- اسی طرح جب خداوند تعالیٰ تمہارا والی اور مددگار ہے تو تمہیں غیبی حوادث سے بے فکر رہنا چاہیئے- اور چند روزہ عارضی تکالیف سے بد دل نہیں ہونا چاہیئے- جیسا کہ سعدی فرماتے ہیں ؎

چہ غم دیوارِ امت را چو باشد چوں تو کشتی بان
چہ باک از موجِ بحر آں کہ باشد نوح کشتی بان

۷- مغیلاں: ببول یا کیکر کا درخت-

ترجمہ :- اگر کعبہ کے شوق میں تو بیابان میں قدم رکھنا چاہتا ہے۔ تو اگر ببول کے کانٹے بھی سرزنش کریں تو غم نہ کھا۔

تشریح :- فرماتے ہیں کہ اے انسان اگر تجھے حج کا شوق ہے تو تجھے راستے کی تکالیف کا سامنا خندہ پیشانی اور بلند حوصلگی سے کرنا چاہیئے۔ دنیا میں کوئی کام بھی بغیر سعی و کوشش اور تکلیف کے نہیں ہو سکتا۔ سفرِ حجاج میں کانٹوں سے ڈرنا اور موتیوں کی تلاش میں موجوں سے خطرہ محسوس کرنا بزدلوں کا کام ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے کلام میں جابجا اس امر کی تلقین کی ہے کہ انسان کی جدوجہد کے بغیر نہ تو دین کے مقاصد حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی دنیا کے۔

۸۔ ترجمہ :- اگر منزل بہت خطرناک ہے اور مقصد (منزل مقصود) دور ہے۔ کوئی ایسا راستہ نہیں جس کا انجام نہ ہو۔ تو غم نہ کھا۔

تشریح :- اگرچہ منزل خطرناک ہے۔ راستہ دشوار ہے۔ چپہ چپہ پر جان کا خوف ہے اور منزلِ مقصود کا بھی کچھ پتہ نہیں۔ کہ کہاں اور کتنی دور ہے تاہم تجھے ہمت نہیں ہارنی چاہیئے۔ مردوں کی طرح رستہ طے کرتا جا اور تمام مصیبتوں کو برداشت کرتا جا۔ آخر تو منزلِ مقصود پہ پہنچ جائے گا۔

۹۔ ترجمہ :- اے حافظ! فقر کے گوشے میں اور سیاہ راتوں کی خلوت میں جب تک دعا اور قرآن کا درس تیرا ورد ہو گا۔ تجھے کچھ ڈر نہیں۔

تشریح :- خواجہ صاحب کی سوانح حیات پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی تمام زندگی درس قرآن میں گزری۔ آپ پرلے درجے کے شب بیدار سحر خیز عابد تھے۔ فرماتے ہیں کہ اے حافظ! جب تک دعا اور درس قرآن تیرا ورد ہے تجھے کوئی خطرہ نہیں۔ اس کے سبب تجھے سعادت دارین حاصل ہو گی۔ اس شعر میں ہر مسلمان کو یہ نصیحت کی گئی ہے کہ ان کی دینی دنیوی بہبودی قرآن کریم سے وابستہ ہے۔

غزل نمبر ۱

۱- ہاتف غیب: غیبی فرشتہ   مژدہ: خوشخبری۔
دلیر بنوش: دلیری کے ساتھ پی۔

ترجمہ:- صبح کے وقت غیبی فرشتے نے یہ خوشخبری میرے کان میں سنائی کہ شاہ شجاع کا زمانہ ہے۔ دلیری کے ساتھ شراب پی۔

تشریح:- مبارز الدین محمد نے شاہ ابواسحٰق انجو کو شکست دینے کے بعد شیراز پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ ایک سخت گیر اور پابندِ شریعت بادشاہ تھا۔ اس نے قابض ہوتے ہی شیراز میں تمام شراب خانے بند کرا دیئے۔ اور ہر جگہ محتسب مقرر کر دیئے۔ وہ اپنی اس سخت گیری کے سبب زندہ دلان شیراز میں محتسب کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ جب اس کی سخت گیری کے سبب لوگ اس کے دشمن ہو گئے۔ تو اس کے بیٹے شاہ شجاع نے اسے گرفتار کر لیا۔ اور اندھا کر کے قید میں ڈال دیا۔ شاہ شجاع نے ان تمام پابندیوں کو ہٹا دیا۔ جو اس کے باپ کے عہد میں لگائی گئی تھیں۔ شراب خانے کھل گئے۔ اور لوگوں کو پھر پہلی سی آزادی میسر آئی۔ حافظ نے جب یہ خوشخبری سنی تو یہ غزل لکھ کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ فرماتے ہیں کہ مجھے فرشتہ غیب نے یہ خوش خبری سنائی ہے کہ اب شاہ شجاع کا دور آ گیا ہے۔ اب شراب نوشی پر کسی قسم کی پابندی نہیں رہی۔ اس لئے تو اب دلیری کے ساتھ شراب پی۔

۲/۳- شد: رفت- گیا۔   کنارہ می جستند: علیحدگی اختیار کرتے تھے۔
چنگ: ایک ساز کا نام
بصورتِ چنگ: چنگ کی آواز کے ساتھ۔ مراد کھلم کھلا   نہفتن: چھپانا۔

ترجمہ :- وہ زمانہ گذر گیا۔ جبکہ اہلِ نظر علیحدگی اختیار کرتے تھے۔ منہ میں ہزاروں باتیں ہوتی تھیں۔ اور ہونٹ خاموش ہوتے تھے۔ اب چنگ کی آواز کے ساتھ یعنی کھلم کھلا ہم وہی باتیں کہتے ہیں۔ جن کے چھپانے سے سینے کی دیگ جوش کھاتی تھی۔

تشریح :- یہ دونوں شعر قطعہ بند ہیں۔ فرماتے ہیں۔ مبارزالدین محمد مظفر کے زمانے میں شراب نوشی پر سخت پابندی تھی۔ اور بادشاہ کے احکام کی خلاف ورزی کرنے کی کسی میں جرأت نہ تھی۔ اس لئے اہلِ نظر نے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ لیکن اب شاہ شجاع کا دورِ حکومت ہے اور لوگوں کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ لوگ اعلانیہ شراب پیتے ہیں اور جو جی میں آتی ہے بغیر کسی خوف کے زبان پر لاتے ہیں۔

۴- **فسق** : بدکاری۔ گنہگاری **مباہات** : فخر کرنا۔
دلالت : راہنمائی۔

ترجمہ :- اے دل میں تجھے نجات کے راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہوں۔ تو اپنی گنہگاری پر فخر نہ کر۔ اور زہد فروشی سے کام نہ لے۔

تشریح :- خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ انسان کو نیک اعمال کے ذریعے راہِ نجات حاصل کرنی چاہیئے۔ ان کی نظر میں ایسے لوگوں کا طرزِ عمل قابلِ مذمت ہے۔ جو اپنے زہد و تقویٰ کی نمائش کرتے ہیں۔ یا اپنے گناہوں پر غور کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ خدا کی رحمت صرف گنہگاروں کے لئے ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف کر دے گا۔ ایسے لوگ غلطی پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو نافرمانی اور ریاکاری سخت ناپسند ہے۔ اس لئے ہماری نجات اسی میں ہے کہ ہم زہد فروشی اور فسق و فجور سے دور رہ کر اپنی زندگی کو بسر کریں۔

۵۔ رائے انور: روشن رائے   صفائی نیت: نیت کی پاکیزگی۔

ترجمہ:۔ بادشاہ کی روشن رائے تجلّی کے نور کے مقام ہے۔ اگر تو اس کا قرب چاہتا ہے تو نیت کو صاف رکھنے کی کوشش کر۔

تشریح:۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں۔ شاہ شجاع کی مدح میں کہ وہ ایک ایسا روشن ضمیر بادشاہ ہے۔ جس کا دل انوار الٰہی کی تجلّی کا مقام ہے لہذا ایسے بادشاہ کی قربت حاصل کرنے کے لئے آئینہ دل کو صاف رکھنا ضروری ہے۔

۶۔ ثنا: تعریف   وردِ ضمیر: وردِ دل۔

محرم: رازدار

ترجمہ:۔ اس کے جلال کی تعریف کے سوا کوئی اور ورد دل کے لئے نہ بنا۔ کیونکہ اس کے دل کا کالا فرشتہ غیب کے پیام کا محرم ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں بھی شاہ شجاع کی تعریف فرماتے ہیں۔ کہ شاہ شجاع ایک روشن ضمیر اور صاحب جاہ و جلال بادشاہ ہے۔ اس کا دل اسرار الٰہی کا محرم ہے۔ اس کے کان فرشتہ غیبی کے پیغامات سنتے ہیں، ایسے باعظمت اور روشن ضمیر بادشاہ کی تعریف کرنا ہر انسان کا اخلاقی فرض ہے۔ اس لئے اے حافظ! تو بھی اپنی زبان پر اس عظیم بادشاہ کے سوا کسی کی تعریف نہ لا۔

۷۔ خسروان: خسرو کی جمع یعنی بادشاہ   مخروش: شور نہ کر۔

ترجمہ:۔ بادشاہ اپنی مملکت کے راز خود جانتے ہیں۔ اے حافظ! تو تو ایک گوشہ نشین گدا گر (درویش) ہے۔ تو شور نہ کر۔

تشریح:۔ مطلب یہ ہے کہ بادشاہ اپنے ملک اور سلطنت کی بہبودی کا راز خود جانتے ہیں۔ اور ان کو تم سے زیادہ اپنے ملک اور

رعایا کی خوشحالی اور بہبودی کا خیال رہتا ہے۔ اے حافظ! تو تو ایک گوشہ نشین مسکین آدمی ہے۔ تجھے ملکی معاملات میں دخل دینے سے کیا سروکار؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ نے یہ غزل اور ایسی ہی کئی دوسری غزلیں شاہ شجاع کے مینخانے کھلوانے پر طنزاً لکھی ہیں۔ یہ شعر اور گذشتہ دو اور شعر گویا ایک قسم کی معذرت ہیں۔ کہ بادشاہ ناراض نہ ہو جائے۔

غزل نمبر ۱۱

صفحہ ۱۴۶

۱۔ دریغا : افسوس بجان آمد : تنگ آ گیا

ترجمہ :۔ سینہ دردِ دل سے مالا مال ہے۔ افسوس کہ اس پر کوئی مرہم ہوتا۔ دل تنہائی سے تنگ آ گیا ہے۔ خدا کے لئے کوئی ہمدم ملے۔

تشریح :۔ خواجہ صاحب فراق محبوب میں تڑپ رہے ہیں۔ ان کا سینہ دردِ عشق سے بھرپور ہے۔ ان کے دل پر محبت کے چرکے لگے ہوئے ہیں۔ ایسے عالم میں کتنا اچھا ہوتا! کہ محبوب ہمارے پاس موجود ہوتا۔ وہ ہمارے زخموں پر مرہم رکھ کر ہمیں تسکین پہنچاتا۔ تنہائی سے ہم بیزار ہو چکے ہیں۔ کاش! کہ محبوب اس تنہائی میں آ کر ہماری ڈھارس بندھاتا۔

۲۔ تیزرو : تیز رفتار۔ سپہر : آسمان

چشم داشتن : امید رکھنا

ترجمہ :۔ اس تیز رفتار آسمان سے آرام کی امید کون رکھ سکتا ہے۔ اے ساقی! جام (شراب) لا۔ تاکہ میں تھوڑی دیر آرام کروں۔

تشریح :۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس تیز رفتار آسمان کی گردش

سے اس دنیا میں کسی کو آرام سکون نصیب نہیں جیسے دیکھو کہ کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔ صرف وہی لوگ گردشِ آسمانی کے اثرات سے محفوظ ہیں جو شراب الٰہی پیتے ہیں۔ اس لئے خواجہ صاحب ساقی سے التجا کرتے ہیں کہ انہیں شرابِ عشق کا ایک جام پلادے تاکہ اس کے نشے میں وہ چند لمحات آرام و سکون کے ساتھ گزار سکیں۔

۳۔ زیرک: عقل مند　　　خردمند: دانا
صعب: سخت　　　صعب روزی: سختی کے دن، مصیبت کا دن۔
پریشان عالمی: پریشانی کا عالم ہے۔

ترجمہ:۔ میں نے ایک خردمند کو کہا۔ کہ میرا یہ حال دیکھ! وہ ہنسا اور کہا! یہ مصیبت کا دن ہے عجیب کام ہے اور پریشانی کا عالم ہے۔

تشریح:۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے مصائب عشق کا حال کسی عقلمند کو سنایا اور اس سے اپنے دکھوں کا علاج چاہا۔ مگر اس نے ہنس کر اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ اور کہنے لگا کہ عشق میں مصیبتیں جھیلنے اور پریشانیاں اٹھانے کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔؟

خواجہ صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مصائب دل صرف اہل دل ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اہلِ خرد بھلا معاملاتِ عشق کو کیا جانیں۔

۴۔ ریش باد: خدا کرے زخمی رہے

ترجمہ:۔ عشق بازی کے راستے میں آرام و آسائش کی تمنا کرنا مصیبت ہے۔ خدا کرے وہ دل ہمیشہ زخمی رہے جو تیرے درد کے ہوتے ہوئے مرہم ڈھونڈے۔

تشریح:۔ خواجہ فرماتے ہیں کہ جو شخص کے راستے پر گامزن ہوتا ہے اسے ہر قدم پر مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مذہب عشق میں آرام و آسائش حرام ہے۔ عاشق جس قدر عشق میں تڑپتے ہیں اسی قدر انہیں لطف بھی حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ خدا کرے

زخمِ دل ہمیشہ ہرا ہی رہے اور کبھی مندمل نہ ہوا تاکہ اس تکلیف سے
ہمیشہ لذت یاب ہوتے رہیں۔

۵- اہلِ کام: اہلِ غرض۔ خود غرض۔ راہ رو: راہ چلنے والا۔ مراد سالک۔

ترجمہ:- اہلِ غرض اور ناز پروردہ لوگ رندی کے کوچہ میں داخل نہیں ہو سکتے۔
سالک کو جہاں سوز ہونا چاہیئے نہ کہ ایک خام طبع اور بے غم انسان۔

تشریح:- فرماتے ہیں کہ منازلِ عشق کے مسافر کو جہاں سوز اور پختہ مغز ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ راہ کی مصائب و مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے۔ ناز پروردہ، خام طبع، بے غم اور مطلب پرست انسان عشق کے راستے پر نہیں چل سکتے۔

۶- ترجمہ:- اس عالمِ خاکی میں کوئی ایسا آدمی نہیں ملتا جو مردِ کامل کہلا سکے، اب
ایک نئے آدم سے ایک اور جہان آباد کرنا چاہیئے۔

تشریح:- خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں اور موجودہ دنیا میں کوئی ایسا انسان نظر نہیں آتا۔ جو صحیح معنوں میں انسان کامل کہلا سکے۔ البتہ اللہ تعالیٰ اگر نیا آدم پیدا کر کے ایک اور نئی دنیا آباد کرے تو شاید وہاں ایسا انسان مل سکے گا۔ خواجہ صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اس دنیا میں یوں تو لاکھوں انسان نظر آتے ہیں مگر ایسا انسان نہیں ملتا جو مردِ کامل ہو۔ بقول اقبال ؎

خدا تو ملتا ہے انسان ہی نہیں ملتا
یہ چیز وہ ہے جو دیکھی کہیں کہیں میں نے

۷- سنجیدن: وزن رکھنا۔ پرکھنا۔ تولنا۔ اہمیت رکھنا۔ استغنا: بے نیازی۔ بے پرواہی۔

ترجمہ:- معشوق کی بے پرواہی کے سامنے حافظ کی گریہ زاری کیا اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کی (بے نیازی) کے سمندر کے سامنے تو

سات سمندر بھی شبنم کا ایک قطرہ نظر آتے ہیں۔

تشریح:۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ فراقِ محبوب میں شب و روز آہ زاری کرتے ہیں۔ ہم نے آنسوؤں کے سمندر بہا دیئے ہیں لیکن معشوق اس قدر بے نیاز ہے کہ اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ معشوق کی بے نیازی ایک سمندر کی مانند ہے۔ اور اس کے سامنے اگر ہم سات سمندر بھی بہا دیں تو ان کی حیثیت ایک قطرۂ شبنم سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ فراقِ محبوب کی گھڑیوں کو صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کیا جائے۔

نظیری نیشاپوری

محمد حسین نام، نظیری تخلص اور نیشاپور کے رہنے والے تھے۔ نیشاپور ایسا علاقہ ہے جو صدیوں تک ایرانی تہذیب و سیاست کا مرکز رہا ہے۔ نیز علمی روایات کے سبب بھی یہ علاقہ بہت مشہور ہے۔ لیکن افسوس کہ علم و فضل کا یہ گہوارہ تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا۔ مگر جب تک فریدالدین عطار۔ نظیری اور خیام کا نام صفحہ ہستی پر موجود ہے اس وقت تک نیشاپور کو یہ فضیلت حاصل رہے گی۔

نظیری نے بچپن نیشاپور میں گزارا۔ شاعری کا ابتداء ہی سے شوق تھا۔ اور شروع ہی سے نظیری کو شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ خراساں میں شہرت حاصل کرنے کے بعد وہ کاشان (قاچان) چلے آئے۔ یہاں اور بھی شعراء تھے جن میں حاتم، فہمی، مقصود، خروہ۔ شجاع۔ رضائی اچھے شاعروں میں تصور کئے جاتے تھے۔ نظیری نے بھی ان کے معرکوں میں قدم رکھا۔ اور ان کی طرحوں پر غزلیں کہنی شروع کیں۔ یہاں نظیری کو آزادئ افکار کی بدولت اپنے ذوقِ شاعری کو نکھارنے کا موقع ملا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ایران کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی شعر و سخن کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اور اکبر کا دربار بلند پایہ شعراء سے آراستہ تھا۔ شاہان مغلیہ کی فیاضیوں اور علمی سرپرستیوں کے قصے سُن کر نظیری کے دل میں بھی ہندوستان جانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ وہی آرزو بقول صائب۔ جو سب کو بے چین رکھتی تھی۔ نظیری کو بھی ہندوستان لے آئی۔

نظیری خانخاناں کی عظمت اور فیاضی کی داستانیں بھی سُن چکے تھے۔ چنانچہ دربار اکبری میں رسائی کے لئے انہوں نے خانخاناں کو ذریعہ بنایا۔ خانخاناں

ان دنوں گجرات کا حاکم تھا۔ ۹۹۲ھ میں نظیری نے بمقام آگرہ میں ان سے ملاقات کی۔ آگرہ سے خانخاناں کے ساتھ ہی نظیری گجرات چلے گئے۔ خانخاناں نے نظیری کو اکبری دربار سے متعارف کرایا۔ ان ہی دنوں جہانگیر کے بیٹا پیدا ہونے کا جشن تھا۔ چنانچہ نظیری نے خسرو کی ولادت کے جشن پر ایک قصیدہ لکھا۔ دربار اکبری میں عرفی اور فیضی کے ہوتے ہوئے نظیری کا چراغ نہ جل سکا اور نظیری کے قصیدہ لکھنے پر بہت سے حاسد پیدا ہو گئے۔ جیسا کہ وہ اپنے قصیدہ کے آخر میں خود اس بات کا یوں اعتراف کرتے ہیں ؎

جماعتی از سفیہانِ تیرہ طبع دنی — مدام در پیش افتادہ اند ہمچوں وبال
زہے تمیزی این ناقدانِ کم مایہ — گہر بقدر خذف گشتہ زر بسرخ سفال
بترس کہ اخترِ نظم مرا بیک ساعت! — توجہ تو بروں آرد از ہبوط و وبال

بہر حال نظیری نے اکبر کی مدح میں اکثر وقتاً فوقتاً قصیدے کہے۔ اور ان کی وجہ سے اسے شہرت بھی نصیب ہوئی۔ مگر وہ دربار میں کوئی جاہ و مرتبہ حاصل نہ کر سکے۔ اس لئے وہ مستقل طور پر خانخاناں کے دربار سے وابستہ رہے۔ اور انہوں نے احمد آباد گجرات میں سکونت اختیار کی۔ چند برس کے بعد حج کا ارادہ کیا۔ اور اس ضمن میں ایک قصیدہ لکھ کر خان خاناں کی خدمت میں پیش کیا۔ جس میں شاعرانہ انداز میں مصارف سفر کی درخواست بھی کی ؎

ہمہ عیشِ این جہانی بعنایتِ تو دیدم
چہ عجب اگر بیابم ز تو زادِ آنجہانی!

خانخاناں نے سفر کا سامان مہیا کر دیا۔ چنانچہ سورت سے جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ کو روانہ ہوئے۔ راستہ میں بدوؤں نے لوٹ لیا۔ تاہم نظیری نے حج و زیارت دونوں حاصل کیں۔ مآثر رحیمی میں نظیری کا یہ سفر ۱۰۱۲ھ میں لکھا ہے۔ مگر نظیری نے اپنے دیوان میں ایک مدحیہ قصیدہ سلطان مراد کی

مدح سرائی میں ہے۔

" ایں قصیدہ نیز بعد از معاودت مکہ معظمہ بہ احمدآباد گجرات در مدح شاہزادہ ہمایوں نژاد شاہِ مراد گفتہ اند۔"

یہ مسلّم ہے کہ مراد ۱۰۰۸ھ میں مرا ہے اس لئے نظیری نے ۱۰۰۸ھ سے پیشتر حج کیا ہوگا۔

حج کے بعد ہی نظیری نے شہزادہ مراد کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اور اکبر کی طرح اس کی مدح بھی کی، مراد کے ساتھ دکن کی مہمات میں بھی شرکت کی۔ شاہزادہ مراد نظیری پر بہت مہربان تھا۔ مگر جوان سالی میں ہی انتقال کر گیا۔ نظیری نے اس المناک موت پر مرثیے بھی کہے۔ علاوہ ازیں نظیری خانِ اعظم مرزا کوکہ کے بھی مداح تھے۔ اس کی مدح میں بھی قصیدہ کہا۔

" ایں قصیدہ در راہِ مکہ مکرمہ بعد از غارتِ ساربان و حرامیان مذیل بمدح نواب محمد عزیز اعظم خان منظوم شد۔"

۱۰۱۴ھ میں اکبر نے وفات پائی اور جہانگیر تخت نشین ہوا۔ وہ نہایت سخن شناس اور صاحبِ ذوق بادشاہ تھا۔ نظیری کی شہرت سنتے ہی دربار میں طلب کیا۔ چنانچہ ۱۰۱۹ھ میں نظیری دربار میں حاضر ہوئے۔ دماغ میں درباری روزینہ کی تلاش نہ تھی۔ بلکہ تجارت سے اپنا گزارہ تھے۔ جہانگیر خود اپنی تزک میں یوں رقمطراز ہے:۔

" نظیری نیشاپوری کہ در فنِ شعر و شاعری از مردم قرار دادہ بود و در گجرات بعنوان تجارت بسر می برد۔ قبل ازیں طلبیدہ بودم در ایں ولا آمدہ ملازمت کردہ قصیدہ انوری را۔

باز ایں چہ جوانی و جمال است جہاں را

بشرح نمود قصیدہ بجہت من گفتہ بود گذرانید، ہزار روپیہ و اسپ خلعت بصلہ ایں قصیدہ بدو مرحمت نمودہ بودم۔

گلزارِ ابرار میں لکھا ہے کہ نظیری نے اپنی وفات سے پیشتر ۱۲ سال گوشۂ عزلت اختیار کر لیا تھا۔ نظیری نے ۱۰۲۳ھ میں وفات پائی۔ اس طرح ۱۰۱۱ھ میں گوشہ نشین ہوئے ہوں گے۔ مگر قرائن بتلاتے ہیں کہ نظیری کے اس تارک الدنیا ہونے کے زمانے میں بھی دربارداری ان سے ختم نہیں ہوئی۔ وہ درباروں سے وابستہ رہے۔

نظیری کو آخری عمر میں دینی تعلیم کا بھی شوق ہوا۔ اور جب خانخاناں کے ساتھ دکن گئے۔ تو راہ میں مندو سے گزرے۔ یہاں بزرگانِ دین سے علم حاصل کیا۔ شیخ غوثی سے عربی تعلیم حاصل کی۔ پھر مولانا حسین جوہری سے تفسیر اور حدیث پڑھی۔

۱۰۲۰ھ میں گجرات سے آگرہ چلے آئے۔ اور اپنا دیوان خانخاناں کے حوالے کر کے پھر گجرات واپس لوٹ آئے۔ اور بمقام احمد آباد ۱۰۲۱ھ میں وفات پائی۔ اور اپنے مکان کے پہلو میں جو مسجد بنوائی تھی اسی میں ہی دفن کئے گئے۔

نظیری نے اگرچہ بہت سے درباروں کی آستاں بوسی کی ہے۔ مگر ان کا اصل تعلق خانخاناں کے دربار سے ہی تھا۔ خانخاناں۔ خان اعظم کوکہ کے بہنوئی تھے۔ اسی مناسبت سے ان کی مدح کی۔ اور اسی طرح اکبر، جہانگیر اور شہزادہ مراد کی مدح کرتے رہے۔ نظیری فطرتاً بڑے غیور تھے۔ ایک دفعہ خانخاناں نے ایک خط لکھا۔ جس کے حاشیہ پر نظیری کو سلام لکھ دیا۔ نظیری کو بہت ناگوار گذرا۔ اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

قدح دوسہ مخصوص دلِ ما کشیدہ ے ۔۔۔ مخدوم چنیں یاد نہ کرد دست خدم را
ما نامِ خود از حاشیہ بشتیم گزیں بیش ۔۔۔ مہمان طفیلی نتوان بود قلم را

نظیری سے خانخاناں اس قدر خوش تھا۔ کہ ایک دفعہ ایک لاکھ روپے سے نظیری کو خوش کیا۔ یوں تو انعام و اکرام ملتے ہی رہتے تھے۔ مگر نظیری

امیرانہ زندگی بسر کرنے کے لئے تجارت کرتے تھے۔ اور اس طرح امراء وقت میں شمار ہوتے تھے۔ مزاج میں عرفی کی آن بان نہ تھی۔ اس لئے گوشہ نشینی کے اوقات میں بھی مدح سرائی سے اجتناب نہ کیا۔

نظیری پر مذہبی تعلیم نے بہت اثر کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان پر اکبر کے دربار کے آزادانہ مذہبی مباحثے کوئی اثر نہ کرتے تھے۔ بلکہ وہ خود ان مباحثوں کے ہی سخت خلاف تھے۔ حج بھی ان کی دینی اور مذہبی زندگی پر اثر انداز ہوا۔ اس کا اظہار یوں کرتے ہیں۔ ؎

چندی بغلط بتکدہ کردیم حرم را
وقت است کہ از کعبہ برآریم صنم را

نظیری نیشاپوری

بحیثیت غزل گو

ہندی شعراء کا گل سرسبد نظیری ہے۔ یہ سخن سنج طوطی گلستانِ شعروشاعری میں اس طرح چہکا کہ سب سے خراج تحسین وصول کیا۔ اس نے درباری زندگی کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے بہت سے قصائد لکھے جن میں اچھے اچھے بھی تھے۔ اور شہزادہ مراد کی اچانک موت پر جو مرثیہ لکھا وہ اس قدر پُر تاثیر اور پُر خلوص ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے شہزادہ مراد سے گہری محبت تھی۔ نظیری کی عمر اگرچہ مدحت سرائی میں گزری۔ لیکن وہ قصیدہ گوئی میں اپنا کوئی رنگ قائم نہ کر سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خاقانی، عرفی اور انوری نے قصیدہ نگاری کا جو معیار کر دیا تھا۔ اس سے تجاوز کرنا اس خاص صنعت میں غیر معمولی انہماک اور مشق و مہارت کا طالب تھا۔ اور غالباً نظیری کو اپنی خاص افتادِ طبع کے باعث اس کا موقع نہیں ملا۔ لیکن اس حقیقت کو کبھی بھی نہیں جھٹلایا جا سکتا۔ کہ فارسی غزل گوئی میں اس نے معنوی اور صوری دونوں حیثیتوں سے بہت کچھ ترقی کی۔ اور اس میں وہ جدتیں پیدا کیں۔ کہ فارسی تغزل کی شان کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ اگرچہ وہ سعدی، حافظ اور خواجو کے استوار کئے ہوئے راستے پر ہی گامزن ہوا۔ لیکن اس نے اپنی غزل میں کئی ایک اضافے کئے۔ اور اس صنفِ سخن میں سبکِ ہندی کے اثرات کے ماتحت جدت اور ندرت کے کئی ایک مظاہرے کئے۔ رنگِ تغزل کے جو کرشمے ہمیں اس کے ہاں نظر آتے ہیں۔ وہ دوسرے شعراء میں کم ہیں۔ جہانگیر نے نظیری کے بارے میں لکھا ہے سے

- نظیری نیشاپوری کہ در فنِ شعر و شاعری از مردم قرار دادہ بود -

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس میں کس قدر حقیقت ہے کیونکہ نظیری اس دور کی پیداوار ہے جسے فارسی شاعری کی ہندی بہار کا نام دیا جاتا ہے - اس میں مختلف شاعروں نے اپنے خیالات کی رنگ و بو کو بکھیرا - لیکن نظیری ہمیں منفرد و ممتاز نظر آتا ہے - اس کے کلام کی مختلف خصوصیات ہیں - اور اس کی فنکارانہ پختگی ہے جو کہ اس کی عظمت کو تسلیم کراتی ہے -

۱ - نظیری ترکیبات اور الفاظ کے انتخاب میں انتہائی حسنِ ذوق سے کام لیتا ہے - اس لئے ہم اسے اس شریعت کا اولوالعزم پیغمبر کہہ سکتے ہیں - کیونکہ جب نکتہ سنجی اور رنگین طبعی زیادہ بڑھی تو ایک ایک ادا الگ الگ نظر آئی تو نظیری نے سینکڑوں نئے الفاظ اور سینکڑوں نئی ترکیبیں ایجاد کیں - یہ الفاظ بلاشبہ پہلے بھی موجود تھے لیکن جس موقع پر اس نے کام لیا - یا جس انداز سے ان کو برتا - شاید پہلے اس طرح سے نہیں برتے گئے - مثلاً

از کف نمی دہد دلِ آسان ربودہ را
دیدیم زوری بازوی ناآزمودہ را

- آساں ربودہ کی ترکیب نئی ہے - اور اس سے ایک وسیع خیال ادا ہو گیا ہے - دوسرے مصرعہ میں " زورِ بازو " " ناآزمودہ " مستعمل تراکیب ہیں - لیکن ان سے نئی طرح سے کام لیا گیا ہے - اور یہی نظیری کی غزل کی نمایاں خصوصیت ہے - اور اسی وجہ سے وہ ایک ممتاز حیثیت کا مالک ٹھہرایا گیا ہے - وہ ایک اور جگہ یوں کہتا ہے -

چہ خوش است از دو یکدل سر حرف باز کردن
سخنِ گذشتہ گفتن گلہ را دراز کردن

اثرِ عتاب بردن ز دل ہم اندک اندک
بہ بدیہہ آفریدان ، بہ بہانہ ساز کردن

" بدیہہ آفریدن" کس قدر موزوں ترکیب ہے۔ ایک بڑے خیال کو انتہائی مختصر الفاظ میں ادا کر دیا ہے جس سے فصاحت و بلاغت پیدا ہو گئی ہے۔ " زدل ہم" اور " اندک اندک" کی ترکیبات واقعہ کی کیسی اچھی تصویر کھینچ دیتی ہیں۔ جس طریقے سے اس نے اس گلہ کی مصوری کی ہے۔ یہ نظیری ہی کا حصّہ ہے۔

۲۔ شاعری ہو یا فن کا مظاہرہ۔ اس میں شاعر اور فنکار مختلف حربے استعمال کرتا ہے۔ بعض اوقات جزئیات اور تفصیلات سے اور بعض مرتبہ اختصار و روایات سے تاکہ اس کی بات میں زیادہ تاثر پیدا ہو جائے اور اس کی بات دل کی انتہائی گہرائیوں میں اُتر جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اثر آفرینی کے لئے جذبۂ خلوص و صداقت کا ہونا ضروری اور اہم ہے۔ لیکن الفاظ بھی اس میں اہم کارکن ہیں۔ مختلف شاعروں نے الفاظ ہی سے اپنے تصور میں رنگ بھرا۔ تخیل کی تابانی کے ساتھ ساتھ جب متناسب الفاظ کی آمیزش ہوتی ہے تو ایسے دو پہلے اشعار پیدا ہوتے ہیں جو کہ شاعر کے نام کو زندۂ جاوید کر دیتے ہیں۔ نظیری نے گنے چنے اور متناسب الفاظ میں بہت جامع تصویریں کھینچی ہیں۔ اس میں سے رمزیت اور ایمائیت کے حسین اور دلفریب نمونے ملتے ہیں۔ اور اس سے وہ غزل میں رنگینی پیدا کر دیتا ہے۔ کیونکہ رمزیہ قوتوں سے کام لے کر شاعر پوشیدہ رازوں اور کیفیات نہانی کو واضح کر دیتا ہے۔ تخیل کی رنگینی کے وفور کی وجہ سے ایمائیت بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

بجائے اس کے کہ وہ محبوب کے ایک ایک عضو کو بیان کرتا۔ اس نے حسن کی ایسی جامع تصویر کھینچی ہے کہ اس کا تاثر ان اشعار سے بہت زیادہ ہے۔ جن میں معشوق کے اعضا اور اس کے خد و خال کی جزوی طور پر تعریف کی جاتی ہے۔ اور یہی نظیری کا کمال ہے۔ ایک اور شعر میں بھی یہی فصاحت و اختصار ہے۔ جن میں الفاظ کا چناؤ تخیل کو اور زیادہ تاباں بنا دیتا ہے۔

زپای تا بسرش عشوہ ہائے صف بستہ
ہزار معرکہ و رخصتِ تماشا نیست

۳- نظیری کے کلام کی نمایاں خصوصیت معاملہ بندی اور وقوع گوئی ہے۔ وہ وجدانی باتوں کو ایسے طریقے سے ادا کرتے ہیں کہ وہ مجسم بن کر سامنے آجاتی ہیں۔ وہ حسن و عشق کی گوناگوں واردات کو محسوس کرتے ہیں۔ زندگی کے ساتھ ان کا گہرا ربط اور لگاؤ ہے۔ حسن و عشق کے معاملات کا گہرا تجربہ ہے اور اس بھرپور تجربے کو اشعار میں پیش کیا ہے۔ ان اشعار کے پڑھنے سے معاملات ہویدا ہو جاتے ہیں۔ اسی پہلو میں نظیری، فغانی شیرازی کا مقلد ہے۔ کیونکہ فغانی ایک نئے دبستان کا موسس تھا۔ اس دبستان کی خصوصیت وقوع گوئی اور معاملہ بندی ہے کیونکہ یورش مغول کے بعد فارسی غزل ایک کروٹ لیتی ہے۔ اب غزلیات کا نفس مضمون نہ زندگی سے گریز و فرار ہے۔ اب شاعر کسی مرد مجاہد کو پیش نہیں کرتا۔ بلکہ اب گوشۂ عافیت کی تلقین کی جاتی ہے۔ اور شاعر سکون کا متلاشی ہے۔ ایسا گہرا سکوت جس میں کوئی شورش نہ ہو۔ اس کا اثر غزل پر بھی ہوتا ہے۔ اب غزل صوفیانہ

افکار کی علمبردار بن جاتی ہے۔ لازمی طور پر ابہام اور پیچیدگی بھی پیدا ہوتی ہے۔ جس سے غزل میں صداقت و خلوص کم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فغانی نے از سر نو سعدی کی طرح غزل کو واردات قلبی کی تصویر بنانا چاہا۔ اس سلسلہ میں سعدی سے بھی آگے نکل گیا۔ اور اپنی زیادہ تر توجہ تصوف اور اخلاق سے نکالکر خالص جنسی واردات کے لطیف پہلوؤں تک محدود رکھی۔ درحقیقت معاملہ بندی عشق کے جنسی پہلوؤں کو نمایاں کر کے دکھاتی ہے لیکن حدِ اعتدال میں رہ کر۔

نظیری پر فغانی کا اثر تو تھا ہی۔ لیکن جب ہندوستان میں آیا تو یہاں کے تہذیب و تمدن اور فنونِ لطیفہ نے اسے خاص طور پر متاثر کیا۔ ان عناصر کے تال میں سے نظیری نے غزل گوئی کا ایک جدید اسلوب نکالا۔ جو واقعی منفرد اور یگانہ ہے۔ ہندوستان کی فلسفہ طرازی اور موشگافی مسلّم ہے۔ فلسفہ ویدانت کے مفسرین نے حقائق کے بیان میں بال کی کھال اتار لی ہے اور پھر فنونِ لطیفہ میں باریکیوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور یہاں کی کلاسیکی موسیقی، سنگیت یعنی تال، سُر اور لے کا ایسا مکمل نظام پیش کرتی ہے کہ باید و شاید۔ ان تمام عناصر نے نظیری کو متاثر کیا۔

لیکن وقوع گوئی اور معاملہ بندی کا عنصر غالب رہتا ہے مثلاً

دو نیم گشتہ دل از کفر و دین نمی دانم
کزیں دو پارہ دل آید ترا بکار کدام

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:۔

من در پی رہائی داو ہر دم از فریب
بر سر گرہ زند گرہِ ناگشودہ را

۴ - معاملہ بندی کے ضمن میں ہی یہ بات آ چکی ہے کہ نظیری کے ہاں ہمیں محسوساتی رنگ زیادہ نظر آتا ہے۔ اسے عالمِ محسوسات سے

لگاؤ ہے۔ اسی لئے وہ اکثر حالات اور کیفیات کی تشبیہ مادیات اور محسوسات سے دیتے ہیں۔ اور تجریدی احساسات کو محسوسات کا رنگ دے کر اثر آفرینی کا مظاہرہ کیا ہے۔ جذبات کو اس طرح حسین پیکروں میں ڈھالا ہے کہ واضح شکل بن جاتی ہے۔ جب وفا کا ذکر آتا ہے تو عاشق اس کی قیمت بلند از قیاس تصور کرتا ہے۔ اسی چیز کو تشبیہ کی صورت میں محسوساتی انداز میں پیش کیا ہے۔

بہر نرخی کہ می گیرند کالای وفا خوبست
پس از عمری گزر افتاد بر ما کاردانی را

پھر وہ کہنا چاہتا ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اور اس کو عالم محسوسات سے ہی تشبیہ دے کر واضح کرتا ہے۔

بدل از دل گذری ہست تا محبت ہست
رہ چمن نتواں بست تا صبا اینجا ست

اس قسم کی محسوساتی تشبیہات کو نظیری عالم تخیل سے نکل کر عالم رنگ و بو میں لے جاتا ہے اور جیتی جاگتی تصویریں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ جس سے تاثر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی محسوساتی تشبیہات سے اشعار میں حسن اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ فصاحت و بلاغت بروئے کار آتی ہے اور شعر پر معنی ہو جاتے ہیں۔ نظیری کے ہاں ایسے نمونے ہی زندگی سے گہرے لگاؤ کو ظاہر کرتے ہیں۔ بھرپور احساسات کا بیان ہے۔ مختلف حسیات کو اور کیفیات کو اس خلوص اور صداقت سے پیش کیا ہے کہ شعر میں مستقل حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ عاشقانہ جذبات کا اظہار بے حجابانہ کیا ہے۔ تشبیہات چونکہ مادیت سے متعلق ہیں۔ اس لئے زیادہ جاذبیت رکھتی ہیں۔

ہمہ شب بر لب و در رخسار و گیسوی زنم بوسہ
گل و نسرین و سنبل را صیاد در خرمن است امشب

۵۔ نظیری کی غزلیات کے مطالعہ سے قاری کو ایک اور چیز کا قدم قدم پر احساس ہوتا ہے۔ اور وہ ہے اس کا ذوقِ جمالیات۔ جسمانی حسن کے بارے میں شاعر بہت حساس واقع ہوا ہے۔ اور نسوانی حسن کی ایسی جامع تصویر کھینچتا ہے کہ قاری اس کے ذوقِ جمالیات کی داد دیئے بغیر نہیں رہتا۔

۶۔ نظیری نے اپنی غزلیات میں کبھی اختصار سے کام لے کر وضاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے ہیں اور کبھی اپنے جذبات کو طوالت دی ہے کبھی (افراط و مبالغہ) سے اور کبھی (افراط و تخفیف) سے کام لیتے ہیں۔ جذباتی کیفیت کو پھیلا کر انتہائی فنکارانہ پختگی سے کام لیا ہے اسی لئے پھیلانے سے اثر میں کمی نہیں ہوئی بلکہ اضافہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات کوئی خاص جذبہ ایک چنگاری کی طرح مختصر سی زندگی لے کر نمودار ہوتا ہے۔ اور آن کی آن میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس قسم کا جذبہ ایک ہی شعر میں سما جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات ایک جذبہ دریا کی موج کی طرح ہوتا ہے کہ بڑھتے اور پھیلتے ہوئے کافی عرصہ تک اپنی بقا کو قائم رکھتا ہے۔ اس قسم کے جذبے کو بیان کرنے کے لئے ایک شعر ناکافی ہوتا ہے۔ اس شعر میں محبوب کے اضطراب کی تصویر کشی کی ہے۔

وحشی غزالی کز صبا رم در بیابان می خورد
رام نظیری می شود در ہوش و ادراکش نگر

اس شعر میں محبوب کے حیا کی طرف اشارہ ہے۔ کہ وہ وحشی غزال صبا کے چھونے سے بیابان میں بھاگتا ہے، اب وہ خود بھی کسی نگاہِ فتنہ سامان

کا شکار ہے۔ اس شعر میں عاشق کی کیفیات کو پوری وضاحت سے پیش کیا ہے۔ اس قسم کی غزلیات میں معنوی اور منطقی تسلسل جذباتی ہم آہنگی کے علاوہ وحدتِ فکر بھی ملتا ہے۔ سعدی، امیر خسرو اور حافظ کے ہاں ایسی غزلیات کے نمونے ملتے ہیں۔ اور نظیری بھی اس میدان میں پیچھے نہیں رہا۔

۷۔ نظیری کی غزلیات میں ہمیں جدّتِ ادا کے نمونے نظر آتے ہیں۔ نظیری بات کو نئے طریقے سے بیان کرتا ہے۔ عشق کی باتیں تو پرانی ہیں۔ گل و بلبل کے افسانے بھی فرسودہ و پامال ہیں۔ محبوب کی بے وفائی اور عاشق کا خلوص یہ بھی پٹا ہوا موضوع ہے۔ جامی نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند
تہی پیمانہ ہا کردند و رفتند

لیکن وہ شاعر مقبول عام ہوتا ہے جو پرانی بات کو نئے طریقے سے پیش کرتا ہے۔ جو اظہارِ فکر و خیال کے لئے کوئی نیا اور تخلیقی پہلو ایجاد کرتا ہے۔ اور پرانی شراب کو نئے پیمانے میں انڈیلتا ہے۔ یہ جدت اور ندرت شاعر مختلف طریقوں سے پیدا کرتا ہے۔ اپنے تخیل کی رنگینی اور نئی نئی تشبیہوں اور استعاروں سے وہ جدت پیدا کر سکتا ہے۔ اس طرح اسے وہ مختلف صنعتوں یا موسیقی کی دھنوں کے استعمال سے الفاظ کو خوش آہنگ بنا کر جدت پیدا کر سکتا ہے۔ نظیری نے یہ جدت نئی نئی تشبیہوں کی ندرت اور حسن سے پیدا کی ہے۔ تخیل کی رعنائی، دلفریبی و تابانی سے کی ہے۔ معشوق کو بے وفا تو ہر شاعر نے کہا ہے۔ عاشق کبھی معشوق سے مطمئن نہیں ہوتا۔ آتشِ شوق فروزاں رہتی ہے کہ محبوب کے انداز میں سرد مہری نظر آتی ہے۔ ذوق و شوق

کا اس قدر دفور ہوتا ہے کہ معشوق کے طور طریقے اور اسلوب سے وہ بے اعتنائی اور بے التفاتی پاتا ہے۔ محبوب کی بے وفائی کا گلہ تو ہر ایک کرتا ہے لیکن نظیری اسے ایسا پیرایہ دیتا ہے کہ اس میں تخلیق کا پہلو ابھر آتا ہے۔ تشبیہوں کی ندرت اور حسن استعارہ ہے۔

شمیم مہر نہ بادِ وفا نمی آید
بہر چمن کہ تو بشگفتہ ای صبا خفت است

محبوب کے کردار وصفات کو چمن، پھول، شمیم اور باد کا تخیل پیش کرکے بیان کیا ہے۔

جلالتِ ادا میں شوخی و ظرافت کا عنصر بھی شامل ہے۔ نظیری تو ظریفانہ انداز میں بھی عاشق کی کیفیات کو احسن انداز میں پیش کر دیتا ہے۔

گرچہ میدانم قسم خوردن بجانت خوب نیست
ہم بجان تو کہ یادم نیست سوگندِ دگر

۸ - اندازِ بیان کی سادگی و شستگی بھی نظیری کو بحیثیت ایک فنکار کے ممتاز مقام دلاتی ہے۔ نظیری نے جذبات کا اظہار بغیر کسی قسم کے تکلف اور رکھ رکھاؤ کے کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ الفاظ کے چناؤ میں نظیری محتاط واقع ہوا ہے۔ لیکن اس میں تصنع اور بناوٹ کا شائبہ تک نہیں۔ جذبات کی صداقت نظیری کی آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیتی ہے۔ اس کے احساسات میں آفاقی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ نظیری کے ہاں عشق و عاشقی کی واردات اس طرح سے بیان ہوئی ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ نظیری کو ایسی زندگی سے لگاؤ رہا ہے۔ محبت کے مختلف پہلوؤں کو اس خلوص اور صداقت سے پیش کرتا ہے کہ شعر میں مستقل حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ محبوب کے وصل سے وہی سرشار ہوتا ہے جسے ہجر کی ہمگین

کیفیات سے واسطہ پڑا ہو۔ وصل کی راحت کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کو ہجر کی بے کلی و بے قراری کا تجربہ ہو چکا ہے۔

کس از معانقۂ روزِ وصل یابد ذوق
کہ چند شب ز ہم آغوشِ خود جدا خفت است

اس شعر میں سیدھے سادے انداز میں ایک بہت بڑی حقیقت کا اظہار کر دیا ہے۔ اس غزل میں عاشق کی قلبی واردات کے ایک پہلو کی پردہ دری اس طرح سے کی ہے۔ کہ طلب اور تمنا میں جو مزا ہے وہ وصل میں نہیں۔ کیونکہ وصل مرگِ آرزو ہے۔ اور ہجر میں لذتِ طلب ہے۔ عاشق کے لئے محبوب کا تصور زیادہ کیف آور ہوتا ہے۔ اس کے خیال کے ساتھ ہم آغوشی اس کو دنیا و ما فیہا سے بے خبر کر دیتی ہے خیال کا اظہار بابا طاہر عریاں نے بھی کیا ہے۔ جو اس طرح ہے۔

نسیمی کز بن آں کاکل آید
مرا خوشتر ز بوی سنبل آید
بشو گیرم خیالش را در آغوش
سحر از بسترم بوی گل آید

چنانچہ نظیری بھی بیان کرتے ہیں کہ طلب اور جستجو میں جو مزا ہے اور لطف ہے وہ ویسے ممکن نہیں۔ اگر تگ و دو کے بغیر منزل پر پہنچ جائیں تو وہ لطف نہیں مل سکتا۔

شب امید بہ از صبح امید می گزرد
کہ آشنائے بہ تمنای آشنا خفت است

نظیری کی غزلیات میں اس قسم کے بہت سے اشعار ہیں جن میں عاشق کے جذبات کو بلا تکلف بیان کیا ہے جو کہ اس کی شاعرانہ عظمت کو اور بھی گہرا کر دیتے ہیں۔ محبوب کی کج ادائی اور سرد مہری کا رونا

روتا ہے۔ مگر جب محبوب ملتا ہے تو گلوں اور شکووں کی ساری کتاب بکھر جاتی ہے۔ عاشق تو محبوب کی ہر بات پر یقین کر لیتا ہے۔ اس کے جھوٹے وعدوں کا سہارا لیکر بھی وہ بہت زیادہ خوشی محسوس کرتا ہے۔ اور اس کی غلط محبت کے اظہار سے عاشق اپنے سارے گلے بھول جاتا ہے ؎

از یک حدیثِ لطف کا نہم دروغ بود
امشب ز دفترِ گلہ صد باب شستہ ایم

۹۔ نظیری نے روزمرہ اور محاورات نہایت کثرت سے برتے ہیں۔ جس سے زباندانی میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس کے ساتھ اکثر محاورات وہ ایسے استعمال کرتا ہے کہ جس مطلب کو وہ ادا کرنا چاہتا ہے۔ بغیر اس محاورے کے وہ اس خوبی سے ادا نہیں کر سکتا۔ ان محاورات سے اس کی لسانی مہارت اور قدرت ظاہر ہوتی ہے۔ اور بلا شک و شبہ اس نے محاورات کے نئے استعمال سے زبان کے ذخیرے میں اچھے اضافے کئے ہیں۔ مثلاً۔ ؏

طفل بودیم کہ باز از شکر و شیر شدیم

اس میں " از شیر باز شدن " دودھ چھڑائے جانے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

؏ شبنم بروی بستر و نرگس بخواب گیر

" بخواب گرفتن " سونے میں جا لینا۔ یہ نظیری کے اندازِ بیان اور اور محاورات کے بیان کی ندرت پر دلالت کرتا ہے۔

؏ نیم بسمل شدۂ بر سرِ پروازی ہست

" بر سرِ پرواز " اڑنے کو ہے " کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

ع شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد

"افسانہ از افسانہ می خیزد" "بات سے بات نکلتی ہے"

چنانچہ ان مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ نظیری نے محاورات کو نئے طریقے سے استعمال کیا ہے۔ اور یہ چیز اس کی زبان پر قدرت رکھنے کو واضح کرتی ہے۔

۱- نظیری کی غزلیات میں غنائیت اور موسیقی کے پہلو کا ذکر کر دینا بے جا نہ ہوگا۔ اس کی غزلیات میں ترنم کا پہلو بہت ابھرا ہوا ہے۔ غزل میں موضوع کے مطابق لَے کا استعمال کیا ہے۔ اس کے پس منظر ہندی موسیقی کارفرما نظر آتی ہے۔ کومل اور اُت کومل، تیور اور اُت تیور وغیرہ دھنیں ہمیں اس کی غزلیات میں ملتی ہیں۔ جن کا تعلق احساسات اور جذبات کے ساتھ ہے۔ جہاں جذبہ کی شدت کا اظہار مقصود ہوتا ہے وہاں تیور اور ات تیور اور جہاں افسردگی اور پژمردگی کو بیان کرنا چاہتا ہے وہاں کومل اور ات کومل دھنوں کو استعمال کرتا ہے۔ نظیری نے نغمہ اور شعر کے لطیف امتزاج سے فارسی شاعری میں ایک نئی روح پھونکی۔ نظیری کے اشعار میں ایسے ہم آہنگ الفاظ آتے ہیں کہ زیر و بم کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً

بزیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را
نواگران نخوردہ گزند را چہ خبر!

"نواگرانِ نخوردہ گزند" میں سُروں کے پورے ٹھاٹھ کی کیفیت پنہاں ہے۔ یہ پوری غزل سرود و نغمہ کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔

مندرجہ ذیل شعر میں "ر" کی تکرار نے موسیقی کی شان پیدا کر دی ہے۔

ہزار شیخ و برہمن ز کیش و دیں برگشت
تصرف نظرِ ارجمند را چہ خبر؟

نظیری کے افکار

نظیری کی غزلیات میں فلسفہ کی شدت نہیں ہے: تاہم موشگافی ضرور کرتے ہیں۔ اور فکر دور بینی اور غواصی کی بدولت وہ معاملہ کچھ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اور فلسفہ کے دائرہ میں داخل ہونے لگتا ہے۔ نظیری کے کلام کا مطالعہ کرنے سے یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی چشم بصیرت نے بھی ان ہی معاملات کو تلاش کرنے کی کوشش کی جس کی مفکرانِ عظیم نے مساعی کی تھی۔ وہ بھی وہ اسرار و رموز کائنات کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ابھی ان اسرارِ سربستہ کو کھولنے کے لئے ہمیں مساعی نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کو معلوم کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

تو مپندار کہ ایں قصہ ز خود می گویم
گوش نزدیک لبم آر کہ آوازی ہست

۲- دل اور خیالات کی بات کرتے ہیں کہ پہلے انسان کے ذہن میں چیز وارد ہوتی ہے۔ پھر وہی تفکر کے جامہ میں ڈھلتی ہے۔

گر عکس روی خویش در آئینہ دیدہ
توحیدِ شیخ و شرکِ برہمن بجا شناس

۳- نظیری عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ تصور کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مجاز کے بغیر حقیقت تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ اس میں محبت کی ارزش کا بیان ہے۔

ہیچ اکسیر بتاثیر محبت نرسد
کفر آوردم و در عشق تو ایمان کردم

۴- پھر دوستی اور دشمنی کا تفرقہ بیان کرتے ہیں کہ بیوقوف دوست سے دانا دشمن بہتر ہے۔ کیونکہ دوست اپنی حماقتوں سے اور فتنہ سے

اپنے دوست کو غیر شعوری طور پر زک پہنچاتا ہے لیکن اصلاح دشمن کے ہاتھوں ہی ممکن ہے۔

در طبع دوستاں ز حسد راستی نماند
انصاف اگر طلب کنی از دشمناں طلب

۵- اسی طرح ایک نہایت دل کش مسئلہ بیان کرتے ہیں۔

روی نکو معالجۂ عمر کوتاہ است
این نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ ایم

۶- نظیری دل آزاری کو سب سے بڑا گناہ سمجھتے ہیں۔ کیونکہ دل خانۂ خدا ہے۔ یہ مضمون بہت سے شاعروں نے بیان کیا ہے۔ ان میں سعدی، حافظ اور دیگر شاعروں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً سعدی کہتے ہیں۔

از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است
دل بدست آور کہ حجِ اکبر است

حافظ بھی اسی فلسفہ کا ببانگِ دہل اعلان کرتے ہیں

مباش در پیٔ آزار و ہرچہ خواہی کن
کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

نظیری کہتے ہیں ؎

نیازارم ز خود ہرگز دلی را
کہ میترسم در آن جای تو باشد

۷- اس غزل کا مقطع بھی ایک اخلاقی پیغام ہے ؎

نظیری زندگی در دردِ دل جو
کہ دردِ دل مسیحائی تو باشد

زندگی میں سب سے بڑی قدر دردِ دل ہے۔ اور یہی زندگی کا مسیحا بھی ہے۔ کیونکہ دردِ دل ہی انسانی زندگی کا مقصد تخلیق ہے۔

۸ - نظیری نے حسنِ سرمدی کا ذکر بھی اپنی غزلیات میں چھیڑا ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ حسن و عشق کی باہمی آویزش آمیزش میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ حسنِ مطلق کائنات کی مختلف موجودات میں بکھرا ہوا ہے اور عشق اس حسن کا متمنی ہے۔

حسن ہر سو در لباس دیگری پنہاں شود
عشق ہر ساعت در آویزد بدامانِ دگر

اس طرح سے نظیری نے اپنے اشعار میں روایت کا اظہار کیا ہے۔ جو کہ فارسی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظیری کی مقبولیت کا راز اس کے افکار میں نہیں بلکہ اس کی فنکاری میں مضمر ہے۔ اور یہ فن کارانہ پختگی ہی ہے جو اسے اعلیٰ درجہ کے غزل گو شاعروں کی ردیف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ اور آخر میں یہ کہتے ہیں کہ صائب کا یہ کہنا

صائب چہ خیال است شوی ہمچو نظیری
عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

غزلیاتِ نظیری

غزل نمبر ا

ا۔ ربودن: لے بھاگنا۔ کف: ہتھیلی

آسان ربودہ: آسانی سے اڑایا ہوا نا آزمودہ: ناتجربہ کار۔ کمسن۔

ترجمہ: ۔ محبوب جو دل آسانی سے اڑا لے گیا ہے۔ اب اسے ہاتھ سے جانے نہیں دینا۔ ہم نے اس ناتجربہ کار کے بازوؤں کا زور دیکھ لیا ہے۔

تشریح: ۔ نظیری کے محبوب کے حسن کا یہ عالم ہے کہ جو ایک دفعہ اس کے دامِ حسن میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ پھر کبھی رہائی نہیں پا سکتا۔ پھر غضب یہ ہے کہ وہ اتنا تجربہ کار بھی نہیں ہے۔ یعنی ابھی کم سنی کا عالم ہے۔ لیکن اس کی کم سنی میں بھی بے پناہ کشش ہے۔ وہ اپنے حسن کے ساتھ ساتھ ناز و ادا سے ہر کسی کا دل موہ لیتا ہے۔ اس کے اس دل موہ لینے کو ہم' دل اڑا لینا کہیں گے۔ اور اسی وجہ سے معشوق کو دلربا کہا جاتا ہے۔ اس کے جسم کا ہر عضو اپنے حسن اور ہر ہر ادا اپنی کشش کے سبب ناظر کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ مصحفی نے معشوق کی ان اداؤں کی تصویر اشعار ذیل میں اس طرح کھینچی ہے۔

تنہا نہ وہ ہاتھوں کی حنا لے گئی دل کو
مکھڑے کو چھپانے کی ادا لے گئی دل کو
یاں چشم فسوں ساز نے باتوں میں لگایا
دے پیچ ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو

نظیری کا محبوب حسین بھی ہے اور کمسن بھی۔ جو کوئی اسے ایک مرتبہ دیکھ لیتا ہے تو اس کا اس قدر گرویدہ ہو جاتا ہے کہ پھر اس کی محبت کے دام

سے نکلنا بھی چاہے تو نکل نہیں سکتا۔ اس شعر میں نظیری نے ایک اچھوتے انداز میں محبوب کی دلربائی کا ذکر کیا ہے۔ وہ براہِ راست یہ کہنے کی بجائے کہ محبوب بے حد حسین ہے اور ہم اس قدر والا و شیدا ہیں کہ اس کی محبت کو ترک کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ محبوب نے ہمارا دل اڑا لیا ہے۔ اگرچہ وہ ناتجربہ کار اور کمسن ہے۔ لیکن اس ناتجربہ کاری میں بھی بلا کی پرکاری ہے۔ وہ دل اڑا لینے اور اڑا کر نہ دینے کا فن خوب جانتا ہے۔ اس کے نازک بازوؤں میں بلا کا زور ہے۔ وہ ایک دفعہ جس کا دل اڑا لیتا ہے پھر اسے ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ یہ کمسن محبوب بھی بلا ہوتے ہیں۔ بیچارہ فیضی جیسا مفسرِ قرآن بھی ان کے ہاتھوں خوار ہوا۔

بچشمِ عزیزاں مرا خوار دارد
بپیرانہ سالی غمِ خورد سالاں

اگرچہ روایتی طور پر اس شعر میں شاعر نے محبوب کو نازک قرار دیا ہے۔ لیکن متضاد بیان کے ذریعے شاعر نے شعر کے ذریعے حسن میں اضافہ کر دیا ہے۔ تضاد یہ ہے کہ ان کے دست و بازو ناتجربہ کار اور نازک ہونے کے باوصف اس حد تک قوی ہیں کہ دل پہ گرفت کر لینے کے بعد کسی طرح نہیں چھوڑتا۔ تضاد کے ذریعے شعر کے حسن میں اس طرح اضافہ کرنا شعراء کے ہاں عام ہے۔ مثلاً

ع درازدستیِ ایں کوتاہ آستیناں بیں (حافظ)

۲- **گرہ زدن**: گرہ لگانا۔ **ناکشودہ**: جو کھلی ہوئی نہ ہو۔ ان کھلی۔

ترجمہ:- میں رہائی کی کوشش میں ہوں۔ اور وہ اپنے فریب سے ہر لحظہ ان کھلی گرہ پر گرہ دیئے جا رہا ہے۔

تشریح :- غزل کی روایت میں محبوب کو جفا جو اور عاشق کو مظلوم قرار دیا جاتا ہے۔ کہیں محبوب جلاد کے روپ میں عاشق کو ذبح کرتا ہے۔ کبھی صیاد کے روپ میں اس کے بال و پر نوچ کر قفس میں بند کر لیتا ہے یا پھندے میں جکڑ لیتا ہے۔ ایسی کوئی بھی تصویر پیش کرتے وقت شاعر کو شعر کی پوری فضا اس کے مطابق بنانی پڑتی ہے۔ مثلاً اس شعر میں تصویر یہ ہے کہ عاشق شکار کی مانند ہے۔ ایک ایسے پھندے میں گرفتار ہے جس کی بست و کشاد محبوب کے ہاتھ میں ہے۔ شکار کو ہر دم آزاد ہونے کی فکر رہتی ہے۔ اور صیاد کو ہر لحظہ پھندا مضبوط تر کرنے کا خیال ہے۔ چنانچہ شکار ابھی ایک پھندا نہیں کھول پاتا کہ صیاد دوسری گرہ لگا دیتا ہے۔ اس باہمی کشمکش کو نظیری نے ایک اور شعر میں یوں بیان کیا ہے ؎

بس از وارستگی ہا بیشتر گشتم گرفتارش
چو صیدی جست صیادش نہ اول سخت تر گیرد

نظیری اس شعر میں کہنا یہ چاہتے ہیں کہ عاشق محبوب کی محبت سے ہاتھ اٹھا لینا چاہتا ہے تاکہ اس کو آرام و سکون نصیب ہو سکے۔ لیکن جب وہ اس قسم کا خیال دل میں لاتا ہے۔ تو محبوب کی اداؤں کی بے پناہ کشش اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ اس کے محبوب کی ہر ادا میں ایک کشش اور جاذبیت ہے۔ یہی ادائیں عاشق کو معشوق کا گرویدہ بنا لیتی ہیں۔ بقول میر ؎

گل ہو مہتاب ہو آئینہ ہو خورشید ہو میر
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہو

یا پھر غالب کہتا ہے ؎

بلائے جان ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

نظیری یہ کہنا چاہتے ہیں۔ کہ اس کا معشوق اپنے ناز و ادا اور لگاوٹ کی باتوں سے ہر لحظہ اس کے عشق میں تیزی پیدا کر رہا ہے۔

۳۔ **جراحت**: زخم　　　**مشک سودہ**: پسی ہوئی کستوری۔

ترجمہ:۔ دل مرہم کی امید میں ہے اور یہ مست ہرن ہمارے زخموں پر پسی ہوئی کستوری چھڑکتے ہیں۔

تشریح:۔ زخم پر کستوری چھڑکنا نمک چھڑکنے کے مترادف ہے۔ یہ شعر پہلے شعر کی تفصیل ہے۔ پہلے شعر میں بھی شاعر نے یہی رونا رویا ہے کہ وہ رہائی کی کوشش کرتا ہے۔ اور بجائے رہائی حاصل ہونے کے اس کے قید و بند میں اضافہ ہوتا چلا آتا ہے۔ بالکل اسی طرح اس شعر میں کہتا ہے وہ اپنے زخم دل کے لئے مرہم کا طلب گار ہے۔ لیکن جو کچھ اسے میسر آتا ہے وہ کسی قسم کے آرام کی بجائے مزید تکلیف کا باعث ہے۔ یعنی عشاق تو یہ سمجھتے ہیں کہ محبوب سے مل کر ان کے دل کو راحت نصیب ہوگی۔ اور اس سے دوری کے سبب جو بے قراری تھی وہ دور ہو جائے گی۔ لیکن معشوق اپنی بے وفائی اور دیگر دل آزار باتوں سے ان کے دل کو اور زخمی کر دیتا ہے۔ معشوق کی طرف سے لگائے ہوئے یہ وہ چرکے ہوتے ہیں جن سے عاشقوں کو ایک گونہ لذت اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔

اس شعر میں رعایت لفظی کے ذریعے حسن پیدا ہو گیا ہے، زخم کے ساتھ ایک طرف مرہم اور دوسری طرف مشک کی مناسبت سے آہو اور ان کی مستی کا ذکر ہے۔ ساتھ ہی ساتھ شاعری کی روایت برقرار رہتی ہے۔ جس میں محبوب کو غزال یا آہو کہنا عام ہے۔

۴۔ **دیدہ در خون غنودہ**: خون میں ڈوب کر اونگھتی ہوئی آنکھ۔　　　**حلاوت**: مٹھاس
آسودگی: آرام و آسائش۔

خواب تلخ شدن: نیند حرام ہونا۔　　　**تلخ**: کڑوا۔

ترجمہ:- میرے دل نے کبھی آرام و آسائش کی شیرینی نہیں پائی۔ خون میں ڈوب کر اونگھتی ہوئی آنکھ میں نیند تلخ ہوتی ہے۔

تشریح:- نیند آرام و آسائش کی علامت ہے۔ لیکن جو آنکھ روتے روتے سو جائے تو اس کی نیند میں تلخی کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ جس طرح خون میں ڈوبی ہوئی آنکھ نیند کی آسائش سے لذت یاب نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح شاعر کا دل بھی جس پر پے در پے چرکے لگتے رہتے ہیں۔ کبھی نیند کی آسائش سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا۔ غالب نے اس سے ملتا جلتا مضمون یوں باندھا ہے۔

بخواب چوں خورم آسودہ دل بداں غالب
کہ خستہ غرقہ بخوں خفتہ است تا خفت است

نظیری کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دل عشق بتاں میں زخمی ہے اور عاشق خون کے آنسو روتا رہتا ہے۔ ایسی حالت میں نیند معلوم۔ شاعر اس بے چینی اور بے قراری کو تمثیل کے رنگ میں اس طرح ادا کرتا ہے کہ جو آنکھ خون میں ڈوبی ہوئی ہو۔ اسے نیند تلخ معلوم ہوتی ہے۔ یعنی اسے نیند نہیں آسکتی۔ اس شعر میں صنعت تضاد ہے۔ چونکہ حلاوت کے مقابلے میں لفظ تلخ استعمال ہوا ہے۔

۵۔ **منفعل:** پشیمان — **رنجش بے جا:** بے سبب آزاری۔

گناہِ نبودہ: وہ گناہ جو کہ سرزد ہی نہیں ہوا۔ — بے سبب ناراضگی۔

بینمش۔ اورا بینم۔

ترجمہ:- اس کو بے سبب آزاری یا بے جا ناراضی پر پشیمان نہ دیکھنے کے لئے میں اس قصور کا بھی اعتراف کرتا ہوں جو مجھ سے سرزد نہیں ہوا۔

تشریح:- محبوب کی جفاجوئی کی روایت اوپر بیان ہو چکی ہے۔ وہ بغیر کسی سبب کے عاشق پر ظلم و ستم کرتا ہے اور بلاوجہ اس سے ناراض ہو جا

اپنی اس بے سبب آزاری پر گاہے گاہے اسے پشیمانی بھی ہوتی ہے لیکن عاشق صادق اسے پشیمان نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس لئے کہ ایک تو اس کے جذبہ عشق کا یہی تقاضا ہے کہ وہ اپنے محبوب کو کسی پریشانی میں مبتلا نہ دیکھے۔ دوسرے عاشقوں کو بھی آزار میں ایک قسم کی لذت ملتی ہے جسے وہ ختم نہیں ہونے دینا چاہتے۔ اور ظاہر ہے کہ لذت آزار میں بھی بے سبب آزاری سے مزید لذت کا اضافہ ہوتا ہے جس کے سبب محبوب ناراض ہے یا ستم پر آمادہ ہے۔ حالانکہ اس سے کوئی ایسا گناہ سرزد نہیں ہوا جس کے سبب محبوب کی رنجش سراسر بے جا ہے۔ ادب عاشقی کا تقاضا یہی نیازمندی ہے۔ بقول حافظ

ع تو در طریق ادب باش و گو گناہِ من است

نظیری نے خود بھی ایک اور جگہ پر ایسی ہی نیازمندی کا اظہار کیا ہے

بے سبب دادی گر آزارم تحمل از من مباش
کردہ ام خاطر نشانِ خویش صد تقصیر را

معشوق کے منفعل ہونے کے مضمون کو غالب نے یوں ادا کیا ہے۔

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

خیال رہے کہ رنجش سے مراد ناراضی اور ایذارسانی دونوں لئے جا سکتے ہیں۔ اور یہاں دونوں مفہوم مناسب ہیں۔

۶۔ منظور گشتن، قبولیت پانا دودہ : سیاہی۔
بیہودہ۔ فضول۔ بے جا

ترجمہ :۔ اے نظیری ہمارا کلام یار نے پسند کر لیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم نے یار کی توصیف میں جو کچھ لکھا تھا۔ اس کی سیاہی رائیگاں نہیں گئی۔

تشریح:- اس میں شاعرانہ تعلّی ہے۔ نظیری نے اپنے کلام کی تعریف عجیب انداز میں کی ہے۔ یار عموماً عاشق کی باتوں کو خود غرضی یا خوشامد و تملق پر محمول کرتا ہے۔ اب عاشق کی تعریف اگر اس کو ناپسند آ گئی ہے تو یقیناً کلام میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور ہے۔ مزید برآں اب معشوق ممکن ہے کہ مہربان ہو جائے۔

غزل نمبر ۲

(۱)

حریف: یہ لفظ اضداد میں سے ہے اس کا مطلب دوست بھی ہے اور دشمن بھی
دُرد: تلچھٹ۔
صافی: شراب مصفا۔
دُردی: گدلی شراب (تلچھٹ والی)
دُرد آمیز۔

ترجمہ:- تیری غلطی یہ ہے کہ تو مصفیٰ اور غیر مصفیٰ دونوں قسم کی شرابوں کا متحمل نہیں اور مصیبت یہ ہے کہ تو اچھے اور بُرے میں تمیز کرتا ہے۔

تشریح:- میخواری کرنا اور پھر شراب اور تلچھٹ میں تمیز کرنا کسی بھی میخوار کو زیب نہیں دیتا۔ اسی طرح جو لوگ عشق میں پڑ کر راحت آرام اور رنج و آلام میں تمیز کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت عشق کے اہل نہیں ہیں۔

زندگی دُکھ اور سُکھ کی آمیزش کا نام ہے۔ جو شخص صرف سُکھ کا ہی طلبگار ہے اور اس کے ساتھ دُکھ کا سامنا نہیں کر سکتا۔ وہ زندگی کی حقیقت سے ناآشنا ہے۔ جب انسان آسائش و تکلیف کو علیحدہ علیحدہ کر کے صرف آسائش سے اپنا دامن بھر لینا چاہے تو وہ ایک ناممکن چیز کی جستجو ہے۔ اور بے جا جستجو کا نتیجہ ظاہر ہے۔ تکلیف اور آزار کے سوا کچھ نہیں۔ اس شعر میں زندگی کے حقائق کا سامنا کرنے کا درس دیا گیا ہے۔ جو آسائش اور تکلیف کے امتزاج سے عبارت ہے۔ صرف آسائش کی تلاش

نظیری کے خیال کے مطابق غلطی ہے۔ اور غور کیا جائے تو مصیبت کا سرچشمہ بھی خود یہی بے جا تلاش ہے۔ جگرؔ نے کہا ہے۔

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

جگرؔ ہی کا ایک اور شعر بھی اسی مفہوم کا حامل ہے۔

کانٹوں کا بھی یہ حق ہے آخر
کون بچائے اپنا دامن

اس مقام پر حافظ کا شعر بھی قابل ذکر ہے۔

حافظ از بادِ خزان در چمن دہر مرنج
فکر معقول و گل بے خار کجاست

۲۔ ورق سیہ گشتہ: کاغذ جو سیاہ ہو گیا ہو۔ مدعا: مقصود۔

ترجمہ:۔ دل کے بغیر تمام نقش و نگار بے کار ہیں۔ مدعا تو اسی ورق پر تھا جو سیاہ ہو گیا ہے۔

تشریح:۔ نظیری کے اس شعر میں تصوّف کا رنگ ہے۔ صوفیاء کے نزدیک دل یعنی باطن کی تطہیر اصل غرض و مدعا ہے۔ ظواہر کی درستی اور اصلاح اس مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ مقصود بالذات نہیں۔ یہی بات نظیری نے یوں بیان کی ہے کہ نامۂ اعمال میں حقیقی اہمیت ورقِ دل کی ہے یعنی باطن کو سنوارنا بنیادی چیز ہے۔ ظاہر کو خواہ کتنی ہی عمدگی سے آراستہ کر لیا جائے باطن کی پاکیزگی کے بغیر لاحاصل ہے۔ اسی طرح سے جس طرح کسی کتاب کے غیر اہم اوراق کو نقش و سے مزین کر دیا جاتا ہے اور اس کی اہم ترین ورق پہ سیاہی گرا دی جائے۔

نظیری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ تجوید یعنی غیر محسوس کو تجسیم یعنی محسوس کی طرف لے آتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ ایسے احساسات کو جنہیں انسان کے مادی حواس نہیں پا سکتے ایسی تصویروں میں تبدیل کر دیتا ہے جنہیں مادی حواس پا سکتے۔

۳- فرق: چوٹی۔ سر۔ کرشمہ: اشارہ چشم، ناز و ادا۔

ترجمہ:- اس کے سر سے لے کر قدم تک جہاں بھی نظر ڈالتا ہوں۔ رعنایاں دل کا دامن کھینچ کر یہی کہتی ہیں کہ یہیں بیٹھے رہو۔

تشریح:- یہ شعر نظیری کے نوادرات میں سے ہے۔ اور غیر محسوس کو محسوس بنانے کی ایک انتہائی کامیاب کوشش ہے کہ شاعر نے محبوب کے سراپے کو ایک ایسی محفل سے تشبیہ دی ہے جس کا ہر گوشہ جنت نگاہ ہے۔ مختصر یہ کہ جہاں شعراء نے محبوب کے ایک ایک عضو کی مداح سرائی میں علیحدہ علیحدہ شعر لکھے ہیں۔ وہاں نظیری نے ایک شعر میں اپنے محبوب کے بے پناہ حسن کو کچھ اس طرح سمو دیا ہے کہ ایک شعر دوسرے شعر کے مفصل سراپوں سے زیادہ بھرپور تاثر چھوڑتا ہے۔ سودا نے اس شعر کا بڑا کامیاب ترجمہ کیا ہے۔

جس جا بھی سراپے پہ نظر جائے ہے اس کے
آئے ہے میرے جی میں یہیں عمر بسر ہو

۴- خطا گرفتن: غلطی پکڑنا۔ آشفتہ:
خطاوار ٹھہرانا۔

ترجمہ:- کوئی شخص بھی کسی دیوانے کو خطاوار ٹھہراتا۔ تو دیوانہ نہ ہوتے ہوئے پریشان حال ہے۔ یہی تیری خطا ہے۔

تشریح:- شاعر اپنے آپ سے مخاطب ہے۔ اور عشق پیشہ لوگوں کی ایک اہم الجھن کا تذکرہ کر رہا ہے۔ جو شخص مکمل طور پر مجنون قرار دے دیا جائے لوگ اس کی دیوانگی کے سبب اس کے ہر قصور کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ عاشق کی دیوانگی اگرچہ بہت شدید ہوتی ہے، لیکن کچھ نوعیت کی ہوتی ہے کہ لوگ اسے دیوانہ ماننے پر راضی نہیں ہوتے۔ اور اس کی خطاؤں کی ذمہ دار اس کی دیوانگی کو نہیں ٹھہراتے۔ ان کی نظر میں وہ ایک بھلا چنگا شخص ہے۔ جس نے خواہ مخواہ اپنی حالت بگاڑ رکھی ہے۔

اور یہ ایک ایسا فعل ہے جس پر اسے ملامت کی جانی چاہیے۔ اپنی دیوانگی کی حقیقت کا اظہار عاشق کے بس میں نہیں اور اس سوزِ پنہاں کا ادراک لوگ نہیں کر سکتے۔ نتیجتہً عاشق کو اپنی اس آشفتگی پر جو درحقیقت اس کی شوریدگیٔ طبع کے سبب ہے۔ ملامت سہنی پڑتی ہے۔ اور جل کر وہ یہی کہتا ہے کہ خطا میری ہی ہے کہ میں اپنی دیوانگی کا اتنا بھرپور اظہار نہیں کر سکتا جس سے وہ لوگوں کے نزدیک مسلم ہو جائے۔

اس شعر کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب انسان صحیح طور پر دیوانگی یعنی انتہائے عشق کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے افعال قابلِ گرفت نہیں ہوتے۔ اسے دیوانہ سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس شعر میں شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ اگر تو عاشقِ صادق کہلانا چاہتا ہے تو حقیقی جنونِ عشق پیدا کر۔

۵۔ راہ بستن: راستہ بند کر دینا۔ گذر: راہ

ترجمہ:۔ جب تک محبت کا وجود ہے دل کو دل سے راہ ہے۔ جب تک بادِ صبا ہے۔ باغ کا راستہ بند نہیں کیا جا سکتا۔

تشریح:۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ جب تک دنیا میں عشق و محبت کا وجود ہے اس کا گزر دلوں سے ہوتا رہے گا۔ اور اس طرح جیسے کہ جب تک بادِ صبا کا وجود ہے اسے چمن میں داخل ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ یعنی جب تک اس دنیا میں عشق و محبت کا وجود ہے عاشق و معشوق میں جو دلی تعلق ہے۔ اسے منقطع نہیں کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ پنہاں: پوشیدہ دیرینہ: پرانا۔

ترجمہ:۔ شکر ہے کہ ہماری نیکی اور بدی تجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہے ورنہ ہمیں بہت عرصہ سے جاننے والے ہزاروں دشمن یہاں موجود ہیں۔

تشریح:۔ شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ شکر ہے کہ ہمارے عیب و ثواب تجھ پر عیاں ہیں۔ تو خوب جانتا ہے کہ ہم میں کون سی اچھائی

یا برائی ہے اور کون سی نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو صورت حال بڑی نازک ہو جاتی۔ اس لئے ہمارے ہزاروں ایسے دشمن جو تمہیں عرصہ دراز سے جانتے ہیں۔ یہاں موجود ہیں۔ اگر ہمارے گذشتہ عیب تجھے معلوم نہ ہوتے اور وہ ان عیبوں کو آشکارا کر دیتے تو تیری ناراضی اور ہماری شرمندگی زیادہ ہوتی۔

اگر اس شعر کی صوفیانہ تعبیر کی جائے تو خطاب ذاتِ خداوندی سے مانا جائے گا۔ اور دشمنوں سے مراد شیطانی عناصر لئے جائیں گے جو ازل سے بنی نوع انسان کی گھات میں ہیں۔

۷۔ سرشک: آنسو۔ گرہ کشا: گرہ کھولنے والا، مشکل حل کرنے والا۔

ترجمہ:۔ تیرے فراق میں چشمِ دل کے آنسوؤں کی جو گرہ بندھ گئی ہے وہ نہیں کھلتی۔ اگرچہ گرہ ایک ہے اور اس کے کھولنے والے سینکڑوں ہیں۔

تشریح:۔ دردِ عشق اور فراقِ یار میں عاشق کی جو حالت ہوتی ہے۔ وہ سب پر عیاں ہے۔ کبھی تو روتے روتے عاشق دریا بہا دیتا ہے اور کبھی ضبط گریہ کا یہ عالم ہے کہ دل و جگر دونوں زخمی ہو جاتے ہیں۔ جدائی کی گھڑیاں مہینوں بلکہ سالوں میں کٹتی ہیں۔ عاشق کی اس مشکل کو حل کرنے کے لئے خواہ کتنے ہی چارہ ساز اور مشکل کشا آئیں مگر ان کے پاس عاشق کے اس درد کا مداوا نہیں ہوتا۔ صرف دیدارِ دوست یا وصالِ یار ہی عاشق کے لئے سامانِ راحت ہو سکتا ہے۔

۸۔ متاع: پونجی۔ اخلاص: خلوص۔
کاسد: کھوٹا، جس کی مانگ نہ ہو، جس کا رواج نہ ہو۔ ناروا: ناسازگار۔

ترجمہ:۔ جہاں کہیں میں جاتا ہوں۔ خلوص کا کوئی نہ کوئی خریدار مل ہی جاتا ہے۔

لیکن یہاں پر یہ پونجی بھی کھوٹی ہے۔ اور یہ بازار اس کے لئے ناساز گار ہے
تشریح :- زندگی کے ہر میدان میں خلوص کی قدر کی جاتی ہے لیکن کوچہ محبوب میں
اس متاع کی کوئی قدر نہیں۔ اور یہاں کا بازار اس جنس کے لئے ساز گار نہیں۔
عاشق ہمہ تن اخلاص ہے۔ لیکن اس کا محبوب اس اخلاص کے باوجود اس
سے بے التفاتی برتتا ہے اور اس جنس گرانمایہ کی قدر نہیں کرتا۔ دوسرے
لفظوں میں خلوص ایک ایسا مسئلہ ہے جو محبوب کے ہاں کھوٹا قرار پاتا ہے۔
شاعر کو محبوب سے یہی گلہ ہے جیسا کہ اردو کے کسی شاعر نے کہا ہے۔

تم نے کچھ بھی نہ قدر کی دل کی ✤ اڑ گئی مفت میں ہنسی دل کی

معشوق کی بے وفائی کے بارہ میں اور اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے کہ وفا کیا ہے (غالب)

ہو وفا جس میں وہ معشوق کہاں سے لاؤں
ہے یہ مشکل کہ حسین ہو، ستم ایجاد نہ ہوا (ریاض)

۹- سر کشیدن : روگردانی نیاز : انکساری۔ عاجزی۔
عجز : عاجزی۔

ترجمہ :- اے نظیری! تو کوچہ انکسار سے اپنی نیاز مندی کا سر نہ ہٹا کیونکہ جس
راستے سے بھی تم آؤ۔ انتہا یہیں پاؤ گے۔ (یعنی اسی کوچہ میں پہنچو گے)
تشریح :- شاعر عجز و انکسار کی اہمیت واضح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انسان
کے لئے عجز و انکسار ہی شایان ہے۔ کوئی بھی طرز زندگی اختیار کیا جائے
اگر عقل سلیم ہو تو بالآخر یہی کھلے گا کہ صحیح لائحہ عمل عجز و انکسار ہی ہے۔

غزل نمبر ۳

۱۔ گھات: گھات۔ پیچھے۔ صیاد: شکاری

اجل رسیدہ: جس کی موت آ پہنچی

ترجمہ:۔ (شکار کی) نظر سامنے ہے اور شکاری اس کے پیچھے گھات لگائے بیٹھا ہے۔ جس کی موت آ پہنچی ہو اسے کیا خبر ہوتی ہے کہ مصیبت کہاں چھپی بیٹھی ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں تدبیر کی واماندگی کا اظہار ہے۔ انسان کچھ نہیں جانتا۔ کہ مصیبت اسے کس کس طرف سے پہنچ سکتی ہے۔ جب اس کی اجل آ پہنچے تو تمام تدبیروں کے باوجود ناگہانی طور پر اسے اس کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ بالکل اس پرندے کی مانند جس کی نظر دور دور تک صیاد کو نہ پا کر مطمئن ہو اور صیاد پیچھے سے اس پر ٹوٹ پڑے۔

۲۔ عشوہ: ناز و ادا۔ فتنہ: یہاں پر مراد چشم نیم باز ہی ہے۔

نیم باز: ادھ کھلی

ترجمہ:۔ ہم اس چشم نیم باز کے عشووں سے کس طرح رہائی حاصل کریں کیونکہ فتنہ تو خواب سے بیدار ہو چکا ہے۔ اور ہمارا پاؤں سو گیا ہے۔

تشریح:۔ فتنہ کے بنیادی معنی آزمائش کے ہیں۔ محبوب کی چشم نیم باز کے اشارے عشاق کے لئے ایک کڑی آزمائش ہوتے ہیں۔ شاعر یہی بیان کر رہا ہے۔ کہ ان دل ربا عشووں سے رہائی اس کے بس میں نہیں۔ پھر محبوب کی اس آنکھ کو جو کھل رہی ہے ایسی مصیبت سے تشبیہہ دیتا ہے جو جاگ اٹھی ہے اور اپنی بے کسی کا اظہار کرنے کے لئے یہ بیان دیتا ہے کہ اس کے پاؤں سو گئے ہیں۔ محبوب کی نیم باز آنکھوں کے حسن نے حسن میں اور زیادہ دل کشی پیدا کر دی ہے۔ اسے دیکھ کر عاشق کچھ اس طرح فریفتہ ہو جاتا ہے کہ وہ جہاں بھی ہوتا ہے۔ دم بخود کھڑا رہ جاتا ہے۔ مختصراً یہ

کہ محبوب کے سحرِ جمال کے سامنے اپنی سپردگی اور بے بسی کا اظہار مقصود ہے۔

۳- شمیم: خوشبو۔ مہر: محبت
شگفتن: کھلنا۔ شگفتہ ای۔ تو کھلا ہے۔

ترجمہ :- وفا کے باغ سے محبت کی خوشبو نہیں آتی۔ جس چمن میں تو کھلا ہے وہاں بادِ صبا سو گئی ہے۔

تشریح :- اس شعر کا لہجہ طنزیہ ہے۔ درحقیقت شاعر کو محبوب کی بے وفائی کا گلہ ہے۔ لیکن وہ اسے اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ محبوب کو باغِ وفا کا پھول کہتا ہے اور پھر شکایت کرتا ہے کہ باغِ وفا سے محبت کی خوشبو نہیں آ رہی۔ پھر طنز میں مزید زور پیدا کرنے کے لئے اس کی توجیہہ یوں کرتا ہے۔ کہ جس چمن میں تو کھلا ہے وہاں بادِ صبا ہی نہیں چلتی چنانچہ کوتاہی بادِ صبا کی ہے۔ ورنہ تو تو بلاشبہ باغِ وفا کا پھول ہے۔ اس شعر میں نظیری نے بڑے عمدہ پیرائے میں محبوب کی بے مہری اور بیوفائی کا ذکر کیا ہے۔ آبرو کہتا ہے: ؎

حسن ہے پر خوبروؤں میں وفا کی خو نہیں
پھول ہیں یہ سب پر ان پھولوں میں ہرگز بو نہیں

۴- طمع بریدن: امید منقطع کرنا۔

ترجمہ :- عشق کا چارہ گر ایسے بیمار سے اپنی امید منقطع کر لیتا ہے جو کہ اس لاعلاج مرض سے بے نیاز ہو کر رات بھر آرام میں سویا ہے۔

تشریح :- جو شخص مرضِ عشق کی چارہ گری کرتا ہے اس کی کوشش یہ ہوتی ہے۔ کہ مریض کے عشق کو اس کی تکالیف کا احساس دلاتا رہے۔ اسے اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ عشق سے کنارہ کش ہو جائے لیکن جس مریض کے بارے میں اس کا مشاہدہ یہ ہو کہ وہ اس لاعلاج بیماری کو اپنے سینے

سے لگائے رات بھر چین سے سو سکتا ہے۔ اس کی شفایابی کی امید اسے چھوڑ دینی چاہیئے۔ اس لئے کہ مریض کو اس مرض کی تکلیف کا قطعاً احساس نہیں رہا۔ اور اب اسے ترکِ عشق پہ آمادہ کرنا ناممکن ہے۔

یا پھر طبیب بھی اس ناامیدی کا سبب یوں سمجھئے۔ کہ جب وہ مریضِ عشق کو عشق کی تکالیف کے بارے میں بالکل بے حس پاتا ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ اب یہ درد مریض میں رنج بس گیا ہے۔ اور درد کا اخراج اس کی جان لینے کے مترادف ہے۔ حکیم مومن خاں مومن کا قول ہے۔

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم تو نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

۵۔ ترجمہ :۔ امید کی رات صبح عید سے بہتر انداز سے گزرتی ہے جس میں عاشق معشوق کی تمنا کرتے ہوئے سو گیا ہے۔

تشریح :۔ رات مصائب و آلام کی علامت ہے۔ صبح مسرت اور شادمانی کی۔ لیکن شاعر نے اس رات کو جس میں کوئی چاہنے والا اپنے محبوب کا خوشگوار تصوّر لئے سو جاتا ہے۔ نہ صرف عام صبح سے بلکہ صبح عید سے بھی بڑھ کر قرار دیا ہے۔ مختصراً امیدِ وصال شاعر کے نزدیک عظیم ترین مسرت ہے۔ باباطاہر نے بھی اسی قسم کے خیالوں کا اظہار یوں کیا ہے۔

نسیمی کز بن آں کاکل آیو
مرا خوشتر ز بوی سنبل آیو
بشو گیرم خیالش را در آغوش
سحر از بسترم بوی گل آیو!

غزل نمبر ۴

۱۔ شاہدان: جمع شاہد حسین لوگ۔ قرابہ: مٹکیزہ۔ صراحی، شیشۂ شراب۔ محبوب۔

ترجمہ ۱۔ چمن کی سیر ذرا ہوش سے کر۔ کیونکہ معشوق وہاں پرمستی کے عالم میں ہے۔ انہوں نے بہار کے بادلوں کے سر پر شیشۂ شراب توڑ دیا ہے۔

تشریح:۔ نظیری نے اس شعر میں جوش بہار کی ایک تصویر پیش کی ہے۔ فصل بہار کی رنگینیوں کو شعراء نے بڑے بڑے اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس موسم میں فطرت کی ہر چیز کا حسن نکھر جاتا ہے جنون ذہنی کی کیفیات بہار سے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ غالب نے اپنی ایک غزل میں اس موسم کے حسن اور جوش کا بھرپور اظہار کیا ہے۔

پھر اس انداز سے بہار آئی ۔ کہ ہوئے مہر و ماہ تماشائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر ۔ بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی

نظیری نے بھی اس شعر میں اسی کیفیت کا اظہار کیا ہے کہ بہار نے ہر چیز کو مست کر دیا ہے حسینوں پر مستی کا عالم چھایا ہوا ہے اور اس کے حسن وارفتہ کو دیکھ کر بادل بھی جھوم رہے ہیں۔ ابر پاروں کا خرام بے پرواہ اس بات کا اظہار کر رہا ہے کہ انہوں نے بھی پی رکھی ہے حسینوں کی مستی کی تاثیر بادلوں کو بھی مست کئے جا رہی ہے۔ اسی موضوع پر اور شعر ملاحظہ ہوں۔ طالب آملی کہتا ہے۔

مستی بہار عمر بود دست از و مدار
زیرا کہ دورِ عمر سراسر بہاریہ!

شبلی نعمانی ؎ شاہد و بادہ و ظرف و جوشش بہار
شبلیا خود تو بفرما کہ بہ اینہا چہ کنم؟

۲- پیالہ کش : بادہ خوار   قدح پیما : ساقی
صبوحی : صبح کی شراب   معاشران : ہم نشین

ترجمہ :- چمن شراب کے جام لنڈھا رہا ہے۔ اور صبا جام بھر بھر کے دیئے جا رہی ہے۔ صبح کی شراب پینے والے نیند سے بیدار ہو رہے ہیں۔

تشریح :- یہ شعر بھی بہار یہ ہے۔ اور وہی تاثر اس میں ہے جو مطلع میں تھا۔ شاعر نے بہار کی منظر نگاری کی ہے۔ نشہ اور مستی ہر چیز پر چھا رہے ہیں۔ بادہ پرستی صرف میخوار ہی نہیں کر رہے۔ بلکہ بزم گلستان بھی بزم میکدہ بنی ہوئی ہے۔ شاخوں پر کھلے ہوئے پھول بھی شراب کے ساغر نظر آ رہے ہیں۔ اور صبا کے دامن میں شراب ہی شراب ہے۔ اور یہ شراب پھولوں کے ساغروں میں انڈیل رہی ہے اور صبوحی نوشِ صبا کو شراب سمجھ کر نیند سے بیدار ہو گئے ہیں۔

ہر کوئی ہے نشہ کے عالم میں
سارا عالم شراب خانہ ہے

۳- خرقہ : گدڑی   نہاں : پوشیدہ
حکیم : دانا -   صوفی : عارف - پارسا

ترجمہ :- صوفی اپنی گودڑی کے نیچے چھپ کر شراب پی رہا ہے اور حکیم اور عارف و زاہد سب اسی شراب سے مست ہیں۔

تشریح :- اس شعر میں نظیری نے بیک وقت دو مضمون باندھے ہیں۔ اس میں بہار کی کار فرمائیاں بھی موجود ہیں اور زاہدوں کی ریاکاری کا پردہ بھی چاک ہے۔ بہار کی کرشمہ زائیوں نے زاہدوں کے اتقا اور صوفیوں نے زہد کا پول بھی کھول دیا ہے۔ وہ بھی اپنے دعوئ زہد کے باوجود شراب نوشی پر مجبور ہو گئے ہیں۔ صوفیوں کی مستی کسی شراب معرفت کی مرہون منت نہیں۔ بلکہ انہوں نے بھی یہی شراب پی لی ہے جس کی

مذمت برتتے رہتے ہیں۔ زاہدوں کی یہ پوشیدہ مے خواری ہمارے شعراء کا عام موضوع ہے۔ انہوں نے اکثر و بیشتر ظاہر پرست زاہدوں کی منافقت کو بے نقاب کیا ہے۔ غالب

کہاں مے خانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

حافظ نے بھی اس منافقانہ زہد پر کھل کر وار کئے ہیں۔

واعظاں کیں جلوہ در محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت مے روند آں کار دیگر می کنند

۴۔ قاف: کوہ قاف۔ ایک پہاڑ کا نام۔ سیمرغ: ہما اور عنقا کی طرح ایک فرضی پرندہ ہے کہتے ہیں اس کا بسیرا کوہ قاف پر ہے

ترجمہ:۔ یہ دنیا اور اس کا عیش کوہ قاف کی طرح ہے اور سیمرغ کی مانند ہے۔ فنا کا دروازہ کھٹکھٹا۔ کیونکہ جو فنا ہو گئے ہیں وہی باقی ہیں۔

تشریح:۔ مصرع اولیٰ میں زندگی کی بے ثباتی کا بیان ہے۔ زندگی کی نعمتیں اور یہاں کے آرام و آسائش کی وہی حقیقت ہے جو سیمرغ اور کوہ قاف کے افسانہ کی ہے۔ یعنی حیات دنیوی ایک بے حقیقت چیز ہے اور اس کی طلب بھی بے ثمر ہے۔ دوسرے مصرعہ میں شاعر نے فنا فی الذات ہونے کی تلقین کی ہے۔ فنا ارباب تصوّر کے نزدیک وہ مقام ہے جس میں سالک تمام دنیا کی نعمتوں کو ٹھکرا کر اپنا رشتہ صرف ذاتِ الٰہی سے استوار کرتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس کے بعد وہ بقا کی منزل پر جا پہنچتا ہے۔ اور عیشِ جاوداں سے ہمکنار ہوتا ہے۔ شاعر کے نزدیک جو لوگ اس مقام تک جا پہنچتے ہیں۔ وہ کبھی نہیں مرتے۔ اسی کو حافظ نے عشق سے تعبیر کیا ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما۔

۵- نخلِ خوش ثمر: وہ درخت جس کا پھل اچھا ہو۔ در تو پیوستند: تجھ سے جا ملے
ز خویش بریدند: اپنے آپ سے کٹ گئے۔

ترجمہ:- نرگس کا لگایا ہوا خوش ثمر درخت ہے کہ باغ اور چمن سب کے سب اپنے آپ سے کٹ کر تجھ سے جا ملے ہیں۔

تشریح:- اس شعر میں محبوب کے حسنِ بے پناہ کا تذکرہ ہے۔ یعنی محبوب کا حسن ایسا جاذب اور دلکش ہے کہ جو کوئی اسے دیکھتا ہے۔ اسی کا ہو جاتا ہے۔ حسن کی اس شعبدہ کاری کی مثال نظیری نے ایک ایسے حسین درخت سے دی ہے کہ جس کے حسن سے متاثر ہو کر باغ کی ہر چیز اپنے وجود سے بے نیاز ہو کر اس میں جذب ہو کر رہ گئی ہے۔ بقول شاعر

آنکھ والے راہ میں حیرت کے پتلے بن گئے
کچھ نہ سوجھا خاک کے پتلوں کا عالم دیکھ کر

۶- ترجمہ:- افلاک کی بے تابی سے (رشک کے سبب) میرا سینہ داغ داغ ہے۔ کیونکہ جب سے وہ تیرے شوق میں اُٹھے ہیں۔ پھر نہیں بیٹھے۔

تشریح:- افلاک کی بے قراری سے مراد اس کی گردش ہے۔ شاعر کے نزدیک وہ بھی محبوبِ حقیقی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

ہمہ ہستند سرگردان چو پرکار
پدید آرندۂ خود را طلب گار

لیکن عاشق کے لئے کسی دوسرے عاشق کا وجود باعثِ رشک ہے رشک کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آسمانوں کی گردش میں جو تسلسل اور دوام ہے شاعر بھی اپنے عشق میں اسی دوام کا آرزومند ہے۔ اور اس رشک سے اس نے اپنے خلوصِ عشق کا اظہار کیا ہے۔ وہ بھی تلاش محبوب میں ہمہ تن جستجو اور سراپا آرزو ہے۔

۷۔ نوا: آواز — بربشیم: ساز کے تار
زمزمہ: دھیمے سُروں کا گیت — فزوں: اونچی
عود: ساز کا نام — پست: مدھم لَے

ترجمہ:۔ آوازِ نغمہ ساز کے تاروں کی آواز سے اونچی ہے۔ اس لئے میں غزل کو مدھم آواز میں گا رہا ہوں۔ کیونکہ ساز کی سُریں دھیمی ہیں۔

تشریح:۔ اس شعر میں آوازِ نغمہ سے مراد شاعر کا الہام ہے۔ اور ساز سے سے مراد فنِ شاعری ہے۔ نظیری کہنا یہ چاہتا ہے کہ شاعری کے ساز پر جذبات کو پوری طرح پیش نہیں کیا جا سکتا۔ شعر اگرچہ اظہار کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ لیکن پھر بھی جذبات کی حقیقی کیفیت کا اظہار اس کے بس میں نہیں۔ شاعر کا شعر شرابِ الہام کا پوری طرح متحمل ہو نہیں سکتا۔ اظہار پھر بھی تشنہ رہ جاتا ہے۔ اقبال نے ایک موقع پر کہا تھا کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں کہہ پاتا۔ نظیری کا شعر اسی نکتہ کی وضاحت ہے۔ اسے پوری طرح احساس ہے کہ میرے جذبات کی مکمل عکاسی نہیں ہو سکی۔ اس کی وجہ سازِ شاعری کی کوتاہی ہے۔ یہ ساز وفورِ جذبات کا پورا ساتھ دے ہی نہیں سکتا۔

۸۔

رمز: اشارہ — خلوتیاں: اربابِ معرفت خلوت نشیں لوگ
نکتہ: دقیق بات — سبو: مٹکا۔

ترجمہ:۔ میں دقیق بات کو رمزیہ انداز میں بیان کرتا ہوں۔ کیونکہ اہلِ معرفت نے مٹکے کا منہ کھولنے سے پہلے دروازہ بند کر لیا۔

تشریح:۔ سبو کا منہ نہ کھولنے سے مراد راز افشا نہ کرنا ہے۔ اہلِ معرفت اسرارِ الٰہی کو سرِ عام نہیں کھولا کرتے ہیں۔ دروازہ بند کرنے سے

مراد یہ ہے کہ کوئی نامحرم اسرار محفل میں نہ آجائے۔ کیونکہ ایسا شخص راز کی تاب ہی نہیں لا سکتا۔ راز سے مراد یہاں پر رازِ عشق ہے جس کو ہر کس و ناکس سمجھنے کا اہل نہیں ہے۔ نظیری کہتا ہے کہ میری بات فقط اہل معرفت ہی پا سکیں گے۔ اقبال نے اسی بات کو

اس انداز میں کہا۔ ع

حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

۹۔ میوہ فشاں: پھل بکھیرنے والا۔ حدیقہ: باغ۔

ترجمہ:۔ تو اس دنیا کے باغ میں پھل بکھیرنے والا درخت ہے کیونکہ ایسا قوی سے قوی تر کوئی درخت نہیں ہے کہ جو خشک نہ ہوا ہو۔ اور اسے کاٹ نہ دیا گیا ہو۔

تشریح:۔ اس شعر میں نخل میوہ فشاں سے مراد فیض پہنچانے والے اور درختِ خشک سے مراد بے فیض انسان ہیں۔ قانونِ فطرت ہے کہ جو چیز اپنی افادیت کھو بیٹھتی ہے زمانہ اسے فنا کر دیتا ہے۔ اس شعر میں ایک اخلاقی نکتہ بیان ہوا ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ وہ دوسروں کے کام آئے۔ اور اپنی ذات سے دوسروں کو فیض پہنچائے اگر اس کی فیض رسانی میں کوتاہی ہوئی تو زمانہ اسے مٹا دے گا۔ مختصر یہ کہ انسان کو معاشرے کا مفید۔ اور کار آمد فرد ہونا چاہیئے ورنہ اس کی زندگی معرض خطرہ میں ہے۔ جتنا کوئی انسان دوسروں کو فیض پہنچائے گا۔ اتنا ہی وہ دنیا و آخرت میں سرخرو ہو گا۔ اس کے برعکس بے فیض انسان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ ذوق کہتا ہے

نام مطلوب ہے تو فیض کے اسباب بنا + پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

۱۰ - کاہلی: سستی — بباغ شدی! تو باغ میں گیا۔

وارستن: چھٹکارا پانا — نشاط: خوشی۔ شادمانی۔

ترجمہ:- نظیری تو سستی کی وجہ سے اس باغ کی خزاں ہے جب کبھی بھی تو باغ میں گیا ہے۔ اہلِ گلشن عیش و نشاط سے محروم ہو گئے ہیں۔

تشریح:- چمن سے مراد انجمن ہے۔ شاعر اپنی کاہلی کا گلہ کر رہا ہے کہ اس کی پژمردہ خاطری اہلِ محفل کو بھی پژمردہ کر دیتی ہے۔ یا شاعر اتنا بد نصیب اور سیاہ بخت ہے کہ جب اس کا سایہ اس کے ہم نشینوں پر پڑتا ہے تو وہ بھی خوشی و مسرت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ایک مصرعہ اس شعر کی وضاحت کے لئے کافی ہے۔

افسردہ دل افسردہ کند انجمنی را

غزل نمبر ۵

۱ - برشکستن: درہم برہم ہونا۔ برخاست ہونا۔ جا بکسی رسیدن: کسی کو جگہ ملنا۔

تماشا: نظارہ

ترجمہ:- جب محفل برخاست ہو گئی۔ تو ہمیں دیکھنے کا موقع ملا۔ اور جب بزم میں کوئی نہ رہا تو ہمیں جگہ ملی۔

تشریح:- یہ شعر محرومی کی ایک کامیاب تصویر ہے۔ احساس محرومی کی مجرد کیفیت کو شاعر نے نہایت ہی حسین تمثیل سے واضح کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میری مثال ایک ایسے شخص کی ہے جو کسی محفل میں لطف محفل میں شریک ہونے کے لئے جائے اور اس کے جاتے ہی محفل برخاست ہو جائے۔ یا پھر وہ محفل میں اس وقت پہنچے جب سب لوگ جا چکے ہوں جامی نے بھی اس کیفیت کو اس انداز میں بیان کیا ہے۔

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند
تہی پیمانہ ہا کردند و رفتند!

۲۔ دی: دیشب یا دیروز کی تخفیف   بضاعت: سامان
گزرا ہوا دن یا گزری ہوئی رات: صد کاروان شکر: بہت زیادہ شیرینی۔
خندہ زن: ہنسی اڑانا۔

ترجمہ:۔ کل اس کے ہونٹوں نے مجھ درویش کی بے سروسامانی کی ہنسی اڑائی۔ جس سے بوریئے کی نئے میں بے انتہا شیرینی بھر گئی۔

تشریح:۔ عاشق بے سروسامان ہے۔ اس کی کل کائنات ایک بوریئے کے علاوہ کچھ نہیں۔ محبوب کی اس بے بضاعتی کو موردِ استہزاء قرار دیتا ہے۔ اگرچہ محبوب کے خندۂ استہزاء میں بے پناہ طنز ہے۔ لیکن شاعر کے نزدیک اس کی ہنسی میں اتنی شیرینی ہے جس سے چٹائی کا تنکا تنکا شیرینی سے بھر گیا ہے۔ محبوب نے ہنس کر اسے شیرینی کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے۔

۳۔ عنقا: ایک فرضی پرندہ جس کا   درازی: طوالت
وجود ناپید ہے

ترجمہ:۔ منزل کی دوری کے سبب ہم نے اپنے بال و پر جلا دیئے ہیں۔ کیونکہ ہمیں عنقا کی بے نیازی کا پیغام پہنچ گیا تھا۔

تشریح:۔ ہماری منزل انتہائی دور تھی۔ ہم میں منزل مقصود تک پہنچنے کی طاقت نہ تھی۔ یعنی مقام معرفت ہماری عقل کی پرواز سے بالاتر ہے اس لئے ہم نے اس عقل و خرد کو خیرباد کہہ دیا۔ کیونکہ مقام معرفت تک پہنچنے کے لئے عشق و جنوں درکار ہے۔ عقل مصلحت اندیش کی اس مقام تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ بقول حکیم الامت:-

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

۴۔ **گمراہ**: جو راستہ کھو بیٹھا ہو۔ **از خواب جستن**: نیند سے ہڑبڑا کر
تیرہ شب: شبِ تاریک۔ اٹھ بیٹھنا۔

ترجمہ:۔ اگر ہم گمراہ ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ تیرے حسن نے اتنا شور برپا کیا ہے کہ ہم تاریک رات میں نیند سے چونک اٹھتے ہیں۔

تشریح:۔ اگر رات کے وقت شور برپا ہو جائے تو اور کوئی سویا ہوا اس شور کو سن کر چونک کر اٹھ کھڑا ہو تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس مقام پر پہنچ کر حقیقتِ حال معلوم کرے۔ لیکن اندھیرے کے باعث وہ بھٹک کر رہ جاتا ہے۔ اور منزل تک نہیں پہنچ پاتا۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے۔ کہ ہماری کیفیت بھی اسی راہرو کی سی ہے۔ اور تیرا حسن اس شور کی مانند ہے۔ اس شور کی آواز تو پہنچ رہی ہے۔ لیکن ہماری رسائی معلوم۔ یگانہ نے خوب کہا ہے:۔

چار سو سنتے ہیں اس جلوۂ بے نام کی دھوم
کان مجرم ہیں مگر آنکھ گنہگار نہیں

۵۔ **راہب**: تارک الدنیا **زنار**: وہ دھاگا۔ جو ہندو لوگ اپنے
مجاہدات: جمع مجاہدہ۔ گلے میں ڈالتے ہیں۔
ریاضت و عبادت **ترسا**: عیسائی معشوق۔
بتِ ترسا: مراد وحدت **زنارِ راہب**: سے مراد کثرت۔

ترجمہ:۔ ہزاروں قسم کی عبادت و ریاضت کے بعد ہمیں محبوب ملا ہے اور برہمن کا جنیو ہمارے ہاتھ لگا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں زنار راہب سے مراد کثرت اور بت ترسا سے مراد وحدت ہے مفہوم یہ ہے کہ ہزاروں عبادات اور مجاہدات کے بعد انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ کثرت میں وحدت کا جلوہ دیکھ سکے۔ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اگر ہماری عبادت میں

خلوص نہ ہو تو ایسی عبادتیں انسان کو قرب خداوندی سے محروم کر دیتی ہیں۔

۶۔ ارزش : قیمت ۔ اہلیت۔ التفات : توجہ۔

ترجمہ :۔ ہم ہیں تیرے زخم التفات کی اہلیت کہاں۔ خود تیری نوازشیں اس قدر عام ہو گئی ہیں کہ ہم تک بھی تیری تمنا آ پہنچتی ہے۔

تشریح :۔ ہم اس قابل کہاں تھے کہ تیری تمنا کرتے۔

یہ بھی اک اتفاق ہے ورنہ
میں کہاں تیری بزم ناز کہاں!

عشق حقیقی کی بنیاد پر شعر کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ مفہوم نکلتا ہے کہ خدا کی ذات سے انسان کی کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ انسان کی بساط ہی کیا ہے کہ وہ عشق الٰہی کا دعویٰ کرے۔ لیکن خدا کی رحمتیں اور نوازشیں اس قدر عام ہیں کہ شانِ رحیمیت کے کرشمے یہ حوصلہ پیدا کر دیتے ہیں کہ انسان خدا تک پہنچنے کی تمنا کرنے لگے۔

ع کرم ہای تو مارا کرد گستاخ

۷۔ عنان : باگ ۔ لگام نکہت : خوشبو

ترجمہ :۔ اے نظیری باد بہار اور صحرا کی خوشبو ہم تک پہنچ چکی ہے۔ ایسے میں یہ بات بہت مشکل ہے کہ ہم آہ و فغاں کی باگ کو تھام سکیں۔

تشریح :۔ اس شعر میں نظیری نے کیفیات فراق کو بیان کیا ہے حسین موسم کا تقاضا ہے کہ وصالِ محبوب میسّر آئے۔ لیکن شاعر اپنے محبوب سے دور ہے۔ اس لئے اسے اس موسم کی رنگینیاں کاٹے کھاتی ہیں۔ بادِ صبا نے بہار کی خوشبو ہر طرف پھیلا دی ہے۔ لیکن شاعر اور بھی زیادہ اداس ہو گیا ہے۔ موسم بہار اور فراق کے تضاد نے شاعر کے غم کو تیز کر دیا ہے۔ اور وہ اس قدر افسردہ خاطر ہے کہ آہ و فغاں پر مجبور

ہے۔ اسے اس آہ و زاری پر کوئی اختیار نہیں رہا۔
مے بھی ہے میگسار بھی مینا و جام بھی!
اب کس کو ڈھونڈتی ہے نظر ہم سے پوچھیئے

غزل نمبر ۶

۱۔ چارہ: علاج ہوشمند: صاحب ہوش۔
رموز: جمع رمز۔ اشارہ۔ کنایہ۔

ترجمہ:۔ شراب غم کا علاج ہے۔ یہ بات کسی صاحب عقل کو کیا معلوم۔ یہ تو کڑوی شراب کے اسرار ہیں۔ انھیں قند کہا جائے۔

تشریح:۔ شراب کا خاصہ یہ ہے کہ وہ غم کو مٹا دیتی ہے۔ اور ایک سرمستی اور بے خودی عطا کرتی ہے۔ نظیری نے شراب کی اس خاصیت کو ایک اور جگہ بھی کہا ہے۔

بے کیمیائے مستی تبدیلِ غم محال است
یا مے حلال فرما یا غم حرام گرداں

وہ لوگ جو شراب کی عطا کردہ بے خودی سے ناواقف ہیں۔ وہ اس بات کو نہیں جان سکتے کہ جیسے کڑوی شراب کے راز کو مٹھاس نہیں پا سکتی۔ مختصر یہ کہ اہلِ خرد، رندانِ بادہ پیما کے اسرار کو نہیں پا سکتے۔ بے خودوں کو جو لذت بے خودی حاصل ہے وہ عقل والوں کے نصیب میں کہاں۔

۲۔ سماع: قوالی۔ وجد و سرود
دردکش: تلچھٹ پینے والے۔ میخوار۔

سمندر: ایک کیڑا جو آگ میں رہتا ہے۔
سپند: ہرمل۔ جب اسے آگ میں ڈالا جائے تو تڑتڑ کی آواز پیدا ہوتی ہے۔

ترجمہ :- میخوارون کے سماع کے بارے میں صوفی کیا جانیں ؟ سمندر کی اداؤں کی ہر بل کو کیا خبر -

تشریح :- اس غزل میں ایک وحدت فکر ہے ۔ یہ شعر بھی پہلے شعر ہی کی تفصیل ہے ۔ صوفیوں اور بادہ کشوں میں جو فرق ہے اسے ہربل اور سمندر کے فرق کی تمثیل سے واضح کیا گیا ہے ۔ ہربل کا استعارہ صوفیوں کے لئے ہے ۔ اور سمندر بادہ خواروں کے لئے ۔ سمندر کا کام ہر وقت جلتے رہنا ہے ۔ اس کی زندگی ہی سوز دوام ہے ۔ لیکن ہربل کے لئے ذرا سی آنچ بھی موت کا باعث ہے ۔ ظاہر ہے کہ صوفی مصائب اور امتحانات کی آنچ میں بالکل ہربل کی طرح تنگ حوصلہ ہیں ۔ لیکن ارباب معرفت صبر کی تصویر ہیں ۔ وہ کسی حال میں بھی ہوں کبھی بھی شکایت نہیں کرتے ۔

۴ ۔ افعی : سانپ ۔ نوا گراں : نغمہ الاپنے والے ۔
نخوردہ گزند : جنہیں ڈسا نہیں گیا ۔

ترجمہ :- پھولوں کی شاخ کے نیچے سانپ نے بلبل کو ڈس لیا ہے ۔ جن نغمہ فروشوں کو ڈسا نہیں گیا ۔ ان کو اس بات کی کیا خبر ؟

تشریح :- یہ نظیری کا نہایت ہی معروف شعر ہے ۔ نظیری مطلع سے لے کر اس شعر تک ایک ہی بات کہہ رہے ہیں ۔ لیکن حسن تکرار کے ساتھ ۔ ہر شعر میں ایک ہی مسئلہ ۔ ایک ہی تمثیل سے بیان ہوا ہے ۔ بلبل کے نغموں میں سوز کی آمیزش اس لئے ہے کہ اسے سانپ نے ڈس لیا ہے ۔ لیکن دوسرے لوگ اس حقیقت سے نابلد ہیں ۔ کیونکہ ان کے ساتھ ایسا سلوک نہیں ہوا ۔ جسے راہِ عشق کے مصائب پیش نہیں آتے ۔ وہ ان کا حال کیا جانے جن پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں ۔

شب تاریک و بیم موج و گردابی چنیں حائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا !

۴۔ تہی دستاں، بے سروسامان میوۂ سرشاخ بلند: اونچی شاخ کا میوہ

ترجمہ:۔ ہم تہی دستوں نے جو دامن پھیلا رکھا ہے۔ اونچی شاخ والے پھل کو اس کی کیا خبر؟

تشریح:۔ اس شعر میں نظیری نے محبوب اور عاشق کے ظاہری تضاد کو بڑی عمدہ تمثیل سے بیان کیا ہے۔ محبوب کی مثال ایک ایسے پھل کی سی ہے جو بہت اونچی شاخ پر جلوہ افروز ہے اور عاشق کی مثال ایک ایسے شخص کی سی ہے جس نے اس پھل کو حاصل کرنے کے لئے دامن پھیلا رکھا ہے۔ محبوب انتہائی حسین اور بے انتہا بے نیاز ہے اور عاشق انتہائی نیازمند ہے کیونکہ اس کے محبوب کو اس کی تمنا کی کچھ خبر نہیں۔ تمنا ایک ایسی چیز ہے کہ فاصلے اس میں حائل نہیں ہو سکتے۔ تمنا کی سادگی ہی اس شعر کا مفہوم ہے۔ محبوب بے نیاز ہے۔ لیکن عاشق اس کی تمنا کئے جا رہا ہے۔ اردو کا ایک شعر اس شعر کے مفہوم سے کچھ قریب ضرور ہے لیکن نظیری کے شعر کو نہیں پہنچتا۔

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارہ کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنے

۵۔ مشکل پسند: جو شخص مصائب کو پسند کرتا ہو۔ بندگی: غلامی۔

ترجمہ:۔ تیرا عشق ہر خاص و عام پر داغ بندگی لگاتا ہے۔ مشکل پسند کو تیرے رد و قبول سے کیا واسطہ۔

تشریح:۔ ایک مصائب پسند عاشق کو اس کی پرواہ نہیں کہ اس کا جذبۂ خلوص قبول ہو یا ٹھکرا دیا جائے۔ وہ تو عاشق محض ہے۔ نیازمندی ہی اس کا مقصود ہے۔

بس اک داغِ سجدہ مری کائنات جبینیں تری، آستانے ترے

شیخ و برہمن: مذہبی راہنما۔ پارسا **تصرّف**: قبضہ
کیش: مذہب۔ **ارجمند**: بلند۔ مبارک
گشتند: منحرف ہو گئے۔

ترجمہ:- ہزاروں شیخ اور برہمن اپنے دین و مذہب سے برگشتہ ہو گئے۔ تیری نگاہِ بلند کو اس تصرف کی کیا خبر؟

تشریح:- محبوب کے حسن کافر کی سحر آفرینیوں نے بڑے بڑے متقیوں کی زہد شکنی کی ہے۔ اور وہ اس کے حسن کے اس قدر گرویدہ ہوئے ہیں کہ مذہب سے دست بردار ہو بیٹھے ہیں۔ لیکن محبوب کی نگاہ سحر کار اتنی معصوم ہے کہ اسے اپنی ان کرشمہ زائیوں کی کچھ خبر نہیں اسے کیا خبر کہ اس کے حسن نے کیا کیا فتنے برپا کر دیئے ہیں۔ سعدی فرماتے ہیں۔

چشمت چو تیغ غمزۂ خونخوار بر گرفت
تا عقل و ہوش خلق را یکبار بر گرفت

میر ممنون نے معشوق کی آنکھوں کی تباہی کو اس طرح بیان کیا ہے۔

غلط کہ حرف خرابی ہے گردش شب و روز
کہ گھر کے گھر تیری آنکھوں نے ہیں تباہ کئے

غزل نمبر ۷

۱۔ **تا بکے**: کب تک **خیمہ زدن**: خیمہ لگانا
بر گذر باد: ہوا کے راستے پر **عہد خوبی**: اچھا زمانہ

ترجمہ:- کب تک میں پھول کی طرح ہوا کی گذرگاہ پر خیمہ لگائے رکھوں گا۔ اچھے زمانے کو گزرتا ہوا دیکھوں اور فریاد کرتا رہوں گا۔

تشریح:- شاعر نے زندگی کی بے ثباتی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ زندگی پھول

کی مانند ہے جو ہوا کے راستے پر کھلا ہوا ہے۔ ایک طرف ہوا کے جھونکے اسے توڑ رہے ہیں۔ اور دوسری طرف خزاں کا ہاتھ اس کی طرف لپک رہا ہے۔ نظیری کہتے ہیں کہ زندگی کی یہ گریز پائی اور زود گزری میرے اختیار سے باہر ہے۔ میں کب تک اس کا ماتم کرتا رہوں گا۔ اور عہد رفتہ کی شادمانیوں کو یاد کرتا رہوں۔ مقصود یہ ہے کہ جب زندگی اختیار میں ہی نہیں اور نہ ہی اس کے ماتم سے کچھ فائدہ ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ اس عارضی حیات کا غم کرنا ہی چھوڑ دیا جائے اور دوسری دنیا سے دل لگایا جائے۔ جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ اس فانی دنیا کی مسرت و شادمانی بالکل عارضی چیز ہے۔ بقول غالب

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غالب
گرمیٔ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

لہٰذا اس فانی دنیا کو اپنا مقصود نہیں بنانا چاہیئے۔ شیخ سعدی کہتے ہیں کہ ؎

دنیا پلی است در گزر دارِ آخرت
اہلِ تمیز خانہ نگیرند بر پلی

۲۔ حاصل : مفصل آفت زدگان : مصیبت زدگان
مزرع : کھیتی

ترجمہ :۔ وہ خزانہ تو آفت زدہ لوگوں کی کھیتی کا حاصل ہے۔ میں غلطی سے ویرانے اور آبادی میں قرعہ ڈالتا رہا۔

تشریح :۔ خزانے کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ ویرانوں میں ہوتا ہے۔ شاعر (محبوب حقیقی) کی جستجو میں ویرانوں اور آبادیوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ لیکن اس کی کوشش مشکور نہ ہوئی۔ اور اسے اپنا مقصود نہ مل سکا۔ آخرکار اس پر یہ راز منکشف ہوا کہ یہ خزانہ تو شکستہ دلوں اور

آفت رسیدہ ہستیوں کے پاس ہوتا ہے۔ نگاہِ آئینہ ساز میں ٹوٹا ہوا آئینہ زیادہ عزیز ہے۔ اس کا جلوہ اس آئینے میں پرتو فگن ہوتا ہے۔ شہریار نے خوب کہا ہے۔

ایں دل شکست است درو غیر خدا نیست
یک لحظ خدا از دل شکستہ جدا نیست

خزانۂ معرفت تو صرف غم دیدہ عشاق کے دل میں ہوتا ہے۔ بقول آتش

برنگِ شمع دل جس نے جلایا تیری دوری میں
تو اس نے منزل مقصود کو زیرِ قدم پایا

اردو کا ایک اور شاعر اسی مضمون کو یوں ادا کرتا ہے۔

جب ہوئے برباد اسے آباد تب پایا پتا
بے نشاں ہو کر ملا ہم کو نشانِ کوئے دوست

صائب کہتا ہے ؎

تا نگردد آب دل صائب آہِ آتشیں
نیست ممکن یافتن آں گوہر نایاب را

۳۔ سر کشیدن : باغی ہونا یکساں : برابر
جنگ زدن : جنگ آزما ہونا شوق : عشق

ترجمہ :۔ میں مست عشق ہوں۔ خون اور شراب میری نظر میں برابر ہیں۔ میں ساقی سے منحرف اور جلاد سے نبرد آزما ہو رہا ہوں۔

تشریح :۔ اس شعر میں راہ عشق کا ایک مقام بیان ہوا ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جب عشق کی سرمستی عاشق کو ماورائے امتیاز کر دیتی ہے وہ امتیازات کی حدوں سے نکل جاتا ہے۔ وہ مجازات کی بھول بھلیوں سے بیزار ہو کر ایک ایسی منزل پر جا پہنچتا ہے جو حفظِ مراتب کی حدود سے آگے ہے۔

۴۔ **شمشاد**: ایک درخت کا نام جو سرو کی طرح حسنِ قامت کیلئے مشہور ہے **شانہ**: کنگھی۔
طرّہ: زلفوں کی لٹ۔

ترجمہ:۔ میں تیرے فراق کی شرح باغ کے پرندے (یعنی بلبل) کے سامنے بیان کروں گا۔ اور تیری زلفوں کی کنگھی شمشاد کی زلفوں میں کروں گا۔

تشریح:۔ شاعر نے اس شعر میں اپنے دردِ ہجراں کو دوسرے فرقت زدوں پر فوقیت دی ہے۔ اور محبوب کے حسن کو حسن فطرت کا کامل ترین نمونہ قرار دیا ہے۔ شاعر کا دردِ ہجر بلبل کے دردِ ہجر سے کہیں زیادہ ہے اور اس کے محبوب کی زلفیں شمشاد کی دراز زلفوں سے بھی دراز تر ہیں۔

۵ تفاوت قامتِ یار و قیامت میں ہے اتنا
وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

۵۔ **منہدم گشتن**: گر پڑنا۔ **بیداد**:
کو: کہاں ہے؟ **داد زدن**: انصاف مانگنا۔

ترجمہ:۔ دل کا کعبہ وفا کی بنیاد کی طرح ڈھے گیا ہے۔ کہاں ہے ایسا حاکم جس کے سامنے میں محبوبوں کے ظلم و ستم کے خلاف فریاد کروں۔؟

تشریح:۔ محبوبوں کی بے وفائی مسلم ہے۔ انہوں نے دنیا سے رسم وفا کو ہی مٹا ڈالا ہے۔ اور ان کی سرد مہری سے عاشق کا دل ٹوٹ گیا ہے۔ دل کی مثال تو کعبے کی سی ہے۔ محبوبوں کے جور سے گویا کعبہ منہدم ہو گیا ہے۔ اتنا بڑا جرم سرزد ہونے کے باوجود کوئی بھی ان سے باز پرس کرنے کو تیار نہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میں اپنی فریاد کہاں لے کر جاؤں۔ کون ہے جو میری دادرسی کرے اور اس ظلم کی تلافی کرے جو میرے ساتھ ہوا ہے۔

۶۔ **حدیث**: بات۔ **ناوک**: تیر۔
دل صد پارہ: جس دل کے سینکڑوں ٹکڑے ہو جائیں۔

ترجمہ :- جب میں باغ میں اس سرو کے قد کی بات چھیڑتا ہوں تو گویا شمشاد کے دل صد پارہ پر تیر چلاتا ہوں۔

تشریح :- اس شعر میں محبوب کے حسنِ قامت کا تذکرہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ شمشاد کو اپنے قد پر بڑا ناز ہے۔ لیکن جب میں نے اپنے محبوب کی سرو قامتی کا ذکر اس کے سامنے کیا تو خود کو میرے محبوب سے کمتر جانتے ہوئے رشک و حسد کی آگ میں جلنے لگا۔۔۔ محبوب کا قد اتنا حسین ہے کہ شمشاد کا دل اس کے رشک سے صد پارہ ہو گیا ہے۔ شمشاد کے سامنے محبوب کے قد کا ذکر کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کے دل پر تیر چلانا۔ محبوب کو ہمیشہ دراز قد کہا جاتا ہے۔ کیونکہ دراز قد اوصافِ حسن میں سے ایک ہے۔ بقول حاتم ؎

تم کہ بیٹھے ہوئے اک آفت ہو
اُٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو

۷۔ وردِ سحری : صبح کی عبادت۔ زہاد : جمع زاہد کی۔ پارسا اور متقی لوگ۔
دوش زدن : کندھا مارنا۔

ترجمہ :- میں اور صبح سویرے اُٹھ کے عبادت کروں ؟ نظیری یہ انصاف کا تقاضا نہیں۔ میرے لئے تو یہی مناسب ہے کہ میں میکدہ کی راہ لوں اور زاہدوں کو کندھا مار دوں۔

تشریح :- یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک رند بادہ پرست زاہدوں کا لبادہ اوڑھ لے اور عبادت و ریاضت میں محو ہو جائے۔ اس کے لئے ہے کہ وہ میخواری کا طریقہ اختیار کرے اور میکدے کی راہ لے۔ دراصل نظیری نے زاہدوں کی ریاکاری پر طنز کی ہے اور رندوں کی غیر منافقانہ روشِ زیست کو سراہا ہے۔ ظاہر داری اور منافقت سے بہتر ہے کہ انسان کھل کر گناہ کرے یا گناہ کا راستہ اختیار کرے۔ اگر میخانہ سے مے خانہ معرفت مراد لیا جائے۔

تو مطلب یہ ہو گا کہ جو لوگ شرابِ معرفت کے دلدادہ ہیں۔ انہیں زاہدوں کی طرح ریاکارانہ عبادت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی مضمون کو حافظ نے یوں ادا کیا ہے۔

صلاحِ کار کجا و منِ خراب کجا
ببیں تفاوتِ رہ کز کجاست تا بکجا

غزل نمبر ۸

۱۔ سنبل: ایک قسم کی گھاس   ناتواں: کمزور

ترجمہ:۔ کبھی تو میں سنبل کے فرش پر اور کبھی گھاس پہ گرتا ہوں۔ میں کمزور ہوں دیکھیں کہاں گرتا پڑتا ہوں۔

تشریح:۔ شاعر نے اس شعر میں اپنی ناتوانی بیان کی ہے۔ دردِ عشق نے شاعر کو اس درجہ ناتواں کر دیا ہے کہ وہ کہیں جا گرتا ہے اور کبھی کہیں گر پڑتا ہے۔ شعراء کے ہاں ناتوانی کا اظہار عام ہے۔ لیکن نظیری کے ہاں تو لطافتِ بیان اپنے کمال پر ہے۔ اس نے ناتوانی کی مثال بادِ صبا سے دی ہے۔ یعنی سوزِ عشق جسمانی طور پر تو ضرور کمزور کر دیتا ہے لیکن روح کی لطافتیں بھی عطا کرتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ تشبیہ بڑی کامل ہے اردو کے ایک شعر میں اس ناتوانی کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن نزاکتِ خیال۔ کے اعتبار سے وہ شعر نظیری کے شعر کو نہیں پہنچتا۔

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ
ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا

۲۔ سرود: گیت۔   آشفتہ: پریشان۔
خاطرم: میرا دل۔   آمد شد: آنا جانا

ترجمہ :- ہر آہنگ اور نغمہ پر میرا دل پریشان ہو جاتا ہے۔ میری مثال اس پھول کی سی ہے جو باد صبا کی آمد و شد سے گر جاتا ہے۔

تشریح :- یہ شعر بھی بڑا لطیف ہے۔ طبع شاعر بڑی حساس ہے۔ دل شاعر کے ساز پر ایک ہلکی سی چوٹ بھی بے پناہ ارتعاش پیدا کر دیتی ہے۔ ہر آہٹ اور صدا اس کے لئے وجہ اضطراب ہے۔

۳۔ سوزی : تو جلائے۔ گرم : اگر مجھے۔
گرد سر کسی گردیدن : کسی پر قربان ہونا

ترجمہ :- اگر تو مجھے سو بار بھی جلائے تو میں پھر بھی تیری بلائیں لیتا ہوں۔ میں پروانہ نہیں ہوں۔ کہ ایک ہی بار جلنے سے ختم ہو جاؤں۔

تشریح :- شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ پروانے کا عشق لاابالی پن ہے۔ اس کی یہ سوزش بڑی مختصر ہے۔ وہ ایک ہی بار جلنے سے راکھ بن جاتا ہے۔ لیکن میرا عشق پروانے کے عشق کے مقابلے میں زیادہ پائیدار ہے اور میرا حوصلہ بھی پروانے سے بڑھ کر ہے۔ وہ تنگ حوصلہ ہے جو جلوؤں کی تاب نہیں لا سکتا۔ میرے عشق میں سوز دوام ہے۔ میں جل کر مٹ جانے سے زیادہ جلتے رہنے کا قائل ہوں۔

۴۔ گریہ آمدن : رونا روزِ جزا : یوم حشر
خضرؑ : ایک مشہور پیغمبر ہیں جن کو آب بقا پینے کی وجہ سے ہمیشہ کی زندگی ملی ہے ان کا کام رہنمائی ہے۔

ترجمہ :- جب میں قیامت کے دن کے موقع پر تیرے شہیدوں کے بارے میں سوچتا ہوں۔ تو مجھے خضرؑ کی بے قدری اور کم دمی پر رونا آتا ہے۔

تشریح :- خضر علیہ السلام کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ سکندر کو آبِ حیات

پلانے کے لئے ساتھ لے گئے تو خود آگے بڑھ کر آب حیات پی لیا اور سکندر کو مایوس و ناکام واپس لوٹنا پڑا۔ خضر کو زندگی جاوید مل گئی لیکن وہ تاقیامت لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہیں گے

شاعر اس سے یہ مضمون پیدا کرتا ہے کہ اگرچہ خضر کو زندگی جاوید عطا ہوئی لیکن چونکہ وہ اس (محبوب حقیقی) کے عشق میں فنا نہ ہوئے اس لئے انہیں وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جو ایک شہیدِ عشق کو ملا۔ یعنی اس طرح زندگی جاوید حاصل کرنے کی نسبت عشق میں فنا ہو جانا زیادہ قابل قدر ہے۔ کیونکہ شہیدِ عشق کو بھی زندگانی جاوید حاصل ہوتی ہے مگر اس کا مرتبہ کہیں بلند ہوتا ہے۔ خضر کے متعلق بھی ہمارے شعراء نے نئے نئے مضمون نکالے ہیں۔ مثلاً غالب کہتا ہے ؎

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے راہنما کرے کوئی

ذوق ؎ جو لذت آشنائے مرگ ہوتا خضر تو ہرگز
نہ پیتا آب حیواں ڈوب مرتا آب حیواں میں

؎ شربتِ مرگ سے محروم نہ رہتا کبھی خضر
لیک ناکام اسے آبِ بقا نے رکھا

فارسی کا ایک شاعر کہتا ہے :-

بہارِ عمر ملاقاتِ دوست داران ست
چہ حظ برد خضر از عمرِ جاودان تنہا

ذوق ؎ مزے جو موت کے عاشق کبھی بیاں کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

اردو کا ایک اور شاعر کہتا ہے ؎

کھا کھا کے رشک تیرے شہیدانِ عشق سے
غم کھا نہ جائے خضر کو عمرِ دراز کا

۵. بے خود: مست۔ نشے کے عالم میں۔

ترجمہ:۔ نظیری میں محبوب کی بزم وصال سے مست و سرشار ہو کر آرہا ہوں۔ مجھ پر ایک نشہ طاری ہے۔ نہیں معلوم کہ کہاں گر پڑوں!۔

تشریح:۔ شعر کا موضوع لذتِ وصال ہے۔ محبوب سے مل کر عاشق پر جو نشہ و سرور طاری ہوتا ہے اس کے آگے شراب کا نشہ تو بالکل ہی ہیچ ہے۔ شاعر کو نعمتِ وصل میسّر آئی ہے اور اس نعمت سے فیضیاب ہونے کے بعد اس پر عجیب قسم کی بے خودی طاری ہے۔ وہ اس محفلِ نشاط میں اپنی ذات اور اپنے وجود کو فراموش کر بیٹھا ہے اور سرور و کیف کا ایک عجیب عالم محسوس کر رہا ہے۔ وصل کے بعد کی تنہائی بھی ایک نیا ہے

غزل نمبر ۹

۱۔ دل نہادن: دل لگانا۔ وداع: رخصت۔

دی: موسم خزاں۔

ترجمہ:۔ دنیا کے رنگ سے دل نہ لگا۔ بہار اور خزاں کے موسم دیکھ۔ ہزار دل پتیوں والے گلاب اور لالہ کے حسن کو رخصت ہوتا ہوا دیکھ۔

تشریح:۔ نظیری نے اس شعر میں دنیا کی بے ثباتی کا احساس دلا کر درسِ عبرت کی فراہمی کی ہے زندگی تغیر کا نام ہے۔ دنیا سے دل لگانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیوں کہ اس کا حسن فانی اور ناپائیدار ہے۔ پھول کتنے حسین ہیں لیکن بزمِ ہستی میں یہ مہمان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے اس دنیا کے فانی اور اس کے عارضی حسن سے دل لگانا بے مقصود ہے۔ اس لئے ایسی چیز یا ہستی سے دل لگانا چاہیئے جو لازوال ہو۔

۲۔ خستہ : تھکا ہوا۔ زخمی۔ کوچ : روانگی۔

ترجمہ :۔ بنفشہ تھکا ہوا ہے، نرگس سو رہی ہے اور پھول محوِ سفر ہے۔ ذرا ہمسفروں کی وفا اور دوستوں کا اتفاق دیکھ۔

تشریح :۔ بے ثباتی اور فنا کے احساس کے ساتھ ساتھ اس شعر میں دنیا کی دوستی اور ان دوستوں کے اتفاق پر بھی طنز ہے یہ دنیا ایسی ہے کہ جہاں ایک مقام پر رہتے ہوئے بھی لوگ اتفاق کی دولت سے محروم ہیں۔ ہر کوئی اپنی اپنی کیفیت میں محو ہے۔ کسی کو خبر نہیں کہ دوسرا کس حال میں ہے۔ نفسا نفسی کا عالم ہے۔

۳۔ پارہ : ٹکڑا۔ آگند است : اٹی ہوئی ہے۔

گلعذار : پھول کے سے رخسار والا۔

ترجمہ :۔ خلق کے جگر کے ٹکڑوں سے خاک اٹی ہوئی ہے۔ پھول کے سینے کے چاک سے گلعذاروں کا داغ دیکھ۔

تشریح :۔ اس شعر میں بھی وہی فنا کی لہر ہے۔ خیام نے اس موضوع پر بہت خوبصورت رباعیات کہی ہیں۔

ہر ذرہ کہ در خاک زمینی بودہ است
پیشی از من و تو تاج و نگینی بودہ است
گرد ز رخِ نازنین بہ آزرم فشاں
کاں ہم رخ خوب نازنینی بودہ است

غالب کہتا ہے۔ ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اسی طرح نظیری نے بھی پہلے مصرعہ میں یہی کہا ہے کہ ؎

زمیں مھا گئی آسماں کیسے کیسے ؟!

اور دوسرے مصرعہ میں یہ پھولوں کے سینوں میں داغ نظر آتے ہیں۔ یہ دراصل ان مہ وشوں کے سینوں کے داغ ہیں یعنی یہ وہ داغ یا جگر کے ہیں۔ جو انہوں نے عشق میں کھائے ہیں۔ یہی داغ مرنے کے بعد ان کی خاک سے پھولوں کے داغ کی صورت میں نمایاں ہو گئے ہیں۔

۴۔ شہریارہ: بادشاہ۔ حاکم۔ جور: ظلم و ستم

ترجمہ:۔ ان (محبوبوں) نے اپنے ظلم و ستم سے دلوں کے مکان برباد کر ڈالے ہیں ذرا ان بادشاہوں کو دیکھو۔ جنہیں اپنے ملک کی پرواہ نہیں۔

تشریح:۔ سلاطین کا فرض ہے کہ وہ شہروں کو آباد و شاداب رکھیں لیکن یہ حسین لوگ جو دلوں کے حکمران ہیں یہ دل کی آبادی کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ بلکہ الٹا اپنے ظلم و ستم سے سے انہوں نے عشاق کے دلوں کو ویران و برباد کر رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دل ہی محبوب کا مقام ہے۔ لیکن وہ اسی کو پامال کرنے پر آمادہ ہے۔ یعنی اپنے ہی ملک کو برباد کرنے کے درپے ہے۔ گرامی نے خوب کہا ہے۔

بیوفا قصدِ قلبِ من داری
دشمنِ خانۂ خدا شدہ ای

اردو کے ایک شاعر نے بھی اس مضمون کو بڑی سادگی اور پرکاری سے بیان کیا ہے ؎

گر یہ دل ناشاد کرو گے اپنا ہی گھر برباد کرو گے

۵۔ آزادہ: ایک آزاد طریق: راستہ
رستگاراں: نجات پانے والے۔

ترجمہ:۔ تو اس مسافرت میں کسی کو بھی (فکر دنیا سے) آزاد نہیں پائے گا۔ اہلِ فنا کا راستہ اختیار کرلے اور ان سے نجات یافتہ لوگوں کو دیکھ۔

تشریح:۔ مسافرت سے مراد حیات دنیوی ہے۔ ایسا انسان یہاں پر ایک بھی

نہیں. جو مصائب اور آلام و افکار سے آزاد ہو. جب تک کہ خواہشات کا غلام رہے. انسان مشکلوں میں گرفتار رہتا ہے. نجات یافتہ لوگ وہی ہیں جنہوں نے فنا کا راستہ اختیار کر لیا ہے. یعنی دنیاوی خواہشات کو یکسر ٹھکرا دیا ہے.

شاعر کہتا ہے کہ دنیوی آلائشوں سے پاک ہو کر اس محبوبِ حقیقی سے دل لگاؤ. تاکہ تم صحیح طور پر مصائب و آلام سے آزاد رہ سکو.

۶ - آبِ دیدہ : آنسو.

ترجمہ :- نظیری! آنسوؤں سے ہی وفا کا پھول کھلتا ہے. جس باغ میں میں ہوں اس کی بارش کا فیضان دیکھ -

تشریح :- شعراء کے نزدیک. گریہ کی بہت اہمیت ہے. گریہ احساسِ ندامت کا کرشمہ ہے. اور یہی وہ بارش ہے جو دل کی آلائشوں کو دھو ڈالتی ہے. اور یہ بارش صرف باغِ عشق میں ہی میسر آ سکتی ہے. اور یہی وہ بارش ہے جو محبوب کے دل میں وفا کا پھول کھلا سکتی ہے - یا عاشق کو وفا پر استوار رکھ سکتی ہے. بقول رومی ؂

ہر کجا باران بود خضرت بود
ہر کجا گریہ بود رحمت بود

صد ۱۹۳

غزل نمبر ۱

۱ - عنان دادن : سپرد کرنا　　ہوس : لالچ - حرص و ہوا -
چنگ : پنجہ - ساز　　دریغ : افسوس

ترجمہ :- تو نے اپنی لگام نفس کے ہاتھ میں دے دی ہے. تو ہوس کے پنجے میں گرفتار ہو گیا ہے -

تشریح :- نظیری کی اس غزل میں اخلاقی آہنگ ابھرا ہوا ہے۔ اور ایک ناصح کی حیثیت میں نظر آ رہا ہے۔ زندگی کی بے ثباتی کا ردِ عمل اس کے ہاں یہی ہے کہ انسان کے پاس فرصتِ زیست بہت کم ہے۔ بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی گمراہی پر پچھتائے اور اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو۔

انسان کو خطاب کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ افسوس کی بات ہے کہ تو اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود گناہوں کی آلودگی میں پھنس گیا ہے اور تو نے حرص و ہوس کو اختیار کر لیا ہے۔ حالانکہ یہ طرزِ زیست تیرے شایانِ شان نہیں۔ تیری اس حالت پر افسوس ہے۔

۳- بستان : بوستان- باغ سجادہ : جانماز
سبحہ : تسبیح مراد عبادت و پرہیزگاری۔

ترجمہ :- تو مستوں کے نغمہ اور صحن گلستان کا مشتاق ہے۔ تجھ پر افسوس ہے کہ تو تسبیح اور سجادہ کا شائق نہیں۔

تشریح :- اس شعر میں بھی وہی بات دوسرے انداز میں کہی ہے کہ اے مخاطب (انسان) تو ہر وقت لہو و لہب میں مشغول رہتا ہے۔ افسوس! کہ تو اس ذاتِ اقدس کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ یعنی اس کی عبادت و بندگی نہیں کرتا۔ اس دنیائے فانی کا عیش و نشاط بھی عارضی ہے۔ انسان کو اس میں نہ کھو جانا چاہیئے۔ بلکہ اسے آخرت کا بھی سامان کرنا چاہیئے۔ جہاں اس کی اصل زندگی شروع ہو گی۔

۴- زعیشہای صبوحی : عصمت : پاک دامنی۔
صبوحی - صبح کی شراب۔

ترجمہ :- تو نے صبح کے عیش و نشاط سے کون کون سے داغ ہیں جو کہ عصمت کے دامن پر نہیں لگائے۔ افسوس ہے تجھ پر۔

تشریح:۔ صبح کا وقت عبادت کے لئے بہترین وقت ہے۔ انسان تو ایک طرف۔ چرند و پرند تک سب اس ذاتِ اقدس کی ثنا خوانی میں معروف رہتے ہیں۔ لیکن اگر ایک انسان اس وقت لہو و لعب اور مے نوشی میں مصروف ہو تو ظاہر ہے کہ اس کا یہ فعل انسان، جسے فرشتوں نے سجدہ کیا تھا، کی طہارت اور تقدیس پر کتنا بد نما دھبہ ہو گا۔ انسان کو لہو و لعب سے بچنا چاہیئے۔

فرہنگ:۔

۵۔ **صیدِ ضعیفاں:** جہاں کمزور لوگوں (جانوروں) کو شکار کیا جائے۔ **تیر کشادن:** تیر چلانا۔ تیر خالی کرنا۔

ترجمہ:۔ کون کونسے تیر ہیں جو تو نے کمزوروں کی شکار گاہ میں اپنے شوخی کے بازو سے نہیں چلائے۔ تجھ پر حیف ہے۔

تشریح:۔ جب کسی کو کوئی اقتدار حاصل ہوتا ہے تو وہ کمزوروں پر مشقِ ستم کرتا ہے۔ انسان کو اس سے باز رہنا اور ڈرنا چاہیئے کیونکہ اقتدار مستقل چیز نہیں ہے۔ آج جو مسندِ حکومت پر بیٹھا ہے وہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ اس پر متمکن رہے۔ انقلابات و حادثاتِ زمانہ کے تحت ممکن ہے کہ اسے دربدر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں اور پھر اس کے ساتھ زمانے والے وہی سلوک کریں جو اس نے دوسروں کے ساتھ کیا تھا۔ اس لئے لازم ہے کہ انسان جب برسرِ اقتدار ہو تو اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر کمزوروں پر ظلم نہ روا رکھے بلکہ ہر ایک کے ساتھ انسانی ہمدردی کا مظاہرہ کرے۔

چو زور مند شدیم از دہانِ مسکیناں
بہ جبر لقمہ ربودیم و در گلو کردیم

فرہنگ:-

۶۔ جمال: خوبصورتی، حسن۔ خو: عادت

کوفیاں: کوفہ کے رہنے والے موصلیاں: موصل کے رہنے والے

جنہوں نے امام حسین کو خود بلایا اور جو بہت حسین ہوتے ہیں۔

پھر شہید کر دیا۔

ترجمہ: حسن کے معاملے میں تو تو اہلِ موصل کی طرح ہے۔ لیکن فطرت کے لحاظ سے تو کوفی ہے۔ افسوس ہے کہ تو کسی شہرِ وفا میں پیدا نہیں ہوا۔

تشریح:۔ محبوب کی بے وفائی کا تذکرہ ہے۔ کہ جتنا اس کا ظاہر حسین ہے اتنا ہی باطن کے لحاظ سے وہ بُرا ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ جتنا وہ حسین ہے اتنا ہی اس کی عادت و اطوار اچھی ہوتیں۔ لیکن معاملہ برعکس ہے۔ اس میں وفا نام کو نہیں۔ اسے اپنے چاہنے والوں کا کوئی احساس نہیں اور وہ اس پر ظلم و جور روا رکھتا ہے۔ کاش کہ وہ کسی ایسے شہر میں پیدا ہوتا جہاں کے لوگ وفا آشنا ہوتے۔

۷۔ فرہنگ: زمام: باگ۔ لگام تنگ بادہ: جو تھوڑی سی پی کر بہک جائے

جرعہ: گھونٹ۔ سبک وقار: بے وقار

ترجمہ:۔ تو ایک ہی گھونٹ پی لینے سے شرم کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔ افسوس کہ تو بے وقار ہے اور بہت جلد بہک جاتا ہے۔

تشریح:۔ انسان کو کم ظرفی سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ ہر دم اپنے وقار کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ اور حیا کی حدود کو پھلانگنا نہیں چاہیئے۔

فرہنگ:

عتاب ورزیدن: غصہ کرنا کین: دشمنی۔ کینہ

اظہار ناراضگی کرنا۔ اہل دل: عشاق۔

۸۔ ترجمہ:۔ تو نظیری کی ہر بات پر اس پر عتاب کرتا ہے افسوس ہے کہ تو اہل دل

کی دشمنی پر آمادہ ہے۔

تشریح:- ہماری ادبی روایات کے مطابق معشوق ہمیشہ اپنے چاہنے والوں پر عتاب نازل کرتا ہے۔ یہ معاملہ ہمارے سب شعرا کو پیش آتا ہے مثلاً غالبؔ کہتا ہے۔ ؎

ہر اک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے"

تم ہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

اردو کا ایک اور شاعر اسی موضوع کو اس رنگ میں پیش کرتا ہے۔

؎ لگے ہو منہ چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب

زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

شاعر محبوب سے کہتا ہے کہ چاہیئے تو یہ کہ تو عاشق سے محبت اور الفت سے پیش آئے۔ لیکن تو الٹا ان کی ہر ہر بات پر ناراضی و خفگی کا اظہار کرتا ہے۔ یہ امر قابل افسوس ہے۔ اور تجھ ایسے حسین کے شایانِ شان نہیں۔

ملک الشعراء محمد تقی بہار

نام میرزا محمد تقی ہے۔ بہار تخلص کرتے تھے۔ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۰۴ ہجری ق کو مشہد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد محمد کاظم صبوری بلند پایہ شاعر تھے۔ ناصر الدین قاچار بادشاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ جنہوں نے انہیں ملک الشعراء کا خطاب دے رکھا تھا۔

بہار نے تخلص میرزا نصر اللہ بہار شیروانی کی نسبت سے رکھا تھا۔ مرزا صاحب بہار کے والد محمد کاظم صبوری کے خاص احباب میں سے تھے۔ وہ خود بھی ایک بلند پایہ ادیب اور صاحب طرز شاعر تھے۔

بہار نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ وہ بچپن میں نقاشی اور پھولوں سے بہت محبت رکھتے تھے۔ اور اپنا زیادہ وقت ایسی کتابیں دیکھنے میں صرف کرتے جن میں تصاویر ہوتی تھیں۔ اسی والہانہ محبت کا نتیجہ تھا۔ کہ وہ ایام طفولیت سے ہی نقاشی کی طرف مائل ہو گئے۔ انہوں نے اس زمانہ کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک دن والد بزرگوار گھر پر نہیں تھے۔ میں ان کے کمرہ میں چلا گیا۔ میں نے ایک کاغذ دیکھا جس پر ایک بڑی سی مہر لگی ہوئی تھی۔ میں نے اس مہر کے حاشیہ میں گھوڑوں اور آدمیوں کی شکلیں بنانا شروع کر دیں۔ اچانک والدہ محترمہ کمرہ میں داخل ہوئیں۔ وہ خفا ہوئیں اور کاغذ مجھ سے چھین کر ایک صندوق میں رکھ دیا۔ جب میں کچھ بڑا ہوا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ کاغذ ناصر الدین شاہ قاچار کا حکم نامہ تھا جس پر میں قلم طرازی کر رہا تھا۔

ابتدائی تعلیم: چار سال کی عمر میں بہار کو اپنی چچی کے ہاں قرآن کریم پڑھنے کے لئے بھیج دیا۔ چھ سال کے ہوئے تو انہیں مردانہ مدرسہ میں داخل کرا دیا۔ مدرسہ میں قرآن کریم اور فارسی کا اچھی طرح مطالعہ کیا۔ تعطیلات میں

والد ماجد سے شاہنامہ پڑھتے اور مشکل الفاظ کے معانی یاد کرتے تھے۔ شاہنامہ ہی انھیں تاریخ ایران کے مطالعہ کی طرف راغب کرنے کا موجب بنا، یہی نہیں بلکہ شعر و شاعری کا ذوق بھی اسی مطالعہ نے پیدا کیا۔ یہاں تک کہ ان کا پہلا شعر بھی شاہنامہ کی بحر میں ہی لکھا گیا ہے ؎

تہمتن بپوشید ببر بیان بیامد بمیداں چو شیر ژیاں

بہار لکھتے ہیں کہ والد محترم نے یہ شعر سنا تو بہت خوش ہوئے اور دس تومان انعام دیا۔ پندرہ سال تک کی عمر تک وہ میری شاعری سے بہت دلچسپی کا اظہار کرتے رہے۔ پھر اچانک ان کے رویہ میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اس کی وجہ ایران کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات تھے۔ یہ تبدیلی اتنی بڑھ گئی کہ انہوں نے مجھے شعر کہنے سے تقریباً منع ہی کر دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں تجارت کا پیشہ اختیار کر لوں۔ ان کا خیال تھا کہ شاعری کا مستقبل اب تاریک ہے اسی لئے وہ میرے لئے کسی دوسرے پیشے کے لئے متجسس تھے۔ ایک دفعہ تو انہوں نے مجھے سکول جانے سے بھی روک دیا۔

اعلیٰ تعلیم: بہار نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ ادبیات فارسی کا مطالعہ والد کی نگرانی میں کیا۔ علم ریاضی و منطق کے لئے عبدالرحمن شیرازی کی شاگردی اختیار کی۔ عربی و فارسی کی اعلیٰ تعلیم کے لئے چند سال میرزا عبدالجواد و ادیب پشاوری و صید علی خان کی صحبت میں گزارے۔ اس کے بعد حالات حاضرہ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ چنانچہ مصری مجلات و مطبوعات کا گہرا مطالعہ شروع کیا۔ مغربی علوم و فنون اور جدید ترقی یافتہ علوم میں خصوصی دلچسپی لینے لگے۔ انہی دنوں والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ تمام خاندان کا بوجھ ان کے کندھوں پر آپڑا۔ یہ ۱۳۲۲ھ کا واقعہ ہے اب کسب معاش کی فکر دامن گیر ہوئی۔ عید میلاد کا موقعہ تھا کہ ایک قصیدہ لکھا اور دربار میں حاضر ہوتے۔ اہل دربار اس قصیدہ سے بہت متاثر ہوئے۔ بادشاہ

نے دل کھول کر داد دی۔ وہ قصیدہ یوں شروع ہوتا ہے۔

آمد چوں دو نیمہ برفت از شب آں سادہ بنا گوش سیم غبغب

کہتے ہیں کہ حبیب بہار نے ان اشعار کو پڑھا

با چہرۂ روشن چو تافتہ روز با طرہ تاری چو نیلگون شب

بنشست و مرا زیر لب ہمی گفت خیز ای ہنری شاعر مہذب

تو اہل دربار کو یہ یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اتنی مشکل بحر اور ثقیل وزن میں ایک نوآموز شاعر اتنی پختگیٔ فن کا ثبوت دے سکتا ہے۔ انہیں گمان ہوا کہ بہار نے اپنے باپ کے اشعار یاد کر رکھے ہیں۔ جنہیں وہ پڑھ کر سنا رہا ہے۔ اسی شک کی بنا پر انہوں نے بہار کا امتحان لینا شروع کر دیا۔ آپ کو کہا گیا کہ تسبیح، چراغ، نمک اور چنار کو رباعی کے وزن میں اکٹھا کیا جائے۔ یہ ایک کٹھن منزل تھی۔ لیکن شاعر کی فطری ذہانت نے ساتھ دیا۔

با خرقہ و تسبیح مرا دید چو یار گفتا ز چراغِ زہد ناید انوار

کس شہد ندیدہ است در کان نمک کس میوہ نچیدہ است از شاخ چنار

اسی طرح ایک شوخ و شنگ نوجوان نے کاغذ پر یہ الفاظ لکھے اور کہا کہ اگر ان کو رباعی کے وزن میں جمع کر دیں تو مانیں۔ الفاظ یہ ہیں۔ ۱۔ آئینہ ۲۔ غورہ۔ ۳۔ ارہ ۴۔ کنش۔ بہار نے ان الفاظ سے ایک ہجو تیار کی اور اس کی شوخی کا جواب دیا۔

چوں آئینہ نیز گشتی احسنت چوں ارہ بخلق تیز گشتی احسنت

در کنش ادیباں جہاں کردی پای غورہ نشدہ مویز گشتی احسنت

اس واقعہ کے بعد احباب ان کی شاعری کے قائل ہو گئے اور دشمن اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

تحریک آزادی میں شمولیت: بہار کو چودہ سال کی عمر میں باپ کے ساتھ آزادی پسندوں کی مجالس میں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔

باپ کی وفات کے بعد جب آپ جدید سیاسی زندگی سے واقف ہوئے تو قوم کی خدمت کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا۔ ایک شاعر کے لئے جو دربار سے وابستہ ہو۔ ایسے مقصد کو اپنانا قوم کے لئے بہت بڑی قربانی تھی۔ ان کے پاس اس اقدام کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی روزی کو ٹھکرا رہے تھے۔ لیکن وہ دل کے مالک تھے۔ وہ اپنے ملک کو سیاسی موت مرتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں وہ تحریک مشروطہ میں شامل ہو گئے۔ چند آزادی پسند نوجوانوں کے ساتھ مل کر انجمن سعادت تشکیل دی۔ بہار کی شخصیت اس انجمن کے ذریعے بہت ابھری۔ ان کی پرجوش تقاریر اور پرولولہ اشعار نے ایران کی سیاسی زندگی میں ہیجان پیدا کر دیا۔ انہوں نے مختلف رسائل و جرائد مثلاً خراسان، طوس اور خورشید میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ ان مضامین نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ یہ واقعات ۱۹۰۰ عیسوی کے ہیں۔ اپنی یادداشت میں انہوں نے خود لکھا ہے :۔

"میرے اولین سیاسی اور اجتماعی اشعار ۱۳۲۵ - ۱۳۲۶ ھ ق میں شائع ہوئے"

بہار کی سیاست میں دلچسپی سے ایک نیا اسلوب فارسی ادب میں وجود میں آیا۔ اور شاعری اب سیاسی خیالات کی ترجمانی کا ذریعہ بن گئی۔ ان کے سیاسی اشعار کے چند ایک نمونے یہ ہیں:

بادشہ ایران سخن گفتن ز آزادی خطا است ‌ ‌ ‌ ‌ کار ایران با خدا است

مذہب شاہنشہ ایران ز مذہبہا جدا است ‌ ‌ ‌ ‌ " " "

ان اشعار سے ان کی سیاسی زندگی بہت ہی معروف ہو گئی۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ اگر میں ہزار قصیدے بھی بادشاہ کی مدح میں لکھ دیتا تو اتنا مشہور نہ ہوتا۔ جتنا کہ ان چند قصائد کو لکھنے سے ہوا ہوں۔

حریت پسند افواج نے جب رجب ۱۳۲۷ ھ ق میں تہران کو فتح کر لیا۔ تو شاہ نے استعفیٰ دیدیا اور روسی سفارت خانہ میں پناہ گزیں ہوا۔ اس

اس وقت بہار کے اشعار آزادی خواہوں کی صفوں میں بہت مقبول تھے اور زبانِ زدِ خاص و عام تھے۔

۱۳۲۸ھ ق (۱۹۰۹ء) کے اوائل میں ڈیموکریٹک پارٹی میں شامل ہوئے۔ اسی سال انہوں نے روزنامہ نوبہار شائع کیا۔ اور اپنی پارٹی کے نمائندہ منتخب ہوئے۔ یہ رسالہ حکومت نے روسی دباؤ کے تحت ایک سال کے بعد بند کرا دیا۔ دوسرے ہی سال انہوں نے ایک ہفتہ وار اخبار تازہ بہار کے نام سے جاری کیا۔ یہ بھی ۱۳۳۰ھ ق میں بند کر دیا گیا۔ ۱۳۳۱ھ ق میں وہ مشہد لوٹے تو نوبہار کو پھر سے جاری کیا۔ نو ماہ کے بعد یہ بھی بند کر دیا گیا۔ انہوں نے بھی روسیوں کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا اور اس قسم کے اشعار سے قوم کی رگوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کیا۔

ہاں ای ایرانیاں ایران اندر بلاست
مملکت داریوش دستخوش نیکاست!

روسی دباؤ کے تحت حکومت نے انہیں ایسے اشعار لکھنے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن حکومت ناکام رہی آخر کار انھیں شہر بدر کر دیا گیا۔ وہ مجبور کر دیئے گئے کہ رشتہ داروں اور عزیزوں سے دور چلے جاویں۔ وہ بے حد مغموم اور اداس تھے ان کو تسلی دینے کے لئے صرف آٹھ ساتھی تھے۔ بہار کے چلے جانے کے بعد ایک روسی ایجنٹ یوسف خان نے ایک جماعت کی تشکیل کی جو تحریک مشروطہ اور ڈیموکریٹک پارٹی کے خلاف تھی۔ یہ تحریک روس کی پشت پناہی سے وجود میں آئی تھی۔ روس ایران میں انتشار پیدا کر کے آزادی خواہوں کی جمعیت کو کمزور کرنا چاہتا تھا۔ اس جماعت نے ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ ق میں مسجد گوہرشاد میں خوب مجلس جمائی۔ لیکن اس کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ اسی زمانہ میں محمد علی میرزا کی افواج کو آزادی خواہوں کی افواج کے ہاتھوں شکستِ فاش ہوئی۔ روس نے مجبور ہو کر اس جماعت

کی حمایت سے باز رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن روسی امداد ختم ہو جانے کے باوجود اس جماعت نے اپنی تخریبی کارروائیاں بند نہ کیں اور بے شمار بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلتی رہی۔ قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم رکھا۔ حریت پسند افواج جب مشہد میں داخل ہوئیں تو اس جماعت کا قتل عام کیا گیا۔

۱۳۳۱ھ ق میں بہار تہران سے دوبارہ مشہد آئے۔ یہاں آکر انہوں نے اپنا کام جاری رکھا اور قوم میں سیاسی شعور اور اجتماعی جذبہ پیدا کرنے کے لئے کوشاں رہے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے تعدد ازدواج اور پردہ کے خلاف مضامین بھی لکھنے شروع کئے۔ بہار نے ان علماء کے خلاف بھی زبان کھولی۔ جو قرآن مجید کی تفسیر اپنے مقاصد کے لئے جس طرح چاہتے تھے کر لیتے تھے۔ علماء کب آرام سے بیٹھنے والے تھے آپ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا گیا۔ اور طرح طرح کی تکالیف پہنچائیں۔ لیکن بہار نے ان تمام مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے کوشاں رہے۔

۱۳۳۲ھ ق میں بہار تیسری دفعہ مجلس کے ممبر منتخب ہوئے۔ اب دوبارہ کوشش کر کے رسالہ نو بہار جاری کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب روس و انگلستان کا سیاسی دباؤ ایران پر اتنا بھاری ہو چکا تھا کہ خود وزیر اعظم ناصر الملک نے اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ اب کوئی معجزہ ہی ایران کو سیاسی موت سے بچا سکتا ہے۔ قدرت نے یہ معجزہ جنگ عظیم کی شکل میں ظاہر کیا۔ جرمن افواج کے ہاتھوں روس کی لگاتار شکستوں سے ایرانیوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ ۱۳۳۳ھ ق میں روسی افواج نے قزوین سے تہران کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ انہوں نے نو بہار میں خبر شائع کی کہ "دشمن نے حملہ کر دیا"۔ حکومت نے نو بہار کو اس جرم میں پھر بند کر دیا۔ اور انہیں تہران سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ بہار چند ساتھیوں کے ہمراہ تہران سے قم چلے گئے۔ قم میں آپ کی جدوجہد کو بہت تقویت پہنچی۔ اس کی بڑی وجہ اہل قم کا بہار کے ساتھ تعاون تھا۔ جہاں آپ نے روسیوں کے خلاف لڑنے کے لئے

ایرانیوں کو تیار کیا۔ انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک رات کو ایک مہم پر جاتے ہوئے آپ کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ علاج کے لئے واپس تہران آئے۔ لیکن زیادہ وقت نہیں ہوا تھا کہ تہران بھیج دیئے گئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہاں سے پھر آپ تہران واپس بلا لئے گئے۔ خوش قسمتی سے روس میں انقلاب آ گیا۔ اور ایرانیوں کو کچھ عرصہ کے لئے روسیوں کی مداخلت سے نجات مل گئی اور ۱۲۹۷ شمسی ۱۹۱۹ عیسوی کو بہار نے ایک نیا مجلہ "دانشکدہ" کے نام سے جاری کیا۔ مگر نیا مجلہ بھی ایک سال سے زیادہ عرصہ تک شائع نہ ہو سکا لیکن اس کے اثرات بہت دیرپا ثابت ہوئے۔ ۱۳۰۱ شمسی میں ایک اور ہفت روزہ مجلہ نوبہار کے نام سے جاری کیا۔ لیکن اس مجلہ میں زیادہ تر ادبی اور تحقیقی مقالے ہی شائع ہوتے رہے۔ ۱۳۰۴ شمسی میں رضا شاہ تخت نشین ہوئے۔ بہار بھی انتخاب لڑے اور حکومت کی انتہائی مخالفت کے باوجود کامیاب ہو گئے۔ حکومت نے وزارت تعلیم کا عہدہ دیا جس کو آپ نے نہایت خوش اسلوبی سے نبھایا۔ ۱۳۰۸ (۱۹۳۰ء) میں آپ ایک مہینہ کے لئے قید کر دیئے گئے۔ قید میں آپ نے غزلیں اور قصائد سیاسی طرز کے لکھے۔ جن میں سب سے مشہور یہ ہے۔

قدرت شاہاں ز تسلیم فقیراں بیش نیست

قدر سلطان امن تر از کلبۂ درویش نیست

۱۳۱۱-۱۳۱۲ شمسی بہار پانچ ماہ کے لئے قید کر دیئے گئے۔ تہران میں قید کاٹی۔ پھر ایک سال کے لئے اپنے پورے کنبہ کے ساتھ اصفہان میں جلاوطن کر دیئے گئے۔ قید و بند اور دیگر مصائب نے ان کی مالی حالت بہت کمزور کر دی تھی۔ یہ دن بہت ہی تنگی میں کٹے۔ آخرکار چند احباب کی کوششوں سے رضا شاہ نے بہار کو مشروط رہائی دی۔ واپس تہران آئے۔ اب وہ سیاست میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ اس لئے زیادہ وقت اہل علم و فضل کی مجالس میں گزارتے رہے۔ ان دنوں تہران یونیورسٹی میں سبک شناسی

پر لیکچر بھی دیتے تھے۔

۱۳۲۰ھ میں جب رضا شاہ کا اقتدار چھن گیا تو وہ دوبارہ میدانِ سیاست میں کود پڑے۔ نو بہار پھر سے جاری کیا۔ چھٹی بار مجلس کے ممبر منتخب ہوئے۔ قوام السلطنت کے عہدِ اقتدار میں پھر وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔

سیر و سیاحت:۔ ۱۳۲۸ھ میں سیاحت یورپ کے لئے نکلے۔ لزین میں قیام کیا ۱۹۵۰ء میں گورنر جنرل پاکستان غلام محمد نے آپ کو پاکستان آنے کی دعوت دی۔ بہار کو اس نوزائیدہ اسلامی مملکت کو دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ سفر کے تمام اسباب مکمل ہو گئے۔ لیکن اچانک بیماری نے سفر کرنے کی اجازت نہ دی۔

اشاعتِ دیوان:۔ بہار کی مالی حالت اتنی اچھی نہ تھی کہ خود دیوان چھپوا سکتے۔ اس کے علاوہ حکومت بھی نہیں چاہتی تھی کہ آپ کے دیوان میں وہ اشعار شائع ہوں۔ جو حکومت کے خلاف لکھے گئے تھے۔ اس لئے دیوان کی اشاعت کافی دیر کی رہی۔ آخر کار ایک دوست کی مدد سے دیوان شائع ہوا

وفات:۔ کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد وہ یکم الہ دی بہشت ۱۳۳۰ھ ق (بمطابق ۱۹۵۱ء) کو وفات پا گئے۔

مقامِ بہار:۔ ملک الشعراء بہار عصر حاضر کے عظیم المرتبت شعراء کی صف میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ان شعراء میں سے نہیں تھے جو شاعری کو خود فراموشی یا تعیش کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ بلکہ وہ ایک مفکر تھے۔ ان کی آنکھوں نے حالات کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تھا۔ ان کا دماغ ایک فلسفی کا دماغ تھا جس میں حالات و واقعات کا اندازہ بڑے صحیح طریقے سے لگایا جاتا تھا۔ ان کی شخصیت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ شاعر اور مفکر۔ ایک شاعر کی حیثیت سے ان کے احساسات و جذبات ایک عام آدمی سے زیادہ بیدار تھے۔ وہ ایک مفکر کی حیثیت سے واقعات کا تجزیہ گہری نظر سے کر سکتے تھے۔ اس لئے ان کا اندازِ شاعری فنی اعتبار سے کلاسیکل ہے۔ لیکن اندازِ فکر کی حیثیت سے جدید ہے۔

آپ کی وفات پر مختلف شعراء اور اہلِ قلم نے آپ کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے۔ علامہ دہخدا نے انہیں معاصر شعراء میں سب سے بلند پایہ اور سب سے لطیف فصیح شاعر قرار دیا ہے۔ انہوں نے بہار کو معاصر شعراء میں سبک خراسانی میں سب سے بڑا شاعر گردانتے ہوئے کہا ہے۔

چوتھی اور پانچویں صدی کے اواخر تک اس سبک میں اتنی لطیف اور فصیح شاعری پیدا نہیں ہو سکی۔ آقائے سعید نفیسی نے انہیں، بلند ترین شاعر کا نام دیا ہے۔

آپ کی شاعری کا خاصہ یہ ہے کہ فن و اسلوب کے لحاظ سے سبک خراسانی کی آئینہ دار ہے۔ لیکن افکار و معانی کے اعتبار سے نئی ہے۔ مثلاً آپ کے قصائد میں فنی زاویے بالکل نئے ہیں۔ ان کے قصائد کسی بادشاہ یا دربار کی مدح سے نہیں بلکہ جذبۂ ملی سے بھرپور ہیں۔ اور حب الوطنی کا جذبہ ان میں غایت درجہ تک پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری عوام کو جدید سیاسی اقتدار سے متعارف کرانے کے لئے مشعل راہ ہے۔ اکثر قصائد میں ایران کی عظمت رفتہ پہ آنسو بہائے گئے ہیں اور جدید سیاسی بدحالی اور قومی پستی کا رونا روتے ہوئے قوم سے پر درد الفاظ میں اپیل کی گئی ہے کہ وہ اجتماعی ترقی اور قومی یک جہتی کے لئے کوشش کرے۔ ظاہر ہے کہ ایسے افکار قدیم شاعری سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ؎

بہوش باش کہ ایران ترا پیام دہد
پیام ترا بعہد عزت و احترام دہد

ایک دوسرے قصیدے میں ایران کی عظمت رفتہ کا نقشہ یوں کھینچا ہے ؎

این ہمان ملکی است کاندر باستان بینی دراو
داریوش از مصر تا پنجاب فرمان گستر است

اے شہنشاہِ جوان بخت ای کہ قلبِ پاک تو
پرتو افگن بر وطن چون آفتاب خاور است
فرصتت بادا کہ زخمِ ملک را مرہم نہی
از ثمرۂ شفقت کہ ایران سخت زار و مضطر است

بہار اس عقیدہ کے قائل ہیں کہ شاعر کو جدید سیاسی، معاشی اور اجتماعی معاملات کو سامنے رکھ کر اپنی قوم کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرنا چاہیئے۔ روس اور انگلستان کی ایران پر بالادستی نے اس ملک کو سیاسی موت کے دروازے تک دھکیل دیا تھا۔ ایران کا قدیم اثاثہ تہذیب و تمدن اپنی موت مرتا جا رہا تھا۔ نئی پود ملک کی عظمتِ رفتہ سے بے بہرہ ہو کر مغربی تہذیب اپنا رہی تھی۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کی ثقافت، تہذیب و تمدن، افکار و قائد کو گھٹیا اور بے کار سمجھ کر ٹھکرا رہی تھی۔ بہار نے نئی پود کو اس بے راہروی اور علمی گمراہی سے بچانے کے لئے ایران کی قدیم ثقافت کی عظمت کو یوں واضح کیا ہے ؎

زدرسِ پارسی و تازی احتراز مکن — کہ این دو قوتِ ملی علی الدوام دہد
شعائرِ پدران و معارفِ اجداد — حیات و قدرتِ اقوام را قوام دہد
مباش غرہ بتقلیدِ غربیان کہ شرق — اگر دہد ہنرِ شرقی احترام دہد
تو شرقی و شرق اندر کمالاتی است — ولی چہ سود کہ غربت فریب تام دہد

بہار وہ مفکرِ عظیم ہیں کہ جن کے قلم نے قوم کی خوابیدہ غیرت کو جھنجھوڑا اور س کی رگوں میں جوش و ولولہ اور غیرت و حمیت کا خون دوڑایا۔ قوم کی سیاسی حالتِ ار کا نقشہ اتنے مؤثر انداز میں کھینچا جو صرف بہار کے ہی قلم کا خاصہ ہے ؎

زچشمِ مامِ وطن خون چکد بر این آفاق — کہ سرخیِ شفقش جلوۂ صبح و شام دہد
بہ خطاب کند با دو دیدۂ خونبار — کہ کیست آنکہ بمن خونِ خویش وام دہد

ایران کے اس فرزندِ عظیم کے سینہ میں ایک بے باک اور نڈر دل تھا۔ وہ اس

حقیقت کے قائل تھے کہ وقت کی آندھیوں کا مقابلہ آنکھیں بند کر کے نہیں کیا جا سکتا۔ قید و بند اور دیگر مصائب زندگی کے گہرے اندھیرے انھیں مشعلِ ہدایت روشن کرنے سے باز نہیں رکھ سکے۔ وہ ایک نقاد تھے اور ان کا قلم ہر اس شخص کی خبر لیتا تھا جس کا قدم مفادِ ملی کے منافی راستوں پر پڑتا تھا۔ محمد علی شاہ کی سیاسی گمراہی اور قوم سے بے تعلقی نے ایران کو مصائب کے گڑھوں میں دھکیل دیا تھا۔ بہار نے شاہِ وقت کی جاہ و عظمت کا خوف کھائے بغیر ایک نظم لکھی۔ اور مشیر السلطنت کے ذریعے اسے پہنچا دی۔

پاسبانا تا بچند این سستی و خواب گران   پاسبان را نیست خواب از خواب سر بردار ہاں
گلۂ خود را نگر بی پاسبان و بی شبان   یک طرف گرگِ دماں و یک طرف شیر ژیان

بہار نے غزلیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن اس صنف سخن میں بھی انہوں نے اپنے بلند مقصد کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان کی غزلیں بھی اکثر سیاسی رنگ میں ہی ہیں۔

خوبرویان از دیا بازیچہ در مردن ما   حیلہ سازند گر اعجاز مسیحا دارند
عاشقاں را سر آزادی و استقلال است   کی زپولتیک سر زلفِ تو پروا دارند

آپ کی ایک مثنوی بھی ہے جس کا عنوان ہے چہار خطابہ۔ اس میں رضا شاہ کو خطاب کر کے انہیں اصلاح کی ترغیب دی گئی ہے۔

بہار نے تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کی تصنیفیں بہت ہی مقبول ہیں۔

زمن نگارم خبر ندارد
بحالِ زارم نظر ندارد

غزل بہار

فرہنگ : صفحہ ۱۶۷

جور : ظلم

آشفتہ تر : پریشان تر۔

شوقت : شوقِ تو۔ تیرا شوق

بکویت : بہ کوئے تو۔ تیرے کوچہ میں

بیداد گر : ظلم کرنے والا۔ بے انصاف

درخور : قابل۔ لائق۔ سزاوار۔

بدر کردن : خارج کرنا۔ باہر نکالنا

بدامانت : بداماںِ تو۔ تیرے دامن میں

آبِ دیدہ : اشک۔ آنسو۔

ہرچہ باشد : جیسے بھی ہو، چاہے کچھ ہو

طرۂ ات : طرۂ تو۔ تیری زلف

عشقِ جہانسوزت : عشقِ جہاں سوزِ تو تیرا دنیا کو جلانے والا عشق۔

براہت : براہِ تو۔ تیری راہ میں۔

داد گر : منصف۔ انصاف کرنے والا۔

غمت : غمِ تو۔ تیرا غم۔

ننشیند : نہ بیٹھے۔

روی گیتی : روئے زمین۔ روئے جہاں۔

نیم شب : آدھی رات

دل سختت : دلِ سختِ تو۔

ترجمہ وتشریح :۔

ترجمہ شعر (۱) آخرکار ہم دنیا کو تیرے جور وستم سے خبردار کردیں گے اور خلقِ خدا کو تیری زلف سے زیادہ پریشان کریں گے۔

تشریح :۔ ابھی تک تو ہم تیرے مظالم خاموشی سے سہتے ہیں۔ لیکن کب تک ؟ بالآخر ہم تیری جفا وجور کا راز فاش کردیں گے۔ اور دنیا کو تیری زلفوں سے بھی زیادہ پریشان کردیں گے۔

بہار رموز وکنایات کے پردے میں سیاسی واقعات پیش کرنے کے لئے بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ اس شعر میں بھی انہوں نے غالباً روس کے ظلم وستم کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ترجمہ شعر (۲) پہلے تو ہم تیرے عشقِ جہاں سوز کی مدد لیں گے اور پھر تیرے عشق کی

مدد سے دنیا کو مزار توں میں بھر دیں گے۔

تشریح :- بہار ایک وطن پرست شاعر تھے۔ اس غزل میں بھی ان کا روئے سخن / مجبوب وطن ہی کی طرف ہے۔

اے میرے مجبوب! پہلے تو ہم خود اپنے دل میں تیرے عشق کی جوت جگائیں گے اور پھر دنیا بھر میں تیرے عشق کی آگ لگا دیں گے۔ یعنی دنیا کو بھی تیرا دالہ شیدا بنا دیں گے۔

ترجمہ شعر (۳) اگر تجھے ہماری جان کی ضرورت پڑی تو ہم تیرے کوچے میں اپنی جان کی پونجی بھی ہار دیں گے۔ اور اگر تجھے ہمارا سر درکار ہے تو سر بھی تیری راہ میں قربان کر دیں گے۔

تشریح :- اے وطن عزیز! اگر ضرورت پڑی تو ہم تیری بقا اور سلامتی کے لئے اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔ اور تیری سربلندی کے لئے ہمیں سر دینے سے بھی دریغ نہ ہوگا۔

شعر (۴) تیرے غم عشق میں، میں اپنے دردناک نالوں سے ظالم ستارے کو بھی منصف بنا دوں گا۔

تشریح :- میں تیرے عشق میں اس قدر آہ و بکا کروں گا کہ تیرے مقدر کا بے رحم ستارہ بھی رحم دل ہوجائے گا۔ یعنی اے میرے وطن! میری پرخلوص گریہ زاری سے تیری تقدیر بدل جائے گی۔ اور تجھ پر جو ادبار کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ چھٹ جائیں گے۔

ترجمہ شعر (۵) تک تیرے غم کی شرح سننے کے قابل ایک دنیا پیدا کریں۔ ہم اپنے آپ کو اس عالم فانی سے باہر نکال لیں گے۔

تشریح :- اے میرے مجبوب وطن! تیرے غم کی شرح اس قدر دردناک ہے کہ ہم جیسے بوڑھے اس کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ اس لئے ہم اس عالم فانی سے رخصت ہوتے ہیں۔ تاکہ باحوصلہ نوجوانوں کی پود ہماری جگہ لے لے۔

ترجمہ شعر (۶) تاکہ ہماری مٹی سے تیرے دامن پر گرد وغبار نہ پڑے۔ ہم روئے زمین کو اپنے آنسوؤں سے تر کر دیں گے۔

تشریح:- ہم زمین کو اسلیئے اپنے آنسوؤں سے تر کر رہے ہیں۔ تاکہ ہماری خاک اڑ کر تمہارے مقدس دامن کو آلودہ نہ کرے۔ اہل ایران دراصل روتے تو اپنی پامالی اور زبوں حالی پر ہیں لیکن شاعر نے حسن تعلیل سے شعر میں انتہائی لطافت پیدا کر دی ہے۔

ترجمہ شعر (۷) پھر آہ نیم شبی یا دعا یا نظر کی مدد سے یا جیسے بھی ہو سکا۔ تیرے سخت دل پر اثر کریں گے۔

تشریح:- ہم آہ نیم شبی یا دعائے سحر گاہی یا کسی مردِ خدا کی نظرِ کیمیا اثر کی مدد سے یا جیسے بھی بن پڑا۔ تیری قلبِ ماہیت کر دیں گے۔ اور تو بالآخر ترکِ جفا کر کے مائل بہ کرم ہوگا۔

ترجمہ شعر (۸) بہار کی طرح اپنی جان شیریں سے دست بردار ہو جائیں گے اور پھر اس کے بعد تیرے کوچے کو شور و شر سے بھر دیں گے۔

تشریح:- تو اگر ہماری فریاد نہیں سنتا۔ تو ہم تیرے کوچے میں ایک شور برپا کر دیں گے۔ تاکہ تو ہماری فریاد سننے پر مجبور ہو جائے۔ زیادہ سے تو ہماری جان لے سکتا ہے لیکن ہم بہار کی طرح سرگرم فغاں ہونے سے پیشتر اپنی جان سے ہاتھ دھو لیں گے۔

لالۂ خونین

فرہنگ:- صفحہ ۱۶۸

خونین کفن: خون میں لتھڑا ہوا کفن
مستورہ: چھپا ہوا۔ پوشیدہ
سر آوردہ: سر نکالے ہوئے۔
نوخیز: نوخاستہ۔ نوخیز۔ تازہ اگا ہوا

جنگِ جہانی : عالمگیر جنگ۔ جنگِ عظیم
قتال : قتل و غارت۔ جنگ و جدل
خامہ : قلم۔
صفحۂ گیتی : تختۂ زمین۔
ذوق : شوق۔ لگاؤ۔
دُود : دھواں
کوہ و کمر : پہاڑ اور وادی۔
در آوردن : نکالنا۔
باختر : مغرب۔
لخت لخت : ٹکڑے ٹکڑے تھوڑا تھوڑا
جفائے فلک : آسمان کا جور و ستم۔
تقلید : پیروی۔
رنجبر : دکھ اٹھانیوالے تکلیف اٹھانیوالے

رمز : اشارہ۔ کنایہ۔
سپہر : آسمان۔
صحفہ : ہموار زمین۔ وسیع جگہ اسٹیج
حریق : سوزش جلن۔ بھڑکتی ہوئی آگ۔
صلح جویانہ : صلح ڈھونڈتے ہوئے۔ امن چاہتے ہوئے۔
مدفون : دفن شدہ۔
خاورِ دور : مشرقِ بعید۔
فشردن : نچوڑنا۔ دبانا۔
مسامات : مسام کی جمع۔ بنِ مو۔ جسم کے باریک سوراخ۔
خونابہ : خونِ ناب۔ خالص خون۔

ترجمہ و تشریح :-

ترجمہ شعر (۱) خون آلود کفن میں ملبوس گل لالہ نے خاکِ زمین سے سر باہر نکالا۔ اور اپنے ساتھ قلبِ انسانی کی پوشیدہ مٹی کو بھی نکال لایا۔

تشریح :۔ شاعر گل لالہ کو دیکھ کر خیالات کی رو میں بہہ گیا ہے اس کو کئی چیزوں سے مماثل ٹھہراتا ہے اور اس کی سرخی کی کئی توجیہیں کرتا ہے۔ اس شعر میں وہ اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ یا تو گل لالہ نے سرخ کفن پہنا ہوا ہے اور یا یہ قلبِ انسانی ہے کہ زمین میں پوشیدہ تھا۔ اور اب منظر عام پر آ گیا ہے گل لالہ کو قلبِ انسانی سے مشابہ ٹھہرانا خالی از لطف نہیں۔

ترجمہ شعر (۲) نہیں یہ تازہ اُگا ہوا لالے کا پھول زمین کا جگر ہے جو کہ جنگ عظیم کے پنجے نے اس کے سینے سے باہر نکالا ہے۔

تشریح :- اچانک شاعر کا ذہن گذشتہ "جنگ عظیم کی طرف پلٹتا ہے تو وہ اس کو زمین کا لختِ جگر قرار دے دیتا ہے۔ جیسے جنگ کے ہلاکت آفریں پنجے نے بطن گیتی سے نکال باہر کیا ہے۔

ترجمہ شعر (۳) یہ اس قتل و غارت کی علامت ہے جو نقاشِ سپہر یعنی آسمان نے اپنے موقلم سے دھوئیں کی سیاہی اور شراروں کی سرخی کی آمیزش سے بنائی ہے۔

تشریح :- یہ شعر گذشتہ شعر سے مربوط ہے۔ اس شعر میں شاعر نے گل لالہ کو جنگِ عظیم کے آگ اور خون کے کھیل کی علامت قرار دیا ہے جو کہ نقش گر آسمان نے وضع کی ہے۔

ترجمہ شعر (۴) یا دھرتی زمین پر جلی ہوئی آگ ہے جسے قدرت کے ذوقِ صنعت گری نے بصورتِ مختصر اسے باہر نکالا ہے۔

تشریح :- شاعر کا شہپرِ تخیل اس وقت یگٹٹ دوڑ رہا ہے۔ اور اسے نئی نئی تشبیہیں سوجھ رہی ہیں۔ اس شعر میں اس نے لالہ کے پھولوں کو آگ کے شعلوں سے تشبیہہ دی ہے۔

ترجمہ شعر (۵) زمین کے ہاتھ خون آلودہ ہیں جو کہ دعائے امن کے لئے پہاڑوں اور وادیوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

تشریح :- شاعر پر اس وقت الہامِ معنی کا نزول ہو رہا ہے تشبیہیں اُس کے سامنے ہاتھ باندھے آ رہی ہیں۔ اس شعر میں شاعر نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ دراصل زخمی زمین کے خون آلودہ ہاتھ ہیں جو دعائے امن کے لئے اٹھے ہوئے ہیں۔

ترجمہ شعر (۶) یہ مدفون آتشیں آہیں ہیں جنہیں زمین نے اپنے سینے سے بصورت شعلہ خارج کیا ہے۔

تشریح :- آتشِ نفس مظلوموں کی شرر بار آہیں جو کہ زمین میں مدفون تھیں۔ اب

زمین سے شعلے بن بن کر گل لالہ کی صورت میں برآمد ہو رہی ہیں۔

ترجمہ شعر (۷) یہ سرخ لوہے کے ٹکڑے ہیں۔ جو کہ مشرق بعید میں خاک تلے دب گئے گئے تھے۔ اور جنہوں نے اب سرزمین مغرب سے سر باہر نکالا ہے۔

تشریح:۔ کبھی مشرق علوم و فنون کا مرکز تھا۔ اہل مغرب نے صدیوں تک اہل مشرق کی خوشہ چینی کی۔ مغرب کی موجودہ علمی اور سائنسی ترقیوں کا بیج بھی مشرق ہی میں بویا گیا۔ شاعر کا اشارہ صرف اسی حقیقت کی طرف ہے۔

ترجمہ شعر (۸) زمین کے پیٹ میں نچوڑا ہوا خون چونکہ ایک بڑی مقدار میں اکٹھا ہو گیا ہے۔ اس لئے گل لالہ کی صورت میں تھوڑا تھوڑا کر کے مسامات میں سے باہر نکل آیا ہے۔

تشریح:۔ جنگ عظیم کے دوران میں انسانی خون کی ارزانی کے سبب زمین ضرورت سے زیادہ سیراب ہو گئی ہے۔ اب یہ فالتو خون زمین کے مساموں میں سے گلِ لالہ کی صورت میں پھوٹ پڑا ہے۔

ترجمہ شعر (۹) تو یہ کہتا ہے کہ یہ وطن پرستوں کی زبانیں ہیں۔ جو کہ جورِ فلک نے سر کے پچھلے حصے سے باہر نکالی ہیں۔

تشریح:۔ شاعر کے ذہن میں مختلف النوع خیالات امڈے چلے آ رہے ہیں۔ اچانک اسے ان آزادی خواہوں کا خیال آتا ہے جن کے ہونٹ مطالبہ آزادی کی پاداش میں سی دیئے گئے۔ اور جن کی زبانیں آزادی کا نعرہ بلند کرنے کے جرم میں کاٹ دی گئیں۔ اس خیال کے آتے ہی وہ لالے کے ان لمبے اور سرخ پھولوں کو وطن خواہوں کی بریدہ زبانوں سے مشابہ قرار دیتا ہے۔

ترجمہ شعر (۱۰-۱۱) یا شہیدانِ راہِ آزادی کی پیروی میں سبز لباس پہننے والے طوطی نے سرخ پر نکالے ہیں۔ یا بہار کے خونچکاں قلم نے دکھی دلوں کے خون سے لوحِ وطن پر کوئی نقش بنایا ہے۔

تشریح:- آخر میں شاعر اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ لالے کا پھول دراصل سبز لباس پہننے والا طوطی ہے۔ جس نے شہیدانِ وطن کی تقلید میں سرخ لباس پہن رکھا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں تو پھر یہ ایک ایسا نقش ہے جو کہ بہار کے خونچکاں قلم نے شہیدانِ آزادی کے خونِ دل سے لوحِ وطن پر بنایا ہے۔

ورودِ پاکستان

فرہنگ:- صفحہ ۱۶۹ تا ۱۷۱

لطفِ خدا: خدا کی مہربانی۔ فضلِ خدا۔
کین: کینہ۔ بغض۔ دشمنی۔
رِجس: لعنت۔ پلیدی۔
قبہ: گنبد۔ کلس۔
مدام: ہمیشہ۔
تشنۂ صلح: صلح کے طالب۔ صلح جو
کامل معیار: معیار پر پورا اترنے والا۔
شوق: محبت۔ عشق۔
سعادت مدار: سعادتمند۔ نیک بخت۔
سالک: راستہ چلنے والے
معظم: باعظمت۔ بزرگ۔
سائسان: سائیس کی جمع۔ سیاستدان نگہبان۔
پر فتوح: فتوحات سے بھرا ہوا۔

یار: رفیق۔ محبوب۔
دیار: ملک۔ شہر۔
دہر: زمانہ۔ دنیا۔
یاری: مدد۔
رِجل: رجل کی جمع۔ مرد
ملتش: اس کی ملت۔ اس کے عوام
تپید: تپیدن سے مضارع۔ تڑپتا ہے
کنار: گود۔ پہلو۔
عالمانِ حقائق: حقیقتوں کے جاننے والے
معاد: جائے بازگشت۔ لوٹ کر جانے کی جگہ۔ قیامت۔ عاقبت
فکرتشاں: فکرت ایشاں۔ ان کی سوچ بچار ان کا تفکر و تدبر۔
والا تبار: بلند مرتبہ۔ ذی شان۔

مطہر: پاک۔ پاکیزہ
بادۂ ناخوردہ: وہ شراب جو ابھی پی نہ گئی ہو۔
زنار: وہ کپڑا جو دوسرے کپڑے کے اوپر پہنا جاتا ہے۔
گمان مبر: خیال نہ کر۔
سماحت ملی: قومی رواداری۔ قومی فراخ دلی۔
وحدت ملی: قومی وحدت۔

آموزگار: استاد
شعار: عقیدہ۔ مسلک۔ عادت
دوست دار: بہی خواہ
رہسپار: مسافر۔
صدق و صفا: سچائی اور خلوص۔
فرہنگ: تعلیم۔ تہذیب۔ ثقافت۔
گوناگوں ملل: قسم قسم کی قومیں۔
زیند: زیستن مصدر سے زیند مضارع ہے۔ زندگی بسر کرتی ہیں۔

علامہ بہار کو پاکستان سے بے پناہ محبت تھی۔ انہوں نے یہ قصیدہ پاکستان کی شان میں شاہِ ایران کے دورہ پاکستان کے موقع پر لکھا تھا۔

ترجمہ و تشریح:

ترجمہ شعر (۱) فضل خداوندی ہمیشہ پاکستان کا مددگار ہو۔ اور آسمان کبھی پاکستان سے عناد نہ رکھے۔

تشریح: روائتی قصیدے کے برعکس بہار نے یہ قصیدہ دعائیہ سے شروع کیا ہے اور پاکستان کے لئے آسمان کی شرپسندی سے محفوظ رہنے کی دعا کی ہے۔

ترجمہ شعر (۲) توحید کی قوت سے پاکستان نے شرک کی لعنت سے نجات پائی۔ یہی فخر دنیا میں پاکستان کے لئے کافی ہے۔

تشریح: تقسیم ہند اور استقلال پاکستان کی طرف اشارہ ہے۔ جبکہ توحید پرستوں نے مشرکین ہند سے الگ ایک خود مختار اور آزاد اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی ہے۔

ترجمہ شعر (۳) اگر کراچی اور لاہور کو قبتہ الاسلام کہیں تو روا ہے کیونکہ پاکستان کا کام بھی اسلام کی مدد کرنا ہے۔

تشریح: قرون اولیٰ میں امویوں کا دارالخلافہ دمشق اور عباسیوں کا دارالخلافہ بغداد

قبتہ الاسلام (اسلام کا گنبد) کہلاتے تھے۔ پاکستان بھی چونکہ مسلم ممالک کے مفادات کا حامی اور مؤید ہے۔ اس لئے اگر کراچی اور لاہور کو قبتہ الاسلام کہیں تو کسی طرح بھی نامناسب نہ ہو گا۔

ترجمہ شعر (۴) ہرچند کہ پاکستان کا اقتدار کسی سے کم نہیں پھر بھی اس کے عوام امن و صلح کے طالب ہیں

تشریح:- اہلِ پاکستان کی صلح جوئی اور امن پسندی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ پاکستانی عوام طاقت و قدرت رکھنے کے باوجود دنیا میں امن و صلح کے علمبردار ہیں۔

ترجمہ شعر (۵) پاکستان کے فاضل اور معیار پر پورا اترنے والے انسانوں نے کس قدر جلد آزادی کا اتنا کڑا امتحان دیا۔

تشریح:- مسلمانانِ ہند کی کامیاب جدوجہد آزادی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے

ترجمہ شعر (۶) کشمیر کا دل اپنی ماں سے جدا بچے کی طرح اپنا سر انتہائی شوق سے پاکستان کی گود میں رکھنے کے لئے تڑپ رہا ہے۔

تشریح:- شاعر نے اس شعر میں بڑے خوبصورت انداز میں پاکستان اور کشمیر کے تعلق کو بیان کیا ہے۔ اور مسئلہ کشمیر پر پاکستانی موقف کی حمایت کی ہے۔

ترجمہ شعر (۷-۹) ایرانی عوام کی جانب سے پاکستان کے باسعادت عوام کو ہزاروں سلام (اس کے علاوہ) حقائق کے جاننے والوں، اہلِ طریقت عقبیٰ شکار نمازیوں، عظیم راہنماؤں اور بڑے بڑے سیاست دانوں کو بھی۔ جن کا تفکر و تدبر پاکستان کا غمگسار ہے اسلام پہنچے۔

تشریح:- ان اشعار میں شاعر نے ایرانی عوام کی طرف سے پاکستان کے ہر طبقہ کے لوگوں کو سلام پیش کیا ہے۔

ترجمہ شعر (۱۰) ہماری طرف سے اس عظیم فاتح اور بلند مرتبہ راہنما (قائداعظم) جناح کی روح پر بھی درود و سلام۔

تشریح :۔ پاکستانی عوام کے بعد شاعر نے پاکستان کے بانی حضرت قائداعظم کی فاتحانہ قیادت اور بابصیرت راہنمائی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد ان کی روح کو درود وسلام بھیجا ہے ۔

ترجمہ شعر (۱۱) اقبال کی پاک روح کو درود و سلام جس کا فلسفہ اہل پاکستان کا معلم تھا ۔

تشریح :۔ اس شعر میں مفکرِ پاکستان علامہ اقبال کی دانش وبینش کو نذرانہ عقیدت پیش کیا گیا ۔ اقبال ہی کے تخیل کو منظم انداز میں اقبال ہی نے پیش کیا ۔ اقبال ہی کے نظریات و افکار سے ہمارے سیاسی راہنماؤں نے بصیرت اور روشنی حاصل کی ۔ اسی لئے شاعر نے علامہ اقبال کو "آموزگار پاکستان" قرار دیا ہے ۔

ترجمہ شعر (۱۲) اس نے ہزاروں شرابوں کا وعدہ کیا جو کہ ابھی پی نہیں گئیں ۔ ایک پاکستان کی شراب ہے جس کا نشہ کبھی نہیں اترتا ۔

تشریح :۔ یہ شعر پچھلے شعر سے مربوط ہے ۔ اس میں شاعر نے علامہ صاحب کو ذیل کے شعر کا حوالہ دیا ہے ۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں !
ہزار بادہ ی ناخوردہ در رگِ تاک است

بہار نے اپنے شعر میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ علامہ اقبال نے رگ تاک میں پوشیدہ اور ناکشیدہ جن ہزارہا شرابوں کا قوم سے وعدہ کیا تھا پاکستان ان میں سے ایک ہے ۔ یعنی علامہ صاحب نے جو امکان ظاہر کیا تھا پاکستان اس کی عملی صورت ہے ۔

ترجمہ شعر (۱۳) اپنی فطرت ، خصلت ، مذہب اور لباس کے لحاظ سے ملتِ ایران نہ تو پاکستان سے الگ تھی اور نہ الگ رہ سکتی ہے ۔

تشریح :۔ اس شعر میں شاعر نے پاکستان اور ایران کی مذہبی ، معاشرتی اور ثقافتی

ہم آہنگی، اشتراک اور یگانگت کا ذکر کیا ہے

ترجمہ شعر (۱۴) یہ خیال نہ کر کہ روئے زمین پر ایرانیوں سے بڑھ کر بھی کوئی پاکستان کا دوست ہو سکتا ہے۔

تشریح:- ایران نے ہمیشہ پاکستان سے دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ شاعر کا یہ دعویٰ کہ ایران سے بڑھ کر پاکستان کا کوئی دوست نہیں محض شاعرانہ مبالغہ نہیں بلکہ تاریخی حقیقت ہے۔

ترجمہ شعر (۱۵) ہمارے شہنشاہ کا دورہ پاکستان ہماری پاکستان سے دوستی کا ثبوت ہے۔

تشریح:- ہمارا شہنشاہ ہماری دوستی کا شاہد ہے جو نہایت صدق دل اور صفائے نیت کے ساتھ عازم پاکستان ہوا ہے۔

ترجمہ شعر (۱۶) بہار اس ثقافت اور شائستگی کا دلدادہ ہے جس سے پاکستان کا تانا بانا تیار ہوا ہے۔

تشریح:- بہار پاکستانی ثقافت اور تہذیب کا متوالا ہے۔ کیونکہ پاکستان اور ایران کی ثقافت مشترک ہے۔

ترجمہ شعر (۱۷) پاکستان کے حق گزاروں کے حضور میں بڑے صدق دل اور ادب کے ساتھ چند باتیں عرض کرتا ہوں۔

ترجمہ شعر (۱۸-۱۹) پہلی بات تو قومی رواداری کے متعلق ہے کہ مختلف اقوام خوشی و مسرت اور امن وچین سے پاکستان میں زندگی بسر کریں۔ کیونکہ جب تک پاکستان میں رواداری کا قانون نافذ نہ ہو۔ اس وقت تک پاکستانی ایک قومی وحدت نہیں بن سکتے۔

تشریح:- آخر میں شاعر نے بڑے صدق دل سے اور صفائے نیت سے پاکستانی مقننوں کو بڑا پرخلوص مشورہ دیا ہے کہ وہ قانون سازی کے وقت اقلیتوں کے حقوق کا بھی تحفظ کریں۔ تاکہ تمام فرقے امن وچین کی زندگی گزاریں۔ اور ایک وحدتِ ملی کی تشکیل کریں۔

ترجمہ شعر (۲۰) بہار نے دسفر پاکستان کی یادگار کے طور پر یہ قصیدہ لکھا ہے اور پڑھا ہے۔ فضلِ خداوندی ہمیشہ پاکستان کا حامی و ناصر ہو۔

وطنیہ

فرہنگ : صفحہ ۱۷۱، ۱۷۲

مہین : سب سے بڑا۔ بزرگترین۔

عاصمہ : پایۂ تخت۔ باعصمت۔

کارت : کارِ تو — تیرا کام

کندن : اکھاڑنا۔

زیم : زیم۔ زلیستن مصدر سے مضارع صیغہ واحد متکلم۔ میں جیوں۔ میں زندہ رہوں۔

محن : محنت کی جمع۔ رنج و غم

بافتۂ خویش : اپنا بنا ہوا۔

آوخ : آہ — افسوس۔

نیوشند : نیوشیدن مصدر سے فعل مضارع کا صیغہ۔ جمع غائب۔ سنتے ہیں۔

محنت : رنج و تکلیف۔ اذیت۔

عجین : خمیر

آشفتہ : پریشان۔ بکھرا ہوا۔

پُرحزن : غم سے بھرا ہوا۔

خلد : خلیدن مصدر سے مضارع صیغہ واحد غائب ہو جاتا ہے

اہرمن : شیطان — بدی کا خدا۔

دردا، دریغا : آہ — افسوس۔

بی برگ : بے ساز و سامان۔ مفلس۔ قلاش

تعزیت : ماتم

نگریاند : تمہیں رلاتی ہے۔

آغشتہ : لتھڑا ہوا۔ آلودہ۔

پیراہن : قمیص

ترجمہ و تشریح :

ترجمہ شعر (۱) اے ایران کے خطۂ عظیم! اے میرے وطن! تیری محبت کے لئے میرے جسم و روح کا خمیر گوندھا گیا ہے۔

تشریح :۔ وطن سے محبت کرنا میری سرشت میں داخل ہے۔ میری خلقت کا باعث بی

یہ ہے کہ میں اپنی مادرِ وطن سے محبت کروں۔
ترجمہ شعر (۲) اے دین کے آباد پایۂ تخت! کیا ہوا کہ تیرے مسائل پھر میرے رنج واندوہ سے بھرپور دل کی مانند پریشان ہو گئے ہیں۔
ترجمہ شعر (۳) میرے جسم و جان تجھ پر قربان ہوں۔ تو نے میرے دل سے غم کو جڑ سے اکھاڑ دیا ہے۔
تشریح شعر ۱ و ۲-۳) پچھلے شعر میں شاعر نے اپنے دل اور وطن دونوں کو ملول و محزون قرار دیا تھا۔ اس شعر میں وہ کہتا ہے کہ وطن نے حزن و ملال کو میرے دل سے جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے یعنی اب مجھے ذاتی غم بھول گئے ہیں۔ اب میں صرف وطن کے لئے ملول و محزون ہوں۔
ترجمہ شعر (۴) اے میرے باغ لالہ و گل اور سرو و سمن! میرا گل و لالہ اور سرو و سمن تجھ سے کچھ دور نہیں۔
تشریح: اے میرے وطن عزیز تیری راہ میں قربان ہونے سے مجھے کسی چیز کا دریغ نہیں ہے۔
ترجمہ شعر (۵) اے میرے چمنِ نوشگفتہ! تیری روح کے بغیر میرے دل میں رنج و غم کے بے شمار کانٹے چبھتے ہیں۔
تشریح:- اے ایران تو چمنِ تازہ شگفتہ ہے۔ لیکن تجھ میں روحِ چمن نہیں۔ تیری اس بے روحی اور بے جانی کو دیکھ کر دل میں خارِ غم کی چبھن ہوتی ہے یعنی تیری زبوں حالی اور پامالی کو دیکھ کر دل کو بہت تکلیف ہوتی ہے
ترجمہ شعر (۶) اگر میں تیرے بغیر جیوں تو خدا کرے میرا فرشتہ میرا شیطان بن جائے۔
تشریح:- اے وطن! میں تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میرا جینا اور مرنا تیرے ہی لئے ہے۔ اگر میں تیرے بعد زندہ رہوں تو خدا کرے میری نیکیاں بدیوں میں تبدیل ہو جائیں۔ یعنی میں تیرے بعد زندہ نہ رہوں۔
ترجمہ شعر (۷) جب تک تیری سرحد دشمن کے لشکر سے بھری پڑی ہے اس وقت

تک میرا دل رنج ومحن سے ہرگز خالی نہیں ہو سکتا۔

تشریح:۔ رضا شاہ کبیر کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے ایران انگریزوں اور روسیوں کی ریشہ دوانیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ خصوصاً روسی فوجوں نے کئی بار ایرانی سرحدوں پر یلغار کی۔ جنگِ عظیم میں بھی اتحادی فوجوں نے سرزمین ایران کو پامال کیا۔

شاعر اسی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے کہ میرے دل میں رنج وغم کے لشکروں نے اس لئے چھاؤنی ڈالی ہے کہ تیری سرحد پر دشمن کی فوجوں کا اجتماع ہے۔ جب تک دشمن کا لشکر تیری سرحد پر موجود ہے۔ میرا دل غم واندوہ سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

ترجمہ شعر (۸) میں تیرے غم میں چپاتی کی مانند پتلا ہو گیا ہوں۔ جب تک فریاد نہ کروں؛ تجھے میرا جسم دکھائی نہیں دے گا۔

تشریح:۔ شعر شاعرانہ مبالغہ سے پُر ہے۔ علامہ بہار عام طور پر سبک خراسانی و سبک عراقی کے پیرو ہیں۔ لیکن اس شعر کا اسلوب اس کے عام اسلوب سے ہٹا ہوا ہے۔

ترجمہ شعر (۹) کس قدر دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ تو اتنا بے سروسامان ہو چکا ہے کہ میرے لئے اپنے بنے ہوئے کپڑے کا کفن بھی نہیں رکھتا۔

تشریح:۔ ایران کی اقتصادی بدحالی کے باعث ایران کی ملکی صنعتیں تباہ و برباد ہو گئیں۔ اہلِ فرنگ نے اپنی عیاری ومکاری سے ایران کی صنعت وتجارت پر قبضہ کرکے اسے اپنی منڈی میں تبدیل کر دیا۔

شاعر اسی صورتِ حال کا ماتم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس لوٹ کھسوٹ نے ایران کو اس قدر بے سروسامان کر دیا ہے کہ وہ مجھے کفن کے لئے دو گز کپڑا بھی بہم نہیں پہنچا سکتا۔

ترجمہ شعر (۱۰) میں نے تیرے ماتم میں بہت سی باتیں کیں۔ افسوس کہ میری باتوں نے

کسی کو بھی نہیں رلایا۔

تشریح - اہلِ وطن کی بے حِسی کا گلہ کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ میں نے ملک کی تعزیت میں بہت سی باتیں کیں ہیں لیکن افسوس کہ کسی پر رقت طاری نہیں ہوئی۔ کسی کا دل نہیں پسیجا۔

ترجمہ شعر (۱۱) لوگ میری باتیں اس وقت سنیں گے جب میرا پیراہن خون سے تھڑ جائے گا۔

تشریح:- پچھلے شعر سے مربوط ہے۔

میری زندگی میں تو لوگ میری باتوں پر کان نہیں دھرتے لیکن جب میں ناموسِ وطن پر قربان ہو جاؤں گا۔ خونِ شہادت سے میرا لباس لتھڑا ہوا ہو گا۔ اس وقت میرے ہم وطنوں کو میری قدر محسوس ہو گی۔ اس وقت وہ باتوں کو ترسیں گے۔ لیکن اس وقت ہم نہ ہوں گے۔

ع مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا۔

ترجمہ شعر (۱۲) اور آج میں انتہائی دُکھ کے ساتھ کہتا ہوں۔ آہ! میرے وطن، افسوس! میرے وطن ٭

غالب کی کہانی خود ان کی زبانی

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت
می‌تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نہ داشت

قاعدہ یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ ہجری کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔

تاریخ ولادت من از عالم قدس ہم۔ شورش شوق۔ آمد و ہم ,, غریب ,,

تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۱۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور شہر دہلی کو زندان مقرر کیا فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد جیل خانہ سے بھاگا۔ تین سال بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے۔ جب دیکھا کہ قیدی گریز پا ہے تو دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑیوں سے فگار ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخمدار مشقت مقرری اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں بیڑیوں کو زاویۂ زندان میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے پھر بھاگا۔ میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ کم دو مہینہ وہاں رہا تھا پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں گا کیا، بھاگنے کی طاقت ہی نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے آدمی سوا اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح میں چلا جاؤں گا

فرخ آں روز کہ از خانہ زنداں بروم
سوئے شہر خود ازیں وادی ویراں بروم

(نام) اسداللہ خاں غالب تخلص عرف مرزا نوشہ قوم کا ترک سلجوقی ہوں سلطان

برکیارق کی اولاد میں سے ؎

سلجوقیم بہ گوہر و خاقانیم بہ فن!

توقیع من بہ سنجر و خاقان برابر است

دادا میرا قوقان بیگ ماوراء النہر سے شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلی آیا۔ پچاس گھوڑے نقارہ و نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔

باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جا کر آصف الدولہ کا نوکر ہوا بعد چند روز حیدرآباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ اور وہاں ایک لڑائی میں بڑی بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔

نصر اللہ بیگ میرا چچا حقیقی، مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کا صوبہ دار تھا۔ جس نے مجھے پالا۔

نوید وصل و بیم مے دہد ستارہ شناس ‏ فکرو ژرف نگاہی نگر در اختر من

یہ شعر افتتاح کلام ہے۔ پہلے کچھ باتیں جو بادی النظر میں خارج بحث معلوم ہوں لکھی جاتی ہیں۔

پانچ برس کا تھا۔ کہ میرا باپ مرا۔ نو برس کا تھا کہ میرا چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکاء حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں مرحوم دس ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے۔ جو انہوں نے نہ دیئے۔ مگر تین ہزار روپیہ سال۔ اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپیہ سال میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کولبرگ صاحب بہادر ریذیڈنٹ دہلی اور سٹرلنگ صاحب بہادر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر ریذیڈنٹ معزول ہوئے سکریٹری صاحب بمرگ ناگاہ مرگئے۔ بعد ایک زمانہ کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا۔ اس کے ولی عہد نے چار سو روپیہ سالانہ

ولی عہد اس تقرر کے دو سال بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلہ مدح گستری پانچ سو روپیہ سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے۔ یعنی اگرچہ جیتے رہے مگر سلطنت جاتی رہی۔ اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

۱۸۳۰ء میں کلکتہ گیا۔

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرّا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے

نواب گورنر جنرل بہادر سے ملنے کی درخواست کی۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ سات پارچہ جیغہ سرپیچ مالائے مروارید یہ تین رقم کا خلعت ملا۔

میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا۔ مولوی کرم حسین میرے ایک دوست تھے۔ انہوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ و بے ریشہ اپنے کفِ دست پر رکھ کر کہا۔ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجئے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس اشعار کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا اور صلہ میں وہ ڈلی ان سے لے لی۔ بیس بائیس پھبتیاں ہیں۔ اشعار کب یاد آتے ہیں۔ آخر کی بیت ہے۔ ؎

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجئے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہئے

ایک شعر بنگالی زبان کا ضیافت طبع احباب کیلئے ارمغان لایا

تم کبھی تھے رات میں آئینگے سو آئے نہیں
قبلہ بندہ رات بھر اس غم سے کچھ کھائے نہیں

بادشاہ دہلی نے ۴؍ جولائی ۱۸۵۰ء کو مجھے نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمت تاریخ نگاری سلاطین تیموریہ مجھے تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرز تازہ پر لکھی۔ ؎

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

جب حضور میں حاضر ہوتا تو اکثر بادشاہ مجھ سے ریختہ طلب کرتے۔ سو وہ پڑھی ہوئی غزلیں کیا پڑھتا۔ نئی غزل کہہ کر لے جاتا۔ ایک صاحب شاہزادگان تیموریہ میں سے لکھنؤ سے ایک زمین لائے۔ حضور نے خود بھی غزل کہی اور مجھے بھی حکم دیا۔ سو میں حکم بجالایا اور یہ غزل کہی۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

بھائی خدا کے واسطے داد دینا۔ اگر ریختہ یہ ہے تو میر و میرزا کیا کہتے تھے۔ اور اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے؟

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اور کی غزل لوگ میرے نام پہ پڑھ دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب نے مجھے آگرہ سے لکھا کہ یہ غزل بھیج دیجیے۔ سدا در لینے کے دینے پڑے ہیں۔ میں نے کہا، لاحول ولاقوۃ، اگر یہ میرا کلام ہے۔ تو مجھ پر لعنت، اسی طرح ایک صاحب نے میرے سامنے یہ مطلع پڑھا۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے عرض کیا کہ صاحب! جس بزرگ کا یہ مطلع ہے اس پر بقول اس کے رحمت خدا کی، اور اگر میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ اسد اور شیر۔ اور خدا میری طرز گفتار نہیں۔ بات یہ ہے کہ ایک شخص میر امانی اسد ہو گزرے ہیں اور یہ غزل ان کے کلام معجز نظام میں سے ہے اور تذکروں میں مرقوم ہے، میں نے تو کوئی دو چار برس

اسد تخلص رکھا۔ ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں۔

بادشاہ نے قلعہ میں مشاعرہ مقرر کیا تھا۔ ہر مہینہ میں دو بار مشاعرہ ہوتا تھا پندرھویں کو اور انتیسویں کو۔ حضور فارسی کا ایک مصرعہ اور ریختہ کا ایک مصرعہ طرح کرتے۔ ایک بار ریختہ کا مصرعہ یہ تھا

خمارِ عشق ہمیں کس قدر ہے" کیا کہئے"

میں نے ایک غزل ریختہ موافق طرح اور دوسرا ریختہ اس طرح میں سے ایک اور صورت نکال کر لکھا۔ ؎

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہئے

تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہئے

دریا میرے آگے، صحرا مرے آگے،، بھی قلعہ مبارک کی غزل ہے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

داد دینا کہ ریختہ اگر بایہ سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اس کی صورت یہی ہوگی یا کچھ اور شکل؟

اس فلک کج رفتار کا برا ہو، ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا ملک و مال جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر ہنس بول لیا کرتے تھے۔

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک

اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو دن چڑھے وہ فوج باغی میرٹھ سے دہلی آئی تھی۔ یا قہر الٰہی کا یہ پے بہ پے نزول ہوا تھا۔ بقدر خصوصیت دلی ممتاز تھا۔ ورنہ سر تا سر قلمرو ہند میں فتنہ و بلا کا دروازہ باز تھا۔

پانچ لشکروں کا حملہ پے بہ پے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر اس

شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکیں و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا اس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مر گئے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا۔ اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا اس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی۔ مرے آدمی کم لیکن جس کو تپ آئی اس نے اعضا میں طاقت نہ پائی۔

ہندوستان سایہ کل پائے تخت تھا

جاہ و جلال، عہد وصال بتاں نہ پوچھ

میرا حال سوائے میرے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں بھی فرق آگیا تو کیا عجب ہے۔ بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو غم کیا ہے۔ غم مرگ غم فراق، غم عزت، یہ کوئی نہ سمجھے میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو غم مجھ کو ہے۔ اس کا بیان تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ کہ انگریزوں کی قوم میں جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھوں قتل ہوئے ان میں میرا کوئی امیدگاہ تھا۔ اور کوئی میرا شفیق۔ کوئی میرا دوست تھا اور کوئی یار۔ کوئی میرا شاگرد، ہندوستانیوں میں کچھ دوست کچھ عزیز، کچھ شاگرد، کچھ معشوق سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے۔ جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو۔ اس کی زیست کیوں کر نہ دشوار ہو جائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ اِنّا للہ واِنّا اِلیہِ راجعون ط

ایک جنم تھا کہ جس میں طرح طرح کے معاملات مہر و محبت در پیش آئے شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ ناگاہ وہ زمانہ نہ رہا۔ نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط۔ بعد چند موت کے دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی جس شہر میں رہتا ہوں اس کا نام دلّی ہے اور اس محلہ کا نام بلی ماراں کا

محلہ ہے۔ لیکن ایک دوست بھی اس جنم کے دوستوں میں نہیں پایا جاتا۔ وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نگاہ ہے۔ کہ وہ میر مہدی آئے وہ میر سرفراز حسین آئے۔ وہ یوسف میرزا آئے۔ وہ میرن آئے۔ وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کے نام نہیں لیتا۔ بچھڑوں میں سے کچھ کہتے ہیں۔ اللہ اللہ، ہزاروں کا ماتم دار ہوں۔ میں مروں گا تو مجھے کون روئے گا۔

وہ دلی نہیں جس میں سات برس کے سن سے آنا جاتا تھا۔ وہ دلی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم تھا۔ بڑے بڑے نامی بازار۔ خاص بازار۔ اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا۔ اب پتہ بھی نہیں ہے۔ کہ کہاں تھے، صاحبان امکنہ و دوکان نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا۔ اور ہماری دوکان کہاں تھی۔

غدر میں میرا گھر نہیں لٹا۔ مگر میرا کلام کیا۔ نظم کیا۔ نثر کیا اردو کیا فارسی میرے پاس کب تھا۔ کہ نہ لٹتا۔ ضیاء الدین خاں جاگیردار لوہارو میرے سلبی بھائی اور شاگرد رشید اور ناصر حسین مرزا صاحب ہندی و فارسی میں نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان دونوں کے گھر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا۔ نواب ضیاء الدین کا کتب خانہ بیس ہزار کی مالیت کا رہا ہوگا۔ لٹ گیا ایک ورق نہ رہا۔ اس میں وہ مجموعہ ہائے پریشاں بھی غارت ہوئے۔ ایک دن ایک فقیر کہ خوش الحان بھی تھا اور زمزمہ پرداز بھی ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ یقین جانو کہ مجھ کو رونا آگیا۔

بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے۔ اس کا وار تو مجھ پر ایسا چلا کہ جیسے کوئی چہرہ پایا۔ اکتوبر کی ساتویں یا آٹھویں تاریخ ۱۸۳۷ء میں بہادر شاہ تخت پر بیٹھے۔ ذوق نے اس مہینہ میں یا دو ایک مہینہ بعد دو سکے کہہ کر گزارے۔ بادشاہ نے پسند کئے۔ مولوی محمد باقر ذوق کے معتقدین میں سے تھے۔ انہوں نے "دلی اردو اخبار" میں یہ دونوں سکے

چھاپے۔ اس کے علاوہ وہ لوگ موجود تھے جنہوں نے اس زمانہ میں ارشد آباد اور کلکتہ میں یہ سکے سنے اور ان کو یاد ہوگا۔ یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے اور گزرانے ثابت ہوئے۔ میں نے ہر چند قلمرو ہند میں "دلی اردو اخبار" ڈھونڈا کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبہ مجھ پہ رہا۔ پنشن بھی گئی اور ریاست کا نام دلشان اور خلعت دربار بھی مٹا۔

میں نے سکہ نہیں کہا۔ اگر کہا تو اپنی جان و حرمت بچانے کو کہا۔ یہ کیا گناہ ہے اور اگر گناہ تھا تو کیا ایسا سنگین کہ ملکہ کا اشتہار معافی بھی اسے نہ مٹا سکا سبحان اللہ۔ گولہ انداز کا بارود بنانا۔ توپیں لگانا اور بینک گھر اور میگزین کو لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔ ہاں صاحب گولہ انداز کا بہنوئی مددگار تھا۔ اور شاعر کا سالا بھی جانبدار نہیں۔

تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو گنہگار۔ نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کیا۔

میری بریت کی درخواست گذری تحقیقات ہوتی رہی۔ تین برس بعد پنڈ چھوٹا۔ میرا پنشن کھلا۔ چڑھا ہوا روپیہ دام دام ملا۔ آئندہ کو بے کم و کاست جاری ہوا۔ مگر لاٹ صاحب کا دربار خلعت جو معمولی مقرر تھا مسدود ہو گیا۔ یہاں تک کہ صاحب سیکرٹری بھی مجھ سے نہ ملے اور کہلا بھیجا کہ "غدر کے دنوں میں تم باغیوں کی خوشامد کرتے تھے۔ اب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو؟ گورنمنٹ کو تم سے ملاقات منظور نہیں"، عالم نظروں میں تیرہ و تار ہو گیا۔ یہ جواب پیام نومیدی جاوید تھا۔ نہ دربار نہ خلعت۔ نہ پنشن۔ انا للہ و انا الیہ راجعون کوئی خیر خواہی نہیں کی جو نئے انعام کا مستحق ہوتا لیکن کوئی بے وفائی بھی سرزد نہیں ہوئی۔ جو دستور قدیم کو برہم مارتا۔

فردوس مکان نواب یوسف علی خاں والئے رام پور نے غم خواری اور درویش نوازی کر کے اس پایہ کو پہنچایا کہ شاہان عجم میں سلطان سنجر نے

اور شاہان ہند میں شاہجہان نے ملازموں کی اتنی پرورش و نوازش کی ہوگی۔ ۱۸۵۷ء میں نواب یوسف علی خاں میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اردو کی بھیجتے۔ میں اصلاح دے کر بھیج دیتا۔

گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر سے آتا تھا۔ قلعہ کی تنخواہ جاری۔ انگریزی پنشن کھلا ہوا ان کے عطایا فتوحات گاہ گاہ گنے جاتے۔ فتنہ و فساد کے دنوں میں قلعہ کی آمد مفقود۔ انگریزی پنشن مسدود۔ یہ بزرگوار سو روپیہ مہینہ ماہ بماہ بسبیل ہنڈی بھجواتے تھے۔ اس ماہ کے علاوہ کبھی دو سو، کبھی ڈھائی سو بھیجتے تھے۔ تب میری اور میرے متوسلین کی زیست ہوئی۔ خدا سے بھی توقع نہ تھی۔ مخلوق کا ذکر کیا آپ اپنا تماشائی بن گیا تھا۔ رنج و غم سے خوش ہوتا تھا۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا۔ جب دکھ مجھے پہنچتا۔ کہتا غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب کیا مرا۔ بڑا ملحد مرا۔ بڑا کافر مرا۔ اور "فردوس نشین" خطاب دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ اپنے کو بادشاہ قلمرد سخن جانتا تھا۔ سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔

اے نجم الدولہ بہادر، ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ۔ ایک قرضدار بھوک سنا رہا ہے۔ میں پوچھ رہا ہوں۔ لا اجی حضرت نواب صاحب! آپ سلجوقی و افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے غیرت بے حیا۔ کوٹھی سے شراب گندھی سے گلاب بزاز سے کپڑا میوہ فروش سے آم صراف سے دام قرض لئے جاتا ہے۔ یہ بھی سوچا ہوتا قرض کہاں سے دوں گا؟

اب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا۔ ادھر درباری مل کو جا مارا۔ ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی لوٹ ماری۔ ہر شخص کے پاس تمسک مہری موجود شہد لگاؤ اور چاٹو۔ نہ مول نہ سود۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنہ کلکڑی کے سو روپیہ رام پور کے قرض دینے والا ایک میرا مختار

وہ سود ماہ بماہ لینا چاہے۔ مول میں قسطاً اس کو دینا پڑے۔ انکم ٹیکس جدا۔ مول جدا۔ بی بی جدا بچے جدا۔ شاگرد پیشہ جدا۔ آمد وہی ایک سو باسٹھ۔

دو قسم کی انگریزی شراب۔ ایک تو کاسٹلین اور دوسری اولڈ ٹام میں ہمیشہ پیا کرتا تھا اور یہ دونوں (غدر سے) پہلے بیس چوبیس روپیہ درجن آتی تھیں لیکن اب پچاس ساٹھ روپے درجن ہو گئی۔ ہر گز چھال کی شراب میں پیتا نہیں تھا۔ یہ مجھے نقصان کرتی تھی۔ اور مجھے اس سے نفرت تھی۔ تنگ آگیا۔ گزارہ بھی مشکل ہو گیا۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کیا کروں کہاں سے گنجائش نکالوں۔ قہرِ درویش بجان درویش۔ صبح کی تبرید متروک۔ چاشت کا گوشت آدھا۔ شراب و گلاب موقوف۔ بیس یا بائیس روپیہ مہینہ بچا۔ روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا۔ تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے؟ کہا گیا۔ کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا نہ پیو گے۔ تو کس طرح جیو گے؟ جواب دیا کہ۔ جس طرح وہ جلائیں گے۔

بارے مہینہ پورا نہ گزرا تھا کہ رام پور سے علاوہ مقرری کے اور روپیہ آگیا۔ قرض متسط ادا ہو گیا۔ متفرق رہا۔ خیر ہوا۔ صبح کی تبرید رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔

اے بے خبر ز لذت شراب مدام ما۔ دیکھا ہم کو یوں پلاتے ہیں۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے۔ تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا۔ بلکہ میں دوزخ کا ایندھن بنوں گا۔ اور دوزخ کی آگ تیز کروں گا۔ تاکہ مشرکین رسالت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں۔

پہلی نومبر ۱۸۵۸ء کو اشتہار عام ہو گیا۔ کہ اب قلمرو ہند میں عمل ملکہ معظمہ عالی مقام کا ہو گیا ہے۔ میں پہلے ہی سے مداحوں میں اپنا نام لکھوا چکا تھا بلکہ دارا کے دربان وزرا کے دو سرٹیفکیٹ حاصل کر چکا تھا پہلی نومبر کو

حسب الحکم کوچہ و بازار میں روشنی ہوئی۔ فقیر نے بھی اس تہی دستی میں کہ اٹھارہ مہینہ پنشن نہیں پایا تھا۔ اپنے مکان پر روشنی کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ جانا اور قلمرو ہند کا بادشاہی عمل میں آنا سنا گیا۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ کو ملکہ معظمہ نے فرزند ارجمند کا خطاب دیا اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم مقرر کیا۔

کبھی کسی کے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما تھا۔ کسی کے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا۔ تو میرا رنگ چمپئی تھا۔ اور دیدہ ور اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جب کبھی اپنا وہ رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ لوٹ جاتا ہے اب داڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی عام ہے۔ ملا۔ حافظ۔ بساطی۔ نیچہ بند۔ دھوبی۔ سقہ بھٹیارہ۔ جولاہا۔ کنجڑا۔ منہ پر داڑھی۔ سر پر بال۔ میں نے جس دن داڑھی رکھی۔ سر منڈا لیا۔

میں اب انتہائے عمر ناپایدار کو پہنچ کر آفتاب لب بام ہوں ہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ درگور ہوں۔ نظم و نثر فارسی قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا ہے اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی رہے گا۔

ابتدائے سن تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے۔ پھر اوسط عمر میں بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر اس روش پر خامہ فرسائی کی ہے۔ نظم و نثر کا عاشق و مائل ہوں۔ ہندوستان میں رہتا ہوں لیکن تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں جہاں تک زور چل سکا۔ فارسی زبان میں بہت بکا۔ اب نہ فارسی زبان کی فکر نہ اردو کا ذکر۔

ابتدائے فن میں میں بیدل اور امیر کے طرز پر ریختہ لکھا۔ چنانچہ ایک غزل کا مقطع ہے۔ ؎

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا   اسد اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا گیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو رد کیا۔ اوراق یک قلم چاک کر دیئے۔ دس بارہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان حال میں رہنے دیئے

ایک اردو کا دیوان ہزار بارہ سو بیت کا۔ ایک فارسی کا دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا۔ تین رسالے نثر کے۔ یہ پانچ رسالے مرتب ہو گئے۔ اب اور کیا ہو گا۔ مجھے اپنے ایمان کی قسم میں نے اپنے نظم و نثر کی داد باندازہ بایست نہیں پائی۔ آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا۔ مدح کا صلہ نہ ملا۔ غزل کی داد نہ پائی۔ ہرزہ گوئی میں عمر گنوائی۔ بقول طالب آملی علیہ رحمتہ۔

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی
دہن بر چہرہ زخمے بود بہ شد

ستر ابترا اردو میں ترجمہ پیر خرف ہے۔ میری تہتر برس کی عمر ہے بس میں بھی انحراف ہوا۔ حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا رفتہ رفتہ وہ بھی حافظہ کی مانند معدوم ہو گیا۔ اب یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں۔ رسمی پرسشِ مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے۔ وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔ غذا مفقود ہے۔ صبح کو قند اور شیرۂ بادام مقشر۔ دوپہر کو گوشت کا پانی سرِ شام تلے ہوئے چار کباب۔ سوتے وقت پانچ روپیہ بھر شراب اور اسی قدر گلاب۔ خرف ہوں۔ پوچ ہوں۔ فاسق ہوں۔ روسیاہ ہوں۔ یہ شعر میر تقی میر کا میرے حسب حال ہے۔

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصّہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

" اسد الاخبار " اور " اشرف الاخبار " والے کہ یہاں کے رہنے والے ہیں اور مجھ سے ملتے رہتے ہیں۔ سوان کے اخبار میں اپنا مفصل حال چھپوا

دیا۔ اس میں میں نے عذر چاہا۔ خطوں کے جواب سے اور اشعار کی اصلاح سے۔ اس پر کسی نے عمل نہ کیا۔ اب تک خطوط کے جواب کا تقاضا اور اشعار واسطے اصلاحوں کے چلے آتے ہیں اور میں شرمندہ ہوتا ہوں۔

پہلے مقدار غذا کی تولوں پر منحصر تھی۔ اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پر تھی۔ اب دنوں پر ہے۔ ہر روز مرگ نو کا مزہ چکھتا ہوں۔ حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں۔ پھر کیوں جیتا ہوں۔ روح اب میرے جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل، کوئی اختلاط کوئی مجمع پسند نہیں آتا۔ کتاب سے نفرت۔ جسم سے نفرت۔ روح سے نفرت جو کچھ لکھا ہے بلا مبالغہ بیان واقع ہے۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بگذرم

آگے میں لیٹے لیٹے کچھ لکھ لیتا تھا۔ اب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہاتھوں میں رعشہ۔ آنکھوں میں ضعف بصر۔ ناتوانی زوروں پر ہے بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے ضعف وسستی۔ گرانی دگراں جانی رکاب میں پاؤں ہے نہ باگ پر ہاتھ ہے اپنا مصرع چپکے چپکے دہراتا ہوں۔

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

اے مرگِ ناگہاں کہاں رہی۔ اسباب و آثار سب جمع ہے۔ ہائے الہی۔ الہی بخش معروف کا کیا مصرع ہے

آہ جی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں

مرزا غالب کی فارسی شاعری

مرزا غالب علیہ الرحمۃ کو عموماً نہ ان کے ہمعصروں نے پہچانا۔ نہ ان کے بعد کے لوگوں نے۔ اس زمانے میں ان کے اداشناس کم اور منکرینِ کمال بہت زیادہ تھے آج ان کے مداح بکثرت اور مخالف کم پائے جاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ زندہ ہوتے تو اپنے بے شمار مداحوں میں بہت تھوڑے اصحاب کو حقیقی مداح سمجھتے۔ ان کی زندگی میں ان کی مخالفت محض عوام کی کورانہ ذہنیت اور مقلدانہ روش کا نتیجہ تھی۔ آج ان کی مدح و ستائش کا عنصر غالب بھی رواج اور فیشن کی حد سے زیادہ نہیں۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ان کے کلام میں عروج و قبول کی استطاعت نہیں۔ سب کچھ ہے اور اس سے بہت بڑھ کر ہے جتنی ہم اس وقت تصور کر سکتے ہیں۔ میرا مقصود سخن یہ ہے کہ ان کو بنظرِ تحقیق دیکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے اور بچشمِ تقلید نظارہ کرنے والے بے شمار ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میں نے بعض بالغ نظر بزرگوں کی زبان سے سنا ہے۔ کہ مرزا کی فارسی سے ان کی اردو کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اور ہمارے ادارات ادبی و طبقات علمی کے رجحان سے بھی یہی برآمد ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس مرزا خود فرماتے ہیں۔

پارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از اردو کہ آں مجموعۂ بے رنگ ہست

ورنہ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانہ تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن

کلیاتِ فارسی کے آخر میں لکھتے ہیں۔

گر ذوقِ سخن بدہر آئین بودے
دیوانِ مرا شہرتِ پروین بودے
غالب اگر ایں فنِ سخن دیں بودے آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

بالکل الگ خدوخال کی ہوتی ۔ یا اگر ان کے کلام فارسی سے بھی ہم بہ شکل انتخاب روشناس کراتے جاتے تو ہماری رائے موجودہ روش سے بالکل مختلف ہوتی ۔

جہاں تک کلام غالب سے میری تحقیق و مطالعہ کا تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فارسی کا رتبہ کئی وجوہ سے اردو سے بلند تر ہے ۔ فارسی میں مرزا کی فطرت عمیق کے تمام گوشے روشن نظر آتے ہیں ۔ ان کی استعداد بلند کی تمام تجلیاں آشکارا ہو جاتی ہیں ۔ توحید ۔ تصوف ۔ اخلاق ۔ فلسفہ ۔ رندی ۔ مذہب مدح ۔ ہجو ۔ مرثیہ ۔ عشق اور مناظر فطرت وغیرہ تمام مضامین کو جدت و ندرت اور شدت و قدرت کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ اور ہر صنف کلام مثنوی ۔ قطعہ قصیدہ ۔ ترجیع بند ۔ ترکیب بند ۔ غزل ۔ رباعی وغیرہ میں مشاقی کا ثبوت دیا ہے یہ تمام چیزیں اس تکمیل و تنوع کے ساتھ اردو میں نہیں ضرورت تھی کہ ان میں سے ہر عنوان پر الگ مستقل مضمون متعدد اصحاب ذوق سے لکھوائے جاتے ۔ تاکہ دنیائے اردو کو مرزا کی فارسیت کے "نقشہائے رنگارنگ" کے اندازہ کرنے میں آسانی ہوتی ۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ مرزا کی زبان میں خسرو اور سعدی کی حلاوت نہیں ۔ ان کے شعر میں حافظ کی رندی و آزادگی نہیں ۔ ان کی غزل میں نظیری کا سوز اور روحانیت نہیں ۔ ان کے قصائد میں ظہیر کی عذوبت اور قاآنی کی طوفان انگیز روانی نہیں ۔ ان کی مثنوی میں نظامی کا فلسفہ اور فردوسی کی سادگی نہیں ان کی رباعی میں خیام کی سرمستی اور سحابی کا تصوف نہیں ۔ لیکن یہ سب صفات ایک خاص حد تک موجود ہونے کے علاوہ یقیناً ایک ایسی چیز بھی ان کی ہر صنف سخن میں موجود ہے جو ان کو ممتاز اور الگ کر دیتی ہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ مرزا اسی دنیا میں رہتے تھے ۔ ان کی تخلیق انہی عناصر سے ہوئی تھی ۔ جن سے ان کے معاصرین اور متقدمین کی ۔ ان کو انہی حالات و واقعات سے سابقہ

پڑتا تھا جن سے جادۂ حیات کے ہر راہرو کو دوچار ہونا پڑتا ہے ان کے پاس اظہار خیال کا ذریعہ وہی الفاظ و محاورات تھے جو زید و عمر کے متاعِ نطق ہو سکتے ہیں۔ مگر باوجود ان تمام ہم رنگیوں اور یکسانیوں کے وہ ہر بات میں انوکھے، ممتاز اور ایک حد تک نرالے تھے۔ وہ فاطر کائنات سے تمام عطیات اور معمولی انعامات کے علاوہ کوئی خاص چیز لے کر کارگاہِ ہستی میں وارد ہوئے تھے۔ یعنی ان کی دکان ادب میں اسلوب بیان کی بداعت اور نفس مضمون کا عمق ایسی چیزیں ہیں جن سے سخن کا تمام مینا بازار ایک بڑی حد تک خالی نظر آتا ہے۔ وہ ہر بات کو خواہ وہ نثر ہو یا نظم، بیان صحت ہو۔ یا تقریر مرض۔ دوست کا ذکر ہو یا دشمن کا قصہ۔ انوکھے انداز سے بیان کرتے ہیں۔ نہیں چاہتے کہ کسی امر میں بھی اسلاف و اقران کی بنائی ہوئی راہوں پر چلیں۔ ان کا بس چلے تو کسی نئے ستارے میں اپنی دنیا جا بسائیں۔ جو انسان کے سانس سے ملوث نہ ہو چکا ہو۔ اگر ان کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جائے جس پر متقدمین سے ہم رنگ ہونے کا شبہ ہو سکے۔ تو وہ اس شبہ کو برداشت نہیں کرتے۔ اور اپنے سامعین کو صاف الفاظ میں وہ بات کہہ دیتے ہیں جس سے ان کے کان کبھی آشنا نہ ہوئے تھے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔ ؎

مبر گمانِ توارد یقیں شناس کہ دزد
متاعِ من ز نہاں خانۂ ازل بردہ است

اور یہ ان کی صاحب نظری کی دلیل ہے۔

با من میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

اب میں مختلف عنوانات کے تحت ان کا کلام پیش کرتا ہوں میں مخصوص اور معتقدانہ طریقِ انتخاب سے ان کی تصویر کا صرف ایک ہی جاذب توجہ رخ نہیں دکھانا چاہتا۔

بلکہ اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ اپنے اس بیان میں غالب سے صحیح تعارف کا حق
ادا کرنے کی امکانی کوشش کروں۔

توحید و تصوف:۔ سب سے پہلے مضمون کے شرف و تقدس کے لحاظ سے
توحید و تصوف کا ذکر کرتا ہوں۔ یہ مضمون جتنا عام اور معمولی ہے۔
خواص کے لئے اتنا ہی اہم و مشکل بھی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مرزا عملی
حیثیت سے نہ رومی تھے نہ سنائی۔ انہوں نے جو کچھ کہا اپنی دراکی
اور طباعی سے کہا۔ اگر مجھے صرف اسی ایک بات پر اظہار خیال کی
اجازت ہوتی تو میں بتاتا کہ غالب کے فارسی کلام میں تصوف اپنی پوری
شان اور اپنے تمام مدارج و مقاصد کے ساتھ کس طرح جلوہ گر ہے۔

مولانا رومی۔ حکیم سنائی، شیخ عطا وغیرہ شعرائے صوفیا اپنے واردات
و حالات کو شعر میں ادا کرتے تھے۔ شعر ان کا مقصود نہ تھا۔ صرف آلۂ اظہار
ما فی الضمیر یا کیفیات باطن کا دھندلا سا عکس کہا جاسکتا ہے۔ لیکن
شعراء کے ایک گروہ کثیر نے بجائے عرفان حقیقت کے صرف شعر کو
اپنا مطمح نظر بنایا۔ اور محض تصوف کی چاشنی سے شعر کو لذیذ بنانا چاہا
مرزا ان دونوں جماعتوں سے الگ ایک تیسری راہ کے سالک تھے۔ وہ
تنگ سرائی سے بیزار تھے۔ اور اس کو "باد خوانی" سمجھتے تھے۔ غزل
سرائی سے پشیمان تھے۔ اور یہ ان کے نزدیک "ہوا پرستی" سے زیادہ
وقعت نہ رکھتی تھی۔ مضامین عالیہ کے بیان میں ان کے سماء فطرت
سے ایک ابر مطیر صرف گہر باری ہوجاتا تھا۔ وہ مقامات تصوف کی مہارت
کا دعوےٰ نہیں کرتے۔ انہوں نے کسی شیخ وقت کے سامنے باقاعدہ
زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تھا۔ وہ ترک و تفرید، مراقبہ، مجاہدہ، ستر، تجلی
صحو، سکر اور قبض و بسط وغیرہ حالات و مقامات کے لذت و الم
سے ایک مسترشدہ طریقت کی طرح آگاہ نہیں تھے۔ لیکن چاہتے تھے۔ کہ

لذائذ روحانی کے سمندر میں ڈوب جائیں۔ فقر و فنا کی کیفیت اپنے اوپر طاری کرلیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

کو فنا ہمہ آلائشِ پندار برد
از صورِ جلوہ وا ز آئینہ زنگار برد

اسی غزل کا مقطع ہے۔

میز بندم ز فنا غالبؔ و تسکینش نیست
بو کہ توفیق ز گفتار بہ کردار برد

قصیدہ اول عرفی کے تتبع میں توحید کے لئے وقف کیا ہے فرماتے ہیں۔

اے زوامِ غیر غوغا در جہاں انداختہ
گفتہ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ

دیدہ بیروں و دروں از خویشتن بُرد انگہے
پردہ رسم پرستش در میاں انداختہ

اس کے بعد عالم کثرت کا ذکر کر کے لکھتے ہیں۔

باچنیں ہنگامہ در وحدت نمی گنجد دوئی
مردہ را از خولیش در بار گراں انداختہ

پھر مقامِ توحید میں عرفہ و فلاسفہ کی نارسائی کا ذکر کرتے ہیں۔

رفتہ ہر کس تا قدمگاہے و زآنجا خویش را
پایہ پایہ از فراز نردبان انداختہ

سید الطائفہ جنید نے کہا تھا۔ وہ حد و انتہا جس پر پہنچ کر توحید کے متعلق عقلمندوں کی عقلیں منتہی ہوتی ہیں۔ رویم کہتے ہیں" توحید یہ ہے کہ بشریت کے آثار محو ہو جائیں۔ اور الوہیت کا تجرد بھی مٹ جائے۔ یوسف بن حسین کے نزدیک جو شخص توحید کے سمندر دل میں آپڑا۔ وہ اوقات کے رہگزروں پر گزرتا ہوا زیادہ سے زیادہ تشنہ کام ہوتا جائے گا۔ یہی باتیں ہیں جو توحید و تحمید کے

عنوان سے مرزا کے باطنِ فکر سے سرزد ہوئیں ۔

اے بخلا و ملا خوئے تو ہنگامہ زا دہر　　با ہمہ در گفتگو بہ ہمہ با ماجرا
آب بخش بزور خون سکندر　　جان نہ پذیری ز ہیچ زندہ خضر ناروا

بزم ترا شمع و گل خستگیٔ بو تراب !

ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا ! ریشہ

گرمیٔ نبض کے کز تو بدل داشت سوز　　سوختہ در مغز خاک وار دگیا

ذاتِ باری اپنی کنہ و حقیقت کے لحاظ سے عقول و افہام کی حدود سے بالا تر ہے ۔ لیکن اپنے مظاہر صفات اور تجلیات خلق و صنع کی حیثیت سے یکسر ھُوَالظاھر کا مصداق ہے ۔

بر رُخ چوں ماہ برقع از کتاں انداختہ
در نہفتن پردہ از راز نہاں انداختہ

ہر ذرہ مظہر تجلی خورشید ہے اور ہر قطرہ رہنمائے حقیقت بحر ہے

اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز بہ تو روئے نیست
در ظلمت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری

اس شعر میں "بادیہ را بہ رہبری" پر غور فرمائیے کتنی نادر سچائی ہے ۔

آفتاب عالم سرگشتگی ہائے خودیم
میرسد بوئے تو از ہر گل کہ می بوئیم ما

بعض جگہ کوئی اپنا دنیوی قصہ بیان کرنا چاہتے ہیں ۔ اور بے ساختہ زبان سے مسائل وجود و نمود اشیاء وغیرہ اچھل پڑتے ہیں ۔ سفر کلکتہ میں قتیل کے ملاحول سے بہت دکھ پہنچا ۔ اس کا ذکر کرتے ہیں اور تمہید میں درس تصوف شروع ہو جاتا ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

ساقی بزم آگہی روزے　　را دستے ریخت در پیالہ من

سرور میں آ کر ساقی سے خطاب کرتے ہیں :-

گفتم اے محرم سرائے سرور   از ادب دور نیست پرسیدن
اوّل از دعوئے وجود بگو   گفت کفر است در طریقت من

پھر مختلف بلاد و امصار کے متعلق سوال و جواب ہوتے ہیں آخر میں پوچھتے ہیں۔

گفتم اکنوں مرا چہ زیبد، گفت   آستیں بر دو عالم افشاندن

یہی بات اپنے مخصوص رنگ میں دوسری جگہ کہتے ہیں۔

اگر بدل نخلد ہر چہ از نظر گزرد   خوشا روانی عمر یکہ در سفر گزرد

سبحان اللہ! اس سے آگے تمنا کا دروازہ بند ہے۔

ایک اور جگہ ساقیٔ میکدہ ہوش سے یوں ہمکلام ہوتے ہیں۔

گفتمش چیست جہاں، گفت سرا پردۂ راز!
گفتمش چیست سخن، گفت جگر گوشۂ ماست
گفتم از کثرت و وحدت سخنے گوے بر من
گفت موج و کف و گرداب ہمانا دریا

انسان کے لیے ادراکِ حقیقت محال ہے۔ لیکن جزوی ادراک سے مایوس ہو بیٹھنا بھی نازیبا ہے کتنی لطیف بات اور سچی رہنمائی ہے

گفتمش ذرہ بہ خورشید رسد، گفت محال
گفتمش کوششِ من در طلبش گفت رواست

جامی کی مشہور غزل ہے۔

اسی بحر اور ردیف و قافیہ میں لکھتے ہیں۔ اور کتنے پیارے انداز میں لکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے قطرہ سمندر کو اپنی گود میں لے لینا چاہتا ہے برگ گل گلشن کی تمام رنگینی تعطر کو سمیٹ لینے کے لئے بے قرار ہے۔ انسان کی ہیچ میرز روح اور محدود مجبور روح دانش اس کو پا لینا چاہتی ہے جس کو نہیں جانتی کہ وہ کیا ہے اور کہاں ہے چھینا چاہتی ہے اور چھین نہیں سکتی۔ تڑپنے کے لئے بے تاب ہے لیکن قوی جواب دے دیتے ہیں۔

چوں زبا نہالال ُجاہا بز زغوغا کردۂ
بایدت از خویش پرسید آنچہ با ما کردۂ

اے جمال حقیقت، اے شورافگن قلوب!

گرنہ مشتاق عرض بے دستگاہ حسن خویش
جان خدایت دیدہ را بہرچہ بلبیا کردۂ

خوشا نصیب ان کے جن کے لئے آج گوشۂ نقاب سرکایا گیا۔

مسرت ہو ان کو جو زیارت فردا کی امید پر شاہد تسکین سے ہمکنار ہیں۔

صد کشاد آں را کہ ہم امروز رخ بنمودۂ
مژدہ باد آں را کہ محو ذوق فردا کردۂ

میں اور تو اے کل!

ذرۂ را دوشناس صد بیاباں گفتہ
قطرہ را آشنائے ہفت دریا کردۂ

پاۓ تحقیق کی آخری منزل یہ ہے کہ۔

جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہر است
خویش را در پردہ خلقے را تماشا کردۂ

سالکانِ راہ کے اوصاف و مقامات کا بیان سنیئے۔ محبوب کی طلب میں ایذا پسند تھا۔

رہرواں چوں گہر آبلہ پا بگنید
پلئے را پایہ فراتر ز ثریا بینند

نشتو ہندا گر ہمرہ مجنوں گردند
بخرو شند اگر محمل لیلیٰ بینند

فراست خاصہ اولیا ہے۔ جو دوام مراقبہ، اتباع اور امر اور اجتناب نواہی سے حاصل ہوتا ہے۔

ہرچہ در دیدہ عیانست نگاہش در ا رند
ہرچہ در سینہ نہانست ز سیما بینند

دور بنیان ازل کوری چشم بد ہیں
ہمہ دریں جا نگرند آنچہ در آنجا بینند

ہونے والے واقعات ان کی ضمیر منیر پر پہلے ہی منکشف ہوجاتے ہیں۔

شرپے را کہ بناگاہ بدر خواہد جست
زخمہ کردار تبار یہ رگِ خارا بینند

قطرہ را کہ ہر آئینہ گہر خواہد بست
صورت آبلہ بر چہرہ دریا بینند

اپنی فطرتِ صالح کے سبب نظامِ کائنات میں کوئی نقص نہیں دیکھتے

راستی از رقمِ صفحہ ہستی خوانند
نقش کج بر ورق شہپرِ عنقا بینند

آیات کریمہ ’’ما تریٰ فی خلق الرحمٰن من تفاوت۔ فارجع البصر هل تریٰ من فطور‘‘ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے بقول سبحانی نجفی۔

تصور حضور و شہود ذات کی ایقانی کیفیت میں مستہلک رہتے ہیں۔

ہر چہ در سو نتواں یافت زہر سو یابند
ہر چہ درجا نتواں دید بہر جا بینند!

ننگ و نام کی الجھنیں، کفر و اسلام کے امتیازات، دیر و حرم کی تفریقات عارف کے دل پر مؤثر نہیں ہوتیں۔

کفر و دیں چیست جز آلائش پندار وجود
پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دین تو شود

با ایں کہ عاشقم سخن از ننگ و نام چیست
در امر خاص حجت دستور عام چیست

عشق کے سامنے عوارض و اعتبارات کی کوئی ہستی نہیں۔

خشک و تر سوزیٔ ایں شعلہ تماشا دارد
عشق یک رنگ کند بندہ و آزاد آمد

کائنات عالم کی کل کا ہر پرزہ ایک ہی منتظم جل ذکرہٗ کے اشارۂ ابرو پر گردش کر رہا ہے۔

نشاطِ معنویاں از شراب خانۂ تست
فسونِ بابلیاں فصلے از فسانۂ تست
مرا چہ جرم گر اندیشہ آسماں پیماست
ز تیز گامیٔ توسنِ ز تازیانۂ تست

زمانہ مسلسل، بے ماضی و بے مستقبل

بجامِ آئینہ حرفِ سکندر و جم چیست
کہ ہر چہ رفت بہر عہد در زمانۂ تست

علیٰ کل شئی محیط۔

ہم از احاطۂ تست ایں کہ در جہاں ما را
قدم بہ بتکدہ و سر بر آستانۂ تست

جب بات یہ ہے تو شکوہ روزگار و شکایت فلک سے کیا حاصل؟

از دستِ دیگر نیست سفید و سیاہِ ما
با روز و شب بعربدہ بودن چہ احتیاج

اس فقرہ سے حسبِ مراد نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

از ننگ اگر ساختۂ پرداختہ ما
کفرے نبود مطلب بے ساختنِ ما

سالک کسی مقام کو تھک کر اپنی منزل سمجھ لیتا ہے۔ ذرا ستانے اور ہوش میں آنے کے بعد دیکھتا ہے کہ وہیں سے ایک آغازِ جدید رونما ہو جاتا ہے۔

من از سر از پا نشناسم بدہ سعی نہ سپہر
ہر دم انجامِ مرا جلوہ آغاز دہد

اخلاق:- اخلاق کے متعلق کلام غالب سے ایک بڑا ذخیرہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ مرزا کا مرتبہ ایک معلم اخلاق کی حیثیت سے بھی بہت بلند ہے۔ ان کی تعلیم اخلاق واعظانہ نہیں، فلسفیانہ ہے۔ ہر عمل کی علت بیان کرتے ہیں۔ نتائج سے روشناس کراتے ہیں۔ اور سامع کو متاثر کرنے میں عموماً کامیاب رہتے ہیں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے۔ ولا تزکوا انفسکم واللہ اعلم بمن اتقی۔ یعنی اپنی بڑائی نہ بیان کرتے پھرو۔ حاضر و موجود خدا کو اہل تقویٰ کا خوب علم ہے۔ یہ نکتہ اساس اخلاق ہے اگر کسی شخص کی گفتار و کردار کا مقصود ریا و نمائش جلب دنیا اور تسکین نفس ہے۔ تو اس کی روح یقیناً مریض ہے۔ اس کا "کامل مطلق" ذات پر صحیح ایمان نہیں۔ اس کے نزدیک نیک عمل کوئی بالذات چیز نہیں۔ بلکہ حطام دنیا کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اگر اس کو یہ چیزیں نطشے کے گمراہ کن فلسفے کے مطابق کسی ناروا ذریعہ سے حاصل ہو سکیں۔ تو وہ اس کے ارتکاب سے باز نہیں رہے گا۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

آن کن کہ در نگاہ کساں محتشم شوی
برخویش ہم زخویش فزودن چہ احتیاج

قرآن مجید ایک اور نقطہ بیان فرماتا ہے لم تقولون ما لا تفعلون تم ایسی بات منہ سے کیوں نکالتے ہو۔ جس سے تمہارا عمل مطابقت نہیں رکھتا اس آیت میں کتنا مضبوط کیریکٹر طلب کیا گیا ہے۔ مرزا فرماتے ہیں۔

با خرد گفتم نشان اہل معنی باز گوے
گفت گفتارے کہ با کردار پیوندش بود

شیراز کے معلم کا ارشاد ہے۔

شنیدم کہ مردان راہ خدا — دل دشمناں ہم نکردند تنگ!
ترا کے میسر شود ایں مقام — کہ با دوستانت خلاف است و جنگ

مرزا نے اسی محبوب تخیل کو ایک نئے لباس میں پیش کیا ہے۔

آنکہ خواہد در صف مرداں بقائے نام خویش
خون دشمن سرخ تر از خون فرزندش بود

دردِ دل کے متعلق کتنی بلند بات کہہ دی ہے۔

بے غم نہاد مرد گرامی نمی شود : زنہار قدر خاطر اندوہگین شناس
سرا بے کہ رخشد بویرانہ خوشتر : زچشمے کہ پیرایہ نم ندارد

اولادِ آدم کے اعمال ایک مربوط سلسلہ علت و معلول کی طرح متولد ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے مصائب و محاسن اسلاف کی پیروی کا نتیجہ ہیں اور اخلاف کی زشتی و خوبی کا باعث۔

نقش پے رفتگان جادہ بود در جہاں : ہر کہ رود بایدش پاس قدم داشتن

درس قناعت و خودداری سنیے۔

کفر است گھر در پے روزی شتافتن : ننگ است ننگ در غم دنیا گریستن

مرزا کی خودداری مشہور ہے۔

تشنہ لب بر ساحل دریا ز غیرت جاں دہم
گر بموج افتد گماں چین پیشانی مرا
تواضع نکنم بے تواضع غالب
لبایہ خم تیغش خمیدنم بنگر

مذہب :۔ مرزا کے مذہب کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا۔ کہ وہ اسلام کے کس فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ مجھے ان کے کلام سے صاف نظر آرہا ہے کہ وہ باوجود شاعرانہ بذلہ سنجیوں کے نفس مذہب کا دل سے احترام کرتے تھے۔ محققین ادیان و مذہب کے نزدیک بالعموم تین باتیں مسلم ہیں۔ توحید۔ عمل صالح اور یقین پاداش توحید کے متعلق فرماتے ہیں

غالب آزادہ موحد کیشم　　بر پاکی خویشتن گواہ خویشم

شرک اور عمل غیر صالح سے اعراض :-

ہمانا تو دانی کہ کافر نیم　　پرستار خورشید و آذر نیم

نکشتم کسے را بہ بے ایمنی　　نبردم ز کس مایہ در رہزنی

اس مثنوی کے آخری اشعار ایمان جزا کے متعلق ملاحظہ ہوں۔

بدیں مویہ در روز امید و بیم　　بگریم بد انساں کہ عرش عظیم

شود از تو سیلاب را چارہ جوئی　　تو بخشی بدیں گریہ ام آبروئی

پھر اعتراف خطا کرتے ہیں اور جناب رسول و رسالت پر ایمان رکھنے کا ذکر کر کے امید نجات کرتے ہیں۔

کہ البتہ ایں رند ناپارسا　　کج اندیشہ گبر مسلماں نما

پرستار فرخندہ منشور تست　　ہوادار فرزانہ دستور تست

فلسفہ :- یوں تو مرزا کی کوئی بات فلسفہ سے خالی نہیں تاہم ایسے اشعار جن پر خالص فلسفہ کا اطلاق ہو سکے۔ کم نہیں ہیں۔ یہاں صرف چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔

انسان کو اگر کسی تکلیف آئندہ کا پہلے سے علم ہو جائے۔ تو وہ اسی وقت سے مبتلائے تکلیف ہو جاتا ہے یہ غلط ہے کہ ع

مترس از بلائے کہ شب درمیان است

بلکہ وہ درمیانی شب تمام استقبال بلا کی نذر ہو کر خود ایک عجیب بلا بن جاتی ہے۔ فرماتے ہیں :-

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلا است

قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

حظ و الم کا احساس و اظہار ناگزیر ہے۔ فکر بشری اس تاثر کے لئے مجبور ہے۔ آئینے میں قبول عکس کی استعداد فطری ہے۔ جیسے وہ خود موجود

عکس نہیں ویسے ہی ہم خط والم کے موجد نہیں۔

گر مہر دگر کیں ہمہ از دوست قبول است
اندیشہ جز آئینہ نما تصویر نیست!

عالم مادی کا ہر لمحہ تغیر سے متاثر ہو رہا ہے۔ یہ تیز خرام کرات یہ متحرک ذرات فضا۔ یہ متغیر افکار و اعمال اور ایمان میں گردش خون اسی حقیقت کی طرف رہنما ہیں۔

در ہر مژہ برہم زدن ایں خلق جدید است
نظارۂ سگالد کہ ہماں است ہماں است

اجزائے کائنات بنی آدم کی خدمت میں مصروف عمل ہیں ارشاد وحی ہے سخر لکم ما فی السموات وما فی الارض
یہی نوع مکرم وافضل ہے لقد کرمنا بنی ادم فضلناکم علی کثیر ممن خلقنا ۔ ارتقا مادہ کا آخری مقام آدم ہے اس مضمون کو مرزا یوں ادا کرتے ہیں۔

ز آفرینش عالم غرض جز آدم نیست
بگرد نقطہ ما دورِ ہفت پرکار نیست

فطرت نے انسان میں جو بلند استعدادیں ودیعت کی ہیں۔ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حال کا انسان جو کچھ کر رہا ہے۔ ماضی کا انسان اس کو خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسی طرح آئندہ پر قیاس کر لو۔

زما گرم است ایں ہنگامہ بنگر شور ہستی را
قیامت می دمد از پردہ خاکے کہ انساں شد

اس لحاظ سے مرتبہ انسان کتنا عظیم ہو جاتا ہے۔

جزوے از عالم واز ہمہ عالم بیشم
ہم چو موئے کہ بہ تن زار میاں برخیزد

کسی بزرگ کا ایک ہی شعر ہے۔

در جہانی و از جہاں بیشی   ہمچو معنی کہ در کلام بسود

لیکن یہ سب معانی و مراتب عطیہ الٰہی ہیں۔ ہم اپنی ذات میں کچھ نہیں اگر ادھر سے تائید نہ حاصل ہوتی رہے۔

شوخی اندیشہ خویش است ستم ہائے ما
تار و پود ہستی ما پیچ و تابے بیش نیست

عشق و محبت ایک طوفان انگیز ہیجان آفریں اور زلزلہ افگن فطری جذبہ ہے۔ علمائے نباتات نے باہم قریب رہنے والے پودوں کو جدا رکھ کر تجربہ کیا ہے ان کی نشو و نما کم ہو جاتی ہے۔ ان کی تازگی جمال پر افسردگی چھانے لگتی ہے۔ اور حیوانات میں طبعاً تجاذب و تواصل کی استعداد نباتات سے بدرجہا بڑھ کر ہے وہ ابنائے جنس بلکہ غیر جنس تک کی نفرت و الفت میں پوری طرح امتیاز کرتے ہیں۔ مانوس اشخاص اشیاء کے قرب و بعد سے بدیہی طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ جب نبات و حیوان میں روح کی خفتگی و نیم بیداری اور احساس کے سکون و عدم بلوغ کی حالت میں یہ شراب مرد افگن اتنا تند اثر رکھتی ہے تو فطرت کی مکمل صنعت گری۔ نشو و نمائے حواس کی مظہر اتم حضرت انسان کے بطونِ قلب و دماغ میں گھس کر یہ جذبہ جو بھی قیامت بپا کرے کم ہے بالخصوص شعرا کی لطافت حس و رقت وجدان عام بنی آدم سے بلند درجہ رکھتی ہے۔ یہ لوگ اس سے بدرجہ غایت متاثر و متکیف ہوتے ہیں۔ اور شعرا میں مرزا غالب جن کو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے خاتم الشعراء کہا جا سکتا ہے جنکی نگاہ حسن کی باریک تریں اداؤں تک پہنچتی تھی۔ جو حسن کو خود حسن سے زیادہ سمجھنے کے لئے طبعاً بہت مجبور تھے۔ کیوں نہ اپنی متاع ہستی لئے ہوئے اس سیلاب بے پناہ میں بہہ جاتے۔ وہ عرفی کی طرح معشوق بھی تھے۔ اور عاشق بھی۔ وہ حسن کی زبان تھے۔ اور عشق کے ترجمان۔ وہ عشق سے زیادہ نفسیات حسن کو بیان

کرتے ہیں - ان خصوصی میں ان کے دماغ نے وہ نکتے اخذ کئے جن کو بیش اردوں کی زبان و قلم نے مس نہیں کیا تھا۔ لیکن ان کے وتنوع کی عمومیت سے انکار نہیں ہو سکتا - اعلیٰ شعر کی یہ تعریف کی گئی ہے۔ کہ اس کے مضمون کو کوئی نظم نہ نہ کر سکے - اور جب کوئی قادر الکلام نظم کر دے - تو سب اسے اپنے خیال کی ترجمانی سمجھنے لگیں -

مرزا کی شب ہائے شباب جنون عشق کے بادہ تند سے سرشار تھیں۔ وہ اس شعلہ آتشیں کی حدت سے برسوں سلگا کئے - ان کے اس نوع کے اشعار آج بھی ایک ہنگامہ زا خروش عشق و تلاطم جذبات کی صحیح ترجمانی کر رہے ہیں۔ ان کی عمیق تمناؤں اور لازوال تشنگی کو کبھی سیرابی نصیب نہ ہوئی وہ معشوق میں فنا ہو جانے کے لئے بے تاب تھے - یا اس کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہتے تھے ان کی حیات معاشقہ کی گہرائیوں تک کون پہنچ سکتا ہے۔ انہوں نے بساط سخن پر جو پھول بکھیرے - ان سے استشمام کرنا فنون مکتبہ کے بڑے بڑے فضلا کے بس کی بات نہیں - اس مائدہ روح سے لذت اندوز ہونے کے لئے واردات اور فطرت سلیمہ کی ضرورت ہے - بالغ نظر، ادا فہم او نکتہ شناس لوگ ان کی اعجاز کاریوں سے بحر حیرت میں غرق ہو جاتے ہیں -

متاخرین ہند اور مرزا کے معاصرین کے ہاں غزل ایک بے جان چیز ہو چکی تھی - علامہ آزاد بلگرامی - سراج الدین علی خاں آرزو - امام بخش صہبائی و غیرہم کی فضیلت و تبحر اور تحقیق و تدقیق سے کس کو مجال انکار ہے لیکن یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ان کا تغزل بصر تفہیم کی لٹی شدہ نعشوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا - جن کی نوک پلک کی آراستگی میں شبہ نہیں - گرانبہا ہار زیب گلو ہیں انگلیاں مرصع انگوٹھیوں سے مزین ہیں - بنا گوش زریں بالوں میں مستور ہیں تمام اعضاء و جوارح اپنا فرض ادا کرنے کے لئے تیار معلوم ہوتے ہیں - ان کے کارخانہ کمال میں سب کچھ ہے لیکن روح نہیں طرفداری ہو گی اگر میں یہ کہوں کہ مرزا

پر اس ماحول کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

ان کے کلام میں یقیناً ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن کو لفظی صنعت گروں کے کلام سے ملا دیا جائے۔ تو کوئی تمیز نہ ہو سکے لیکن ان کی روشنی طبع کا ان کو اس اغلاق و پیچیدگی کی تاریکیوں سے نکالنے میں بڑا زور صرف ہوا ہے اور حقیقت نگاری کی شاہراہ پر لانے میں مسلسل سعی کی۔ شوخی بیان نزاکت خیال رشک، تاثرات فراق۔ تمنائے وصل۔ معاملات فی مابین وغیرہ ایسے مضامین ہیں جن کو پیکر غزل کے اعضائے رئیسہ کہا جاتا ہے۔ ان سب کے متعلق چند اشعار بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔ بہت سے اشعار ایسے ہیں جن کے معانی کی طرف اشارہ کرنے کی بھی مجھ میں تاب نہیں۔ سنئے اور معنی کے بحر میں غوطہ لگائیے۔

تو در آغوش دوست و دلم از کار شدہ

تشنہ لب دار و رسن پر سر چاہے دریاب

فغانی کا مشہور شعر یاد آگیا۔

غم نا امیدی من نگر آن زمان بدانی

کہ بروں ز باغ آئی و گلے بچیدہ باشی

محاکات کا ایک منظر ملاحظہ فرمائیں۔

بخوابم ے رسد بند قبا وا کردہ از مستی

ندانم شوق من بردے چہ افسوں کردہ است امشب

اپنا اور معشوق کا تعلق اور مابہ الامتیاز

میرم ولے بتر سم کز فرط بدگمانی

داند کہ جاں سپردم از عافیت گزیست

در بادہ دیر بستم آرے زبخت جانیست

در غمزہ زود رنجی آرے زناز نیست

شوخی بیان ملاحظہ ہو۔

این سخن حق بود گاہے بر زبان ما ترفت!
چون تو خود گفتی کہ خوباں را دل از خاست مست

توجیہہ عجیب :-

بے وجہ در رہت نیست از پا فتادن من
بر دیدہ مے فشانم در رہ ہر قدم قدم را

نزاکت خیال :-

بے خود بوقت ذبح طپیدن گناہ من
دانستہ دشنہ تیز نکردن گناہ کیست
شباہتیست مر آنرا کہ بر نیامدہ است
دگر نہ موئے بہار یکی میان تو نیست

مسلسل غزلیں لکھی ہیں اور خوب لکھی ہیں۔

بمرگ من کہ پس از من بمرگ من یاد آر
بکوئے خویشتن آں نعش بے کفن یاد آر
من آں ہیم کہ از مرگم جہاں بزم نخورد
فغان زاہد و فریاد برہمن یاد آر

ان کا محبوب نظیری کے محبوب کی طرح کسی اور پہ عاشق ہو چکا ہے
چنانچہ لکھتے ہیں :-

چشمش پر آب از تف مہر پری وشیست
من در گماں کہ از اثر دود آہ کیست!
ظالم تو و شکایت عشق این چہ ماجراست
بارے بمن بگو کہ دلت دادخواہ کیست

یہی مضمون ایک دوسری غزل میں ملاحظہ فرمایئے :-

در گریہ از بس ناز کی رخ ماندہ بر خاکش نگر
واں سینہ سوزاں از تپش بر خاک نمناکش نگر
برقعے کہ جانہا سوختی دل از جفا سردش ببیں
شوخے کہ خونہا ریختی دست از جفا پاکش نگر

بزم وصال کی رازداری و احتیاط اور نشاط و استغنا کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم — قضا بہ گردش رطل گراں بگردانیم
بگوشہ بنشینیم و در فراز کنیم — بہ کوچہ بر سر راہ پاسباں بگردانیم

مجاز سے حقیقت کی طرف سعود کر رہے ہیں۔

رفت آنکہ کسب بوئے تو از باد کردمے — گل دیدمے و درد ترا یاد کردمے
رفت آنکہ قیس را بسترگے ستودمے — در جابجے ستائش فرہاد کردمے

اور چند اشعار سنیے جن میں حقیقی تغزل نمایاں ہیں۔

سیرم نتواں کرد ز دیدار تو گوہاں — نظارہ بود شبنم و دل ریگ رواں ہائے

نظارہ و دل، شبنم و ریگ کیا نادر تشبیہ ہے

فوقیت دریں سو یہ کہ بر نخش منتش
—— با دل شدہ ہیچ نگوئے ہمہ داں ہائے ما

دوسرا مصرعہ دیکھیے۔ بولتا۔ پھڑکتا اور تڑپتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

در خلوت تابوت نرفتست ز یادم — بر تختہ در دوختہ چشم نگراں ہائے

ہائے کتنی ظالم مظلومیت ہے۔

معشوق کا تصور۔ اسے پالینے کا خیال۔ عاشق کے نزدیک منتہائے مقصود کمالِ مراد یا کامرانی کونین جو کچھ بھی کہو کم ہے۔ فرماتے ہیں۔

مژدہ خرمی و بے خللی را مانی — ابدی جنت، فیض ازلی را مانی
بسکہ ہموارہ دلآویزی و شیریں حرکات — سایہ طوبیٰ و جوئے عسلی را مانی

ایک اور غزل کے چند شعر سنیے۔ حسرت امید اور آرزو کی مکمل نقاشی ہے۔

بیاد جوش تمنای دیدنم بنگر | چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر
زمن بجرم تپیدن کنارہ می کردی | بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر

رشک :- ہر رشک ایک طبعی ملکہ ہے جو کم و بیش ہر انسان میں پایا جاتا ہے اس کا صحیح استعمال بام ترقی و فلاح تک پہنچنے کے لئے بمنزلہ نردبان ہے صنعت عام۔ تجارت اور حکومت وغیرہ ہر شعبہ عمل میں اس کی شعبدہ کاریاں دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن معاملات حسن و عشق میں اس کا تسلط بہت بڑھ جاتا ہے۔ جس سے متاثر نہ ہونا انسان کے بس کی بات نہیں۔

خطا معاف نگاہوں کو کھینچ لیتا ہے حسن
خطا معاف یہ آنکھیں نہیں ہیں پتھر کی

لیکن عاشق نہیں چاہتا کہ اس کے معشوق کی پیاری صورت کوئی دیکھے۔ اس کی نازک اور نغمہ خیز آواز کوئی سنے۔ اس کی نرم انگلیوں کو بطور مصافحہ بھی کوئی مس کرے۔ وہ اس کو تمام ہستی و ملحقات ہستی کو اپنے لئے وقف کر لینا چاہتا ہے۔ اس میں بقدر وہم و گمان بھی کسی دوسرے کا دخل اسے گوارا نہیں مرزا اس میں بھی گوناگوں مضامین اور بوقلموں نکتے پیدا کرتے ہیں۔ رقیب کی یاد اپنے دل میں لانا نہیں چاہتے۔ کیونکہ وہی دل یاد دوست کا مسکن ہے۔ اس طرح دشمن کو دوست سے ہم نشینی حاصل ہو جانے کا خطرہ ہے۔

یاد از عدو نیارم آنہم ز دوربینی است
کاندر دلم گذشتن با دوست ہم نشینی است

افراط رشک دوزخ ہے۔

بر روئے حاسداں در دوزخ کشودہ رشک
از بہر خویش جنت در بستہ ایم ما

ماتم امام میں تنہا رونا چاہتے ہیں۔

باخاکیاں بجنگم و افلاکیاں برشک | خواہم بر آستان تو تنہا گریستن

قاصد کے سامنے محبوب کا نام لینے سے بھی جھجکتے ہیں۔

چوں بہ قاصد بسپرم پیغام را رشک نگذارد کہ گویم نام را

یہی مضمون اردو میں بھی ادا کیا ہے

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں۔
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

رشک آیدم ز روشنی دیدہ ہائے خلق دانستہ ام کہ از اثرِ گردِ راہ کیست

خمریات:- خمریات سے مرزا کو خاص شغف تھا۔ چنانچہ اس زمین میں بھی بہت گل کاری کی اور اپنی ایجاد آفریں طبیعت سے نئے نئے مضامین پیدا کئے ظلمت کدہ ہستی میں ان کو اگر کبھی روشنی کی جھلک نظر آتی ہے۔ تو محض برقِ شراب کی طفیل جیسا کہ فرماتے ہیں۔

شبم تاریک و منزل دور و نقش جلوہ ناپیدا
ہلاکم جلوۂ برقِ شراب گاہ گاہی را

ان کے درد کی دوا۔ دل کی قوت اور جان کا نور یہی چیز ہے۔ وہ بطور میراث کوئی دنیوی سامان اس کے سوا اپنے مورث سے نہیں چاہتے۔

رکوزم دمے بدہر درماں بودم نیروے دل و روشنی جاں بودم
گفتم بہ پدر خوب مے نوش مکن تا بادہ بمیراث فراواں بودم

لیکن خود اپنے وارث کے لئے ایک دو خم مے بھی باقی چھوڑنا گوارا نہیں کرتے

اے آنکہ ترا سعی بدرمان من است
منعم مکن از بادہ کہ نقصان من است
حیف است کہ بعد من بمیراث رود
ایں یک دو سہ خم کہ در شبستانِ من است

جلوہ ساقی و ساغر مے سے یکساں گرمی بزم کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

بنای گرم است بزم از جلوۂ ساقی کہ پنداری گداز جوہر نظارہ در جام است مستاں را

عکس جمال دوست سے فروغ بادہ کو دیکھ کر کیا تشبیہ کی ہے۔

نازم فروغ بادہ ز عکس جمالِ دوست
گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را

بھوے معشوق کا شغل دیکھیے

سوز و ز گرمیش مے وا دہم چناں بہ لا
ریزد ز آبگینہ و ساغر شراب را

آب و شراب کا امتیاز ملاحظہ ہو۔

آبش دہم و اُو بہ بادہ ہر دم از تمیز
نوشد مے و ز جام فرو ریزد آب را

حلت شراب کے لیے کوئی نہ کوئی وجہ نکال لیتے ہیں۔ واعظ کو مخاطب کرتے ہیں۔

بگفتہ کہ بہ تلخی لبانِ دہند پذیر
برو کہ بادہ ما تلخ تر از ین پند است

کبھی شراب کے حرام ہونے کا خیال آجاتا ہے۔ اس کا ترک کرنا بھی گوارا نہیں اپنی تسلی کے لیے خود ہی جواز کا پہلو نکال لیتے ہیں۔

بہ بادہ گر بودم انس شاعرم نہ فقیر
سخن چہ تنگ ز آلودہ دامنی دارد

بلکہ اگر زاہد لوگ شاعر سے فتوے لینے کی تکلیف گوارہ کریں تو آئیں اور سنیں کہ ایک حیلہ سے وہ بھی پی پلا کر مغفور ہو سکتے ہیں۔

صہبا حلال زاہد شب زندہ دار را
امّا بشرط آنکہ ہماں صبح دم کشد

مرزا کے نزدیک شباب و زہد اجتماع نقیضین سے کم نہیں

شباب و زہد چہ ناقدر دانی ہستی است

شکوہ سنجی: ۔ شکایت زمانہ مرزا کا خاص مضمون ہے اسکو بارہا بیان کیا ہے ۔ اور ہر جگہ اسلوب بدیع اور انداز عجیب کے ساتھ غزل ۔ رباعی قصیدہ قطعہ مثنوی غرض کوئی صنف سخن اس سے خالی نہیں ۔ لکھتے ہیں ۔

در باغ مرادِ ما زبیداد تگرگ ۔ نہ نخل بجائے ماند نے شاخ نہ برگ
چوں خانہ خراب است چہ بالیم ز سیل ۔ چوں زیست وبال است چہ ترسیم ز مرگ

در بزم نشاط ختگان را چہ نشاط
از عربدہ پائے بستگان را چہ نشاط
گر ابر شراب ناب بارد غالب
با جام و سبو شکستگان را چہ نشاط

تمام عمر عبث توقعات میں گزر گئی ۔

بازی خورد روزگار بودم ہمہ عمر ۔ از بخت امیدوار بودم ہمہ عمر
بے بابہ فکر سود ماندم ہمہ جا ۔ بے وعدہ در انتظار بودم ہمہ عمر

کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی ۔ کوئی کمال کام نہ آیا ۔ آخر بڑھاپے میں تمام خواہشیں ترک کر کے صرف مے کو مراد ٹھہرایا گیا تھا ۔ اس نے بھی وفا نہ کی ۔

اوراق زمانہ در نوشتیم و گذشت ۔ در فن سخن یگانہ گشتیم و گذشت
مے بود و دوائے ما بہ پیری غالب ۔ زاں نیز بہ ناکام گزشتیم و گزشت

آسماں کو کسی کی تابندگی نہیں بھاتی ۔

داغم از پردرشں چرخ کہ در بزم امید
سر شمعے کہ فروزد بدم گاز دہد

مرزا عوام کے خلاف جرمن کے مشہور فلسفی شوپنہار کی طرح کسی کامیابی پر مسرور نہیں ہوتے ۔ بلکہ فطرت کائنات کے ماہر ہونے کے سبب ایک انوکھی حقیقت کا اظہار کرتے ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ اگر کوئی مراد بر آئے ۔ تو خوش نہیں ہونا چاہیئے ۔ بلکہ ایک دوسری نامرادی کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے

آسائش کی تلاش بھی فضول ہے۔ ایک الجھن سے نکلو گے دوسری میں پھنس جاؤ گے اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا۔

مجو آسودگی گر مرد راہی کاندریں وادی چو خار از پا بر آید پا ز دامن بر نمی آید

ہستی موجب علائق ہے اور علائق موجبِ مصائب۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تمام مصائب کی جڑ اقرارِ ہستی اور تعبیرِ ہستی ہی ہے۔

تمام زخمیم از ہستیم چہ می پرسی!
ز جسمِ لاغرِ خویشیم بر پیرہن خار است

علائق سے نجات چاہتے ہیں۔ لیکن کامیابی کہاں؟

دامن افشاند بجیب و ماندہ در بند تنم
وحشتے کو تا بروں آرم ز عریانی مرا

ہفت آسماں بگردش و ما در میانہ ایم
غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ مے رود

اسی خیال کو اردو میں یوں ادا کیا ہے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!

اپنے خون میں تڑپنے کی شکایت کرتے ہیں اس ذات کے حضور میں جس کے علم میں نہاں و آشکارا اور شہود و غیب یکساں ہے۔

حیف کہ من بخوں تپم و ز تو سخن رود کہ تو
اشک بدیدہ بشمری نالہ بہ سینہ بنگری

بخت بد کی یہ تاثیر ہے کہ کوثر خشک ہو جائے اور طوبیٰ پر بھی خزاں آجائے۔

کوثر اگر بمن رسد خاک خورم ز بے نمی
طوبیٰ اگر ز من شود ہیمہ کنم ز بے بری

ایک قطعہ میں اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اے غالبؔ زیاں کار جب خدا نے رزق عباد اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ تو تم بھوکے کیوں مرتے ہو؟ دراصل بات یہ ہے کہ چند سال سے تمہاری قطع حیات اور انسداد رزق کا حکم ہو چکا ہے فرشتہ رزق بہت فرمانبردار ہے۔ اس نے فوراً تعمیل ارشاد کی اور رزق بند کر دیا دوسرے فرشتے نے تجھے ہلاک کرنے میں دیر لگا رکھی ہے۔

دوم فرشتہ کہ یادش بخیر مقروں باد — روا نداشت در اہلاک شیوۂ تعجیل

لطیفہ کم از قول شاعرے تضمین — کہ در لطیفہ مرا در اکسے نبود عدیل

انتہائے شکوہ یہ ہے کہ صاحب شکوہ تمام وسائط و وسائل اور اسباب و علل کو نظر انداز کر کے ایک آخری جرأت سے مسبب حقیقی کی بارگاہ جلال میں کھڑا ہو کر اپنی داستان اندوہ پیش کر دے اور اپنی ہستی حقیر کو صدور افعال کے ناقابل سمجھ کر سب کچھ اسی طرف منسوب کرنے میں باک نہ کرے۔ یہ مضمون سب سے پہلے عہد نامہ قدیم کے صحیفۂ ایوب میں، اکمل واتم طریق پر موجود ہے اس صحیفہ کے تمام ابواب میں ستم رسیدہ ایوب جناب باری میں نہایت کھلے ہوئے شکوہ سنج نظر آتے ہیں۔ جس کو پڑھ کر کوئی صاحب دل کرب و اذیت اور حیرت و استعجاب کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

مرزا نے اپنی مثنوی گہربار کے قریباً ساٹھ شعر اس مضمون کے لئے وقف کئے ہیں۔ غالباً علامہ سر اقبال کے شکوے کا ماخذ یہی مثنوی ہے مرزا نے اپنے شکوہ کو لفظی و معنی کے اعتبار سے معراج کمال پر پہنچا دیا ہے۔ بازپرس کا دن ہے صالحین اپنی صلاحیت کے ثمرات سے متمتع ہو رہے ہیں۔ عاصی مجرموں میں ایک حسرت مند اور شرمگیں جماعت نمودار ہوتی ہے۔ ان میں مرزا غالب دہلوی سینہ کوباں نظر آتے ہیں۔ یہ بڑھتے بڑھتے داور محشر کے حضور اپنی شفاعت و وکالت پر خود ہی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس طویل مضمون کا خلاصہ یہ ہے۔

"میرے اعمال کو ترازو میں نہ رکھ۔ میرے ہر رنج و درد کا باعث میری ذات

کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ مجھے حساب و پرسش سے معذور رکھ۔ یا مجھے صاف گوئی کی جرأت دے۔ میری گستاخ گفتاری معاف کر۔ اے گفتہ و ناگفتہ اے یکساں واقف مجھ کو کہہ لینے دے۔ جو میرے دل میں ہے۔ میں قتل وغارت اور شرک وکفر کا مجرم نہیں۔ مے خوار ہوں۔ اور وہ بھی برائے نام بہت سی چاندنی راتیں اور بہار کے دن حسرت مے نوشی میں گذر گئے۔ دمِ عیش رقصِ بسمل سے زیادہ نہ تھا۔ تو نے مجھے دنیا میں ہمیشہ بے برگ ونوا ہی رکھا۔ دنیا کے دکھوں کی یاد مجھے بہشت میں بے چین کر دینے کے لئے کافی ہے۔ میرے گناہوں سے حسرتِ گناہ کا پلہ بھاری ہے۔ بے شک میں رند وناپارسا اور گبر مسلماں نما ہوں۔ لیکن تیری پاک کتاب کا عابد اور تیرے دانا پیمبر کا محب ہوں۔ مجھے نجات سے بہرہ یاب کر۔

مراثی: یہ مثنوی تنہا ہی مرزا کی قوت ایجاد و مادہ اجتہاد پر ایک برہان قاطع ہے۔ مرثیہ میں چند قصائد اور متعدد قطعات و ترکیب بند لکھے ہیں۔ جن میں مضمون کی ندرت کے ساتھ درد و اثر کی فراوانی ہے غالب کو آج تک مرثیہ گو کی حیثیت سے بالکل خاموش سمجھا گیا ہے۔ لیکن یہ قطعاً ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ ان مراثی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے ۔۔ کہ اندوہ وماتم کے مضامین کو بیان کرنے پر بھی انہیں کافی قدرت حاصل تھی۔ ملاحظہ فرمایئے شاہزادہ کا مرثیہ لکھتے ہیں۔

اے دل بچشم زخم حوادث فگار شو — اے چشم از تراوش دل اشکبار شو
اے خاک چہرہ گر نتواں زد بجادرا — اے چرخ خاک گر نتواں شد غبار شو

شہزادہ سے خطاب کرتے ہیں۔

اے رہ نوردِ عالم بالا چگونہ — ما بے تو در ہمیم تو بے ما چگونہ
با گل رخانِ دہر دفاے نداشتی — با حوریانِ آئنہ سیما چگونہ

امام حسین علیہ السلام کے مرثیہ میں جو سینہ کوبی و اشک ریزی کی ہے

کون کہہ سکتا ہے۔ کہ اس میں تکلف ہے۔ دیکھئے :-

اے فلک شرم از ستم بر خاندانِ مصطفیٰؐ
داشتی زین پیش سر بر آستانِ مصطفیٰؐ

اے بہر دیاہ نازاں ہیچ میدانی چہ رفت
از نور بر چشم و چراغِ دودمانِ مصطفیٰؐ

مناظرِ فطرت: نیچرل شاعری کے ایجاد کا سہرا عموماً شعرائے مغرب کے سر سمجھا جاتا ہے لیکن ہمارا نیچرل شاعر اس اسٹیج پر بھی پوری قدرت و قوت کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ بہت سے قصائد کی تشبیہیں بہار کی تصویر کشی سے آراستہ کی گئی ہیں۔ بعض قصائد و قطعات میں روشنیاں فلک کا نظارہ پیش کیا ہے۔ اس منزل میں مرزا ایک ماہر فلکیات سے کم نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ قصیدہ نمبر ۳۵ کی تشبیب میں گلگت کو خطاب کرتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

سیر گاہیست در اطراف تو گوئی کشمیر
رودستائیست ز افضائے تو گوئی مشیرا

قصیدہ نمبر ۱۴ طوطیانِ زمرد رنگ کی توصیف سے شروع ہوتا ہے۔

خیز تا بہ نگری لب شاخِ نہال طوطیان زمردیں تمثال
گاہ مرجان دماندہ از منقار گر زبر جد فشاندہ از پر و بال

قصیدہ پنجم کی تمہید میں مرزا کی ایجاد خیز طبیعت نے جو کچھ لکھا ہے۔ جہاں تک میرا مطالعہ ہے کسی پیشرو کا شرمندہ تقلید نہیں۔ صبح کا وقت ہے برہمن کے ہاتھ میں کلید ہے۔ میکدہ متحرک ہے۔

خیزند دستہ ہائے مغاماں نہ شستہ روے در اہتمام چیدن رسم زنار رون
از شور دیریان بگمانِ خروش صور اموات را ز رقص بہ تن بر درد کفن

مثنوی "چراغ دیر" میں بنارس کا نقشہ دکھایا ہے۔

بیا اے غافل کیفیت ناز　　نگاہ بہ پری زادانش انداز

میاں ہا نازک دولہا توانا

زنادانی بکار خویشتن دانا

تبسم بسکہ در لب ہا طبیعی است

دہن ہا رشک گلہائے بہشتی ست

ہجو: ہجو سے اگرچہ پرہیز کرتے ہیں۔ لیکن جہاں کہیں زبان سے کچھ نکل جاتا ہے پھول گرتے معلوم ہوتے ہیں کسی سخت دشمن کے متعلق لکھتے ہیں

گردیدہ جہدے کہ در ویرانیے کاشانہ ام

چرخ در آرائش ہنگامہ عالم نگرد

گرہ ہجوت راندہ باشم نکتہ با برخود مپیچ

زانکہ حرفے زانچہ گفتم خاطرم خرم نکرد

میرے خیال میں تو اس سے آگے ہجو کا کوئی اور درجہ نہیں، اور لطف یہ ہے کہ شفائی و سوزنی کی طرح عریاں الفاظ کا شائبہ تک نہیں،

ایک بے ہنر شیطان سیرت دشمن کی تواضع ہو رہی ہے

آیا بے ہنر دشمن دیو سار　　بہ نازی بہ ہنگامہ زر در زر

زما باشی فارغ کہ ما فارغیم　　خداوند بہ ہوائے این شور و شر

عورت کی رفاقت سے عمر بھر دل برداشتہ رہے، نثر و نظم کے اکثر اجزا اس پر شاہد ہیں۔

بہ آدم زن بہ شیطاں طوقِ لعنت

سپردند از رہ تکریم و تذلیل

ولیکن در اسیری طوقِ لعنت

گراں تر آمد از طوقِ عزازیل

مزاح: مرزا کی تحریرات سے ایک سنجیدہ ظرافت اور فلسفیانہ مزاح ٹپکتا ہے۔ اس

میں بھی عجیب و غریب نکتے پیدا کیے ہیں مشہور ہے کہ ازدواج خانہ داری موجب مصائب و آلام ہے۔ اس قید سے آزادی اپنے فکر کی مفید صحت و قوت ہے اس خیال سے کیا نادر نتیجہ نکالتے ہیں۔

آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود — از غصہ فراغتش ہمانا نبود
دارد بہ جہاں خانہ و زن نیست درو — نازم بخدا چرا توانا نبود

اور سفینہ کبھی تند خرامی حاجی کا قیافہ لگا رہے ہیں۔

اے آنکہ براہ کعبہ روئے داری — نازم کہ گزیدہ آرزوے داری
زیں گونہ کہ تند مے خرامی دانم — در خانہ زنِ ستیزہ خوئے داری

بہشت اور زہاد کا تصور کرتے ہیں۔

گر دیدن زاہداں بجنت گستاخ — دیں دست دراز ی بہ ثمر شاخ بہ شاخ
چوں نیک نظر کنی ز روئے تشبیہ — مانند بہ بہائم زِ علف زار فراخ

شراب چاہتے ہیں۔ مگر مفت، اعلیٰ اور بکثرت

غالب بہ سخن گست ہمسر نیست — از نشہ رہوش ہیچ اندر سر نیست
مے خواہی مفت و نغز و آنکہ بسیار — ایں بادہ فروش ساقی کوثر نیست

افلاس کے سبب صوم و صلوٰۃ کے متحمل نہیں ہو سکتے شرع میں ترمیم چاہتے ہیں۔

در عالم بے زری کہ تلخ است حیات — طاعت نتواں کرد بامید نجات
اے کاش زحق اشارت صوم و صلوٰۃ — بودے بہ وجودِ مال چوں حج و زکوٰۃ

جہالت کے بھی مختلف درجے ہیں۔

ہر چند زمانہ جمع جہال است — در جہل نہ حال شاں بیک منوال است
کودن ہمہ لیک از یکے تا دگرے — فرق خر عیسیٰ و خر دجال است

احترام اساتذہ:۔ اکثر غزلوں کے مقطعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا دل اساتذہ کے احترام سے معمور تھا۔ خصوصاً ظہوری سے بہت زیادہ عقیدت رکھتے تھے۔

بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب
رگ جاں کردہ ام شیرازۂ اوراقِ کتابش را

غالب از صہبائے اخلاق ظہوری سرخوشیم
پارہ بیش است از گفتار ما کردار ما
غالب از من شیوۂ نطق ظہوری زندہ گشت
از نوا جان در تن ساز بیانش کردہ ام

نظیری اور صائب کی غزلوں پر طبع آزمائی کرتے ہیں اور برابری کا دعویٰ نہیں کرتے

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب
خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم
ایں جواب آں غزل غالب کہ صائب گفتہ است
در نمود نقشہائے اختیار افتادہ ام

عرفی کے تتبع پر بھی نازاں ہیں۔

کیفیت عرفی طلب از طینت غالب
جام دگراں بادہ شیراز ندارد

اپنے متعلق خوب رائے رکھتے ہیں۔

جوہر طبعم درخشاں است لیک
روزم اندر ابر پنہاں میرود
تو اے کہ محو سخن گستراں پیشینی!
مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

غزلیاتِ غالب
غزل نمبر ۱

شعر نمبر ۱
جنون - دیوانگی شیفتگی و محبت کی انتہا - مراد جنونِ عشق
محمل - عماری - کجاوہ - ڈولی
صحرائی تحیر - دشت حیرت مراد حیرت کی فراوانی
واماندن - رک جانا تھک کر چور ہو جانا اٹک جانا - ماندہ کی بجائے راندہ پڑھا جائے ر کلیات غالب کے اصل نسخہ میں راندہ ہے

ترجمہ :- جنونِ عشق نے اپنے محمل (کجاوے) کو آج رات دشتِ حیرت میں دھکیل دیا ہے۔ اور اب حیرانی کا یہ عالم ہے کہ نگاہ آنکھ میں اور آہ جگر میں رک کے رہ گئی ہے
تشریح :- عاشق معشوق کا انتظار کرتے کرتے تھک جاتا ہے۔ شب وعدہ میں بے تابی - بیقراری - پریشانی - بے چینی اور اضطراب کی انتہا ہو جاتی ہے صبر آزما انتظار بالآخر عاشق کو اپنے ہی در پر یوں بٹھا دیتا ہے۔ جیسے کوئی دربان۔

وعدہ آنے کا دفا کیجے یہ کیا انداز ہے!
تم نے کیوں سونپی ہے میرے در کی دربانی مجھے

آہٹ پہ کان در پہ نظر دل میں درد سا
اللہ! کیا گھڑی ہے گھڑی انتظار کی

معشوق کے وعدہ وصل سے مایوسی اور ناامیدی عاشق کے حواس مختل کر دیتی ہے۔ اس کا فکر بالآخر دشتِ حیرت میں کھو جاتا ہے۔ بلکہ مایوسی و ناامیدی میں لبا اوقات خیال یار کے دامن کا چھوٹ جانا بھی بعید نہیں آنکھیں انتظار میں روزنِ دیوار بن جاتی ہیں۔ اور آہیں بخیہ چاک گریبان ہو جاتی ہیں۔ تلخ کامی۔ حسرت، ناامیدی - بے بسی اور بے چارگی

حیرانی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مشہور مقولہ ہے اَلْجُنُوْنُ فُنُوْنٌ یعنی جنون کی کئی قسمیں ہیں۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ عاشق کبھی تو اپنے دل کی دھڑکن کو محبوب کی آواز پا سمجھنے لگتا ہے۔ اور کبھی بادِ صبا اور بادِ نسیم کو پیغامبر سمجھ کر اس سے ہمکلام ہوتا ہے۔ ہجر یار میں ضعف و ناتوانی کی وجہ سے عاشق میں اتنی جان بھی نہیں رہتی۔ کہ آہ بھر سکے۔ یا آنکھ بھر کو دیکھ سکے

دراصل حیرت کی فراوانی کو غالب نے صحرائے تحیر باندھا ہے۔ محبوب کے انتظار میں حیرت آئینہ کا فرش بچھا دیتی ہے۔ حیرت کو عموماً آئینہ سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے۔ فراوانی حیرت کے متعلق غالب کا ایک شعر ملاحظہ ہو

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرش شش جہت انتظار ہے

شعر نمبر ۲۔ ساماں نشاط۔ خوشی اور عیش و طرب | نشاندن۔ بٹھانا
پنداشتن۔ سمجھنا

ترجمہ :۔ محبوب کے وعدۂ وصل و ملاقات کے شوق کے ذریعے میں نے تو خوشی اور طرب کا سامان تیار کر لیا تھا۔ مگر اب یہ محسوس کرتا ہوں جیسے اس نے جھوٹا وعدہ کر کے آج رات مجھے پھولوں کی سیج سے اٹھا کر آگ پر بٹھا دیا ہو۔

تشریح :۔ عاشق امید وصل پر جیتا ہے۔ وعدۂ وصل پر ہزاروں سکیمیں بناتا ہے اور مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتا۔ یا وقتی طور پر خوش فہمی میں اپنے لئے وہ گویا پھولوں کی سیج تیار کر لیتا ہے مگر جب وعدہ وصل پورا نہیں ہوتا۔ تو تڑپتا ہے بیقرار ہوتا ہے۔ انگاروں پر لوٹتا ہے۔ اور بالآخر پکار اٹھتا ہے

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

انتظار ناکام میں عاشق نے ہزاروں ہی رونے روئے ہیں۔ وصل یا دیدار سے محروم رہ جانے کے بعد عاشق محض خواب ہی میں اپنے محبوب کو دیکھ لینے کا متمنی رہتا ہے تاکہ اضطراب دور ہو۔ اور تپش جاتی رہے۔ مگر مجال خواب بھی کہاں؟

وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

تپشِ دل اسے سونے نہیں دیتی۔ سر رنج بالیں بن جاتا ہے۔ اور تن بارِ بستر۔ ایسی صورت میں نیند کہاں؟

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
میرا سر رنجِ بالیں ہے میرا تن بارِ بستر ہے

یا

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالب
کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

غزل نمبر ۲

شعلہ: آتشیں رو۔ آتشیں رخسار ۔ سرخ چہرہ محبوب
ژند: زرتشت کی مشہور العامی کتاب استاد کی شرح جو ژند کے نام سے مشہور ہے

ژند خوانی۔ ژند پڑھنا ۔ نوا۔ آواز۔ صدا

شرر فشانی۔ چنگاریاں بکھیرنا۔ شعلے برسانا۔

ترجمہ:۔ آج وہ دہکتے ہوئے چہرے والا محبوب (مغ بچہ) ترنم ریزی (خوش الحانی سے ژند پڑھنے) میں یوں مصروف ہے کہ اس کے لبوں سے نکلنے والے نغمے عاشق پر ہر گھڑی شرر باری کر رہے ہیں۔

تشریح:۔ اس شعر میں صنعت مراعات النظیر ہے۔ جیسے بہشت۔ طوبےٰ۔ گل اور ریحان کو ایک شعر میں استعمال کرنا۔

آتشیں رو۔ شرر فشانی اور ژند وغیرہ میں بھی رعایت لفظی اور مناسبت ہے

محبوب نغمہ ریزی میں مصروف ہے۔ اس کا گانا بلکہ ہر نوا عاشق کی جان پر برق کا کام کر رہی ہے۔ جیسے مطرب کی ہر صدا عاشق کے خرمن حیات پر بجلی کی طرح گر جاتی ہے۔ اور ہوش و حواس کو غارت کر دیتی ہے پہلے محبوب کے جلوہ حسن پر عقل و ایمان نچھاور کئے تھے۔ اب اس کے دل کش نغموں پر جان دینا پڑی محبوب کے نغموں نے ایسی آگ لگائی ہے کہ جس سے جانبر ہونا مشکل ہے۔

ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی

مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے (غالب)

غالب نے ایک اور جگہ اسی خیال کو یوں ادا کیا ہے۔

ڈھونڈے ہے اس مغنیٔ آتش نفس کو جی

جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

شعر ۲:۔

عکس ۔ سایہ	ہمچو ۔ مثل ۔ مانند
فارغ از روانی ۔ بہنے سے رک جانا ۔	دلجو ۔ دلکش

ترجمہ:۔ جب سے اس قد رعنا کا عکس پانی میں پڑا ہے چشمہ آئینے کی مانند بہنے سے رک گیا ہے (آئینہ اپنی آب و تاب کی وجہ سے آب بستہ کی طرح نظر آتا ہے۔)

تشریح:۔ اس شعر میں شاعر نے محبوب کے قد رعنا کی خوبصورتی، دلکشی اور دلفریبی کا بہترین نقشہ کھینچا ہے۔ محبوب کے حسن کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ اسے دیکھ کر بہتا پانی بھی حیرانی کے عالم میں تھم جاتا ہے۔ چشمۂ آب آئینے کی مانند بالکل ششدر و حیران ہو کر رہ جاتا ہے۔ آئینے میں صاف اور شفاف پانی کی چمک اور آب و تاب تو ہے۔ لیکن وہ روانی سے محروم ہے۔ غالب نے ایک اور جگہ اپنے معشوق کے قد رعنا کی یوں تعریف کی ہے۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم

میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

شعر ۳ :- کشاکش - کھینچا تانی   گسلا گسلیدن مصدر یعنی ٹوٹنا

روان - جان - جان روح

ترجمہ :- میری کمزوری اور ضعف کی کشمکش روح جسم سے جدا نہیں ہو رہی - یہ جو میں نے (ابھی تک) مرا نہیں ہوں - میری ناتوانی اور کمزوری ہی کی وجہ سے ہے۔

تشریح :- فراق یار اور عشق و دلبستگی نے ضعف و ناتوانی کو اس قدر بڑھا دیا ہے - کہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوں - جان تن سے نکل نہیں سکتی - روح کو جسم سے نکلنے کے لیے کچھ قوت کی ضرورت ہے - مگر اب مجھ میں تو اتنی طاقت بھی کہاں ہے -

یہ عالم ہے غم فرقت میں ان کے ناتوانوں کا
کہ آہوں میں رسائی ہے نہ اشکوں میں روانی ہے

شعر ۴ :- کشتہ - اسم مفعول از کشتن   ستمگر - ظالم

مقتول - مارا ہوا   دلفریبی ہا - مکاریاں - عیاریاں

یکسر - لگاتار - مسلسل

ترجمہ :- میں اپنے ہی دل کا مارا ہوا ہوں - کیوں کہ میرے دل نے ظالم محبوبوں کے مسلسل فریب کھانے کے باوجود ہمیشہ ہی ان کو مہربانیوں پہ محمول کیا -

تشریح :- عاشق ایک فریب خوردہ انسان ہے - محبوب کے ہاتھوں بے رخی بے اعتنائی اور جور و ستم دیکھنے کے باوجود بت بیداد گر کو پوجتا رہتا ہے محبوب کی بیوفائی کو وفا سمجھتا ہے جور و ستم کو لطف و کرم پر محمول کرتا ہے دراصل وہ حق بجانب بھی ہے کیونکہ

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

مگر اصل قصور دل کا ہے ۔

عشوؤں کی ہے نہ اس نگہ فتنہ زا کی ہے   ساری خطا میرے دل شورش ادا کی ہے

شعر ۵۔ دائم۔ ہمیشہ خاک۔ قبر

رُخ نہفتہ۔ منہ چھپائے ہوئے ہاں ہاں۔ حروفِ تنبیہہ

ترجمہ:۔ ہمیشہ میری قبر پہ منہ چھپا کر گذرنا۔ اے میرے خدا ناشناس محبوب بھلا یہ کیسی بدگمانی ہے (خبردار جو تو ایسا کر رہا ہے)

تشریح:۔ محبوب ہمیشہ عاشق سے منہ چھپاتا رہا۔ بے رخی اور بے التفاتی سے کام لیتا رہا۔ بدگمانیوں میں نامحرم سمجھتا رہا۔ پہلے تو اور بات تھی۔ عاشق کہتا ہے کہ اب میرے مرجانے کے بعد میری قبر کے پاس سے پردہ کر کے گذر جانا کسی طرح بھی مستحسن نہیں ہے۔ شاید محبوب کو کھٹکا ہے۔ کہ کہیں میں اس کو دیکھ نہ لوں۔ یہ محض مجھ پہ بدگمانی ہے۔ ورنہ قبر سے مردہ کیسے دیکھ سکتا ہے؟

اس شعر میں محبوب کے حجاب اور شرم و حیا کی انتہا کو ظاہر کیا گیا ہے خدا ناشناس اس لئے کہا۔ کہ محبوب کو خدا کا خوف نہیں۔ ورنہ عاشق کی قربانی جاں نثاری۔ عشق و شیفتگی بلکہ رات دن کی محویت کا ہی لحاظ کر کے اس کو اپنے دیدار یا وصال سے بہرہ ور کر دیتا۔

شعر ۶:۔

تہیدستی۔ فقیری۔ غریبی بہرہ۔ حصہ

مفلسی۔ ناداری سرمستی۔ عین نشہ اصل نشہ۔ پورا نشہ

آستیں افشانی۔ رقص و سماع میں مشغول ہونا۔

ترجمہ:۔ اس قسم کی تنگدستی۔ تہی دامنی اور مفلسی کے ساتھ زندگی کی دلچسپیوں اور لذتوں سے کیا بہرہ مل سکتا ہے۔

تشریح:۔ ہمارا کام تو نشہ و سرشاریٔ عشق کی وجہ سے فقط رقص و سرود میں مشغول ہو کر دنیاوی لذتوں سے بے نیاز رہنا ہے یا اس تہی دامنی کے ساتھ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ گدا اگر تواضع کند خوئے اوست دالا معاملہ ہے۔

ہم نے اگر لذات دنیاوی اور دیگر عیش و عشرت کو ترک کر رکھا ہے تو محض اسلئے کہ ہم مجبور ہیں تعیش کے وسائل ہی ہمارے پاس کہاں ہیں۔ جو لذت اندوز ہوں۔

شعر ۷ :-

مژدہ - خوشخبری۔
ہما - ایک مبارک فال پرندہ جسکے متعلق مشہور ہے کہ جس کے سر پر سے گزر جائے وہ بادشاہ بن جاتا ہے۔
گرانی - بوجھ

ترجمہ :-

اے وہ شخص جس نے مجھے اس وادی میں ہما کی خوشخبری دی ہے تجھے کیا معلوم کہ میں اتنا آزاد منش ہوں۔ کہ میرا سر ہما کے سایہ کو بھی بوجھ محسوس کرتا ہے۔

تشریح :- ہما کا سایہ جس کو جاہ پسند لوگ عین سعادت سمجھتے ہیں۔ میں تو اس کو بھی ہرگز خاطر میں نہیں لاتا۔ میں تو ہما کے سایہ کو اپنے سر پر بوجھ تصور کرتا ہوں۔ بادشاہ بننا تو بہت دور کی بات ہے۔

سایہ ہما تو حریص طامع اور آزمند لوگوں کو مبارک ہو اس شعر میں نازک خیالی کی انتہا ہے۔

شعر نمبر ۸
ہجران - فراق - جدائی
درازی - لمبائی - طول
کواکب - جمع کوکب - ستارے
سبحہ - تسبیح
گرداندن - پھیرنا - چلانا

ترجمہ :- خدا کرے معشوق کی عمر اتنی لمبی ہو جتنی کہ عاشق ناکام کی شب فراق۔ آج رات آسمان نے بھی ستاروں کی تسبیح گردانی کی ہے۔

تشریح :- اس شعر میں طول ہجر و اختر شماری کا بیان ہے۔

شام فراق کو اکثر شب یلدا سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس کی طوالت اور درازی ضرب المثل ہے۔ گھڑیاں مہینوں اور مہینے سالوں میں کٹتے ہیں

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گذرتی ہیں مہینوں میں (اقبال)

ہجر و فراق کی گھڑیاں ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ شاعر محبوب کی عمر درازی کے لئے دعا کرتا ہے۔ اور درازیٔ عمر کا اندازہ عام طور پر عمرِ نوح سے لگایا جاتا ہے لیکن شاعر کی دعا کا انداز نرالا ہے۔ عمرِ نوح تو ختم ہو سکتی ہے لیکن شبِ فراق ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ مثلاً شامِ تنہائی کا نقشہ غالب یوں کھینچتے ہیں۔ ؎

بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

چنانچہ شبِ فراق کی طوالت سے آسمان بھی حیران ہے اور ستاروں سے تسبیح گردانی کا کام لے رہا ہے کہ شاید اس سے سحر ہو جائے۔ اس شعر میں صنعتِ حسنِ تعلیل ہے۔

دانی کہ چوں ہمی گذرانیم روزگار
روزی کہ بے تو می گزرد روزِ محشر است

شعر نمبر ۹

بند۔ بٹن — قبا۔ کوٹ

واکردن۔ کھولنا — افسوں۔ جادو

ترجمہ:- محبوب مستی کے عالم میں کوٹ کے بٹن کھول کر آج رات خواب میں میرے پاس آ رہا ہے۔ نہ معلوم میرے جذبۂ شوق نے اس پر کیا جادو پھونکا ہے۔

تشریح:- گو وصالِ محبوب دشوار ہے۔ مگر عاشقِ صادق کے خیال کو ہمیشہ خواب میں محبوب ہی سے معاملہ رہتا ہے۔

روز آتا ہے میرے دل کو تسلی دینے
تجھ سے تو دشمنِ جاں تیرا خیال اچھا ہے

مگر جب آنکھ کھلتی ہے۔ تو عاشق پھر پریشان ہو جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے ؎

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

شاعر کہتا ہے۔ کہ محبوب بند قبا کھول کر مستی کے عالم میں میرے پاس آرہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ میرے جذبۂ شوق نے اس پر جادو پھونک دیا ہے ورنہ وہ عام طور پر مجھے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا۔

شعر نمبر ۱۰
شوریدہ۔ پریشان حال دیوانہ — جنبانیدن۔ ہلانا
مجنوں۔ قیس عامری۔ عرب کے مشہور عاشق لیلیٰ کا نام

ترجمہ:۔ اے محبوب! تیری زلف کس رقیب روسیاہ کے ہاتھ لگی ہے کیونکہ یہ دل دیوانہ آہ و زاری کر رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مجنوں کی زنجیر کے سرے کو آج رات کسی نے ہلا دیا ہے۔

تشریح:۔ عاشق کا دل دیوانہ ہجر و فراق کی وجہ سے آہ و زاری کرتا ہے اس آشفتہ خاطری کا اصل سبب تو یہ ہے۔ کہ عاشق کا دل محبوب کی زلفوں میں اسیر ہے۔ مگر محبوب ہمیشہ کم لطفی اور بے اعتنائی سے پیش آتا ہے۔ عاشق ہجر و فراق میں تڑپتا ہے۔ مگر رقیب روسیاہ محبوب کی صحبت سے لطف اندوز ہو رہا ہے یہ تصور عاشق کے لئے سوہانِ روح ہے بالآخر رشک میں پکار اٹھتا ہے کہ:۔
نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

شعر نمبر ۱۱
محشر۔ حشر کا میدان — افسانہ۔ داستان۔ کہانی

ترجمہ:۔ اے غالب! دردِ فراق کی حکایت کو مختصر طور پر بیان کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ آج رات جو کچھ بیان کرنا باقی رہ جائے گا۔ اسے روزِ محشر کے موقع پر کہا جا سکتا ہے۔

تشریح :- دردِ جدائی کی داستان دلچسپ بھی ہے اور طولانی بھی۔

بیان درد پایانی ندارد
خوشا دردی کہ درمانی ندارد

غالب کہتا ہے کہ شبِ فراق کا قصہ تو ختم ہی نہیں ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ اس کو مختصر طور پر بیان کیا جائے۔ باقی قصہ قیامت کے دن داورِ محشر کے سامنے کہہ دیا جائے گا۔ شاید دادرسی بھی ہو جائے۔

غالب نے کیا ہی خوب کہا ہے۔

نہ دے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہائے جدائی کا

در نامہ نیز چند بگنجد حدیث عشق
کوتاہ کنم کہ قصہ ی کار دفتر است

شعر ۱۲ :- فکر۔ تخیل۔ خیال شاعری
انجمن۔ شاعروں کی محفل
ظہوری۔ دکن میں ایک مشہور ایرانی نژاد نثر نگار اور شاعر
صائب۔ تبریز کا رہنے والا مشہور ایرانی شاعر جو برسوں ہندوستان میں مقیم رہا۔
محو ہمزبانی۔ محو گفتگو

ترجمہ :- شعر و شاعری یا فکر کی بلند پروازی کا شوق غالب کو عام شاعروں کی محفل سے باہر لے گیا۔ اور ظہوری و صائب کے ساتھ ہمکلام ہوتا رہا۔

تشریح :- مرزا غالب سبک ہندی کے مشہور شعراء میں سے تھے اور ظہوری اور صائب کی طرز ان کو بہت پسند تھی۔ طرزِ بیدل میں بھی لکھتے رہے۔

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

معمولی شعراء کو غالب خاطر ہیں نہ لاتے تھے۔ اس لئے ان کی محفل اور صحبت کو پسند نہ کرتے چنانچہ ظہوری و صائب کی طرز پر لکھتے رہے۔

غزل نمبر ۳

شعر ۱۔ دلبر۔ معشوق۔ دلربا　　بیداد۔ ظلم و ستم
ستمگر۔ ظالم

ترجمہ :- اس محبوب نے میرا دل چھین لیا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس کو دل چھیننے کے باوجود دلبر نہیں کہہ سکتے۔ اس کا ظلم و ستم تو سہہ سکتے ہیں لیکن اسے ظالم نہیں کہہ سکتے۔

تشریح :- غالب نے دو متضاد باتوں کو یک جا جمع کر دیا ہے بظاہر یہ شعر ایک معمہ سا معلوم ہوتا ہے۔ یعنی جو دل چھین کر لے جائے اس کو دلستاں نہ کہیں۔ اور اگر ظلم و ستم کرے تو اسے ظالم نہ کہہ سکیں۔ عجب بات ہے۔ یہاں محبوب سے مراد مجازی محبوب نہیں بلکہ محبوب حقیقی مراد ہے۔ اس محبوب حقیقی کو دلبر کے عام لفظ سے پکارنا اس کی توہین ہے۔ باوجود دل چھین لینے کے وہ ہمارے سکون قلب کا سامان ہے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اس کے بغیر ہم زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔

دلآرامے کہ بردہ است از دل آرام
بکامِ دل چو جان اندر برماست

ہم اس محبوبِ حقیقی اور جانِ جہاں کی تمام سختیاں اور ستم برداشت کرتے رہتے ہیں۔ لیکن شکوہ نہیں کر سکتے۔ اس کو ظالم، ستمگر، جابر کہنا بے ادبی ہے ہماری تمام مصلحتوں کو وہی سمجھ سکتا ہے۔ وہی بناتا اور وہی بگاڑتا ہے

اس نازنین سے ہم کو جتنے گزند پہنچے
سب دلپذیر پہنچے سب دل پسند پہنچے　　(حسرت)

اس محبوب حقیقی کی خوشنودی ہی ہمیں مقصود و مطلوب ہے جفا کو بھی وفا
ہی سمجھنا پڑتا ہے۔

گر میکشی بقہر و گر میکشی بلطف
تا بندہ ایم برائے تو عین رضائے ماست

مزید برآں شیوہ عشق کے خلاف ہے کہ محبوب کو دل کا چور کہا جائے۔
محبوب جو بھی ستم ڈھائے۔ ان کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مگر شکوہ اپنا از
اپنے عشق کی توہین ہے۔

شعر ۲:-

رزمگاہ - میدان جنگ	ناچخ - نیزہ
بزم گاہ - محفل - مجلس	بادہ - شراب
ساغر - پیالہ	

ترجمہ:- محبوب کے لڑائی کے میدان میں نیزہ اور خنجر نہیں لے جا سکتے اور اس
کی محفل میں شراب اور ساغر کا نام نہیں لے سکتے۔

تشریح:- محبوب کے تیز نگاہ اور خنجر وابرو کے سامنے فولادی نیزہ اور خنجر بھی کام
نہیں دے سکتے۔ اس کے زخمی کا جان بر ہونا ناممکن ہے اس کی آنکھوں
میں وہ نشہ ہے کہ دیکھنے والا مست ہو جاتا ہے وہاں شراب و جام کا تذکرہ
بیکار ہے۔ بغیر پیئے ہی نشہ طاری ہو جاتا ہے۔

جامی از شوق تو شد مست نہ مئی دیدہ نہ جام
بزم عشقست چہ جائے مے و جام است اینجا

بغیر اسلحہ کے قتل کرنا اور بغیر نشہ مے کے نشہ پلا دینا محبوب کی بڑی خوبی ہے

شعر ۳:-

گرم روی - تیز رفتاری	طوبیٰ - بہشت کا ایک میوہ دار درخت
کوثر - بہشت کی ایک نہر کا نام	

ترجمہ :- معرفت کے راستے پر چلنے والے ایک مسافر کی حیثیت سے میں سایہ اور سرچشمہ کی تلاش نہیں کرتا۔ اس لئے میرے ساتھ درخت طوبیٰ اور نہر کوثر کا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔

تشریح :- سرچشمہ۔ طوبیٰ اور کوثر ہم نسبت الفاظ ہیں۔ اس شعر میں صنعت لف ونشر مرتب ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ زاہد متقی۔ عبادت گذار اور ریاضت کش صوفی راہ معرفت پر تیز رفتاری اور گرم جوشی سے گامزن ہیں لیکن شاعر کہتا ہے۔ کہ میرا مسلک کچھ اور ہے نہ تو بہشت وطوبیٰ وکوثر اور حور وقصور کا خیال ہے۔ اور نہ ہی کسی اور صلے کی پرواہ

سایۂ طوبیٰ و دلجوئی ولب جو
بہوای سر کوئے تو برفت از یادم

سچا عاشق راستہ طے کرتا رہتا ہے نہ تو تھکاوٹ محسوس کرتا ہے اور نہ ہی تشنگی۔ محبت کے نشہ میں مست اپنی راہ پر چلا جاتا ہے۔ ستانے کے لئے اس کو کسی سایہ کی ضرورت نہیں۔ اور پیاس بجھانے کے لئے کسی سرچشمہ کی احتیاج نہیں۔ اس کی اطاعت وعبادت بے لوث اور بے غرض ہے۔ غالب نے اس خیال کو اس شعر میں ادا کیا ہے ؂

طاعت میں تا رہے نہ مئے وانگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

شعر (۴)

نہاں۔ چھپا ہوا۔ پوشیدہ — دار۔ پھانسی کا تختہ

منبر۔ مسجد میں وہ مقام یا جگہ جہاں واعظ کھڑا ہو کر وعظ کرتا ہے۔

ترجمہ :- وہ راز جو میرے سینے میں پوشیدہ ہے۔ وہ محض واعظانہ ہی کوئی بات نہیں کہ اسے منبر پر کھڑے ہو کر کہہ دیا جائے۔ بلکہ وہ ایسا راز

ہے ہے۔ پھانسی کے تختے پر ہی کہا جا سکتا ہے۔
تشریح: عشق و سرمستی کی باتیں اور معرفت کے اسرار و رموز بیان کرنا کچھ آسان نہیں۔ منصور حلاج نے اپنے سینے کا راز ابھی ظاہر ہی کیا تھا۔ کہ اسے سولی پر لٹکا دیا گیا۔ اس دنیا میں دعوٰی انا الحق کو سمجھنے والے بہت ہی کم لوگ ہیں۔ قصۂ دار و رسن کچھ اور ہی شئے ہے۔ اس کو سننے کے لئے ہمت کی ضرورت ہے اس کو کہنے کے لئے جرأت اور حوصلہ درکار ہے۔

شعر نمبر ۵:-
شیفتہ۔ دیوانہ　　　　مومن۔ صاحب ایمان
کافر۔ منکر خدا اور رسول
ترجمہ:- ہمیں اس غالب دیوانے سے عجیب معاملہ آن پڑا ہے۔ اس کو مومن کہنا بھی مشکل ہے اور کافر کہنا بھی آسان نہیں۔
تشریح:- اس شعر میں صنعت تضاد ہے۔ مومن اور کافر دونوں متضاد کلمے ہیں۔ حضرت غالب ایک عجیب شئے ہیں۔ ان کو کسی مذہب، دین یا عقیدہ سے منسوب کرنا مشکل ہے۔ مگر اُس کے خلوص، صفائی قلب اور کردار کو دیکھ کر اس کو کافر کہنا بھی دشوار نظر آتا ہے۔

غزل نمبر ۴

شعر ۱
خضر:- ایک پیغمبر کا نام ہے جن کے متعلق مشہور ہے۔ کہ چشمہ آب حیات سے فیض یاب ہو کر عمر جاوداں حاصل کی۔ کہتے ہیں بھولے بھٹکے مسافر کی رہنمائی بھی فرماتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ان کی ملاقات ہوئی۔

کشتیٔ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم!
علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

راہ سپردن۔ راہ سپاری۔ راستہ چلنا　　　　عصا۔ سونٹا۔ لاٹھی

ترجمہ :- اس وادی میں جہاں عصائے خضر بھی سو گیا ہے میں اپنے سینے کے بل راستہ طے کر رہا ہوں۔ اگرچہ میرے پاؤں سو گئے ہیں۔

تشریح :- عشق یا سعی و کوشش کی اس دشوار گذار وادی اور کٹھن راہ میں جہاں حضرت خضر علیہ السلام جیسے رہنما بھی بھولے بھٹکے مسافروں کی راہنمائی سے عاجز آ جائیں۔ میں عزم و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔

اگر راستہ چلتے چلتے پاؤں تھک جاتے ہیں تو میں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ نہیں جاتا۔ بلکہ سینہ کے بل چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ طلب و جستجو اور جذبہ عشق بیٹھنے نہیں دیتے۔ بلکہ راہ کو عبور کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

شعر ۱۲

نیاز - نیازمندی　　　　ناز - غرور و نخوت

ترجمہ :- اس نیازمندی کی بنا پر جو مجھے تجھ سے حاصل ہے مجھے حق پہنچتا ہے کہ میں ناز کروں - اور یوں سمجھتا ہوں جیسے کوئی گدا کسی بادشاہ کی دیوار کے سایہ تلے سویا ہو۔

تشریح :- سبحان اللہ! کیا شعر ہے۔ جب عاشق سراپا نیاز ہو اور محبوب سراپا ناز یعنی عاشق کو محض اپنی نیازمندی، عشق و محبت اور عقیدت و ارادت پر فخر ہو - اور محبوب کو اپنے حسن و جمال اور ناز و ادا پر غرور ہو - تو پھر ایسی صورت میں اگر عاشق کو محفلِ محبوب میں کہیں بھی پناہ نہ ملے تو اس کے سایۂ دیوار ہی کے نیچے سو کر سکونِ قلب اور جمعیتِ خاطر حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے یا شوقِ دیدار میں دیوار کے پاس آ بیٹھتا ہے ؎

مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آ کر تیری دیوار کے پاس

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تیری دیوار دیکھ کر

شعر ۳ :-

حشر ۔ قیامت　　　　　　خستہ شکستہ حال

روسیاہ ۔ کالے منہ والا۔ بدکار گنہگار

ترجمہ :- جو عاشق یا مریض عشق دردِ عشق کی شکایت کرتے کرتے اور دوا کے غم میں سو گیا ہے۔ وہ قیامت کے دن خستہ حال اور روسیاہ اٹھے گا۔

تشریح :- دردِ عشق میں دوا ڈھونڈنا یا غم دوا میں پریشان ہونا عاشق کے لئے باعث ننگ ہے۔ مریضِ عشق تو درد کی لذت پہ مرتا ہے بلکہ بقول غالب

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

حرفِ شکایت لب پہ لانا یا فریاد کرنا آئینِ عاشقی کے خلاف ہے!

عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

مذہبِ عشق کے آئین میں تو مہر بلب رہنا ہی مناسب ہے۔

زخم پہ زخم کھا کے جی - اپنے لہو کے گھونٹ پی
آہ نہ کر لبوں کو سی ۔ عشق ہے دل لگی نہیں
جنہوں کا عشق صادق ہے وہ کب فریاد کرتے ہیں
لبوں پہ مہرِ خاموشی دلوں میں یاد کرتے ہیں

مگر جو لوگ داد و فریاد کرتے ہیں۔ اور درد کا مداوا ڈھونڈتے ہیں وہ قیامت کے دن ناکام و نامراد اور روسیاہ بن کر اٹھیں گے۔

جن لوگوں نے تسلیم و رضا کی خو ڈالی ہے۔ وہی قیامت کے دن بھی سرخرو ہوں گے عشق میں شکوہ و شکایت کرنے والے ذلیل و خوار ہوں گے

شعر ۴ -

شب تار - اندھیری رات　　　　　　گسستن ۔ ٹوٹنا

ناخدا ۔ ملاح ۔ کشتی بان

ترجمہ ۔ ہوا مخالف ہے ۔ رات اندھیری ہے اور سمندر میں طوفان برپا ہے ۔ کشتی کا لنگر ٹوٹ چکا ہے اور ناخدا ملاح سو رہا ہے ۔

تشریح ۔ غالب نے کیا ہی اچھا نقشہ کھینچا ہے حالات کا ہوا مخالف سمت چل رہی ہو تو جہاز کا چلنا دشوار ہے ۔ رات اندھیری ہو تو صحیح راستہ نہیں سوجھتا سمندر میں طوفان برپا ہو ۔ تو جہاز ڈگمگاتا ہے ۔ ایسے حالات میں اگر بدقسمتی سے ناخدا یعنی رہنما اور قائد بھی نااہل ہو یا تساہل پسند ہو ۔ تو یقیناً مسافروں کی تباہی و بربادی کا سامان پیدا کرے گا ۔ ایسی کشتی ساحل مراد تک نہیں پہنچ سکتی ۔ ایسے نااہل رہنماؤں پر اعتماد کرنا غلطی ہے ۔

حافظ نے اسی موضوع پر یہ شعر کہا ہے ۔

شب تاریک بیم موج و گردابِ چنیں حائل
کجا دانند حال ما سبکسارانِ ساحل ہا

شعر نمبر ۵ ۔

شبخون ۔ چھاپہ	بنگہ ۔ مکان ۔ جگہ ۔ گھر
عسس ۔ چوکیدار ۔ پہریدار	حرم سرا ۔ شاہی محل

ترجمہ :۔ چوکیدار گھر میں اور بادشاہ اپنے شاہی محل میں خواب استراحت میں مصروف ہے ۔ لیکن تیرا غم شہر میں لوگوں کے گھروں پر چھاپہ مار رہا ہے ۔

تشریح :۔ اربابِ بست و کشاد اور فرمانرواؤں کی نااہلی ۔ غفلت شعاری اور غیر ذمہ داری کی بہترین تصویر کھینچی گئی ہے ۔ مثلاً بادشاہ اپنے فرائض و وظائف سے غافل سو رہا ہو حکمران اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہوں ۔ معاملہ اندیشی نگری اور چوپٹ راجہ کی مانند ہو سرکاری ملازمین اور چوکیدار ۔ پاسبان بجائے نگرانی اور کام کاج کے اپنے گھروں میں اطمینان سے سو رہے ہوں ۔ تو ایسی صورت میں رعایا کے گھروں کا خدا ہی حافظ ہے ۔

جب کوئی انتظام ہی نہیں۔ تو شبخون مارنے والے کو کون مانع آئے گا۔ غالب نے اپنے زمانے کی بگڑی ہوئی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔

فگندہ ناقہ، عماری و ساربان غافل
متاعِ بردہ حرامی و کاروان خفتہ

شعر ۶:- سبحہ۔ تسبیح سجادہ۔ مصلّٰی
ردا۔ چادر وزوِ مرحلہ۔ رہزن۔
پارسا۔ پرہیزگار لرزیدن۔ کانپنا۔

ترجمہ:- میرا دل تسبیح، جانماز اور چادر کے لئے کانپ رہا ہے۔ کیونکہ چور جاگ رہا ہے۔ اور پرہیزگار محوِ خواب ہے۔

تشریح:- یہاں پر چور سے مراد نفس امارہ ہے۔ خواہشات نفسانی بیدار ہوں۔ تو ایسی صورت میں عبادات کی چیزیں تسبیح، جانماز اور چادر وغیرہ بیکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ظاہری رسوم ادا کرنے کا کیا فائدہ جبکہ خواہشات نفسانی اور شیطانی قوتیں ہی نہ دب سکیں۔ عبادت گذار یا پرہیزگار کو تمایلاتِ نفسانی اور شیطانی قوتوں سے غافل نہ رہنا چاہیئے۔ جو پارسا ظاہری رسوم عبادت میں کھو جائے اور اپنے اردگرد ماحول کی اصلاح نہ کرے۔ اپنے باطن کو پاک نہ کرے تو یقیناً دین وایمان کی متاع لٹ جاتی ہے۔

شعر ۷:-

درازی۔ لمبائی۔ طوالت بخت۔ نصیبہ۔

ترجمہ:- شب ہجراں کی طوالت اور محض رات بھر جاگنے کا ہی قصہ نہیں ہے خدا کے لئے میرے نصیبے کو ڈھونڈیئے۔ وہ کہاں سو رہا ہے۔

تشریح:- شب فراق کی درازی اور رات بھر کی بیداری اور اختر شماری محتاج بیان نہیں ہیں۔ غم کی تاریک رات ختم نہیں ہوتی۔ عاشق تڑپتا رہتا ہے۔ لیکن سحر نمودار ہونے کا نام نہیں لیتی۔ عاشق پر عجیب وحشت

طاری ہو جاتی ہے۔ مگر غالب کہتا ہے۔ کہ شب فراق کی طوالت اور ان پریشانیوں کا اصلی سبب خفتگیٔ بخت ہے۔ اگر نصیبہ یاوری کرے تو مشکل حل ہو سکتی ہے۔ جب نصیبہ ہی روٹھ جائے۔ تو سارے معاملے بگڑ جاتے ہیں بہتر یہی ہے کہ عاشق محبوب کی یاد میں ہی محو رہے۔

شبِ فرقت میں یاد اس بے وفا کی بار بار آئی
بھلانا ہم نے بھی چاہا۔ مگر بے اختیار آئی

شعر ۸ :-

ایمنیٔ راہ ۔ راستوں کا پر امن ہونا	قرب ۔ نزدیکی
حظ ۔ مزہ ۔ لطف	ناقہ ۔ سانڈنی

از رفتار ماندن چلنے سے رہ جانا

ترجمہ :- اب جب کہ میری سانڈنی چلنے سے رہ گئی ہے اور میرے پاؤں بھی سو گئے ہیں۔ تو ایسی صورت میں راستے کے محفوظ ہونے اور خانہ کعبہ کے قریب ہونے کا کیا فائدہ ہے۔

تشریح :- بے شک حرم کے راستے محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ مسافر کو کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ خانہ کعبہ تک پہنچنا بالکل آسان ہے۔ لیکن جب تاب و تواں ہی باقی نہ رہے۔ اور وسائل مسافرت ہی جواب دے جائیں تو کیا کیا جا سکتا ہے۔

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

شعر ۹ :-

ترجمہ :- اے غالب مجھے اپنی طرح سکھ کی نیند سوئے ہوئے نہ سمجھ کیونکہ کوئی مجروح اور زخمی انسان جس کی ایک ایک نس دکھتی ہو اگر سو بھی جائے تو خون میں لت پت ہی سوئے گا۔

تشریح :- زخمی اور مجروح انسان جس کی ایک ایک نس دکھتی ہو۔ زخموں سے خون رستا ہو۔ اول تو وہ سوتا نہیں اور اگر آنکھ لگ بھی جائے تو تھوڑی دیر کے بعد وہ جاگ اٹھے گا۔ اور پھر وہی آہ و فغاں اور وہی نالہ و فریاد سنائی دے گا۔ دوسری طرف محبوب آرام کی نیند سوتا ہے۔ وہ عاشق کے زخموں اور شب بیداریوں کا حال کیا جان سکتا ہے۔

مرا دو دیدۂ پُر آب خوں فشاں بیدار
ترا دو نرگسِ مخمور۔ ناتواں خفتہ

من اوفتادہ و بر روئے خاک تکیہ زدہ
تو سر نہادہ و بر فرشِ پرنیاں خفتہ

غزل نمبر ۵

اشک ۔ آنسو	مژگاں ۔ پلکیں
چکیدن ۔ ٹپکنا	بنگر ۔ دیکھ از نگریستن

ترجمہ :- اے محبوب آ ۔ اور دیکھ کہ میں تجھ کو کس جوشِ محبت اور الفت سے دیکھ رہا ہوں ۔ نیز آنسوؤں کی طرح پلکوں کے اوپر سے میرا ٹپکنا ملاحظہ کر۔

تشریح :- عاشق محبوب سے کہتا ہے کہ میرے دل میں تیرے دیدار کی تمنا کا یہ عالم ہے ۔ کہ ایک از خود رفتہ انسان کی طرح پڑا ہوں ۔ ہمہ تن آنکھ بن کے رہ گیا ہوں ۔ تجھے اگر میری اس خود رفتگی یا تیرے تصور سے ہم آغوشی اور مدہوشی کا یقین نہیں آتا۔ تو آ کر تو دیکھ کہ میں کس طرح تیرے عشق میں رو رو کر جان دے دیتا ہوں میرا سارا وجود آنکھ کے راستے اشکوں کی صورت میں بہ نکلے گا۔

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں ۔

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

شعر ۲ کنارہ کردن۔ علٰحدگی اختیار کرنا خاک۔ قبر
تپیدن۔ تڑپنا۔ بیقرار ہونا آرمیدن۔ آرام کرنا۔

ترجمہ:۔ اے محبوب تو مجھ سے اس جرم کی پاداش میں کنارہ کشی اختیار کرتا تھا۔ کہ میں تیرے ہجر میں تڑپتا رہتا ہوں۔ اب میری قبر پر آکر دیکھ کہ میں کس سکوت میں آرام کر رہا ہوں۔

تشریح:۔ تیری جدائی کی تاب نہ لانے کی وجہ سے میں بے قرار رہتا تھا۔ تڑپتا تھا۔ آہ و فریاد کرتا تھا۔ تجھے یہ چیزیں ناگوار گذرتی تھیں۔ اور تو مجھ سے دور رہتا تھا۔ اب میں قبر کی تنہائی اور تاریکی میں ابدی نیند سو رہا ہوں اب نہ تو وہ تپش ہے اور نہ ہی وہ اضطراب بلکہ سکون بے حسی و بے حرمتی چھائی ہوئی ہے۔ اب تو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔

شعر ۳۔ ترجمہ:۔ مجھے پہلے غیر پر رشک آتا تھا۔ اب تو میرا معاملہ اس سے بھی بڑھ گیا ہے یعنی دیکھ اور شرم کر کہ غیر تو غیر میں خود بھی اپنے آپ کو تیری محفل میں نہیں دیکھتا اب اس سے زیادہ غیرت انگیزی کیا ہو سکتی ہے۔

تشریح:۔ رقیب کو محبوب کی محفل میں برداشت نہیں کیا جا سکتا شاعر کہتا ہے کہ رقیب کا تو کیا ذکر اب رشک کا یہ عالم ہے کہ میں تیری بزمِ وصال میں اپنے آپ کو بھی دیکھنا گوارہ نہیں کرتا۔ اس موضوع پر غالب کے اور شعر دیکھئے۔

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

نفرت کا گماں گذرے ہے میں رشک سے گذرا
کیوں کر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے!

شعر ۴۔ ترجمہ :۔ میں نے سنا ہے کہ تو مجھے دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن میں ناامید نہیں ہوں۔ میں نے تیرے نہ دیکھنے کے متعلق جو کچھ سنا ہے؟ ذرا دیکھ تو سہی کہ میں نے اس کو کس حوصلے سے سنا ہے! (برداشت کیا ہے)

تشریح :۔ محبوب عاشق کو نہ ملنے کی دھمکی دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ میں تمہاری صورت نہ دیکھوں گا۔ لیکن عاشق کا اس دھمکی کو سن لینا بہت بڑا حوصلہ ہے۔ اس روح فرسا خبر کو سن کر بھی ترکِ عشق نہ کرنا قابل داد ہے۔

شعر ۵۔ دمیدن۔ اُگنا — بالیدن۔ بڑھنا

آشیاں گاہ شدن۔ گھونسلہ بن جانا — ہما۔ ایک مبارک فال پرندہ جسکے متعلق مشہور ہے کہ وہ جس شخص کے سر پر سے گذر جائے وہ بادشاہ بن جاتا ہے۔

دام چیدن۔ جال بچھانا

ترجمہ :۔ دانہ اگا۔ بڑھا۔ درخت بن گیا۔ اور اس پر پرندوں نے گھونسلے بنالئے ہما کے انتظار میں میرے جال بچھانے کو دیکھ۔

تشریح :۔ اس شعر میں انتہائے انتظار ہے۔ محبوب کا ملنا سایہ ہما سے کمتر نہیں۔ اس ہما کو دام میں پھنسانے کے لئے دانہ بو دیا گیا وہ دانا اگا۔ بڑھا اور نمو اور درخت بن گیا۔ پرندوں نے اس درخت پر گھونسلے بنالئے۔ خیال تھا کہ شاید ہما اس درخت کو اپنا آشیاں بنالے اور عاشق اس ہما (محبوب) کے سایہ سے فیض یاب ہو کر سعادت حاصل کر سکے۔

شاعر کا مقصد دراصل یہ ہے کہ عاشق کی عمر عزیز کا بیشتر حصہ اس انتظار میں بسر ہو جاتا ہے۔ دور از کار تشبیہہ اور پیچیدہ خیال کا باندھنا سبک ہندی کا خاص انداز ہے۔

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

شعر ۶ نیاز مندی۔ انکساری — حسرت کشاں۔ حسرت کے مارے عاشق

دز دیدہ دیدن۔ دز دیدہ نگاہی
چوری چھپے دیکھنا۔

ترجمہ :۔ تو حسرت کے مارے عاشقوں کے انکسار کو نہیں جانتا۔ تو میری آنکھوں سے دیکھ اور دیکھ کر میں تجھ کو دز دیدہ نگاہوں سے کیسے دیکھتا ہوں۔

تشریح :۔ عاشق محبوب سے کہتا ہے کہ تو حسرت زدہ عاشقوں کی نیاز مندی اور عجز و انکسار کیا جانے نہ تو کسی پر تو عاشق ہوا اور نہ ہی تجھ کو اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

عاشق نشدی محنت الفت نکشیدی
کس پیش تو غمنامۂ ہجراں چہ کشاید

عاشق کبھی تو محبوب کی راہ میں کھڑا ہو جاتا ہے اور کبھی اس کے کوچے کا طواف کرتا ہے۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ محبوب کا دیدار نصیب ہو جائے کبھی چوری چھپے محبوب کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے

تیرے کوچے اس بہانے ہمیں دن کو رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا
جو اور ہو کچھ تیری دید کے سوا منظور
تو مجھ پہ خواہشِ جنت حرام ہو جائے
وہ دور ہی سے ہمیں دیکھ لیں یہی ہے حسرت
مگر قبول ہمارا اسلام ہو جائے

شعر ۷ ہوائی۔ خواہش۔ تمنا — تماشا۔ منظر

ترجمہ :۔ اگر تو باغ کی رونق دیکھنے کی آرزو رکھتا ہے۔ تو آ اور مجھ کو خون میں لت پت تڑپتے ہوئے دیکھ۔

تشریح :۔ باغ کے سرخ سرخ پھول اور لالہ و گل دیکھنے میں وہ لطف کہاں ہے

جو عاشق کو خون میں لت پت دیکھتے ہیں ہے ۔ صحیح معنوں میں لالہ زار یہی ہے ۔ سو اگر محبوب ان مناظر سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے تو عاشق کے داغوں کی بہار دیکھ لے ۔

دل نہیں ورنہ دکھاتا تجھکو داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا ۔ کار فرما جل گیا !

شعر ۸ ۔ دریاب ۔ پالے ۔ دیکھ　　　ساغر کشیدن ۔ شراب پینا
دریافتن ۔ پالینا ۔ سمجھ جانا　　　گل گل شگفتن ۔ کلی کلی کا کھل جانا ۔

ترجمہ :۔ تو میری بہار بن جا ۔ اور پھر کلی کلی میں میرا کھلنا دیکھ ۔ مجھے خلوت میں لے جا اور میرا شراب پینا ملاحظہ کر ۔

تشریح :۔ شاعر نے منظر وصال کی تصویر کھینچی ہے اور کہتا ہے کہ اگر تو مجھے خلوت میں لے جائے تو دیکھ میں کس طرح مست و سرشار ہو جاتا ہوں اسی طرح میرے باغ زندگی کی اگر تو بہار بن جائے ۔ تو میری زندگی کے باغ کی کلی کلی کھل جائے ۔

شعر ۹ بداد رسیدن ۔ فریاد کو پہنچنا　　　تغافل ۔ غفلت شعاری

ترجمہ :۔ اے محبوب تو نے میری داد رسی نہیں کی ۔ چنانچہ میں نے درد عشق میں جان دیدی ۔ دیکھ میں نے تیرے طرز تغافل کی داد کس طرح دی ۔

تشریح :۔ اے محبوب تو نے مجھے درد عشق دیا تھا ۔ اسکی دوا بھی تیرے ہی پاس تھی مگر تو نے تو مجھے وہ دوا نہ دی ۔ اور نہ ہی میرے درد کا علاج کیا جب تو ہی ہر طرح چارہ ساز نہ ہو تو میں نے بالآخر تڑپ تڑپ کر تیرے فراق میں جان دیدی ۔ اور تیری بے رخی بے اعتنائی اور غفلت شعاری کی داد ، میں نے گویا اپنی موت کی صورت میں دی ۔

شعر ۱۰ ۔ تواضع ۔ انکساری ۔ عاجزی　　　خمیدن ۔ جھکنا

ترجمہ :۔ اے غالب میں بغیر تواضع کے محبوب کی تواضع نہیں کرتا ۔ اس کی تلوار (تیغ ابرو) کے خم کے سایہ تلے میرا جھکنا دیکھ !

تشریح :۔ محبوب کے تیغ ابرو کے خم کو عاشق نے تلوار کا خم کہا ہے اس خم تیغ ابرو کے سامنے عاشق کو جھکنا پڑتا ہے لیکن شاعر کہتا ہے کہ یہ جھکنا اور انکسار محض اس لئے ہے کہ خود خم تیغ ابرو نے انکسار اور عاجزی سے کام لیا۔

اس شعر میں حسنِ تعلیل ہے۔ ابرو کے خم کی وجہ کچھ اور ہے۔ مگر شاعر کہتا ہے۔ کہ یہ محض تواضع اور انکساری کی وجہ سے ہے۔

غزل نمبر ۶

شعر ۱

گلبن۔ پھلواڑی۔ گلاب کا پودا　　برگ۔ پتا پتی

نشان۔ علامت۔ نشانی۔ نمونہ

ترجمہ :۔ اے دل امید کے گلبن سے کوئی نشانی مجھے لا دے۔ اگر کوئی تازہ پھول نہیں کھلا۔ تو پھر خزاں کے موسم میں کوئی مرجھائی ہوئی پتی ہی لا دے۔

تشریح :۔ محبوب سے عاشق ہزاروں امیدیں وابستہ کر لیتا ہے۔ مگر جب کوئی بھی پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ تو مایوسی کے عالم میں معمولی سی نسبت کو ہی ترجیح دینے لگتا ہے۔ غالب نے اس قسم کے خیال کو اردو میں یوں ادا کیا ہے۔

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے　　کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلک نا انصاف　　آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

شعر ۲ ناسور۔ زخم۔ پھوڑا　　تونگر۔ امیر۔ سرمایہ دار۔ بڑا ہونا

ہدیہ۔ تحفہ　　کف۔ ہتھیلی

الماس فشاں۔ ہیرے کے ٹکڑوں کو بکھیرنے والا

ترجمہ :۔ کسی ہیرے برسانے والی ہتھیلی سے مجھے کوئی تحفہ لا دو :۔ تاکہ میرا زخم ناسور بن جائے ۔

تشریح :۔ جس طرح زخموں پر نمک چھڑکنے سے زخم پھٹ جاتے ہیں اسیطرح ہیرے کی کنی سے زخم پھٹ کر ناسور کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۵

عشرت پارۂ دل زخم تمنا کھانا

لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

مراد یہ ہے کہ کفِ الماس فشاں یعنی کفِ محبوب سے ہیروں کا تحفہ مجھے لا بھیجیے ۔ تاکہ محبت کے زخم اور پھٹ جائیں ۔ اور عاشق ان زخموں سے لطف اندوز ہو سکے ۔ شعر کا مرکزی خیال ایذا طلبی ہے جسمیں عاشق کو لذت حاصل ہوتی ہے

شعر ۳ :۔

آشوب ۔ پریشانی ۔ ابتلا ۔ دکھ تکلیف ۔ مصیبت

کشود دل ۔ دل کا خوش ہونا ۔ کھلنا

ہنگامہ نشانی ۔ ہنگامہ خیز جگہ ۔

ترجمہ :۔ اے میرے جذبہ عشق غم کی پریشانی سے تو میرا دل کشود حاصل نہ کر سکا ۔ اس مقصد کے حصول کے لئے تو ہنگاموں کی سرزمین سے مصائب ۔ آلام ۔ پریشانیاں اور فتنے لاؤ ۔

تشریح :۔ راہِ عشق میں کٹھن منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے ۔ پہاڑوں ۔ وادیوں اور خارزار راہوں کو دیکھ کر عاشق کا جی خوش ہوتا ہے ۵

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں ۔ جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

شاعر اپنے جذبہ محبت کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ آشوب غم سے تو میرا دل ہلکا نہ ہو سکا ۔ میرے سامنے تو اب کئی ایک فتنے برپا ہوں ۔ تو جب جا کر میرا جی خوش ہوگا ۔

شعر ۴ :۔

گیرم ۔ میں مانتا ہوں ۔

ہدف ۔ نشانہ

خدنگ۔ تیر　　غلط انداز۔ غلطی سے پھینکا جانیوالا

ترجمہ:۔ اے میرے نصیبے میں مانتا ہوں کہ میں محبوب کی نگاہوں کے لئے موزوں نشانہ نہیں ہوں۔ اس لئے کبھی تو اپنی کمان سے کوئی تیر غلطی سے مجھ پر پھینک!۔

تشریح:۔ عاشق کو اعتراف ہے کہ محبوب کے تیر نگاہ کیلئے وہ شایان شان نشانہ نہیں۔ لیکن پھر بھی کاش محبوب کی نگاہوں کا تیر غلطی ہی سے اسے آ لگے۔ عاشق محبوب کی نگاہ غلط انداز کا متمنی ہے۔

وہ شرمائے بیٹھے ہیں گردن جھکائے　　غضب ہو گیا اک نظر دیکھ لینا
وہ شرمائی صورت وہ نیچی نگاہیں　　وہ بھولے سے ان کا ادھر دیکھ لینا

شعر ۵:۔ کف۔ ہتھیلی　　نامہ شوق۔ محبت بھرا خط

مژدہ وصل۔ ملاپ کی خوشخبری

ترجمہ:۔ اے قاصد تو دوست کی طرف سے کوئی محبت کا پیغام نہیں لایا۔ اس لئے تو زبانی پیغام کے ذریعے ہی مجھے وصل کی خوشخبری سنا۔

تشریح:۔ عاشق قاصد کو خالی ہاتھ دیکھ کر مایوس نہیں ہوتا۔ بلکہ دل کو تسلی دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ میرے محبوب کو خط لکھنے کی فرصت نہ ہو گی۔ اسلئے غالباً اس نے زبانی پیغام دیدیا ہو گا۔ چنانچہ عاشق نامہ بر کا منہ دیکھتا ہے۔ کہ زبانی ہی پیغام دے۔

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر　　کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

شعر نمبر ۶:۔ اندوہ۔ غم　　رشک۔ یہ خواہش کہ میں بھی دوسرے جیسا بن جاؤں۔ یا دوسرے کی خوبی مجھ میں آجائے۔ بغیر اس کے زوال کے۔ مگر حسد میں دوسرے کی خوبی کے زوال کی آرزو بھی ہوتی ہے۔

ترجمہ:۔ اے میرے دوست تیرے غم میں رشک کے مارے ساری دنیا نے جان

دے دی - اب مجھے بھی رشک سے مار ڈال اور ساری دنیا کا غم مجھے دے دے -

تشریح - شاعر کا مقصد یہ ہے کہ اندوہِ عالم تو گوارہ ہے - لیکن شرکتِ رشک گوارا نہیں ہے - اے محبوب ساری دنیا تجھے چاہتی ہے اور تیرے غمِ عشق میں بیقرار رہتی ہے - رشک کا یہ عالم ہے کہ ہر شخص رشک میں تجھ پر اپنی جان نثار کر دیتا ہے - مگر اب مجھ سے یہ کیسے برداشت ہو سکتا ہے - کہ باقی دنیا تجھ پہ مرے - چنانچہ مجھے رشک سے مار ڈال - اور سارے جہان کا غم و اندوہ مجھے لے دے -

رشک کے متعلق غالب کا ایک اور مشہور شعر ہے اگرچہ موضوع مختلف ہے

چھوڑا نہ رشک نے کہ تیرے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

شعر ۲ سخن سادہ - سیدھی اور سادہ بات نکتہ - باریک باتیں -
پیچیدہ بیانی : پیچیدہ باتیں

ترجمہ :- اے غالب سیدھی اور سادہ بات میرا دل نہیں موہ سکتی - چند باریک باتیں کسی الجھے ہوئے بیان کی میرے پاس لائیے -

تشریح :- غالب کی مشکل پسندی کا ذکر ہے - چونکہ طبیعت مشکل پسند تھی - اس لئے سیدھی سادھی بات دلکش معلوم نہیں ہوتی تھی - وہ کہتے ہیں - کہ مجھے سادہ اسلوب بیان اور آسان طرز تحریر مرغوب نہیں ہے - نکتہ آفرینی اور دقت نظر کی ضرورت ہے - یہی وجہ ہے کہ میں آسان کلام اور پا ئمال مضامین سے متاثر نہیں ہوتا -

غزل نمبر ۷

شعر نمبر ۱

جنون مست - دیوانہ عشق نو بہار - آغاز بہار
صراحی بر کف - ہتھیلی پر شراب کی بوتل گل در کنار - کوئی حسین معشوق بغل میں

ترجمہ :- میں جنونِ عشق میں مست ہوں مجھے بہار کے آغاز میں مارا جا سکتا ہے۔ (بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ) شراب کی صراحی میری ہتھیلی پر ہو اور حسین محبوب میرے پہلو میں ہو۔

تشریح :- موسم بہار میں دیوانے کا جنون حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

پھر ہوائے دعوتِ جوشِ جنوں آنے لگی
پھر بہار آئی چمن سے بوئے خون آنے لگی

جوشِ جنوں میں دیوانہ اپنے گریبان کو تار تار کر لیتا ہے اور خارِ دشت اس کا تلوا کھجلاتا ہے۔ ع

کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں یہ نہیں معلوم
کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا
پھر تازہ ہوا جوشِ جنوں فصلِ گل آئی
پھر شوق ہوا سلسلہ جنبانِ تمنا (حسرت)

بہرحال مستوں کے لئے موسم بہار جنوں انگیز ہوتا ہے۔ شعر کا اصلی مفہوم یہ ہے۔ کہ اگر عشق کے دیوانے کو مارنا مقصود ہے تو اس کے لئے بہترین موسم بہار کا آغاز ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ محبوب پہلو میں ہو اور جام شراب ہاتھ میں ہو۔ عیش و عشرت کے سب سامان مہیا ہوں تو پھر مرنا مشکل نہیں۔ بلکہ عین مقصود حیات ہے۔

شعر نمبر ۲ - بپایاں بردہ ام عمری -

میں نے زندگی بسر کی ہے میں نے ساری زندگی گزار دی ہے
کوئی می فروشان ۔ میخانہ ۔ شراب فروشوں کا محلہ
پایان ۔ اخیر ۔ انجام
خمار ۔ نشہ اترنے کی حالت

ترجمہ :- اس جرم کی یاداش میں کہ میں نے ساری زندگی نشہ و مستی کے عالم میں گزاری ہے حالتِ خمار میں شراب فروشوں کے کوچہ میں مجھے قتل کیا جا سکتا ہے۔

تشریح :- موت ناگزیر ہے۔ مگر مست شراب جس کی ساری زندگی شراب نوشی و مستی میں گزری۔ اسے حالت خمار میں مار دیا جائے۔ تو اس کی موت آسان ہو گی۔ کیونکہ شراب نوشی میں اس کی زندگی مضمر ہے۔ اور نشہ اترنے کی حالت وارد ہونا یقیناً ایسے شرابی کی موت ہے۔

شعر ۳ ہجران - فراق - جدائی کفر - ناشکری - ضد ایمان

وبیت - خونبہا - وہ رقم جس سے خون کا بدلہ ادا ہو جائے۔ آشکارا - کھلم کھلا

ترجمہ :- فراق یار میں زندہ رہنا مذہب عشق میں کفر ہے۔ میرے قتل کا کوئی خونبہا نہیں۔ میں تو چراغِ سحر ہوں۔ مجھے بلا خوف و خطر سب کے سامنے قتل کیا جا سکتا ہے۔

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا؟

تشریح :- بیشک ہجر یار میں زندگی موت سے بدتر ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مذہب عشق میں یار کے بغیر زندہ رہنا کفر بھی ہے۔ سچے عشق میں محبوب کے بغیر کون زندہ رہ سکتا ہے۔ اول تو عاشق کا زندہ رہنا ہی دشوار ہے اور اگر زندہ رہ بھی جائے تو چراغ سحری کی مانند زندگی کا لطف نہیں جیسطرح چراغِ سحری بیکار شئے ہے۔ اگر اسے بجھا بھی دیا جائے۔ تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ایسی بیکار شئے کو اگر کوئی مٹا دے۔ تو خون بہا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی قسم کے خیال کو حسرت نے بھی یوں ادا کیا ہے ؎

عشق میں جان سے گزر جائیں اب یہی جی میں ہے کہ مر جائیں
شب وہی شب ہے دن وہی دن ہیں جو تری یاد میں گزر جائیں

دانی کہ چوں ہمی گذرانیم روزگار
روزی کہ بے تو می گزرد روز محشر است (سعدی)

شعر ۴ ۔ تغافل ۔ غفلت شعاری　　　بزم ۔ محفل

گریہ بے اختیار ۔ بے قابو ہو کر رونا

ترجمہ :۔ محبوب کا تغافل مجھے زندہ رکھتا ہے ورنہ اس کی محفل میں بے اختیار رونے پر مجھے قتل کیا جا سکتا ہے ۔

تشریح :۔ محبوب بے رخی ۔ بے اعتنائی اور تغافل سے کام لیتا ہے ۔ اس کی وجہ سے عاشق کی کئی ایک مذبوحی حرکتیں اس کو نظر نہیں آتیں وہ یونہی گزر جاتا ہے ۔ ورنہ جب عاشق بے اختیار روتا ہے ۔ تو اگر محبوب کو پتہ چل جائے ۔ یا وہ دیکھ لے تو محض اسی جرم کی پاداش میں عاشق کو قتل کیا جا سکتا ہے کیونکہ عاشق کا رونا دھونا ۔ آہ و نالہ ۔ محبوب کی رسوائی و بدنامی کا باعث ہوتا ہے ۔ اور جوں جوں لوگوں کو معلوم ہوتا ہے عاشق بے باک ہوتا جاتا ہے

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

عاشق کے رونے کا کوئی ٹھکانہ بھی ہے

ہم رونے پہ آ جائیں تو دریا ہی بہا دیں
شبنم کی طرح ہم کو رونا نہیں آتا

رونے میں محبوب کے عتاب کے علاوہ اور بھی کئی نقصان ہیں مثلاً بقول غالب

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ محبوب کا تغافل ہی عاشق کے بچاؤ کی صورت پیدا کر دیتا ہے

اس محو تغافل کی جفا میرے لئے ہے
صد شکر کہ اتنا تو روا میرے لئے ہے

شعر ۵ ۔ خاک ۔ قبر　　　گل فشانی ۔ پھول برسانا

کشتن شمع ۔ چراغ بجھانا

ترجمہ :- اے دوست ! میری قبر پر آ - اور اگر تو میری قبر پر پھول چڑھانا جائز نہیں سمجھتا تو میرے مزار پر جلنے والی شمع کو تو اپنے دامن کی ہوا سے بجھا سکتا ہے ۔
تشریح :- مرنے کے بعد بھی محبوب کو عاشق کا انتظار ہی رہے گا ۔ عاشق محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ۔ کہ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تو میری قبر پر آنا پسند نہ کرے گا ۔ اور نہ ہی پھول چڑھائے گا چلو نہ سہی ۔ میرے مزار کی شمع تو بجھانے کے لئے ہی آجا ۔ میل و رغبت سے نہ سہی ۔ نفرت ہی کی وجہ سے آجاؤ ۔ وفا کے لئے نہیں تو جفا کے لئے ہی چلے آؤ ۔

ایک ٹھوکر ہی سہی اے شوخ بے پروا خرام
رہگذر میں ہے تری اک آرزو والا پڑا

شعر ۶ :- ننگ - عار نوید - خوشخبری -
ترجمہ :- اے محبوب ! اگر تو مجھے قتل کر کے اپنے ہاتھ اور خنجر کو میرے خون سے آلودہ کرنا باعثِ ننگ و عار سمجھتا ہے تو پھر ایک وعدہ ہی کر لو کیونکہ میں انتظار میں مارا جا سکتا ہوں ۔ انتظار میں موت آسان ہے ۔
تشریح :- انتظار یار میں وہی اذیت ہے جو مرتے وقت جانکنی میں ہوتی ہے ۔ اسلئے عاشق کہتا ہے کہ یوں قتل کرنا اگر مشکل ہے تو صرف وعدہ ہی کر لو ۔ تمہارے انتظار میں موت ضرور آجائے گی ۔ محبوب وعدہ تو وفا نہیں کرے گا ۔

ترے وعدہ پہ جیے ہم تو یہ جان چھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے

شعر ۷ :- گرفتم میں نے فرض کیا تسلیم کیا مان لیا ۔ بے نیاز - بے پروا ۔

ترجمہ :- غالب میں نے مان لیا کہ محبوب میرے قتل کرنے سے بے نیاز ہے مگر مجھے تو دوست
کی بے نیازیوں کے دکھ سے ہی مارا جا سکتا ہے ۔

تشریح :- میں تسلیم کرتا ہوں کہ محبوب کو میرے قتل سے کیا ملے گا ۔ بے شک وہ میرے قتل سے بے نیاز ہے مگر میرے قتل کرنے کیلئے کسی خاص اوزار کی ضرورت نہیں ۔ خنجر و شمشیر و سناں لازم نہیں مجھے ہلاک کرنے کے لیے محض بے نیازی ۔ بے رخی اور بے التفاتی ہی کافی ہے میں اس دکھ میں جان دے دوں گا ۔ کہ میرا محبوب مجھے درخور اعتنا نہیں سمجھتا ۔ غالب نے محبوب کے تغافل سے متعلق کیا ہی اچھا شعر کہا ہے ۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

غزل نمبر ۸

شعر ۱ ۔ ساز ۔ باجا	نوا گر کردن ۔ نوا سنج کرنا
بند ۔ قید	پارہ ۔ کچھ ۔ تھوڑا سا ۔

ترجمہ :- جنون عشق میں زنجیروں کے ساز کی جھنکار سے مجھے نوا پیرا بنا دے اگر قید و بند ذوق عشق کے مطابق ہے تو پھر اس کو تھوڑا سا اور بھاری کر دے تاکہ جھنکار ترنم پیدا ہو سکے

تشریح :- عاشق قید و بند سے نہیں ڈرتے ۔ سزا میں انکو لطف حاصل ہوتا ہے اس ذوق گناہ کی پاداش میں ہر سختی کو سہنے کے لئے تیار رہتے ہیں ۔

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب	بڑھتا ہے اور ذوق گناہ ہر سزا کے بعد
گر کیا ناصح نے ہمکو قید اچھا یوں سہی	یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

جرم عشق میں سزا دیکر زنجیروں میں جکڑ دینا عاشق کیلئے لطف انگیز ہے ان کی جھنکار سے عاشق کا ایمان تازہ ہو جاتا ہے اور روح اہتزاز میں آجاتی ہے ۔ اس لئے عاشق خود ہی التجا کرتا ہے کہ میرے جنون عشق کا علاج اگر زنجیریں پہنانا ہی ہے تو بے شک پہنا دیجئے ۔

اس ساز کو پہن کر میں نوا پیرا ہو جاؤنگا۔ زنجیروں کی جھنکار میں جو ترنم پیدا ہوگا۔ اس سے میرے کان محظوظ ہونگے۔ اگر زنجیروں کو قدرے گراں تر کر دیا جائے تو یہ زنجیریں یقیناً جنوں نواز بھی ہونگی

شعر نمبر ۲۔ نوروز۔ ایرانی سال کا پہلا دن ۲۱ مارچ ماہ فروردین کی پہلی تاریخ۔ یہ موسم بہار کا آغاز ہوتا ہے رات دن برابر ہوتے ہیں

جاودانہ۔ ہمیشہ۔ دائمی

تاریکی۔ اندھیرا

ترجمہ:۔ عید نوروز کے عیش و نشاط کا فیض ہمیشہ رہے تو اچھا ہے اس لئے میرے دن کو تاریکی کی وجہ سے میری رات کے برابر کر دے۔

تشریح:۔ عید نوروز کا جشن ایران میں کئی دن تک منایا جاتا ہے آنے والے سال کو خوشیوں مسرتوں۔ شادمانیوں، کامیابیوں اور کامرانیوں سے لبریز سمجھا جاتا ہے نیز نوروز کے فیض کو لوگ دائمی سمجھتے ہیں اب عاشق عید نوروز کے لیل و نہار کیطرح اپنے شب و روز میں بھی مساوات کا متمنی ہے اس کی زندگی تاریکیوں، مصیبتوں اور دکھوں سے گھری ہوئی ہے وہ خوئے ایذا طلبی کیوجہ سے دائمی غم کو عیش نوروز سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ جس طرح دائمی عیش میں لطف ہے تو میرے غم میں بھی دوام پیدا کر اور میرے روز و شب میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔

شعر ۳۔ پاشیدن۔ جھڑکنا جھگڑے کرنا مجال۔ جرأت۔ طاقت

باور کردن۔ یقین کرنا۔

ترجمہ:۔ وہ بات جو دل سے اٹھے۔ اس کے اظہار سے لبوں کو کیسے سیا جا سکتا ہے۔ اے محبوب یا تو بات کرنے کی اجازت دے یا نہ کہی ہوئی بات کو باور کر لے یا وہ بات جو دل سے اٹھتی ہے اس سے کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ محبوب پر تو کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔

تشریح:۔ دل کی بات لب پر آجائے تو کیا فرق پڑتا ہے جب دل کو ٹھیس پہنچی ہو تو جذبات کو زیادہ دیر تک دبایا نہیں جا سکتا لبوں کو سینا مشکل ہے اور اگر شکوہ محبوب تک پہنچ جائے تو بے نتیجہ۔ عاشق محبوب سے گلہ کرتا ہے کہ ستم بھی ڈھاتے ہو

اور زبان بند رکھنے کا حکم بھی دیتے ہو، حالانکہ شکوہ کرنے سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

ہاں اگر عرض مدعا اور داستانِ غم کہنے کی اجازت نہیں تو پھر ناگفتہ ہی بات کو مان جایا کرو

شعر ۴: رسائی۔ پہنچ — سعی۔ کوشش
عقدہ ہا۔ گرہیں مشکلات — پیاپے۔ لگاتار
شناور۔ تیرنے والا

ترجمہ:- میری سعی و کوشش کی کامیابی میں لگاتار پیچیدگیاں اور مشکلات پیدا کرتا جا اور میرے کام کی روانی میں فتنے کھڑے کر دے۔

تشریح:- زندگی کشاکش کے اندر ہے بلکہ زندگی نام ہے مشکلات، مصائب، آلام اور پریشانیوں کا۔ عاشق مشکلات کا عادی ہو چکا ہے وہ محبوب سے کہتا ہے کہ میرے راستے میں اور روڑے اٹکا دے میری کوششوں کو بار آور نہ ہونے دے میرے راستے میں جتنے بھی فتنے پیدا ہوں گے مجھے ان سے لذت حاصل ہوگی اور میں اس کشاکشِ زندگی سے لطف لیتا رہوں گا۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

زندگی کا راز جا کر کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

شعر ۵: خس۔ گھاس پھونس خس و خاشاک — شرر فشاں کردن۔ جلانا چنگاریاں پیدا کرنا
خونابہ۔ یہ کلمہ خون اور آب سے مرکب ہے — خون آب آلود۔ خون جگر۔ اشک خونیں
خون یا پانی ملا ہوا ہونا۔ — بیشوا: معذور۔ لاچار

ترجمہ:- اے کہ تو خس کو شرر فشاں کر سکتا ہے۔ میرے زخم کے بخیے زخم کے جوش خون سے ادھیڑ دے (پر لگا دے)

تشریح :- اے محبوب تجھ میں جب اتنی قوت اور تاثیر ہے کہ تو خس کو شعلہ در کر سکتا ہے
اس میں سے چنگاریاں پھوٹ سکتی ہیں تو پھر تیرے لئے یہ بات کوئی مشکل نہیں کہ میرے زخموں
کے جوش خون سے بخیے ادھڑ جائیں گویا انہیں پر لگ جائیں۔ جدت خیال ملاحظہ فرمائیے
زخم پھٹ جانے سے عاشق کو اور لذت حاصل ہوگی
جس طرح ؎ لذت ریش جگر غرق نمکداں ہونا !

شعر ۶ - خوی - عادت   تابہ - توا
سمندر - ایک جانور کیڑا جو آگ میں زندہ رہ سکتا ہے۔

ترجمہ :- تو نے مجھے سرکش طبیعت عطا کی ہے میں رشک کے عجز و انکسار کو پسند نہیں کرتا۔ میرے
سینے کو گرمی سے سمندر کا توا بنا دے۔

تشریح :- اے خدا تو نے خود ہی مجھے سرکش طبیعت بخشی ہے رشک میں عجز و انکسار اور ذلت کا سامنا
کرنا پڑتا ہے جس سے مجھے انتہائی نفرت ہے اغیار کے قرب رہیں اس رشک میں کب تک مرتا
رہوں۔ مجھے تو ایسا سوز و گداز اور تپش و حرارت بخشئے جس میں آگ میں زندہ رہنے والا کیڑا
(سمندر) بھی زندہ رہ سکے عاشق تپش و حرارت عشق کی انتہا چاہتا ہے۔

شعر ۷ - از درون - باطن میں   روان - روح - جان
سپاس - شکریہ   بیرون - بیرونی طور پر
شکوہ سنج شکوہ کرنے والا۔

ترجمہ :- اے خدا باطنی طور پر تو میری جان سپاس گذار ہو۔ مگر ظاہرا طور پر میری زبان کو ستاروں
کی گردش کا شاکی رہنے دے۔

تشریح :- لوگ گردش فلک کا عموماً گلہ کرتے ہیں ستاروں کی نحوست کے شاکی رہتے ہیں۔ لیکن
غالب کہتا ہے کہ بظاہر اگرچہ میں بھی ایسا ہی کرنا چاہتا ہوں لیکن حقیقت میں اپنے دل کی
گہرائیوں میں تیرا انتہائی سپاس گذار ہوں۔ کیونکہ تو نے ہی مجھے اپنا درد عشق عطا کیا اور اہل
درد لوگوں میں پیدا کیا۔ عشق کی لذت سے آشنا ہونا معمولی نعمت
نہیں ہے۔

شعر ۸۔ فراخور۔ لائق۔ مطابق   ظرف۔ قابلیت، حوصلہ، ہمت، استعداد

ترجمہ:۔ خدا تعالیٰ کی بخشش اگر انسانی ظرف کے مطابق ملتی ہے تو اے خدا مجھے عقل و ہوش میں افزونی عطا کر اور شراب کی دولت سے بھی مالا مال کر دے۔

تشریح:۔ انسان کو اپنی صلاحیتوں، عقل و خرد اور وسعت نظر و عالی ظرفی میں جو حصہ قسام ازل کی طرف سے ملا ہے وہ غنیمت ہے۔ اگر شراب کی فراوانی عطا ہو تو اس کے استعمال میں بھی عقل و ہوش کا استعمال ضروری ہے۔ کیونکہ شراب پی کر بہک جانا کم ظرفی ہے۔ ۵

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

شعر ۹۔ ہستی۔ وجود   قہرمانِ وحدت۔ مراد وحدتِ خدائے
داور کردن۔ منصف بنانا   بزرگ و برتر۔

ترجمہ:۔ غالب نے اپنے لئے ایک وجود تراش لیا ہے۔ اب انصاف کرنے کے لئے خدا کو ہی قہرمانِ وحدت یا کار فرما سمجھا جاتا ہے۔

تشریح:۔ غلبۂ وحدت سے ہی ہستی غیر کو محو کیا جا سکتا ہے۔ وحدت کو تشبیہاً قہرمان یا کار فرما کہا گیا ہے حقیقتاً غالب کا وجود کوئی شے نہیں۔ جو کچھ ہے وہ خالق حقیقی ہے۔ اب غالب نے جو اپنی ہستی تراش لی ہے۔ وہ قابل گرفت ہے۔ اس لئے ثالثی کی ضرورت ہے۔ وہ یگانہ دیکتا ہی ثالث ہو سکتا ہے (خدا) ؂

اقبال کی زندگی کے حالات اور شاعری

شاعر کے ذاتی حالات کا اس کے کلام پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اقبال کا خاندان کشمیر کا ایک قدیم اور معزز خاندان ہے۔ ان کے اجداد دینی علوم سے خاصا شغف رکھتے تھے جس کا گہرا اثر کلام سے نمایاں ہے۔ اقبال خود سیالکوٹ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد آکر رہ گئے تھے ولادت ۱۸۷۷ء میں ہوئی۔ سیالکوٹ ہی میں ابتدائی عمر کا زمانہ بسر ہوا اور بعد کو ڈگری کی تعلیم کے لئے وہ لاہور چلے گئے۔ کشمیر کی دلفریبی سے ایک عالم متاثر ہے۔ اقبال جیسے شاعر کے دل سے اس شعریت سے پر خطہ زمین کی یاد کہاں نکل سکتی تھی؟ بچپن کے اکثر قطعات میں کشمیر کو یاد کیا ہے ؎

کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے — اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثہ میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد — جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور — یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر — بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

کیا عجب ہے کہ ذیل کے اشعار میں بھی یہی احساس کام کر رہا ہو۔

کیا بد نصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں — ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں
ارمان ہے یہ جی میں اڑ کر چمن کو جاؤں — ٹہنی پہ گل کی بیٹھوں آزاد ہو کے گاؤں
پھر دن پھریں ہمارے پھر سیر ہو وطن کی — اڑتے پھریں خوشی سے کھائیں ہوا چمن کی
جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے — دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے — دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

اقبال کی خاندانی خصوصیات کی طرح ان کی تعلیم کی روش نے بھی انکی طبیعت کو بنانے میں بڑا حصہ لیا۔ ابتدائی تعلیم کیلئے وہ سیالکوٹ کے قدیم مکتب میں بٹھائے گئے۔ آئندہ فدائی مشرق کے دل میں مشرقی فنون سے عشق کی یہ تخم کاری تھی۔ یہاں اقبال نے کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں کہ ضرورت زمانہ نے انہیں مکتب چھوڑ کر انگریزی مدرسہ میں شریک ہونے پر مجبور کیا

عموماً یہ ضروری نہیں ہے کہ دنیا کی تمام بڑی ہستیاں اپنی ابتدائی تعلیم میں یا تعلیم کے کسی خاص مرحلہ پر بھی اپنی ہم جماعتوں سے ممتاز رہی ہوں۔ اور اسی طرح ہر ممتاز طالب علم زندگی کی کشمکش میں کامیاب رہے۔ تاہم اقبال ان ہستیوں میں سے ہیں جو ہر جگہ اور ہمیشہ بلندی کے ممتاز معیار پر رہتی ہیں۔ امتیاز کے ساتھ انہوں نے ابتدائی، وسطانی اور فوقانی تعلیم ختم کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے اسکاچ مشن کالج میں شریک ہونے کے ساتھ ہی انہیں پبلک مقبولیت بھی حاصل ہونے لگی۔ دقوع امر سے پہلے اس کے اسباب فطرت کی طرف سے فراہم ہو جاتے ہیں۔ اس کالج میں اقبال جیسے ذہین طالب علم کو ایک جید عالم کا سہارا مل گیا یہ مولوی سید میر حسن ہیں جو بعد میں شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز ہوئے مولوی صاحب عربی اور فارسی کے متبحر عالم تھے۔ ان کے شخصی اثر کے متعلق آنریبل سر شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں "ان کی تعلیم کا یہ خاصہ ہے کہ جو کوئی ان سے فارسی یا عربی سیکھے تو اس کی طبیعت میں اس زبان کا صحیح مذاق پیدا کر دیتے ہیں" عربی اور فارسی سے مناسبت طبعی اقبال کو خاندانی ترکہ میں ملی تھی۔ اس پر میر حسن جیسے عالم کا ساتھ گویا پیاسے اور سمندر کی یکجائی ہے۔

اقبال کا ذوق سلیم اور عربی اور فارسی زبانوں کا صحیح مذاق اسی تعلق کا نتیجہ ہے اسکی دستگیری سے وہ آئندہ اردو سے زیادہ فارسی شاعری میں کامیابی حاصل کر سکے اور اردو میں نئے فلسفیانہ اور صوفیانہ مضامین ادا کرنے کے لئے سانچے فراہم کر دیئے۔ ان کی لفظ تراشی میں جس قدر گہرائی ہے۔ اس سے زیادہ ادبیت بھی موجود ہے۔ فارسی شاعری میں اقبال کے کارنامے لازوال ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اس آخری دور میں جس طرح اقبال اردو کے بے مثل شاعر ہیں۔ فارسی میں بھی ان کا ہندوستان میں کوئی مد مقابل نہیں۔ ایران میں نواب بڑے شاعروں کا پیدا ہونا گویا مسدود ہی ہو گیا

اسکاچ مشن کالج سے اقبال نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ نہ صرف عربی بلکہ انگریزی میں ان کی ممتاز کامیابی نے انہیں وظیفے اور تمغے دلائے یہیں اقبال کی شاعری کی مقبولیت کی بھی ابتدا ہوئی۔ شاعر کی حیثیت سے اقبال ان لوگوں میں ہیں جن کی طبیعتیں

ابتدا ہی سے بار آور ہوتی ہیں۔

لیکن اقبال کی آئندہ عظمت کا بنیادی پتھر لاہور میں رکھا گیا۔ جہاں یہ بی اے کی تعلیم کے لئے آگئے تھے۔ لاہور کے گورنمنٹ کالج میں اقبال فلسفہ اپنا اختیاری مضمون لے کر داخل ہوئے۔ گذشتہ لسانی حکمیں کے مرحلہ سے گذرنے کے بعد یہاں فن فلسفہ میں بھی ایک ایسا شفیق استاد مل گیا۔ جس کو خود مشرق اور خصوصاً اسلام سے خاص اُنس تھا۔ یہ علی گڑھ کے مشہور پروفیسر آرنلڈ ہیں۔ جو بعد میں سر آرنلڈ ہو گئے تھے ان کی طبیعت سے سر عبدالقادر بھی بے حد متاثر ہیں" اور لکھتے ہیں کہ پہلے انہوں نے علی گڑھ کالج کی پروفیسری کے زمانے میں اپنے دوست مولانا شبلی مرحوم کے مذاق علمی کے پختہ کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی" اس دوسرے موقعہ پر بھی پروفیسر موصوف نے اقبال جیسے شاعر کے خیالات کو سنوارنے میں سعی مشکور کی۔ اور اس طرح اردو کے دو بڑے ادیب ان سے متاثر ہوئے۔

جس طرح اقبال نے اپنی غیر معمولی ذہانت سے پروفیسر آرنلڈ کے دل میں جگہ پیدا کی تھی۔ اسی طرح آرنلڈ کی اعلیٰ قابلیت نے بھی اقبال پر احترام اور محبت کے لازوال اثرات چھوڑے۔ ان باہمی تاثرات کی ناقابل فراموش یادگار "نالہ فراق" کے زیر دست جذبات ہیں۔ انہیں کی صحبت میں دراصل اقبال کا فلسفیانہ کردار بنا اور نشو و نما پایا یہی وہ تعلق ہے۔ جس نے اردو کو ایک غور و فکر کرنے والا شاعر عطا کیا۔

یوں تو اسکاچ مشن کالج ہی سے اقبال کی شاعری ہو چکی تھی۔ لیکن لاہور میں آکر وہ خوب چمکی اس کے کئی اسباب ہیں پہلے تو یہ کہ دہلی اور لکھنؤ کی کش مکش سے چھوٹنے کے بعد اردو ادب اور شاعری کو اب لاہور میں ٹھکانا نصیب ہوا تھا۔ اس زمانے میں کلکتہ کے علاوہ علمی سرگرمی میں یہ ہندوستان کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ دوسرے دہلی اور لکھنؤ کے بعض بچے کھچے شاعر بھی یہاں جمع ہو گئے تھے۔ جن میں مرزا ارشد گورگانی دہلوی اور میر ناظم حسین ناظم لکھنوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے قیام نے لاہور کے بازار حکیماں میں ایک بارونق مشاعرے کی

بنیاد ڈال دی تھی - اقبال کا ذوقِ شاعری بھی ان کو کشاں کشاں اس محفل تک لے گیا اس کی قابلیت نے محفلِ مشاعرہ کے تمام اراکین کو ان کا مداح اور دوست بنا دیا اور خود اقبال بھی کہتے ہیں کہ انہیں مرزا ارشد کی فیضِ صحبت سے مستفید ہونے کا موقعہ مل گیا۔ داغ دہلوی سے اصلاح کرنے سے پہلے اقبال نے ارشد گورگانی سے بھی اصلاح لی

ابھی دہلی کے مخصوص شاعر مرزا داغ دہلوی زندہ تھے۔ ان کی غزل خوانی کے انوکھے انداز نے انہیں نہ صرف اردو کے پچھلے تمام شاعروں سے ممتاز بنا دیا تھا۔ بلکہ اپنے معاصرین شعرا میں استادی کا درجہ بھی عطا کر دیا تھا۔ گو یہ ملازمت کے سلسلے میں دکن آ گئے تھے. لیکن ان کا فیض ہندوستان بھر میں بالواسطہ اور بلاواسطہ برابر جاری تھا - اقبال ابتدائی غزل گوئی میں ان کے رنگ سے اس قدر متاثر ہوتے. کہ مراسلت کے ذریعے ان کی شاگردی اختیار کر لی ۔ اس واقعہ کا اثر صرف واقعے کی حد تک نہیں ہے . بلکہ اقبال کی غزلوں کو بنانے اور ان کی زبان کو درست کرنے میں یہ بے حد کارگر ثابت ہوا - ابتدائی غزلوں کی زبان میں وہ مرزا داغ کی سلاست اور اسلوب میں اسی ندرت کو جگہ دینا چاہتے ہیں جس سے داغ کی شاعری ممتاز ہے ذیل کے انتخاب سے یہ امر بہ خوبی واضح ہو جائے گا۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی ۔۔۔ مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا ۔۔۔ خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا ۔۔۔ تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد ۔۔۔ مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی
نہیں ذکر ہوتا ہے اقبال تیرا ۔۔۔ فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

اس طرح کی غزلیں اس میں شک نہیں کہ اقبال کے پاس کم ہیں ۔لیکن ان کے قصداً نظری کر دیئے جانے کا سخت احتمال ہے ۔اقبال کی طبیعت بچپن سے سنجیدہ واقع ہوئی ہے . داغ کی شاعری کا اثر ان کے دل سے بہت جلد دور ہو گیا ہوگا . کیونکہ زبان کی چاشنی سے ہٹ کر تکراری مضامین کے سوا ان کے

پاس کیا تھا۔ جو اس فلسفی شاعر کی توجہ کو الجھائے رکھتا۔ یقین ہے کہ اقبال نے اس طرح کی غزلیں انتخاب کے وقت خود چھانٹ دیں۔

غزل کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کے سب سے زبردست تاثر کا انکشاف بھی ضروری ہے۔ داغ کی شاعری سے سیری حاصل ہو جانے کے بعد فطرتاً اقبال کی طبیعت کو غالب کے کلام سے لگاؤ پیدا ہوا۔ غالب کا کلام درحقیقت اقبال کے مطالعہ کے مقابل تھا۔ کیونکہ دونوں کی ذہنیت بڑی حد تک مشابہ ہے غالب میں وہی عمق ہے جس کی اقبال کے دماغ کو ابتدا سے تلاش تھی۔ شاعر خصوصاً بڑھتا ہوا شاعر مضطرب ہوتا ہے۔ اس کی ذہنی بے چینی کو کہیں سکون مل سکتا ہے تو وہ صرف عمیق خیالات کی دنیا میں اقبال کے متلاشی دماغ کو غالب کے کلام میں ایک ساتھی سا مل گیا۔ اس کے بعد انہوں نے جو غزلیں لکھیں۔ وہ لفظاً اور معنیً غالب کی تقلید نہیں۔ تو غالب کے کلام سے متاثر ضرور ہیں۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے اقبال نے بی اے اور ایم اے کے امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کئے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں پہلے اورینٹل کالج لاہور اور پھر اپنی قدیم درسگاہ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ اس وقت تک اقبال کی شاعری مخصوص اداروں یا شاعروں کی غزل خوانی سے آزاد ہو کر عام ہو گئی تھی۔ اب نظموں کو پڑھ کر سنانے کا موقعہ باقی نہیں رہا تھا۔ عوام ان کا استقبال کرنے کیلئے ہر جگہ تیار رہتے تھے۔ اور یہ اخبارات اور رسائل کے ذریعے ان تک پہنچ جاتیں۔ شاعر کا مضمون مخصوص نہیں ہوتا۔ اس کا دل مصوری کا آلہ ہوتا ہے۔ جس میں ہر وہ چیز منعکس ہو جاتی ہے جو اس کے سامنے آجاتی ہے۔ اس وقت ہندوستان کی غلام قوموں کے بین الاقوامی اختلافات اور ان کی خیالی بنیادوں پر جان توڑ کشمکش نے ہر جگہ اودھم مچا رکھا تھا اقبال بھی ہر دردمند کی طرح اس حالت کو دیکھ دیکھ کر متاثر ہوتے اور فریاد کرتے ہیں۔ اسی سبب سے ان کی اس دور کی شاعری میں وطن پرستی کا جذبہ غالب ہے "ہمالہ" "صدائے درد" "تصویر درد" "نیا شوالہ" "ترانہ ہندی" وغیرہ نے اقبال کو

حالی اور اکبر کی صف میں نمایاں جگہ دلا دی۔

۱۹۰۵ء میں اقبال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے یورپ گئے۔ جاتے ہوئے بجائے دنیوی سفارشات کرنے کے وہ روحانی استعانت کے لئے حضرت محبوب الٰہی کی درگاہ پر گئے۔ مزار پر جو نظم پڑھی۔ وہ کئی پہلو سے اہمیت رکھتی ہے۔ پہلے تو اس سے شاعر کی طبیعت کا رجحان معلوم ہوتا ہے۔ پھر جو التجا کی ہے وہ دنیوی طالبوں کی طرح عزت و ثروت یا شہرت کی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ علمی معیار کے حصول کی ہے۔ جو شاعر کا نصب العین تھا۔

یورپ میں اقبال نے اسی نصب العین کے حاصل کرنے کی سعی کی۔ انہیں بچپن سے عربی۔ فارسی اور پھر فلسفہ کا شوق تھا۔ تحقیقات بھی کی تو انہیں سے متعلق ڈاکٹری کے لئے "ایران اور ما بعد الطبیعات" پر مقالہ لکھا۔ لندن میں بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ باقی وقت ان کا مشرقی اور مغربی زبانوں کے شاہکاروں کے مطالعہ میں صرف ہوا جن کا فلسفہ کی حد تک شوپن ہار ہیگل۔ کانٹ۔ برگساں۔ لاک اور شاعری میں شیکسپیر۔ بائرن براؤننگ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

یورپ کے قیام میں اقبال کی ملاقات بعض ایسے علماء سے ہو گئی جن کی دنیا میں کافی شہرت ہے۔ یہ پروفیسر براؤن۔ آنجہانی ڈاکٹر نکلسن وغیرہ ہیں۔ ان میں بعض کی دوستی کو اقبال کی حیات کے ساتھ تعلق ہے۔ ڈاکٹر نکلسن ان کی شاعرانہ قابلیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جب اقبال نے اپنی شہرہ آفاق نظم "اسرار خودی" لکھی تو ڈاکٹر نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے تعلیقات کے ساتھ اس کو شائع کیا۔ اس ترجمہ نے دراصل اقبال کو انگریزی اور دوسرے مغربی علماء کے وسیع تر حلقوں سے روشناس کیا۔ یورپ ہی میں اقبال کی فارسی شاعری کی ابتدا اور شہرت ہوئی۔ اس ابتدا کا واقعہ سر شیخ عبدالقادر نے اپنے مقدمہ "بانگ درا" میں بیان کیا ہے۔

( ) پہلی ہی غزلیں لکھنے کے بعد اقبال کو معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت فارسی شعر گوئی میں بھی ایسی ہی رواں ہے جیسی اردو میں تھی۔ یہ ایک انکشاف تھا جس سے اقبال نے

بے حد فائدہ اٹھایا۔ ان کی بہترین شاعری فارسی میں ہے۔ اردو میں اس کے فطری حدود کے لحاظ سے ان کی شاعری ہندی اور ہندوستانی تھی۔ لیکن فارسی شاعری کا مخاطب تمام عالم اسلامی ہو گیا۔ فارسی شاعری میں اس وسعت کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا

یورپ ہی کے قیام سے متعلق ایک اہم بات اور رہ گئی ہے یہاں رہ کر اقبال نے جس طرح علمی خزانوں کو ٹٹولا۔ اسی طرح ذہنیتوں اور معاشرہ کا بھی بغور مطالعہ کیا جو انقلاب ان مشاہدات سے ان کے نقطہ نظر میں پیدا ہوا وہ ان کی فارسی شاعری میں کم مگر اردو شاعری میں بے حد نمایاں ہے۔ کیونکہ فارسی شاعری دراصل یورپ کے بعد شروع ہوئی۔ لیکن یورپ جانے سے پہلے کی اردو شاعری بعد کی شاعری کے لیے موازنہ کا کام دیتی ہے۔

پروفیسر آرنلڈ ہندوستان سے جانے کے بعد لندن یونیورسٹی میں عربی کے معلم مقرر ہو گئے تھے۔ اتفاق سے جن دنوں اقبال یورپ میں مقیم تھے۔ پروفیسر صاحب کو کسی مجبوری کی وجہ سے رخصت لینی پڑی تھی۔ ان کے غیاب میں اقبال ان کا کام سر انجام دیتے رہے۔ یہ ایک ہندوستانی کے لیے اس کی قابلیت کا قابلِ فخر اعتراف ہے

۱۹۰۸ء میں اقبال ولایت سے وطن واپس ہوئے۔ اور تھوڑے عرصہ کے بعد گورنمنٹ کالج کی ملازمت کو ترک کر کے وکالت شروع کر دی۔ اقبال کی شاعری کا یہی بہترین اور پختہ کارانہ دور ہے۔ یہ دور شاعری کی کیفیت اور کمیت دونوں لحاظ سے بے حد اہم ہے اور درحقیقت پہلی شاعری کا منتہا ہے۔

ہم نے اوپر اس کا کہیں ذکر کیا ہے کہ سب سے پہلے سر شیخ عبدالقادر نے اقبال کی شاعری کے تین دوروں کا پتہ لگایا۔ پہلا دور ابتدائی عشق سے لے کر ۱۹۰۵ء میں اقبال کے یورپ جانے تک ہے۔ دوسرا دور قیام یورپ کا اور تیسرا ۱۹۰۸ء میں وطن لوٹنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ شاعر کے کلام اور اس کی ذہنیت کا ارتقا معلوم کرنے کے لیے خاص خاص زمانوں میں شاعر کے میلانات کا پتہ لگانا ضروری ہے خصوصاً وہ شاعر جو اپنے عہد کی پیداوار ہو۔ اقبال کی شاعری میں ان تینوں زمانوں کا

فرق اس قدر نمایاں ہے۔ کہ وہ نقاد جو ان کی حیات، ماحول اور ان کی طبیعت پر ان کے اثرات سے ناواقف ہو۔ شاید ان کی بعد کی یا پہلی نظموں کو ان کے نام سے منسوب کرنے میں پس و پیش کرے بعض حالات میں ان کا نقطۂ نظر اس قدر بدل گیا ہے کہ پہلے سے متضاد معلوم ہوتا ہے۔

اگلے اور پچھلے تمام شاعروں کی طرح اقبال کو بھی نمود حاصل کرنے سے پہلے شاعرسازی کے کارخانے سے بھی گزرنا پڑا۔ متقدمین کی طرح اقبال کی ابتدا بھی غزل کی شاعری سے ہوئی۔ انہیں قدیم استادان فن کی شاگردی بھی کرنی پڑی جس کی تفصیلات پیچھے گزر چکی ہیں اقبال نے قدیم شاعری کی مشق سے اتنا ہی فائدہ اٹھایا۔ جتنا پہلے اساتذہ سخن نے اٹھایا تھا۔ لاہور میں انہیں ارشد گورگانی سے بہتر شاعر نہیں مل سکتا تھا۔ اقبال نے ان سے تلمذ حاصل کیا۔ پھر جب نظر اور وسیع ہوئی تو داغ جیسے استادِ فن کو غزل دکھائی۔ اس طرز سے بھی سیری ہو گئی۔ تو پھر وہ غالب کی شاعری سے استفادہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان تینوں اساتذہ سے استفادہ کرنے کے بعد بھی اقبال نے ایک سچے شاعر اور متلاشی حقیقت کی طرح دنیا کے دوسرے بڑے بڑے شاعروں کے کلام سے الہام حاصل کیا جو کچھ سیکھا تھا اس پر قانع ہونے کی بجائے انہوں نے اپنی امیج سے کام لے کر قدما کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کیا۔ غزل کی شاعری میں جب یہ پختہ کار ہو گئے تو مغربی شعرا کے کلام سے بہترین خیالات اور بہترین اسالیب کو انہوں نے اپنا نمونہ بنایا۔ بڑھنے والی اقوام کے افراد کا یہی اصول رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اقبال کی غزل کی شاعری کا بڑا حصہ ہماری نظر کے سامنے نہیں ہے اور جو کچھ باقی رہ گیا ہے۔ وہ بھی صرف ان کے نام کی نسبت کی وجہ سے پڑھا جاتا ہے۔ غرض اس باقیات الصالحات کے متعلق جو بھی کہا جا سکے۔ سب صحیح ہے۔ لیکن اس کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں۔ اس سے غزل کی صنف پر ان کی قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ جہاں داغ کی پیروی کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ

داغ کی روح کو اپنے جسم میں داخل کر لیا ہے۔ وہی سادگی، وہی شگفتگی اور وہی زبان کا چٹخارہ ہے۔ جو داغ کے کلام کی خصوصیت ہے۔ بعد میں جب غالب کے کلام نے ان پر تسلط جمایا، تو یہ غالب کے رنگ ہی میں کہنے لگے تھے۔ اگر یہی مشق سخن جاری رہتی۔ تو ہمیں توقع ہے۔ کہ اردو میں ایک دوسرا غالب پیدا ہو جاتا۔ داغ کی شاعری سے زبان کی روانی اور سلاست سیکھنے کے بعد غالب کی سنگین فکر کے تتبع نے انہیں ایک مکمل غزل گو شاعر بنا دیا تھا۔ یہ ابتدائی مرحلے آئندہ شاعری کا پیش خیمہ ہیں۔

اساتذہ فن کی شاگردی سے نکل کر شاعر نے جب اپنے اطراف پر نظر ڈالی تو اس کے سامنے آزاد۔ حالی، شبلی اور اسماعیل کی شاعری کے نمونے موجود تھے اقبال کے پاس ان کا مطالعہ یہ معنی تو نہیں رکھ سکتا تھا۔ کہ آنکھ بند کر کے اسی روش پر گامزنی شروع کر دی جائے۔ ان کے مطالعہ کے ساتھ ہی ان کے خیالات اور مطمح نظر کی طرف توجہ کا منعطف ہونا ضروری تھا۔ قطعاً اقبال بھی حالی اور اکبر کی قومی اور معاشرتی فضا میں چلنے پھرنے لگے۔ ہر نو عمر انگریزی خواں کی طرح وطن اور قوم کی محبت کے جذبات ان کے دل میں بھی ابھرنے لگے۔ ہندوستانیوں کی جو حرکت ان کو ناگوار معلوم ہوتی۔ وہ اس کا اظہار کر دیتے تھے۔ عوام کے افعال میں مستقبل کا خیال بہت کم رہتا ہے۔ حالی کی طرح قوم کی غلطیوں سے اقبال بھی اسے مطلع کر دیتے تھے۔

وطنی نظمیں اقبال کی اس قدر مقبول ہوئیں کہ بچے بچے کی زبان پر چڑھی ہوئی ہیں خصوصاً وہ نظم جس کا عنوان "ہندوستان ہمارا ہے"۔ "صدائے درد"، "ہمالہ"، "تصویر درد"، وغیرہ میں بھی وطنیت کا احساس شدت سے پایا جاتا ہے۔

ان نظموں کے علاوہ اقبال کی ابتدائی شاعری کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو مغربی شعراء جیسے ٹینی سن، امرسن، گوئٹے وغیرہ کے کلام سے ماخوذ ہے۔ درحقیقت اقبال کی موضوعی نظموں کا اولین نقش ہیں۔ اس دور کے اکثر شعراء جنہوں نے مغربی نظموں

کے مقابلہ میں نظمیں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ پہلے پہل مغربی شعراء کے علوم کو نمونہ بناتے رہتے ہیں۔ ماخوذ خیالات میں اقبال نے عموماً ایسی فلسفیانہ نظمیں انتخاب کی ہیں۔ جو اردو میں آنے کے بعد اس کا ایک جزء معلوم ہونے لگی ہیں۔ یہ تقلید کی بڑی کامیابی ہے۔ ایسی نظمیں اقبال نے عموماً بچوں کے لئے لکھی ہیں۔ لیکن وہ اردو ادب میں ایک اضافہ ہیں۔

فطرت کی عکاسی اور قلبی جذبات کے اظہار کے حقیقی اسالیب اردو میں میر حسن میر انیس اور نظیر اکبرآبادی کے زمانہ سے پیدا ہو چکے تھے۔ لیکن اس نقطۂ نظر سے ان شعراء کے کلام کو حالی سے پہلے بہت کم اہمیت دی گئی۔ آزاد اور حالی نے جب شاعری کا رخ بدل دیا۔ تو فطرت نگاری کی اہمیت خواص و عوام پر روشن ہوئی۔ اسماعیل میرٹھی نے اردو شاعری کے اس خاص پہلو کو حد کمال تک پہنچا دیا۔ اقبال کی شاعری جب شروع ہوئی۔ تو لوگوں کی توجہ قدیم طرز کی شاعری سے ہٹ کر اسی طرح کی فطری شاعری پر جم گئی تھی۔ گو تنوع کے نہ ہونے سے یہ میدان اس وقت تک صرف حالی اور اسمٰعیل میرٹھی کی شاعری پر محدود تھا۔ لیکن اقبال کی فطری نظموں نے نہ صرف اس میدان کو وسیع کیا۔ بلکہ آئندہ شعرا کے لئے بے شمار راستے کھول دیئے "ہمالہ"، "گل رنگین"، "ابر کہسار"، "آفتاب صبح"، "پیام صبح"، "چاند"، "صبح کا ستارہ"، وغیرہ اقبال کی منظر نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ اسی طرح جذبات کا صحیح مگر شاعرانہ اظہار جس طرح "مرزا غالب"، "داغ"، "تصویر درد" "کنار راوی" میں کیا گیا ہے۔ ان سے پہلے کی اردو نظموں میں شاید ہی مل سکے خود حالی کی نظمیں اس حیثیت سے بہت معمولی ہیں۔ اسمٰعیل کی منظر نگاری میں اقبال سے زیادہ گھلاوٹ اور سلاست ہے۔ گو ان میں اقبال کی سی گہرائی نہیں ہے۔

ان تمام خصوصیات کے علاوہ ابتدائی نظموں میں اقبال کا شخصی عنصر اور ذاتی خیالات کی جھلک بھی بے حد موثر ہے۔ فکر عمیق کے آثار اقبال کی چھوٹی سے چھوٹی اور سطحی سے سطحی نظم میں صاف ظاہر ہیں۔ اقبال نہ صرف فلسفہ کے معلم ہیں۔ بلکہ اچھے مفکر

بھی ہیں ۔

اقبال کے اسلوب اور اکبر الہ آبادی کے اسلوب میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ یہ ہتھوڑے ہیں اور وہ منقطع ۔ لیکن اقبال کے کلام میں چند ظریفانہ نظمیں بھی ہیں ان کے ماخذ کی تلاش کے لئے اکبر کے کلام کے اثر کی طرف رہنمائی بے جا نہ ہوگی کوئی وجہ نہیں کہ نو عمر اقبال اکبر کے مقبول طرز شاعری سے کورے ہوں ۔

اکبر کا یہ اثر اقبال پر بہت ہی نام نہاد ہے ۔ اصلی اثر وہ ہے جس سے ان کی شاعری کی اصولی تعمیر میں مدد ملی ۔ اردو شاعری کے ارتقا کا یہ وہ رشتہ ہے ۔ جو میر حسن سے شروع ہو کر انیس، نظیر، آزاد، حالی اور اسمٰعیل سے گزرتا ہوا اقبال تک پہنچ رہا ہے ۔ حالی اپنی بنیادی کوششوں میں جن شعراء کا خواب دیکھتے رہے تھے ۔ وہ درحقیقت اقبال ہی جیسے سخن آرا ہیں ۔

شاعری کا ایک پہلو تربیتی بھی ہوتا ہے ۔ شاعروں کے خیالات اقوام کی درستی میں بڑا حصہ لیتے رہے ہیں ۔ اس حیثیت سے قدیم اردو شاعری بہت کم اہمیت رکھتی ہے ۔ کیوں کہ وہ قوم کی کسی حالت سے تعرض نہیں کرتی ۔ بعض شعراء کے کلام میں اخلاقی نقطے ملتے ہیں ۔ لیکن یہ زیادہ تر تصوف کے ضمن میں ظاہر ہوئے ہیں ۔ اور اس قسم کے اشعار اس قدر تھوڑے ہیں کہ ان کا عدم اور وجود برابر ہے

گو آزاد جدید شاعری کے سب سے پہلے علمبردار ہیں ۔ لیکن ان کی نظمیں قومی حالت سے بے تعلق ہونے کی وجہ سے انہیں حالی کے مقابلہ میں عقبی زمین میں ڈال رہی ہیں ۔ بہت ممکن ہے کہ تاریخ ادب کے سوا شاعر کی حیثیت سے آزاد کا ذکر آئندہ نسلوں میں بالکل نہ ہو ۔ اس کے برخلاف حالی کی شاعری باوجود سیدھی ہونے کے زندہ ہے ۔ اور ہمیشہ زندہ رہے گی ۔ وہ قوم کی زندگی سے وابستہ ہو گئی ہے ۔ اس نے نہ صرف شاعری کے بنیادی خیال میں ایک انقلاب برپا کیا ۔ بلکہ موجودہ تعلیم اور معاشرت کے بہت سے مسائل سے وہ واصل ہے اور قوم کے اخلاق، خیالات، کردار کو درست کرنے کی کوشش کرتی ہے وہ قوم کو

بیدار کرتی ہے اور اس کے سامنے ایک نصب العین بھی قائم کرتی ہے جیسے بعض وقت کہا گیا ہے۔ حالی کی شاعری کا ایک معین "پیغام" ہے۔ پھر تم ادھر کو چلو سر کی ہوا ہو۔

گویا حالی ایک جدید قوم کی تعمیر کرنے والے ہیں۔ اسمٰعیل کی شاعری فروعات میں حالی سے بالکل مختلف ہے۔ لیکن اس کی اصلی سپرٹ وہی ہے۔ جو حالی کی شاعری کی ہے۔ بلکہ ایک جز یعنی فطرت نگاری میں وہ حالی سے مشترک بھی ہے۔

اکبر قدامت پرست طبیعت کے انسان تھے۔ اسلئے حالی کی جدید تعمیر سے وہ پوری ہمدردی نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ قوم کو غفلت سے بیدار کرنا چاہتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کو مغربی تقلید کے غار میں اندھے کی طرح گرتے ہوئے دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی اپنی قدیم روایات کو برقرار رکھ کر ترقی کی راہیں اختیار کریں۔ زمانے کی ہر آن تبدیلی کے ساتھ اپنی حالت کو بدلنا انہیں پسند نہیں تھا۔

ہوس پرستوں کو کیوں یہ کد ہے ان انقلابوں کی کیا سند ہے
اگر زمانہ بدل رہا ہے۔ بدلنے کو ہی بدل رہا ہے

قومی اور وطنی جذبات سے لبریز دل اقبال جب اس اختلاف پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں قوم کی زبوں حالت پر حالی کے ساتھ ماتم کرنا پڑتا ہے۔ ابتدائی دور کی شاعری میں اقبال کے پاس یہ اثر بہت زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن مرض کے علاج کا ان کے پاس کوئی معین نسخہ ہے۔ اس لحاظ سے اس دور کی شاعری کے متعلق ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اپنے اور اپنے ہم قوموں کیلئے کیا راستہ تجویز کرتے ہیں۔ اسی واسطے اس دور کی شاعری کو بعض بزرگوں نے تذبذب تلاش اور اضطراب کی شاعری بھی کہا ہے۔ اقبال کی طبیعت کا یہ انتشار صرف قومی نظموں سے ظاہر ہے۔ بلکہ دوسری نظمیں بھی اس سے خالی نہیں ہیں "شمع" "خفتگان خاک سے استفسار" "شمع اور پروانہ" وغیرہ سے یہ خصوصیت صاف

ظاہر ہے کہ حقیقت شاعر دنیا کی ہر چیز کی ماہیت دریافت کرنا چاہتا ہے لیکن ابھی فطرت کے راز اس کی سمجھ سے بالا معلوم ہوتے ہیں۔

بعد کے دور کی نظموں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو عشق کی تلاش تھی جس کے بغیر زندگی بے لطف ہو رہی تھی تنہائی میں اور مجمع میں غرض ہر جگہ وہ اپنے آپ کو اجنبی پاتا ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی نصب العین معین نہیں ہوا جس کے لئے وہ بے چین ہے۔

یہ انتشار یورپ میں جانے کے بعد رفع ہو جاتا ہے۔ اور شاعر وہیں سے آئندہ کے لئے ایک تجویز سوچ کر وطن واپس آتا ہے۔

غرض اس دور میں اقبال مجموعی حیثیت سے وطن پرست شاعر ہے قومی نظموں سے ہٹ کر انہوں نے جو نظمیں اس دور میں لکھیں وہ بھی بلند پایہ ہیں۔ ان کا آئندہ اعلیٰ فلسفیانہ اور صوفیانہ کردار ان نظموں میں ہر جگہ نمایاں ہے "گل رنگین"، "خفتگان خاک سے استفسار"، "شمع"، "ماہ نو"، "انسان اور بزم قدرت"، "بچہ اور شمع" وغیرہ ایسی نظمیں ہیں۔ جن میں شاعر نے کائنات کے مہتم بالشان مسائل، جیسے حیات کے ماخذ، حیات کا مقصد، انجام حیات اور حیات بعد الموت، اور عشق اور حسن وغیرہ سے بحث کی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی تہ تک پہنچنے کی وہ کوشش کرتے ہیں۔ کہیں تو وہ اس عالم صغیر یعنی انسان اور اس کی قوتوں پر غور کرتے ہیں۔ کہیں وہ انسان اور بیرونی کائنات کو بالمقابل رکھ کر دونوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ انہیں انسان کی ہنگامہ آرائی اور نیچر کی خاموش کارگزاری میں بڑا فرق نظر آتا ہے جس چیز کی ماہیت کو سمجھنے سے وہ قاصر رہ جاتے ہیں۔ اس کے لئے خدا سے استعانت طلب کرتے ہیں۔

یہ دور "التجائے مسافر" پر ختم ہو جاتا ہے۔ جس نظم میں شاعر نے اپنے اعلیٰ نصب العین کے حصول میں استقلال کی اس درگاہ سے دعا مانگی ہے۔

اقبال کی شاعری کا دوسرا دور قیام یورپ کا ہے۔ یورپ میں اقبال کا زمانہ بہت

معروف گذرا۔ ایک طرف تو وہ علمی سرمایہ کو سمیٹ رہے تھے۔ دوسری طرف یورپ کی معاشرت، تمدن اور سیاست پر بھی ان کی نظر جمی ہوئی تھی۔ ان کا مضمون چونکہ اسلامی فلسفہ اور خاص کر ایرانی فلسفہ تھا۔ اس لئے ان کی طبیعت جس کو پہلے سے عربی اور فارسی سے خاص لگاؤ تھا۔ اس مضمون میں خوب مضبر ہے۔

یورپ میں اقبال کی شاعری کا جو زاویہ نظر بدلا اس کے بے شمار قدرتی اسباب ہیں۔ پہلے تو یہ کہ فطری لگاؤ کی وجہ سے مقالہ کے لئے جو موضوع اختیار کیا۔ وہ ان کو اسلامی فلسفہ سے بخوبی روشناس کرانے والا تھا۔ دوسری اتفاقی بات یہ ہے کہ اقبال کو اپنی فارسی زبان پر قدرت کا انکشاف وہیں ہوا۔ تیسرے انہوں نے یورپ کی معاشرت کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اگر اس سے پہلے ان کے خیالات یورپ کو اپنا نمونہ بنانے کے تھے تو وہ بدل گئے۔ چوتھی چیز یہ ہے کہ پہلے وہ صرف ہندوستانی اور خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کے شاعر تھے۔ ہندوستان سے باہر نکل کر انہوں نے جب تمام عالم اسلامی پر ایک عام مصیبت مسلط دیکھا۔ تو اُن کی ہمدردی وسیع تر ہو گئی۔

اسلامی فلسفہ کی تحقیق نے اقبال کو حقیقی اسلام اور اس کے سادہ ترین اور مہتم بالشان اصول زندگی اس کا مطمح نظر اور اگلے مسلمانوں کی عظمت سے کما حقہ روشناس کر دیا۔ اگلی عظمت کے مقابلہ میں موجودہ مصیبت کو دیکھ کر ان کے ہمدردانہ جذبات میں تحریک پیدا ہوئی۔ اور انہیں یہیں سے آئندہ نظموں کا موضوع مل گیا پہلے اقبال کا یہ خیال تھا کہ مسلمان وطن پرست بھی ہو سکتا ہے لیکن اب یہ خیال کمزور پڑ گیا خصوصاً اسلئے بھی کہ ہندوستانیوں میں جو خیالی تفرقہ پیدا ہو گئی تھی وہ دور ہوتی ہی نظر نہیں آ رہی تھی۔

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا ۔ بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہو جا

اس بے سود کام پر اپنی ہمت ضائع کرنے کو انہوں نے فضول سمجھا اسکی بجائے بالواسطہ طریقوں سے مسلمانوں میں رواداری کا احساس پیدا کرنیکی کوشش

شروع کی۔ کیونکہ نصیحت براہِ راست ہمیشہ زبوں گوش ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس تبدیلی خیال میں یہ حکمت بھی مضمر تھی۔ کہ جب تک قومیں کسی اعلےٰ نصب العین کے شعبوں میں سرگرم نہ ہوں۔ وہ اختلافات کے خیالات ہی کو اپنا میدان عمل سمجھتی رہتی ہیں اب دقت یہ تھی کہ اردو جو ہندوستان کی زبان ہے۔ صرف ہندوستان تک ہی محدود ہے، بیرونی مسلمانوں تک اس کی رسائی ناممکن ہے۔ اسکا حل انہیں اتفاقاً ہاتھ آگیا تھا۔ فارسی میں بھی یہ آسانی سے شعر لکھنے لگے تھے۔ اس لئے انہوں نے فارسی زبان کو اپنی شاعری کا ذریعہ بنا لیا۔ تاکہ مسلمانوں کا زیادہ وسیع حصہ اس کو پڑھ سکے۔

یورپ سے لوٹنے کے بعد زیادہ توجہ اقبال نے فارسی شاعری پر صرف کی۔ گو اردو میں بھی وہ برابر لکھتے رہے۔

یورپ کی سیاسی اور معاشرتی حالت کے مشاہدے اور مطالعہ نے اقبال کو ان کی خامیوں سے واقف کیا۔ یورپ کی سیاست جسقدر پیچیدہ ہے۔ اس سے زیادہ سقیم بھی ہے۔ پیچیدگی یہ ہے کہ ان اقوام کا جو اصول ہے اس پر ان کا عمل نہیں اور جب اصول اور عمل دونوں موجود ہوں تو ان میں صداقت نہیں۔ یورپی قومیں آزاد اپنے آپ کو اسی وقت سمجھتی ہیں جبکہ ان کا کوئی غلام ہو اور وہ کسی قوم کی عزت اسی وقت کرتی ہیں۔ جب وہ اس سے ڈریں۔ ان کی سیاست کی بنیاد اس پہ ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو، مادی اور سائنس کے وسائل سے دنیا کی دوسری قوموں کو تباہ اور برباد کر دیا جائے۔ تاکہ ان کا بول بالا ہو۔ معاشرتی حالت میں جو اسقام ہیں ان کا تفصیلی ذکر ایک کتاب چاہتا ہے۔ سرمایہ دار اپنے ہی ہم جنس اور ہم قوم غریبوں اور مزدوروں کا خون چوسنے کیلئے بے چین ہیں۔ ادنیٰ طبقے زندگی کی کم سے کم ضروریات کیلئے بھی دوامی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ مگر امرا کو اپنے عیش و آرائش سے سیری نہیں ہوتی۔ پھر ان اقوام میں ظاہر پرستیاں ایسی ہیں کہ جن کی زندگی کیلئے قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یورپ اپنے سائنس اور دوسرے مادی وسائل کی مدد سے دنیا کی خدمت کے بہانے تباہ کر رہا ہے۔

جب اقبال دنیا کی راہنما قوموں کی حالت سے مایوس ہو گئے تو انہیں مجبوراً صدر اسلام کی زندگی کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اسلام کے وسیع اصول مساوات، محبت اور اخوت اور ان پر سختی کے ساتھ عمل پیرا ہونے ہی میں اقبال کو نجات نظر آنے لگی۔ اسلام ہی کا نظام معاشرت ان کے لئے اب دارالامان باقی رہ گیا تھا۔ فطرتاً وہ ادھر متوجہ ہو گئے۔ ان کے دل میں مقصد حیات کا جو احساس پیدا ہو گیا تھا وہ مطمئن ہو گیا۔ کیونکہ بنی نوع انسان کی فلاح کا خیال پختہ ہو گیا۔ اب وہ تمام عالم میں کسی کو اپنا اور غیر ہی نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ ان کا دارالامان سب کے لئے تھا۔ گویا "عشق" کی چنگاری جو ان کے دل میں فروزاں ہوئی تھی۔ بھڑک کر شعلہ بن گئی۔ اب وہ تذبذب جاتا رہا۔ اور متلاشی حقیقت کو حقیقت کا پتہ لگ گیا

اقبال کی شاعری کا آخری دور ۱۹۰۸ء کے بعد کا ہے۔ اس سنہ میں وہ ہندوستان واپس ہوئے۔ یہ دور حقیقت میں اقبال کی شاعری کا زریں دور ہے اس دور کی شاعری نے اقبال کیلئے دنیا کے لازوال شعراء کے زمرہ میں جگہ نکال لی ہے۔ اور اس دور کی شاعری اقبال کی زندگی کا ماحصل اور ان کی شعری کوششوں کا منتہا ہے۔

اس دور کی شاعری کی تمہید بہت تھوڑی ہے۔ کیونکہ اس کا بیشتر حصہ دوسرے دور کے ضمن میں گزر چکا ہے۔

اقبال نے یورپ میں جو میلان شاعری کا پیدا کیا تھا۔ اب وہ عملی صورت اختیار کرنے لگا۔ ان کی ہمدردی کائنات کے ہر اس ذرہ کے ساتھ تھی جو مصیبت میں ہو۔

ان کا مذہب اور مسلک صوفیانہ یعنی عشق و محبت تھا۔ ایسا عشق کہ جو کائنات کے ہر ذرہ کے ساتھ ہو، ہر ذی حیات کیساتھ ہو، ہر فرد بشر کے ساتھ ہو، اور حسن و حیات کے مخرج کے ساتھ ہو۔ اسی لئے اس دور کی شاعری میں "عشق" کی تلقین بڑے شد و مد کے ساتھ کی ہے۔ عشق ہی ان کو دونوں عالم کا حکمران نظر آتا ہے کائنات کے ہر ذرہ کو دوسرے ذرے کے ساتھ عشق ہے۔ اسکے بغیر زندگی

کے بعد موت تصور کرتے ہیں جس میں ذہن کی جھلک نہ ہو۔ پھر جس طرح شعرائے اردو نے عشق کے ساتھ وحشت یعنی حرکت کو ضروری سمجھا تھا۔ یہ بھی حرکت یعنی عمل کو ضروری تصور کرتے ہیں۔ عشق تو ایک مذہب ہے اور اس کے ارکان عمل کے ذریعہ ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ آخری ترمیم گویا اقبال کا اپنا اضافہ ہے۔

اس آخری دور میں اقبال کی اردو شاعری فارسی شاعری کے مقابلے میں مدھم پڑ گئی۔ تاہم اردو شاعری فارسی شاعری کا تتمہ رہی۔ فارسی شاعری کی پوری اسپرٹ اس میں موجود ہے۔ فارسی شاعری کے آغاز اور اسکی طرف زیادہ تر توجہ کے اسباب ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ لیکن ایک چیز جو یہاں خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ اقبال نے ایرانی فلسفہ کی جو تحقیقات کی تھیں اس سے انہیں بڑی مدد آئندہ فارسی شاعری میں ملی۔ اپنے مضمون کیلئے انہیں یوں تو سارے مسلمان فلسفیوں کے کارنامے پڑھنے پڑے۔ لیکن وہ مولانا روم سے بے حد متاثر ہوئے۔ اقبال کے آخری کلام پر مولانا روم کے فلسفہ کا ہی اثر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی ذہنیت کو معراج کمال پر پہنچانے والا ہی رومی کا کلام ہے۔ جو "مثنوی معنوی" اور "دیوان شمس تبریز" جیسی دو ضخیم کتابوں پر مشتمل ہے۔ اقبال کا تصوف ان کی نظر افروزی، وسعت، جذبات، حیات کے رازوں سے آگاہی۔ کائنات کے ساتھ انس و محبت اور عشق غرض اُن کی شاعری کا ڈھانچہ بڑی حد تک حضرت رومی ہی کا ممنون احسان ہے اقبال نے خود جا بجا اس کا اعتراف کیا ہے۔

اقبال پر رومی کا اسقدر زبردست اثر تھا کہ انہوں نے اپنی مثنوی "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" کی بنیاد ہی "مثنوی معنوی" کی طرز پر رکھی ہے۔ دونوں مثنویاں کی بحر وہی ہے۔ اور اسلوب وہی آغاز بھی مثنوی کے آغاز سے ہوتا ہے مولانا روم کا اثر اقبال پہ بہت قدیم ہے۔

نہ صرف یہ بلکہ اقبال کا عظیم الشان فلسفہ "خودی" بھی مولانا ہی سے متاثر ہے۔ صوفی عقائد کے موجب جب انسان اپنی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے۔

یا اپنی ہستی کو مٹا دیتا ہے۔ تو دونوں صورتوں میں اس کی حالت لامحدود ہو جاتی ہے اس حالت میں کائنات پر حکومت کرنا بھی اس کے لئے ایک معمولی بات ہے۔ لیکن اس خودی کے احساس سے اقبال نے جو کام لیا ہے۔ وہ ان کا اپنا قابل قدر کارنامہ ہے جس کا تعلق بڑی حد تک ہماری موجودہ حالت اور ضرورت سے ہے۔

اقبال نے اب تک جس قدر فارسی نظمیں لکھی ہیں وہ چھ کتابوں کی صورت میں شائع ہوئی ہیں۔ (۱) زبور عجم۔ (۲) اسرار خودی۔ (۳) رموز بیخودی۔ (۴) پیام مشرق۔ (۵) مسافر (۶) ارمغانِ حجاز۔ ان میں سے آخری تین بے حد اہم ہیں۔ پیام مشرق میں ایک طویل نظم کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی متفرق نظمیں بھی شامل ہیں۔ یہ سب نظمیں بلند پایہ ہیں۔ "پیام مشرق" کے ذریعہ اقبال نے مغرب کے لئے مشرق کا تحفہ بھیجا ہے۔ یہ المانوی شاعر گوئٹے کے دیوان کا جواب ہے۔ جو مغربی دیوان کے نام سے شائع ہوا تھا۔

"رموزِ بیخودی" میں ملت اسلامی کے ارکان سے بحث کی ہے لیکن "اسرار خودی" محکوم اقوام کے لئے بڑی اہم نظم ہے۔ بظاہر یہ متصوفانہ معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں یہ محکوم اقوام کی اصلاح ذہنیت کا بڑا آلہ ہے اس میں حاکم اور محکوم ذہنیتوں کا فرق بڑی حکیمانہ قابلیت سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کا اصلی مقصد اس پستی کو دور کرنا ہے جو محکوم اقوام کے مغالطے کی وجہ سے ان کی ذہنیتوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ نظم اقبال کی اکثر نظموں کی طرح بے حد اور رنگین خیالات پر مشتمل ہے۔

اس دور کی اردو نظموں میں چار یا پانچ بڑی اور باقی چھوٹی نظمیں ہیں ان میں اکثر نظموں کا تعلق مسلمانوں کی موجودہ حالت سے ہے۔ تمام نظموں کو ہم ذیل کے چار عنوانات کے تحت تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) قومی اور وطنی　　　(۲) معاشرتی اور اخلاقی

(۳) حکیمانہ　　　(۴) تاریخی

قومی اور وطنی نظموں میں بڑی اور معرکۃ الآرا نظمیں شکوہ، جواب شکوہ، خضر راہ

اور طلوعِ اسلام ہیں۔ ان کے علاوہ کئی مختصر نظمیں جیسے "ترانۂ ملی"، "وطنیت"، "خطاب بہ نوجوانانِ اسلام"، "مسلم"، خاص طور سے توجہ طلب ہیں۔ ان کے متعلق کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے۔ ہر نظم قومی جذبہ میں حقیقی معنوں میں ڈوبی ہوئی ہے پھر جن الفاظ سے قوم کو جگانے کی کوشش کی گئی ہے اعجاز معلوم ہوتا ہے "ترانۂ ملی اور وطنیت" دورِ اوّل کی اسی موضوع کی نظموں کی توسیع یا ترمیم ہے۔ پہلے دور میں اقبال نے کہا تھا ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اب اس میں یہ ترمیم کی کہ ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا — مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اس اختلاف کی توجیہہ وہ خود اس طرح کرتے ہیں۔

تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور — ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

نیز ؎ بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے۔

"شکوہ"، "جوابِ شکوہ"، "خضرِ راہ"، اور "طلوعِ اسلام" میں سے کسی نظم کا جواب اردو میں نہیں ملتا۔ "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" میں جس شاعرانہ انداز سے مسلمانوں کی پستی کا شکوہ خدا سے کیا ہے۔ اور پھر ابھرنے کی جو ترکیب بتلائی ہے۔ وہ زبانِ الہام کی شان رکھتی ہے۔ یہ نظمیں اقبال کی عمر بھر کی کمائی ہیں

معاشرتی اور اخلاقی نظموں کے تحت وہ تمام نظمیں آجاتی ہیں جو تمدن یا تنظیم پر ہیں۔ یا کسی متعلق مضمون پر لکھی گئی ہیں۔ یہی وہ نظمیں ہیں جو بالکل اکبر الہ آبادی کے نقطۂ نظر کو پیش کرتی ہیں۔ اس دور کی اہم ترین نظمیں اقبال کی حکیمانہ، فلسفیانہ اور متصوفانہ نظمیں ہیں۔ ان میں اقبال کا اصل کردار جس قدر جھلک رہا ہے کسی اور عنوان کی نظموں میں نہیں۔ تاریخی نظمیں اقبال کی اسی وسیع نظری کا ثبوت ہیں جن کا اور تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں گو اسلامی تاریخ سے متعلق نظمیں زیادہ ہیں۔ لیکن حقیقت میں تخصیص کوئی نہیں۔ تاریخ کا جو اہم پہلو شاعر کو متاثر کر سکا ہے وہ

اس پر خیال آرائی کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ ان میں حضرت صدیقِ اکبر پر ایک نظم ہے۔ تو دوسری رامچندر جی پر ہے۔ یہ نظمیں گویا شاعر کے تاریخی تاثرات کی یادگار ہیں۔

آخر میں اقبال کی شاعری کی ادبیت کے متعلق بھی چند الفاظ ناگزیر ہیں کیونکہ شاعری میں کمالِ "فکر" اور "تخیل" کے ساتھ ساتھ جب تک زبان پر بھی پوری قدرت حاصل نہ ہو وہ حسنِ گویائی پیدا نہیں ہو سکتا۔ زبان اور خیال دونوں شعر کے لئے ویسے ہی ضروری لوازم ہیں جیسے جان کے لئے قالب۔ بلکہ شعر میں زبان کا جز اس سے زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ یہ ممکن ہے ایک اعلیٰ فہم اور ذکی شخص میں اس کے جسمانی حسن کا فقدان اس کی عظمت پر کوئی اثر نہ ڈالے لیکن بہترین خیالات ہی کیوں ہوں۔ جب تک وہ بہترین اسلوب میں ادا نہ کئے جائیں۔ ادب میں بڑا درجہ حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی لئے بعض نقادوں نے شعر کی یہ خوبی مقرر کی ہے۔ کہ بہترین خیالات بہترین الفاظ میں ادا کئے جائیں۔

اردو رسالوں نے اقبال کی زبان پر غیر منصفانہ تنقیدیں کی تھیں ظاہر ہے کہ ایسے رسالوں نے اقبال کے ان اشعار کو تنقید کے لئے انتخاب کیا جن میں روزمرہ یا محاورے کے لحاظ سے کوئی خامی نظر آئی تھی۔ بعض بزرگوں نے اقبال کی فارسی شاعری کی طرف زیادہ دیکھ کر اس کی توجیہہ فرمائی۔ کہ اردو رسائل میں اس طرح کی مضحکہ خیز تنقیدوں نے اقبال کو اردو شاعری سے بددل کر دیا ہے لیکن اقبال کی ذہنیت والے شاعر کے متعلق یہ خیال زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ ہم نے پہلے ہی فارسی شاعری پہ اقبال کے زیادہ توجہ کرنے کا سبب بتلا دیا ہے۔

اقبال کی شاعری کے اس پہلو پر غور کرتے وقت تنقید نگار کو کئی امور کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ اقبال کا کُل فارسی کلام سلاست اور روانی کے ایک ہی اعلیٰ معیار پر نہ ہو اور یہ ہو نہیں سکتا یا اس کے ہر شعر میں حافظ کی سی شیرینی اور سعدی کی سی سادگی اور صفائی موجود نہ ہو لیکن اس سے ان کی عظمت پر کیا حرف

آسکتا ہے۔ جبکہ خود مولانا روم جیسے شاعر کا پورا کلام خوبی کے ایک ہی معیار پر نہیں ہے نہ صرف یہ بلکہ مولانا رومی کو بھی بعض جگہ محاورے اور روزمرہ کی پابندی سے ہاتھ دھونا پڑا ہے۔ اردو کلام پر اعتراضات کا بھی یہی حال ہے۔ اردو میں میر اور سودا جیسے قدیم شاعروں کو چھوڑ کر جن کی ہر بات متوسلین کے لئے نمونہ تھی۔ انیس سے لے کر حالی تک بھی کسی شاعر کا کلام اعتراضات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ انیس کے پرستار شبلی اکثر اعتراضات کو دور کرنے کے بعد بھی خامیوں کے واضح کرنے سے نہ رک سکے۔ اقبال کا کلام پھر کس طرح خطا سے پاک رہ سکتا ہے؟ ایک بڑے نقاد نے سچ کہا ہے۔ کہ سقم ہی کسی کارنامے کے انسانی ہونے کی دلیل ہے۔

فارسی کی طرح اردو میں بھی غزل کی زبان اس قدر منجھ گئی ہے کہ کسی غزل گو شاعر کو زبان کی تمام پابندیوں کا لحاظ رکھنے میں دقت نہیں ہوتی اور جو لوگ خیال کو قربان کر کے صرف زبان کا غلام بننا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ وہ اس لحاظ سے کسی کو ہلتے دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ حالانکہ تغزل کے علاوہ دوسری شاعری کا اصول ہی جدا ہے خاص کر اس شاعر کے لئے جس کا مطمح نظر مضمون موضوع اور خیال کی اہمیت ہے۔ زبان کی بعض غیر اہم بندشوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اگر شیکسپیئر قدیم زمانے کا شاعر تھا۔ تو براؤننگ جیسے شاعر جدید کے خیالات بھی بعض وقت زبان کی پابندیوں کو توڑ کر باہر نکل جاتے ہیں۔ انگریزی کی طرح فارسی اور اردو شاعری پر بھی ایک دور لفظی صناعی کا گزرا ہے۔ اس زمانے کے لسانی معیار کو سامنے رکھیں تو یقیناً بعد کے شاعروں کا کلام کہیں کہیں پھیکا یا سقیم نظر آئے گا۔ نقاد کو ہر معاملہ میں نصب العینی ہی نہ بن جانا چاہئے۔ بلکہ حقائق بھی اس کے پیش نظر رہیں۔

فارسی اور اردو دونوں میں اقبال کا کلام ایک قابل قدر اضافہ ہے خواہ زبان کی حیثیت سے ہو یا مضامین کی۔ فارسی زبان میں اقبال نے اپنے زمانہ کی ضروریات سے متعلق بہت سی اہم اصطلاحات الفاظ اور ترکیبوں کا اضافہ کیا۔ اس زمانے میں جبکہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران میں بھی شاعری قدما کے معیار سے بالکل مختلف اور

جدید الفاظ اور ترکیبوں کا مرکب بن گئی ہے۔ اقبال نے قدما کے معیار زبان ہی کو ہر جگہ برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے ان کے کلام کو پڑھ کر اکثر جگہ کسی قدیم شاعر کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے یہی چیز ہے جو اقبال کو اپنے زمانے کا بڑا فارسی شاعر بنا رہی ہے۔

اردو زبان کی جو خدمت اقبال کی شاعری نے انجام دی ہے وہ فارسی سے زیادہ عظیم بالشان ہے غالب کی غزلوں کو چھوڑ کر اردو میں سوائے اقبال کے کوئی شاعر ایسا موجود نہیں ہے۔ جس کے کلام میں اعلیٰ خیالات بھی ہوں۔ اور پاکیزہ زبان بھی اقبال کے کلام کے مقابلے میں آزاد بلکہ خود حالی کے کلام میں بھی شعریت اور ادبیت کم معلوم ہوتی ہے۔ اقبال کی شاعری کو میر۔ سودا۔ درد۔ میر حسن۔ میرانیس۔ ذوق مرزا غالب اور داغ کے معیار سے جانچنا ہی ظلم ہے۔ اقبال کا میدان اپنا جدا ہے۔ جس کے وہ تنہا مالک ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے شاعری کی جو دنیا پیدا کی ہے اس کے لوازم حسن۔ صرف محاورہ بندی اور روزمرہ نہیں ہیں۔ اقبال نے اردو میں جتنے نئے اور خوبصورت الفاظ تراشے ہیں۔ جتنی ادبی ترکیبیں وضع کی ہیں، اور نفیس تشبیہوں اور استعاروں کا جس قدر ذخیرہ فراہم کر دیا ہے اس کی تفصیل کی مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔

اقبال کے چند بنیادی تصوّرات

پروفیسر رازی

قانون عروج وزوال

قوموں کا عروج وزوال قانونِ قدرت کے تحت رونما ہوتا ہے چنانچہ مسلمانوں کا زوال وانحطاط بھی نتیجہ ہے۔ اسی قانونِ قدرت سے انحراف کا۔ کلام اللہ میں بڑے

سادہ اور بلیغ الفاظ میں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے۔ کہ اگر تم نے دین فطرت (خدا کے قانون) سے روگردانی کی تو تمہاری جگہ وہ دوسری قوم کھڑی کر دے گا۔ پھر وہ لوگ تمہاری طرح نہیں ہوں گے۔

ان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

وما کان ربک لیھلک القریٰ بظلم واھلھا مصلحون۔

ترجمہ:۔ تمہارا رب ظالم نہیں کہ بستیوں کو یوں ہی تباہ کر ڈالے۔ حالاں کہ ان بستیوں کے باشندے نیک اور صالح لوگ ہوں۔

اسی اٹل قانون کو ایک اور جگہ یوں بیان کیا۔

تلک القریٰ اھلکنٰھم لما ظلموا وجعلنا لمھلکھم موعدا

ترجمہ۔ یہ بستیاں جن کے آثار تم دیکھ رہے ہو ان کو ہم نے اس وقت تباہ کیا۔ جب انہوں نے ظلم کیا۔ اور ہم نے ان کے ہلاک ہونے کے لئے ایک وقت مقرر کر دیا۔

اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں پر بھی ابتلا و آزمائش کے کئی دور آئے وہ زوال کی پستیوں میں بار ہا گر کر پھر اٹھنے کی کوشش کرتے رہے ۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ اخلاقی، تمدنی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے ہندی مسلمانوں کے لئے انتہائی تنزل کا دور تھا۔ قوم کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ اعتقاد و عمل کی تمام گمراہیاں افراد پر مسلط تھیں۔ ملت کے سامنے کوئی مقصد یا نصب العین نہیں تھا۔ مختصر یہ کہ انفرادی اور اجتماعی ہر لحاظ سے وہ زمانہ اور رفاتی جڑ پکڑ چکے تھے۔ جو عموماً مرنے والی قوم کے نشانات سمجھے جاتے ہیں۔

مولانا حالی نے اس مرنے والی قوم کا مرثیہ لکھا اور جمود کو توڑنے کے لئے قومی تاریخ کے کارنامے سنائے۔ سابقہ عظمت کی یاد دلائی۔ تنزل اور پستی کا احساس دلایا۔ یہ تشخیص تو صحیح تھی۔ لیکن علاج اور مداوا کے بغیر۔

جب اقبال نے آنکھ کھولی تو اس نے دیکھا کہ (۱) ہندی مسلمانوں کے علاوہ باقی اسلامی دنیا کی حالت بھی یاس انگیز ہے (۲) مغربی تہذیب و تمدن کا زہر مشرقی مسلمانوں کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے (۳) جمود بے حسی اور بے عملی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ (۴) مذہبی عبادات و رسوم بے روح بن کر رہ گئی ہیں۔ (۵) قسطائیت۔ اشتراکیت۔ مادیت اور دہریت کے طوفان مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لے چکے ہیں۔ (۶) اقتصادی۔ سیاسی۔ تمدنی اور معاشرتی لحاظ سے مسلمان انتہائی پستیوں میں گر چکا ہے۔ چنانچہ اقبال مسلمانوں کے تمام ملی اور روحانی امراض کی نہ صرف ماہیت ہی دریافت کرتے ہیں۔ بلکہ علاج کا نسخہ بھی تجویز فرماتے ہیں ان کا پیغام اور تحریک از سرتاپا قرآن پر مبنی ہے۔ اور ان کے فکر کا سرچشمہ قرآن ہی ہے۔ یہ کہنا کہ علامہ کے افکار کی اساس نطشے۔ نٹشے، برگساں، ہیگل کانٹ ڈیکارٹ۔ الگزنڈر۔ میکٹگرٹ یا دوسرے مغربی مفکرین و حکما کے فلسفہ پر ہے غلط ہے۔ البتہ اس سے انکار نہیں کہ علامہ نے مشرقی و مغربی علوم کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ اور دیگر مفکرین کے افکار و تصورات سے بقدر ضرورت استفادہ بھی کیا۔ وہ ہر چند حکیمان فرنگ کے درس سے فیض یاب ہوئے۔ ان کے قلب کا سوز اصحاب نظر کی صحبت کا مرہون منت ہے۔ جس کا اعتراف وہ خود کرتے ہیں۔

دانش افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

اقبال اور قرآن

علامہ مرحوم کے کلام میں بیشتر اصطلاحات تلمیحات شخصیات اور مقامات اسلامی تاریخ صوفیائے کرام کی تصانیف اور قرآن و احادیث سے ماخوذ ہیں۔

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات — در ضمیرش دیدہ ام آب حیات
گوہر دریائے قرآں سفتہ ام — شرح رمز صبغۃ اللہ گفتہ ام

دارم اندر سینہ نور لا الٰہ — در شراب من سرور الا اللہ

فکرِ اقبال کی تعمیر میں قرآن و حدیث کے علاوہ شیخ محی الدین ابن عربیؒ امام غزالیؒ، امام رازیؒ، عارف سنائیؒ۔ فریدالدین عطارؒ اور مولانا رومؒ کے افکار اور فلسفہ و حکمت کا بھی حصہ ہے۔

رومی اور اقبال

اقبال سب سے زیادہ مولانا رومیؒ سے متاثر ہیں وہی ان کے روحانی استاد ہیں۔ چنانچہ رومیؒ سے اپنی عقیدت و ارادت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

باز بر خوانم ز فیض پیر رومؒ — دفتر سربستۂ اسرارِ علوم

جانِ اُو از شعلہ ہا سرمایہ دار — من فروغِ یک نفس مثلِ شرار

پیرِ رومی خاک را اکسیر کرد — از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

موجم و در بحرِ اُو منزل کنم — تا درِ تابندۂ حاصل کنم

من کہ مستی ہا ز صہبائش کنم — زندگانی از نفس ہائش کنم

نکتہ ہا از پیر روم آموختم
خویش را در حرف او واسوختم

دونوں کا منتہا و مقصود ایک ہے۔ دونوں کے افکار و تصورات میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اقبال کو سمجھنے کے لئے رومی کے افکار سے استفادہ بھی ضروری ہے۔ رومی و اقبال میں جو مماثلت پائی جاتی ہے اس کی تشریح و توضیح کے لئے ذیل میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے مقالہ سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

عارف رومی اور علامہ اقبال میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے دونوں اعلا درجے کے شاعر ہیں۔ دونوں اسلامی شاعر ہیں۔ دونوں کی شاعری حکیمانہ ہے۔ دونوں معقولات کے سمندر کے تیراک ہونے کے باوجود وجدانات کو معقولات پر مُرجّح سمجھتے ہیں۔

دونوں خودی کی نفی کے بجائے خودی کی تقویت چاہتے ہیں
دونوں کے نزدیک حقیقی خودی اور حقیقی بے خودی میں کوئی
تضاد نہیں - بلکہ ایک کے بغیر دوسری مہمل اور بے نتیجہ
ہے۔ دونوں کا تخیل تقدیر کے متعلق عام مسئلہ تخیل سے
الگ ہے۔ دونوں کا خیال ہے کہ جزوی طور پر اعمال افراد
پہلے ہی سے خدا کی طرف سے معین اور مقرر نہیں بلکہ
تقدیر آئینِ حیات کا نام ہے۔ دونوں ارتقائی مفکر ہیں
نہ صرف انسان بلکہ تمام موجودات ادنیٰ سے اعلیٰ منازل
کی طرف عروج کر رہے ہیں۔ انسان کے عروج کی کوئی
حد نہیں قوت، آرزو اور جہد صالح کبھی نئی کائناتیں
انسان پہ نہ صرف منکشف ہو سکتی ہیں بلکہ خلق ہو سکتی
ہیں۔ دونوں قرآن کریم کے آدم کو نوعِ انسان کی معراج
کا ایک نصب العینی تخیل سمجھتے ہیں دونوں جد وجہد کو
زندگی اور خفتگی کو موت سمجھتے ہیں۔ دونوں کے نزدیک
بقا مشروط ہے سعی بقا سے۔ دونوں اپنے سے پیشتر
کے افکار سے کما حقہٗ واقف ہیں اور متضاد عناصر کو
ایک بلند تر وحدتِ فکر کی سطح پر لانا چاہتے ہیں اس
طبعی مناسبت کی وجہ سے اقبال اپنے آپ کو عارف
رومی کا مرید سمجھتا ہے۔ یہ مرید معمولی تقلیدی مرید نہیں
کمال عقیدت کے ساتھ پیر کے رنگ میں رنگا ہوا
مرید ہے۔ لیکن آزاد! حقیقت یہ ہے کہ عارف رومی
کا صحیح خلیفہ چھ سو برس کے بعد پیدا ہوا جب
تک دنیا میں مثنوی معنوی پڑھنے والے اور اس سے سوچوں

میں سوز و گداز پیدا کرنے والے باقی رہیں گے
تب تک اقبال کا کلام بھی اس کے ساتھ پڑھا جائیگا اور
روحانی لذت اور زندگی پیدا کرتا رہے گا۔

مختصر یہ کہ اقبال نے مسلمانوں کے سامنے قرآن کے اسرار و رموز پیش کیے ان کے روحانی امراض کا مداوا اسی سے ڈھونڈا۔ رمز لا الٰہ سے آگاہ کیا۔ وراثتِ ارض کے اصول بتائے۔ نیابت الٰہی کا مفہوم سمجھایا۔ حیات و مرگ کی حقیقت کو آشکارا کیا۔ اَنْتُمُ الاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْن کی تفسیر پیش کی۔ پیام مشرق کے دیباچہ میں اپنے خیالات کی اصل بنیاد ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیئے۔ کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنی فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدِ نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید و تولید ہو قابل احترام ہے۔

اقبال نے اپنا پیغام شعر و نغمہ کے ذریعہ پہنچایا۔ یہ طریق یقیناً مؤثر اور دلکش ہے۔ اقبال کا منتہائے مقصود مریض قوم اور انسانیت کی اصلاح ہے۔ یہ سازِ سخن تو محض بہانہ تھا۔

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست

سوئے قطارمے کشم ناقۂ بے زمام مرا

اب میں اقبال کے ان چند بنیادی تصورات کا ذکر کروں گا جن کی اساس فرقان حکیم پر ہے۔

عقیدہ توحید اسلام میں سب سے بڑا بنیادی عقیدہ خدا پر ایمان لانا ہے۔ بنی نوع انسان کے لئے فلاح و نجات کا یہ ایک اہم پیغام تھا۔ جیسے قرآن نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے الفاظ میں دیا۔ لا کا سلبی پہلو یہ ہے۔ کہ خود ساختہ معبودوں۔ آقاؤں۔ حکمرانوں اور مالکوں کو قبلہ حاجات نہ سمجھا جائے۔ اور ایجابی پہلو یہ ہے۔ کہ صرف معبودِ حقیقی کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جائے۔ آج کل کے اکثر مسلمان کلمہ توحید تصدیق قلب کے بغیر ہی پڑھتے ہیں اور دل کو صنم خانہ بنا رکھا ہے۔ مختلف معبودوں کے علاوہ اولاد، زر، زمین اور زن بھی متعدد بت ہیں۔ جن کی پرستش میں ہم شب و روز مشغول ہیں۔

خوفِ دنیا۔ خوفِ عقبیٰ۔ خوف جاں خوف آلام زمین و آسماں
حُبِ مال و دولت و حُبِ وطن حُبِ خویش و اقربا و حُبِ زن
تا عصائے لا الٰہ داری بدست ہر طلسم خوف را خواہی شکست

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کے وجود کی اس مختصر مملکت پر لا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا صحیح معنوں میں غلبہ ہو جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا ہر قول، فعل اور عمل اللہ کے لئے نہ ہو۔ جو شخص محض زبانی ہمارے سامنے خدا کے وجود سے انکار کر دے۔ ہم اس پر پل پڑتے ہیں۔ اس کو کشتنی سوختنی اور گردن زدنی قرار دیتے ہیں۔ خواہ عملاً وہ ہم سے بہتر ہی کیوں نہ ہو۔ خود اپنے اعمال کا یہ حال ہے کہ ہر لمحہ خفیہ یا علانیہ مختلف گناہوں کے مرتکب ہو کر عملی طور پر خدا کے وجود سے انکار کرتے رہتے ہیں۔ اور زبان سے کلمہ توحید کا اعادہ۔ حقیقت یہ ہے کہ عقیدۂ توحید ہم کو کئی ایک بے حیائیوں سے بچاتا ہے۔ عزت نفس اور خودداری کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اقبال نے مسلمانوں کو اسی رمز لا الٰہ سے آگاہ

کیا ہے ۔ کیونکہ ان کے مختلف امراض میں سے ایک مہلک مرض یہ بھی تھا جس نے مسلمانوں کو پست ہمت کرکے صراطِ مستقیم سے بھٹکا دیا ۔

تہا دِ زندگی میں ابتدا لا انتہا الا ! | پیام موت ہے جب لا ہوا الا سے بیگانہ
وہ ملت روح جس کی لا سے آگے بڑھ نہیں سکتی | یقیں جانو ہوا لبریز اس ملت کا پیمانہ

عقیدہ توحید کا اثر انسانی زندگی پر یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کے سامنے سر نہیں جھکاتا ۔

پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست

فلسفۂ خودی

علامہ اقبال کے بنیادی تصورات میں خودی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ یہ لفظ انہوں نے غرور، نخوت، تکبر یا سرکشی کے معنوں میں استعمال نہیں کیا ۔ بلکہ یہ اصطلاح شعورِ ذات، خود اعتمادی، احساس انفرادیت ۔ معرفت نفس، خود شناسی یا استحکام ذات کے معنوں میں استعمال کی گئی ہے ۔

فلسفۂ خودی کو سمجھنے سے پہلے اس بات کو ذہن نشین کر لیا جائے ۔ کہ علامہ اقبال افراد و اقوام میں ایک انسانی سیرت کی تجدید و تولید چاہتے ہیں اخلاق حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ کے ذریعے انسان کو بقائے دوام کا تاج پہنانا چاہتے ہیں ۔ جمود بے عملی ۔ بے حسی ۔ ذہنی تعطل اور دماغی تعیش کا استیصال چاہتے ہیں ۔ اقبال کے نزدیک خودی انسان کا کوئی پہلو نہیں ۔ بلکہ یہ ایک روحانی یا نفسانی چیز ہے ۔ کشمکشِ حیات اور تنازع للبقا میں یہی روحانی خودی معیار زندگی ہے جو ہر ذی حیات میں موجود ہے ۔ یہی بقائے اصلح کا ایک ذریعہ ہے افراد کی طرح یہ خودی اقوام میں بھی پائی جاتی ہے ۔ قومی خودی کے آگے انسانیت میں بھی ایک خودی ہوتی ہے اور پھر کائنات کی بھی ایک خودی ہے اور یہی کائنات کی اصل و بنیاد ہے ۔ مذہب کی اصطلاح میں اس کا نام خدا ہے چنانچہ

اقبال نے اسی لئے کہا ہے۔

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبت آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

یعنی تمام چیزوں سے بے نیاز ہو کر پہلے خودی کی تلاش کرے۔ خدا مل جائے گا اس کے بغیر خدا کا ملنا دشوار رہے۔ کائنات کی ہر ایک چیز خودی ہی کے زور سے قائم ہے۔ خودی نہ ہو تو یہ عالم درہم برہم ہو جائے۔ قطرہ کو دیکھئے۔ خودی کے زور سے گوہر بن جاتا ہے۔ پہاڑ خودی کو چھوڑ دے۔ تو صحرا یا دست بن جائے موج جب تک خودی کے زور سے سمندر کے پہلو میں موج بن کر رہے وہ سمندر کے کاندھے پر سوار رہے گی۔ سبزہ زورِ خودی سے سینہ گلشن چیر کر نکل آتا ہے۔ شمع کی تعمیر چند ذرات سے ہوتی ہے۔ جن کو خودی نے جکڑ رکھا ہے۔ لیکن جب اس نے خود گذاری اپنا پیشہ بنالیا تو اپنے وجود سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ آنسوؤں کی مانند اپنی ہی آنکھ سے ٹپک کر رہ گئی۔

خودی یا انانیت اپنا الگ ایک وجود رکھتی ہے۔ یہ وجود عمل سے پائدار اور لازوال بنایا جا سکتا ہے۔ یہی انا فطرتِ انسانی کی منتشر قوتوں کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد خودی مکان و زمان کی حدود و قیود و سے بھی گذر جاتی ہے۔ خودی کی تکمیل و تربیت اور استحکام سے انسانیت انتہائی بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ پھر عالم انسانیت میں مرد کامل یا فوق البشر کا ظہور ہوتا ہے۔ یہی اقبال کا مقصود و مدعا ہے۔

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشت خاک میں پیدا ہو آتش ہمہ سوز
یہی ہے سرِ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانی شب و روز

خودی کے بغیر عبادت بے معنی ہے۔ ذکرِ نیم شبی، مراقبہ اور عبادت

اگر خودی کو نہ بچا سکیں تو بیکار ہیں۔

یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور
تری خودی کے نگہبان نہیں تو کچھ بھی نہیں

خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا
وہی ہے مملکتِ صبح و شام سے آگاہ

وہی نگاہ کے ناخوب و خوب سے محرم
وہی ہے دل کے حلال و حرام سے آگاہ

حیاتِ خودی مقاصد کی تخلیق سے برقرار رہ سکتی ہے۔ اس کی تابندگی کا دار و مدار شعاعِ آرزو پر ہے۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است!
اصل او در آرزو پوشیدہ است

آرزو را در دلِ خود زندہ دار
تا نہ گردد مشتِ خاکِ تو مزار

زندگی کے بقا اور قیام کے لئے جستجو اور تلاش بڑی اہمیت رکھتی ہے اس لئے زندگی کی بنیاد ہی آرزو پر رکھی گئی ہے۔ کسی نہ کسی آرزو کو دل میں برقرار رکھا جائے ورنہ یہ جسم مزار بن کر رہ جائے گا۔ آرزو کے ذریعہ ہی تمام مقاصد کو شکار کیا جا سکتا ہے۔ اور انہیں سے ہمارے تمام اعمال اور افعال کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ دل میں نئے نئے مقاصد پیدا ہوتے ہیں۔ تو ہماری زندگی برقرار رہ سکتی ہے۔ اس کی آب و تاب کا انحصار شعاعِ آرزو پر ہے۔ بے مقصد و آرزو، زندگی موت کے مترادف ہے۔ اقبال کے نزدیک انسانی خودی کا استحکام چھ چیزوں سے ہو سکتا ہے (۱) محبت (۲) فقر (۳) شجاعت و ہمت (۴) تحمل (۵) کسبِ حلال (۶) قوتِ تخلیق۔

جس طرح کسی جاندار کو بقائے وجود کے لئے ہر قسم کے جراثیم یا مہلک امراض سے بچنا ضروری ہے۔ اسی طرح حیاتِ خودی کو بھی بعض مضر چیزوں سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً (۱) خوف (۲) سوال (۳) غلامی (۴) نسب پرستی۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے خودی کمزور ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ ارتقائی سلسلہ میں خودی کو تین حالتوں سے گذرنا پڑتا ہے (۱) اطاعت (قانونِ حیات کی پابندی) اور ضبطِ نفس۔ (نفسانی خواہشات و

جذبات پر غالب آنا۔ (۳) نیابت الٰہی (انسانیت کا اوجِ کمال)

افراد سے جماعتیں اور اقوام بنتی ہیں۔ اس لئے جب تک افراد کے اندر یہ خوبیاں پیدا نہ ہوں۔ اقوام کی حالت بہتر نہیں ہو سکتی۔ اعلےٰ جماعت یا قوم کے لئے علامہ اقبال نے آٹھ خصائص کو بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ اول۔ توحید دوم نبوت اور رسالت پر ایمان۔ سوم کتاب و سنت کی رہنمائی۔ چہارم مرکزیت، پنجم نصب العین ملی۔ ششم غلبہ و استیلا یا قوت تسخیر، ہفتم اجتماعی خودی۔ ہشتم حفظ و احترام امومت۔

اقبال کا تیسرا بنیادی تصور اتحادِ عالمِ اسلام ہے۔ اور پھر اس کے ذریعہ اتحادِ انسانیت۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے قومیت و وطنیت کی سخت مخالفت کی ہے۔

نیشنلزم کی مختصر تاریخ

بنی نوعِ انسان کی ابتدائی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ یہ باہمی آویزشوں، خانہ جنگیوں اور خوں ریزیوں کا ایک لامتناعی سلسلہ ہے صدیوں تک انسان خاندان، نسب، قبیلہ، اور مقام و وطن کے جنون میں مبتلا رہا۔ ان مختلف تنگ دائروں کے اندر پھنس کر قتل و غارت کا بازار گرم کرتا رہا۔ عہدِ وسطیٰ میں فیوڈل سسٹم یعنی جاگیردارانہ نظام اور تمدن و تہذیب دست و گریباں ہوتے رہے بالآخر اس نظام کی اندرونی خرابی۔ عوام کی بے اطمینانی اور بدحالی ہی اس کے کفن کا تار و پود بن گئیں۔ اور فیوڈل سسٹم کی جگہ قرونِ وسطیٰ کے آخر میں نیشنلزم نے لے لی۔ دنیا جب مختلف گروہوں اور حصوں میں بٹ گئی تو حبِ وطن کا جذبہ اس قدر پھوٹ پڑا کہ مختلف ممالک اپنے مفاد۔ اغراض اور تحفظ کی خاطر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہونے لگے۔ آہستہ آہستہ تحفظ کے جذبہ کی جگہ تعصب نے لے لی۔ فرانس اس نیشنلزم کی تحریک میں پیش پیش تھا یورپ کے دوسرے ممالک بھی اس تحریک میں کسی طرح پیچھے نہ تھے۔

فرانس کے نیشنلزم کا عروج جون آف آرک (۱۴۲۹-۱۴۳۱ء) کے ظہور کا زمانہ تھا ۔ مختصر یہ کہ یہی جذبہ اس حد تک ابھرا کہ قومی عصبیت کے نعرے بلند ہونے لگے ۔ چنانچہ قرونِ وسطیٰ کی تمام جنگیں اسی نیشنلزم کے نام پر لڑی گئیں اور کروڑوں جانیں تلف ہوئیں ۱۵۳۱ء میں اطالوی مصنف اور سیاستدان میکیاولی نے سیاست اور مذہب میں تفریق پیدا کی ۔ اور ریاست کے مفاد کو مذہب اور اخلاق پر فوقیت اور ترجیح دینے کا پرچار کیا ۔ یہ شخص فلورنس کا رہنے والا تھا ۔ اور مدتوں حکومت کے مختلف عہدوں پر سرفراز رہا "پرنس" اس کی مشہور تصنیف ہے ۔ میکیاولی کی تعلیمات کو اس عہد کے خیالات و جذبات کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے ۔ اس کی تعلیم کا اثر سولھویں، سترہویں، اٹھارویں بلکہ انیسویں صدی تک رہا ۔ قومیت اور وطنیت کے نام پر لاکھوں انسانوں نے جانیں قربان کردیں ۔ کروڑوں بے گناہ بندگانِ خدا کا خون بہایا گیا ۔ ان تین چار صدیوں میں نیشنلزم کے علمبردار کبھی تو آلیور کرامویل جیسے مستبد حاکم اور کبھی پیٹرک اعظم فریڈرک اعظم اور نپولین جیسے حاکمِ مطلق رہے ۔ کبھی یہی نیشنلزم آمریت اور جمہوریت کا لباس پہن کر نمودار ہوتی رہی ۔

نیشنلزم کے نتائج

تاریخ کا ایک مبتدی بھی اس حقیقت کو بخوبی سمجھ سکتا ہے ۔ کہ نیشنلزم نے بنی نوعِ انسان کو کس قدر نقصان پہنچایا ۔ ایک ملک نے دوسرے ملک کو ہڑپ کرنے کی کوشش کی ۔ بڑی بڑی طاقتور حکومتوں نے چھوٹی چھوٹی کمزور سلطنتوں کو سمیٹ لینا چاہا باہمی پیکار اور کشمکش کے دروازے کھل گئے ۔ چھوٹی چھوٹی جنگوں کو چھوڑ کر ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم اور ۱۹۳۹ء کی دوسری عالمگیر جنگ کے نتائج دیکھ لیجئے ۔ مہذب انسان کی درندگی ۔ وحشت اور بربریت اپنی انتہا کو پہنچ گئی کروڑوں جانیں تلف ہوئیں ۔ بستیوں کی بستیاں راکھ کا ڈھیر بن گئیں ۔ لاکھوں گھر نذرِ آتش ہوئے ۔ کروڑوں انسان خانماں برباد ہوئے لاتعداد بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں

کی زندگیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تلخ ہو کر رہ گئیں۔ تجارت پیداوار اور صنعت کو سخت نقصان پہنچا۔ قحط۔ گرانی۔ عزبت۔ افلاس نادار ی اور فلاکت ان سب پر مستزاد!

نیشنلزم کے نام پر اس ہلاکت اور بربادی کو دیکھ کر دنیا کے بڑے بڑے سیاستدان، مفکرین اور حکما چونک اٹھے۔ صلح و آشتی اور وحدت انسانی کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ اقبال کا مسلک بھی وحدتِ انسانی ہے۔ وہ منتشر افراد اور اقوام کو ایک مرکز پہ لانا چاہتا ہے۔ انسانوں میں اخلاقِ حمیدہ اور صفات پسندیدہ دیکھنے کا متمنی ہے اور پھر توحید کے اثر سے ان بکھرے ہوئے انسانوں کو شیرازہ بندی کی دعوت دیتا ہے۔ اقبالؒ کے اس درس کی بنیاد یکسر اسلامی تعلیمات پر ہے۔ اسلام کسی قومیت کا قائل نہیں۔ خود اسلامی قومیت ایک ایسا وسیع دائرہ ہے۔ جس میں دنیا کے ہر گوشے کے مسلمان سما جاتے ہیں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل سطور اقبال کے انہی خیالات و جذبات کی آئینہ دار ہیں۔

اقبال اور قومیت

جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسانوں کی اخلاقی اصلاح کا داعی نہیں۔ بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے۔ جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے! تاریخ ادیان اس بات کی شاہد عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں دین قومی تھا۔ جیسے مصریوں اور یونانیوں کا بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے جس سے بدبخت یورپ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ دین چونکہ پرائیویٹ مقاصد کا نام ہے اس واسطے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف سٹیٹ ہے۔

یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوعِ انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی۔ نہ انفرادی اور پرائیویٹ، بلکہ خالصتہً اسلامی ہے

اور اس کا مقصد باوجود فطری امتیازات کے بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل قوم اور نسل پر مبنی نہیں کیا جا سکتا۔ نہ اس کو برابر ہو کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جا سکتا ہے صرف یہی ایک طریق ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ جو ایک امت کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے کیا خوب کہا ہے مولانا رومی نے، ہم دلی از ہم زبانی بہتر است۔

اقبال اور وطنیت

میں نظریۂ وطنیت کی تردید اس زمانے سے کر رہا ہوں جبکہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا۔ مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی میں یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی۔ کہ یورپ کی ملحدانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریۂ وطنیت کی اشاعت کی جائے چنانچہ ان لوگوں کی تدبیر جنگ عظیم میں کامیاب ہو گئی۔ یہ کہ اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے چلے آئے ہیں کیونکہ سب کرۂ ارض کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے علیٰ ہذا القیاس چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ وطن کا لفظ محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ اس کے حدود آج کچھ ہیں۔ اور کل کچھ۔ کل تک اہل برما ہندوستانی تھے اور آج برمی ہیں۔ ان معنوں میں انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جس کی پرورش کے لیے اثرات کی کچھ ضرورت نہیں مگر زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن

ایک اصول ہے، ہئیت اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔

مفکرین اور حکماء کی رائیں

قومیت اور وطنیت کی آگ کے شعلوں کو اب ٹھنڈا کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ اس کی ہلاکت کو دیکھ کر دنیا امن اور سکون کی متلاشی ہے ایسا نظام یقیناً زیادہ عرصہ نہیں چل سکتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مشرق و مغرب کے تمام بڑے بڑے مفکرین اقبال کے ہمنوا ہیں۔ مسٹر جان ایس ہائی لینڈ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

> تہذیب و تمدن کی بقا کی خاطر نیشنلزم کا دبا دینا از بس ضروری ہے۔ حب الوطنی ہی کافی نہیں بلکہ ہمیں عالمگیر اخوت اور عالمگیر قومیت کا جذبہ پیدا کرنا چاہیئے۔
>
> نیشنلزم کا نتیجہ ہمیشہ باہمی پیکار و منافقت اور تباہی و بربادی ہوگا۔ انسان ایک دوسرے سے اسطرح مربوط ہیں۔ کہ اگر اس کا تدارک نہ کیا گیا۔ تو بالآخر ساری دنیا اس نیشنلزم کے شعلوں کی لپیٹ میں آکر بھسم ہو جائے گی۔

مسٹر ایچ۔ جی ویلز اپنی مشہور کتاب THE NEW WORLD ORDER (دنیا کا نظام نو) میں رقمطراز ہیں۔

> زمان و مکان کی حدود و قیود نے انسانوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے جب تک یہ تنگ نگاہی اور مادی منافع چھوڑے نہیں جاتے انسان کا ایک مرکز پر اکٹھے ہونا محال ہے۔ عالمگیر سوشلزم کے قیام کی اشد ضرورت ہے۔ مذہب نسل، رنگ اور وطن کے امتیاز کے بغیر سب انسانوں کے حقوق مساوی ہونے چاہئیں۔

برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر ارنسٹ بیون نے اتحادی اقوام کے نمائندوں سے کہا

میں یقین رکھتا ہوں کہ اپنی زندگی میں دنیا بھر کو ایک ہی حکومت
کے ماتحت دیکھ لوں گا۔ سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ملکی
حد بندی فضول نظر آنے لگے گی۔ اس نے ہمیں مجبور کر دیا ہے
کہ ہم شاعروں اور پیغمبروں کے اس نظریہ پر عمل پیرا ہوں جسے
انسانی جمہوریت اور اتحاد کہا جاتا ہے۔

اس قدر تلخ تجربوں کے بعد بھی اب انسان اگر قومیت اور وطنیت کے تنگ دائروں میں پھنسا رہے تو یہ محض اس کی جہالت ہوگی۔ اگلی ارتقائی منازل کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا کسی طرح بھی بنی نوع انسان کے لئے سود مند نہیں ہو سکتا۔ قدرتی طور پر انسان جن کڑیوں سے گذر چکا ہے۔ ان سے اس کو محبت ضرور ہوتی ہے۔ قبیلہ یا خاندان سے لگاؤ کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ کہ ماں یا باپ کی محبت میں کمی ہوگئی۔ اسی طرح انسانیت کے دائرہ میں آنے کا نتیجہ یہ نہیں ہو سکتا کہ وطن کی کشش اور محبت جاتی رہے۔ بقول اقبالؒ واقعی یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ مگر اس کی پرستش بھی تو جائز نہیں۔ اقبالؒ کو وطن سے محبت ضرور ہے۔ مگر وہ وطنیت کے تعصب سے بیزار ہے۔ اس کی پرستش کو بت پرستی کے مترادف سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک دین اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

وطن کا تعصب اقبالؒ کے نزدیک لعنت ہے جو اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔ کیونکہ اسلامی قومیت کی بنیاد کلمہ توحید پر ہے۔ نسب، خاندان قبیلہ اور وطن محض حوالہ و تعارف کے لئے ہیں۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے تو اس سے — قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے — ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے — غارت گر کاشانۂ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

موت وحیات

کوئی فرد ہو یا قوم جس کسی کو بھی موت کا ڈر لاحق رہے اسے عزت اور اطمینان کی زندگی نصیب نہیں ہو سکتی۔ دنیا میں بڑے کام ان لوگوں نے انجام دیئے۔ جو موت سے نہ ڈرے۔ بزدل کے اعصاب پر موت ہر وقت مسلط رہتی ہے چنانچہ تجربہ شاہد ہے کہ بزدل ہمیشہ پست ہمت اور ذلیل ہوا کرتے ہیں۔ یہی حال موت سے ڈرنے والی قوم کا ہے۔ اس خطرناک مرض میں مبتلا ہونے کے سبب وہ قوم حمیت وغیرت، وقار وہیبت اور آزادی و استقلال کو کھو کر پستی اور ذلت کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اقبالؒ کو اپنی بیمار قوم میں یہ مہلک مرض بھی نظر آیا۔ چنانچہ اس نے حیات وممات کا فلسفہ سمجھایا۔ اقبال کے نزدیک جس چیز کو موت سمجھ لیا گیا۔ وہ دراصل بلند مرتبہ تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ زندگی ایک مسلسل چیز ہے جسے موت کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

خوگر پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں — موت اس گلشن میں جز سنجیدن پر کچھ نہیں

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات / عام اس کو یوں نہ کر دیتا نظامِ کائنات
موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے / خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں / آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں
زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں / ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

افراد میں جاں نثاری سرفروشی اور قربانی کا جذبہ ہو تو وہ قوم جس کے یہ افراد ہوں موت کے ہاتھوں مٹ نہیں سکتی۔ بلکہ سربلند و سرفراز ہوتی ہے اقبالؒ کے نزدیک ساری داستانِ حرم یہ ہے کہ ابتداء اسماعیل علیہ السلام کی قربانی سے ہوئی اور انتہا امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر فرماتے ہیں۔

ع
غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم!
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسماعیلؑ

ملت اسلامیہ کے درخت کی آبیاری بہادروں، شہیدوں اور سرفروشوں کے خون سے ہوتی چلی آئی ہے۔ اسلامی تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھئے کہ مسلمان کئی بار باطل سے ٹکرائے لیکن دبے نہیں۔ بلکہ ہر بار ابھرے۔ اقبال اس حقیقت کا اظہار انتہائی فخر و ناز سے ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم / سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا
تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں / خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

مولانا رومؒ نے بھی فلسفۂ موت کو بڑے لطیف انداز میں سمجھایا ہے فرماتے ہیں کہ اے انسان جب تو عالمِ وجود میں آیا۔ تو عناصرِ اربعہ میں سے کوئی چیز تھا یا ان سب کا مرکب۔ اگر تو اسی پہلی حالت پر ہی رہتا۔ تو یہ ارتقائی منازل کیسے طے ہوتیں۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے پہلے وجود یعنی جمادات کی بجائے نباتات اور نباتات سے حیوانات کا وجود عطا ہوا۔ پھر حیوان سے انسان کے درجہ تک پہنچا۔ یہ بقا فنا ہی سے حاصل ہوئی۔ پھر فنا سے ڈرنے کا فائدہ؟ پہلی فنا کی حالتوں نے جوہرِ انساں کو کون سا ضرر پہنچایا جو موت سے

ڈر کر جسمانی زندگی سے چمٹے رہیں۔ ابتدائے آفرینش سے کرات تک انسان نے لاکھوں حشر دیکھے لیکن باوجود اس کے ترقی کرتا چلا گیا۔ تو پھر محض بقائے جسم کی خاطر یہ پریشانی اور خوف کیوں ہو۔ اب مرشد رومی کے چند اشعار سنیئے۔

تو از آں روزے کہ در ہست آمدی — آتشے یا خاک یا بادے بُدی
گر بداں حالت ترا بودے بقا — کے رسیدے مر ترا ایں ارتقا
از مُبدّل ہستی اول نماند — ہستی دیگر بجائے او نشاند
ایں بقا ہا از فنا ہا یافتی — از فنایش رو چرا بر تافتی
صد ہزاراں حشر دیدی اے عنود — تاکنوں در لحظہ از بدو وجود
در فنا ہا ایں بقا ہا دیدۂ — بر بقائے جسم چوں چسپیدۂ

مختصر یہ کہ جس دن مسلمانوں نے موت کا ڈر دل و دماغ سے نکال دیا وہ عروج و کمال کی بلند ترین چوٹی تک پہنچ جائیں گے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہمیں اقبالؒ کے پیام کو سمجھنا از بس ضروری ہے۔

عقل و عشق

کلام اقبال میں عقل و عشق کا تصور بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ عقل نام ہے مادی اشیاء کی حقیقت کے ادراک کرنے والی قوت کا۔ مصلحت اندیشی اور احتیاط اس کے ضروری اوصاف سمجھے جاتے ہیں۔ یہ مکان و زمان کی قیود کی پابند ہے۔ اس کے پاس مظاہر کے علم یا خبر کے سوا اور کچھ نہیں (علم یا خبر کا دارومدار حواس پر ہے) اس کی منزل مقصود ہستی مطلق کی معرفت ہے۔ یہ اکثر اسباب و علل کے لامتناہی سلسلہ میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ اور حقیقت کے عقدہ کو حل کرنے سے قاصر ہے یہی وجہ ہے کہ اقبال ہمیں یہ درس دیتا ہے۔

خرد زنجیری امروز و دوش است — پرستار بتانِ چشم و گوش است
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور — چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے
خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں — ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

عقل را سرمایہ از بیم و شک است　　　　عشق را عزم و یقیں لا ینفک است

عشق نام ہے والہانہ جذبہ کا ۔ یہ ایک وجدانی کیفیت ہے ۔ جس کا خاصہ مستی انہماک اور جذب کلی ہے ۔ عشق و محبت کا یہ جذبہ انسانی جبلت میں ودیعت کیا گیا ہے ۔ اس سے انسانی ذہن زمان و مکان کی قیود اور زنجیروں سے آزاد ہو جاتا ہے ۔ عشق کا انحصار پیہم آرزو پہ ہے ۔ دل کی دنیا اس سے آباد ہے ۔ اقبال کے نزدیک عشق بوالہوسی نہیں بلکہ زندگی کے لیے محرک عمل ہے ۔ اس جذبہ سے تسخیر فطرت کا کام بھی لیا جا سکتا ہے ۔ اسکے ذریعہ انسان کی نظر بلند ہو جاتی ہے ۔ عشق ہی کائنات کی بارونق ہے عشق نہ ہو تو یہ سارا سلسلہ درہم برہم ہو جائے ۔ عشق زندگی کی تخلیقی قوت ہے ۔

اقبال عقل کا مخالف نہیں ۔ لیکن وہ محض عقل پر ہی تکیہ کرنا درست نہیں سمجھتا ۔ عشق کو عقل پر ترجیح دیتا ہے ۔ اس کے نزدیک عشق و عقل کے امتزاج سے انسانی اعمال کی رہنمائی کی جا سکتی ہے ۔ عشق اور عقل دونوں منزل مقصود کی طرف رہنمائی کرتے ہیں ۔ لیکن دونوں کے راستے الگ الگ ہیں ۔ عقل افتاں و خیزاں کسی حیلے سے منزل تک پہنچاتی ہے لیکن عشق منزل مقصود کی طرف تیز گامی سے لے جاتا ہے ۔

ہر دو بہ منزلے رواں ہر دو امیر کارواں
عقل بہ حیلہ مے برد عشق برد کشاں کشاں

خرد سے راہرو روشن بصر ہے　　　　خرد کیا ہے چراغ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا ؟　　　　چراغ رہگذر کو کیا خبر ہے

مندرجہ ذیل نظم کے مطالعہ سے اقبال کے اس تصور کی وضاحت ہو جائیگی

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن

بندۂ تخمین و ظن کرمِ کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور۔ علم سراپا حجاب
عشق کی گرمی سے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفات عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات عشق حیات و ممات
علم سے پیدا سوال۔ عشق ہے پنہاں جواب
عشق کے ہیں معجزات سلطنت فقر و دیں
عشق کے ادنےٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں، عشق زمان و زمیں
عشق سراپا یقیں اور یقیں فتحِ باب
شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال۔ لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب عشق ہے ام الکتاب

افکار اقبال

اقتباس از اسرار خودی

اس بیان میں کہ خودی عشق و محبت سے مستحکم ہوتی ہے

صفحہ ۱۹۵

۱۔ خودی:۔ معرفت نفس۔ خود شناسی شرار:۔ شرارہ۔ آگ کی اڑنے والی چنگاری۔ فارسی میں واحد کیلئے آتا ہے

ترجمہ:۔ وہ نقطہ نوری کہ جس کا نام خودی ہے ہماری خاک (یعنی جسم) کے نیچے (ایک) زندگی کی چنگاری ہے۔

تشریح:۔ فرماتے ہیں کہ خودی اپنی اصل کے لحاظ سے ایک نقطۂ نوری ہے جو ہمارے وجود میں ایک چنگاری کی مانند پوشیدہ ہے۔ خودی سے ہماری زندگی قائم ہے۔ خودی کے بغیر ہم کچھ بھی نہیں ہیں۔

۲۔ پائندہ۔ قائم رہنے والی۔ قائم سوزندہ۔ جلانے والی
استوار۔ تابندہ۔ چمکنے والی۔ روشن

ترجمہ:۔ (خودی) محبت ہی سے زیادہ مستحکم ہوتی ہے اسی سے یعنی محبت سے وہ دیر تک زندہ رہنے والی، زیادہ جلانے والی اور زیادہ روشن ہوتی ہے۔

تشریح:۔ فرماتے ہیں عشق ہی وہ جذبہ ہے جس سے خودی مستحکم ہوتی ہے عشق خودی کو ایک زندہ حقیقت بنا دیتا ہے عشق کی آگ میں جل کر خودی کو وہ بے پناہ قوت حاصل ہوتی ہے جس سے وہ دنیا میں ہر طرف اجالا کر دیتی ہے۔

۳۔ اشتعال۔ روشن ہونا۔ بھڑکنا مروارید۔ موتی۔ قیمتی پتھر
جوہر (۱)۔ گوہر کا معرب (۲)۔ نچوڑ۔ ست
(۳)۔ روح۔

ارتقا۔ نشو و نما۔ ترقی کرنا۔ — ۴۔ وہ چیز جو بذاتِ خود قائم ہو۔ عرض کے خلاف جس کا قیام جوہر کے وسیلے سے ہوتا ہے جیسے لوح اور نقش میں لوح جوہر اور نقش عرض ہے کپڑا اور رنگ میں کپڑا جوہر ہے اور رنگ عرض ہے

مضمر۔ پوشیدہ، پنہاں۔ دل میں رکھی ہوئی بات

ممکنات۔ ممکن کی جمع وہ باتیں جنکا ہونا ممکن ہو۔

ترجمہ :۔ محبت سے اس کا جوہر روشن ہوتا ہے اور اس کی پوشیدہ ممکنات (یعنی مخفی صلاحیتوں) کی نشو و نما ہوتی ہے۔

تشریح :۔ فرماتے ہیں کہ جب انسانی خودی میں محبت کی آگ بھڑکتی ہے تو اسس سے اس جوہر کو ایک چمک حاصل ہوتی ہے عشق ہی خودی کی مخفی استعدادوں کی نشو و نما کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کی خودی میں بے پناہ ترقی کی استعداد پنہاں رکھی ہے لیکن یہ قوتیں عشق کے بغیر اجاگر نہیں ہو سکتیں جسطرح آگ سونے کو کندن بنا دیتی ہے اسی طرح عشق خودی کی مخفی قوتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔

۴۔ اندوزد۔ جمع کرتی ہے۔ — عالم افروزی۔ دنیا کو روشن کرنا۔

ترجمہ :۔ اس کی فطرت عشق سے آگ جمع کرتی ہے اور عشق ہی سے وہ دنیا کو روشن کرنا سیکھتی ہے۔

تشریح :۔ اللہ تعالیٰ نے خودی کی فطرت کچھ اس طرح بنائی ہے کہ وہ عشق سے مستحکم ہو سکتی ہے۔ عشق ہی وہ ذریعہ ہے جس سے خودی کو استحکام حاصل ہوتا ہے اسی لئے وہ عشق سے قوت حاصل کرتی ہے اور عشق کے ذریعے دنیا میں بڑے بڑے کام انجام دے کر دنیا کو روشن کر سکتی ہے

۵۔ باک :۔ خوف

ترجمہ :۔ عشق کو تلوار اور خنجر کا ڈر نہیں ہے۔ عشق کی اصل پانی، ہوا اور مٹی سے نہیں ہے۔

تشریح :۔ علامہ فرماتے ہیں کہ عشق کوئی مادی شے نہیں ہے۔ جو عناصر سے وجود میں آئی ہو۔ وہ تو ایک ابدی اور غیر فانی جوہر ہے جسے کوئی فنا نہیں کر سکتا۔ اسی لئے عاشق صادق کبھی موت سے نہیں ڈرتے وہ سمجھتے ہیں کہ موت صرف مادی چیزوں کو فنا کر سکتی ہے لیکن عشق کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتی۔

۶۔ پیکار۔ جنگ۔ لڑائی۔ معرکہ آبِ حیوان۔ آبِ حیات

ترجمہ :۔ دنیا میں عشق کے سبب (عاشق) کی جنگ بھی ہے اور صلح بھی عشق آبِ حیات بھی ہے جوہر دار تلوار بھی۔

تشریح :۔ فرماتے ہیں کہ عاشق کی صلح و جنگ کا دار و مدار صرف عشق پر ہے وہ صرف ان لوگوں سے صلح رکھتا ہے جو اسکے معشوق کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں مسلمان صرف ان لوگوں کے ساتھ صلح رکھتا ہے۔ جو خدا کے پرستار ہیں اور خدا سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اس کے معشوق یعنی خدا کے دشمن ہیں ان سے جنگ کرنا وہ فرض منصبی سمجھتا ہے۔ اسی لئے وہ کفار سے ہمیشہ آمادہ جنگ رہتا ہے۔

۷۔ خارا۔ سخت پتھر، ایک قسم کا سادہ اور لکیردار ریشمی کپڑا جو سورج کے سامنے رکھنے سے پھٹ جاتا ہے جیسے کتان کپڑا چاند کے سامنے پھٹ جاتا ہے۔ شق ہو دن۔ چیر جانا، شگاف پڑ جانا پھٹ جانا۔

ترجمہ :۔ عشق کی ایک نظر سے سخت پتھر میں بھی شگاف پڑ جاتا ہے اور عشقِ الٰہی کے سبب (عاشق) سراپا حق بن جاتا ہے۔

تشریح :۔ فرماتے ہیں کہ عشق بے پناہ قوت کا مالک ہے۔ وہ پتھر میں شگاف ڈال سکتا ہے۔ وہ بے حس انسان کو اپنی محبت سے متاثر کر دیتا ہے فنا فی العشق ہو جیسے عاشق میں معشوق کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں جس

طرح سے لوہا آگ میں جلنے سے آگ جیسی سرخی اور جلانے کی خصوصیت حاصل کر لیتا ہے۔ اسی طرح ایک عاشق اللہ میں بھی خدائی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ فنا تصرف کی اصطلاح میں اس عمل کا نام ہے جس میں عاشق معشوق کی خوشنودی کیلئے معشوق کی مرضی پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ اس فنا سے عاشق کو بقائے دوام حاصل ہوتی ہے۔

۸۔ نوح۔ بڑا نوحہ کرنے والا ایک مشہور پیغمبر جن کے وقت میں دنیا میں طوفان آیا۔ یہ طوفان تین ہزار تین سو اڑتیس سال قبل مسیح میں آیا تھا۔ ان کی عمر کم و بیش ہزار سال کی تھی۔

ایوب۔ ایک نہایت ہی صابر و شاکر پیغمبر کا نام۔

ترجمہ:۔ تو عاشقی سیکھ اور کسی محبوب کو تلاش کر۔ کسی نوح کی آنکھ اور کسی ایوب کا دل طلب کر۔

تشریح:۔ فرماتے ہیں اے مسلمان تو اگر اپنی خودی کو بلند کرنا چاہتا ہے تو کسی سے عشق کرنے کا سلیقہ سیکھ۔ تو کسی محبوب کو تلاش کر۔ اس میں شک نہیں عشق کے راستے میں مصیبتوں کے پہاڑ کھڑے ہیں تجھے ان پہاڑوں سے ٹکرانا ہوگا۔ محبت کے کٹھن امتحانوں سے گزرنا پڑے گا۔ اسلئے تو ان امتحانوں میں سے گزرنے کے لئے کسی نوح کی آنکھ اور کسی ایوب کا قلب تلاش کر۔ نوح کی آنکھ سے مراد مرشد کامل کی آنکھ اور قلب ایوب سے مراد کسی حق آگاہ مرد کامل کا دل ہے۔ یعنی تو ان تمام مشکلات عشق پر کسی مرد کامل کی توجہ سے ہی غالب آسکتا ہے اس لئے کسی مرد کامل کی رہنمائی میں تو راہ عشق کو طے کرے۔

صفحہ ۱۹۶

کیمیا:۔ اصطلاح میں ناقص چیزوں میں روح شامل کر کے انہیں مرتبہ کمال پر پہنچانا کیمیا کہلاتا ہے۔ یعنی تانبے کو سونا اور رانگ کو چاندی بنانا۔ فارسی میں بمعنی عشق اور

پیرو۔ مرشد کی نظر کامل بھی کیمیا کہلاتی ہے اور یہاں یہی مراد ہے
مشت گل۔ مٹھی بھر مٹی۔

ترجمہ:۔ تو ایک مٹھی بھر مٹی سے کیمیا حاصل کر۔ کسی مرد کامل کے آستانے کو چوم
تشریح:۔ اس شعر میں مشت گل سے مراد انسان کا مادی وجود ہے فرماتے ۔
ہیں اگر تو اپنے مادی وجود کو کیمیا میں تبدیل کرنا چاہتا ہے تو جا مرد حق آگاہ
کے آستانے کی گدائی کر۔ اس کی صحبت اختیار کر۔ اس کی نگاہِ التفات
تیرے وجود میں کیمیا کی خصوصیت پیدا کر دیگی۔ کسی مرد کامل کی صحبت
ہی سے عشق میں پختگی حاصل ہو سکتی ہے اور جب انسان میں عشق کی آگ
بھڑک جاتی ہے تو وہ اس ذریعے پر ناقص چیز کو بھی کامل بنا سکتا ہے
بغیر تقلید مرشد کے عشق میں پختگی کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا۔

۱۰ - رومی۔ مولانا جلال الدین محمد رومی ایک ایران کے مشہور صوفی شاعر جنہیں اقبال
اپنا مرشد روحانی سمجھتے ہیں۔ ان کی مثنوی معنوی جو چھ دفتروں پر مشتمل ہے فارسی
زبان کے صوفیانہ ادب میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔
تبریز۔ یعنی حضرت شمس الدین تبریز جو ایک مجذوب درویش تھے۔ مولانا روم
ان کے ہی مرید تھے۔ تبریز ایران کے ایک شہر کا نام ہے۔

ترجمہ:۔ تو اپنی شمع کو رومی کی مانند روشن کر۔ تو روم کو تبریز کی آگ میں جلا دے۔
تشریح:۔ فرماتے ہیں۔ تو اپنی وجود کی شمع میں مولانا روم کی طرح عشق کی آگ
روشن کر جس طرح انہوں نے اپنی ذات کو شمس تبریز کی آگ میں جلا دیا تھا
اس طرح تو بھی پیر رومی کی تقلید کر جس طرح انہوں نے اپنے مرشد حضرت
شمس تبریزی کی صحبت اختیار کر کے اپنی خودی کو مضبوط و مستحکم بنایا تھا
اسی طرح اے مسلمان! تو بھی کسی مرد کامل کی صحبت اختیار کر کے اپنی خودی کو
مستحکم کر جسطرح مولانائے روم نے اپنے وجود کو اپنے مرشد کے وجود میں
فنا کر دیا تھا۔ اسی طرح تو بھی مرد کامل کے وجود میں اپنا وجود فنا کر دے

یعنی فنا فی الشیخ ہو جا۔ فنا فی الشیخ سے یہ مراد ہے کہ مرید کے ہر عمل میں مرشد کے عمل کی تقلید شامل ہو۔

۱۱۔ بنمائمت :۔ بنمایم ترا۔ میں تجھے دکھاؤں۔

ترجمہ :۔ ایک معشوق تیرے دل میں پوشیدہ ہے۔ اگر تو آنکھ رکھتا ہے تو میں تجھے دکھاتا ہوں۔

تشریح :۔ فرماتے ہیں مسلمان تجھے معشوق تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو نور تیرے دل کے نہاں خانہ میں پوشیدہ ہے اگر تجھ میں دیکھنے کی قابلیت ہے تو میں تجھے وہ معشوق دکھا سکتا ہوں علامہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پیغمبر خدا حضرت محمد صلعم کی ذات تو ہر مسلمان کے دل میں موجود ہے۔ لیکن مسلمان ان کی موجودگی سے ناواقف ہیں۔

۱۲۔ خوباں۔ خوب کی جمع حسین لوگ۔

ترجمہ :۔ اس کے عاشق حسینوں سے زیادہ خوبصورت زیادہ دلکش زیادہ حسین اور زیادہ محبوب ہوتے ہیں

تشریح :۔ فرماتے ہیں۔ یہ وہ معشوق ہے جو دنیاوی معشوقوں سے بالکل الگ ہے۔ اس لحاظ سے اس کے عشق میں عاشق معشوقوں سے بھی زیادہ دلکش اور حسین بن جاتے ہیں۔ یعنی جو شخص رسول اللہ کی محبت میں فنا ہو جاتا ہے۔ تو اس محبت کی وجہ سے اس کے چہرے پر وہ روحانی جلال برسنے لگتا ہے۔ جو عاشق کے وجود کو فرشتوں کے لئے بھی قابل رشک بنا دیتا ہے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

سراپا حسن بن جاتا ہے۔ جس کے حسن کا عاشق
بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں

۱۳۔ ثریا :۔ پروین جھمکا۔ سات سہیلیوں کا جھمکا۔ وہ چھ سات یا زیادہ ستارے جو انگور کی شکل میں آسمان پر ہیں اور جاڑے کے موسم میں شام

ہی سے دکھائی دیتے ہیں ۔

شعر ۱۳: ہمدوش ۔ ساتھی ۔ رفیق ۔ ہمسر ۔ برابر ۔ ہم قدر ۔ برابر کا

ترجمہ :۔ اس کے عشق سے دل توانا ہوتا ہے (اور) خاک ثریا کی ہمسر ہو جاتی ہے

تشریح :۔ فرماتے ہیں ۔ رسول خدا کی محبت اختیار کرنے سے عاشق رسول کے دل کو تقویت پہنچتی ہے دنیاوی معشوقوں کی محبت میں عاشق کا حال ہمیشہ پریشان ہی رہتا ہے لیکن رسول خدا کی محبت سے انکو روحانی سکون حاصل ہوتا ہے اور اسی عشق کی عطا کردہ قوت سے دنیا میں اہم کارنامے انجام دے سکتا ہے ۔ رسول خدا کی محبت کی بدولت عاشقوں کا مرتبہ فرشتوں کیلئے بھی قابل رشک ہو جاتا ہے اور وہ مقام انسان کو نہایت رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں ۔

۱۴۔ نجد ۔ عرب کے ایک ملک کا نام جس کی زمین بلند ہے اور جو حجاز سے مشرق کی طرف خلیج فارس تک وسیع ہے اور ریگستانی علاقہ ہے

خاک نجد ۔ سے مراد سرزمین عرب ہے جہاں سے اسلام کا سرچشمہ پھوٹا

چالاک ۔ چست ۔ تیز ۔ متحرک

افلاک ۔ فلک کی جمع ۔ آسمان

ترجمہ :۔ خاک نجد (سرزمین عرب) اس کے فیض سے متحرک ہو گئی وہ وجد میں آگئی اور آسمانوں پر پہنچ گئی ۔

تشریح :۔ علامہ اقبال نے شروع میں کہا تھا ۔ کہ معشوق خود تیرے دل میں چھپا ہوا ہے ۔ تجھے اس کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ اب وہ کہتے ہیں کہ اے مخاطب اگر تو سمجھا ہے تو میں تجھے اب اس معشوق کا نام بتاتا ہوں ۔ یہ وہ معشوق ہے جسکی محبت کے فیض نے عرب کی سرزمین میں حرکت پیدا کر دی ۔ اس کی کیمیا اثر نگاہ نے عربوں جیسی بت پرست اور متمدن قوم میں ایمان کا جوہر پیدا کر کے ان کے مقام کو آسمان سے بھی زیادہ بلند کر دیا ۔ علامہ کہنا چاہتے ہیں وہ معشوق جسکی محبت سے

مسلمانوں میں وہ مذکورہ بالا خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔

۱۵۔ ترجمہ:۔ مسلمان کے دل میں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ہے اور ہماری عزت و آبرو سرکار دو عالم کے نام ہی سے ہے۔

تشریح:۔ علامہ اس شعر میں واضح الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ وہ عشق جو ہر مسلمان کے دل میں پوشیدہ ہے اور جس کے نام سے ہمیں عاقبت میں حقیقی عزت و آبرو حاصل ہو گی اس کا نام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

۱۶۔ طور۔ فلسطین کے ایک مشہور پہاڑ کا نام جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تجلی دیکھی تھی۔

بیت الحرم۔ عزت و آبرو کا گھر۔ خانہ کعبہ

کاشانہ۔ جھونپڑا۔ چھوٹا سا گھر۔ گھونسلا۔ آشیانہ

ترجمہ:۔ کوہ طور آپ کے دولت کدہ کے گرد و غبار کی ایک لہر ہے اور آپ کا کاشانہ کعبہ کے لئے بیت الحرم کا (درجہ) رکھتا ہے۔

تشریح:۔ فرماتے ہیں کہ کوہ طور پر صرف حضرت موسیٰ نے ایک دفعہ ہی تجلی دیکھی تھی لیکن رسول کریمؐ کے خانہ مبارک میں تو ہر لمحہ تجلیات الٰہی کا نزول ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے آپ کے دولتکدہ کے سامنے کوہ طور کی کوئی حیثیت نہیں۔ اسیطرح آپ کا کاشانہ مبارک کا مقام بھی بہت بلند ہے وہ کعبۃ اللہ کیلئے بیت الحرام کا مقام رکھتا ہے۔

۱۷۔ آنی۔ ساعت۔ لمحہ۔ لحظہ　　ابد:۔ ہمیشہ۔ بے انتہا زمانہ

کاسب۔ کسب کرنیوالا۔ کمانیوالا　　افزائش۔ اضافہ۔ زیادتی

ترجمہ:۔ آپ کے اوقات (زندگی کے ایام) کے مقابلے میں ابد ایک لمحہ سے (بھی) کمتر ہے (بلکہ) آپ کی ذات سے ابد (کی شان) میں اضافہ ہو گیا

تشریح : ۔ فرماتے ہیں آپ کی حیات مبارک کے مقابلے میں ابد ایک لمحہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ۔ بلکہ آپ کی ذات وہ ذات مبارک ہے جس سے ابد کی شان میں اضافہ ہو گیا ہے اور جو زمان و مکاں دونوں پر حاوی ہے ۔

۱۸ **ترجمہ :** ۔ بوریا آپ کے خواب راحت کا ممنون ہے آپ کی امت کے پاؤں کے نیچے کسریٰ کے تاج ہیں ۔

تشریح : ۔ فرماتے ہیں آپ کی شان ہے کہ خود تو نہایت سادہ زندگی بسر کی ہے ۔ لیکن مسلمانوں کی روحانی تربیت کر کے دلوں میں وہ جوش ایمانی پیدا کر دیا جس کے سامنے قیصر و کسریٰ کی طاقتیں بھی پاش پاش ہو کر رہ گئیں انہوں نے بڑے بڑے تاجداروں کے تخت الٹ دیئے اور دنیا میں ہر طرف خدائے واحد کے نام کو پہنچایا ۔

صفحہ ۱۹۷

۱۹ : **شبستان** ۔ رات کے رہنے کا مکان ، بادشاہوں کی خواب گاہ ۔ مسجد میں رات کو عبادت کرنے کی جگہ ۔

حرا ۔ مکہ معظمہ میں ایک پہاڑ جس کے غار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے نبوت سے چند روز قبل خداوند تعالیٰ کی عبادت کی ۔

خلوت ۔ تنہائی

ترجمہ : ۔ انہوں نے حرا کے شبستان میں خلوت اختیار فرمائی ۔ انہوں نے ایک دین ، قوم دنیا ، آئین اور حکومت پیدا کی ۔

تشریح : ۔ فرماتے ہیں آپ کی ذات وہ ذات ہے ۔ جس نے غار حرا میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کر کے قوم کی اصلاح کے لئے شب و روز دعائیں مانگیں اللہ تعالیٰ نے آپکی دعائیں قبول کیں اور انہیں اس قوم کی اصلاح کیلئے مامور کیا جو خدائے واحد کو فراموش کر کے بت پرستی کے شرک میں گرفتار تھی انہوں نے انکے کانوں میں توحید کی صدا پہنچائی

ان کو خدائے واحد کی عبادت کا پیغام دیا۔ اور ان کو اخلاقی پستی سے نکال کر ایک عظیم قوم بنا دیا۔ انہیں نہ صرف حکومت کا مالک بنا دیا بلکہ ایک ایسا مکمل دستور العمل بھی عطا فرما دیا جس سے وہ دین و دنیا میں خوشحالی کی زندگی بسر کر سکیں۔

۲۰۔ نوم۔ نیند۔ سونا۔ خواب

تخت خسروی۔ تخت شاہی۔

ترجمہ:۔ ان کی آنکھیں راتوں کو نیند سے محروم رہیں۔ یہاں تک کہ ان کی امت شاہی تخت پر سوئی۔

تشریح:۔ فرماتے ہیں یہ وہ مبارک ذات ہے جس نے راتوں کو اٹھ اٹھ کر مسلمانوں کی دینی و دنیوی ترقی کے لئے اللہ کے حضور میں دعائیں مانگیں۔ چنانچہ ان کی دعائیں قبول کر کے اللہ تعالیٰ نے نہ صرف مسلمانوں کو دنیا میں حکومت اور تخت شاہی سے نوازا بلکہ دین میں بھی سربلندی عطا فرمائی۔

۲۱۔ ہیجا:۔ لڑائی۔ جنگ

آہن گداز:۔ لوہے کو پگھلانے والی۔

ترجمہ:۔ جنگ کے وقت آپ کی تلوار آہن گداز یعنی لوہے کو پگھلانے والی بن جاتی ہے (اور) نماز میں آپ کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔

تشریح:۔ فرماتے ہیں کہ میدان جنگ میں جب آپ دشمنوں کے خلاف جنگ فرماتے تھے تو آپ کی تلوار ان کے حق میں فرشتہ موت بن جاتی تھی ان کو اپنی جان بچانی مشکل ہو جاتی تھی۔ لیکن جب آپ نماز ادا کرتے تھے تو آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں۔

۲۲۔ نصرت۔ فتح

آمین۔ کلمہ دعا۔ خدا ایسا ہی کرے۔ قبول کر۔

قاطع - قطع کرنے والی - خاتمہ کرنے والی -

ترجمہ :- فتح کی دعا میں آپ کی تلوار آمین (کا کام دیتی) تھی آپکی تلوار بادشاہوں کی نسل کا خاتمہ کرنے والی تھی -

تشریح :- فرماتے ہیں جب آپ فتح و نصرت کیلئے اللہ کی بارگاہ میں دعا فرماتے تھے - تو آپ کی تلوار آمین کہتی تھی - اور فتح و نصرت آپکے مبارک قدموں کو چومتی تھی - آپ کی تلوار میں وہ جوہر تھے جس نے دنیا کے عظیم بادشاہوں کی نسلوں کو ختم کر دیا تھا - یعنی انہوں نے اپنی تلوار سے دنیا سے شہنشاہیت کا خاتمہ کیا اور دنیا کو بتایا کہ دنیا میں حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے انسان کو دوسرے انسانوں پر حکمرانی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے -

۲۳ - آئین - قانون - قاعدہ - مذہب - رسم و عادت -

پیشین - اگلا - سابقہ -

درنورد - لپیٹ دیا -

ترجمہ :- آپ نے دنیا میں ایک نئے دستور العمل کا آغاز کیا (اور) پہلی قوموں کی مسند کو لپیٹ دیا -

تشریح :- فرماتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے ان تمام قوانین کا خاتمہ کر دیا - جو دنیا کی مختلف قوموں میں رائج تھے - انہوں نے دین اسلام کی صورت میں دنیا کو ایک نئے ضابطہ حیات سے روشناس کرایا - آپ نے نہ صرف ملوکیت اور شہنشاہیت کی مخالفت کی بلکہ مختلف قوموں میں رنگ نسل نسب و قوم اور وطن کے اختلافات کو بھی ختم کر کے رکھدیا - اسلام سے قبل اکثر قومیں نسل و قوم یا وطن کو اپنی عزت و برتری کا معیار رکھتی تھیں لیکن اسلام نے ان جھوٹے معیاروں پر قلم تنسیخ کھینچ دیا - اور دنیا کو بتایا کہ اللہ کی نظر میں تم میں سب سے زیادہ قابلِ عزت وہ ہے جو سب

سے زیادہ متقی ہو۔

۲۴۔ کلید۔ کنجی۔ اُم۔ ماں۔ مادر

گیتی۔ دنیا۔

ترجمہ:۔ آپ نے دین کی کنجی سے دنیا کا دروازہ کھولا اور مادرِ گیتی نے (اپنے) بطن سے آپ جیسا (کوئی) فرزند پیدا نہیں کیا

تشریح۔ فرماتے ہیں آپؐ نے دنیا کو دین اسلام کی صورت میں وہ دستور العمل عطا فرمایا ہے۔ جس پر عمل کر کے انسان دنیا میں سربلندی و حکومت حاصل کر سکتا ہے۔ اور وہ یہ چیز ہے جو دنیا کے کسی بھی مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ اس لحاظ سے دنیا میں کوئی ایسا رسول پیدا نہیں ہوا جو آپ کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔

۲۵۔ خوان۔ دسترخوان

ترجمہ:۔ آپ کی نظر میں بلال و پست برابر تھے۔ آپؐ اپنے غلام کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھے

تشریح:۔ فرماتے ہیں کہ آپؐ نے دنیا سے امیر و غریب آقا و غلام کی تفریق ختم کر دی۔ آپؐ نے اہل دنیا کو مواخات و اخوت کا درس دیا۔ اور غلاموں کا درجہ اس قدر بلند کر دیا کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی مثال کے طور پر حضرت بلالؓ ایک حبشی غلام تھے لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد ان کا مقام اس قدر بلند ہوا کہ حضرت عمرؓ انہیں سیدنا بلال کہہ کر خطاب کرتے تھے۔

۲۶۔ مصاف: مصف کی جمع صف باندھنے کی جگہ۔ میدان جنگ

گردوں سریر۔ آسمان جیسا مرتبہ رکھنے والا تخت

جنگ

اسیر۔ قیدی

سردار طے۔ عرب کے قبیلہ بنی طے کا سردار حاتم جو اپنی فیاضی کیلئے مشہور تھا

ترجمہ: وہ بلند مرتبہ ہستی کہ آسمان اس کے تخت کی مانند تھا۔ ایک جنگ میں طے قبیلہ کے سردار (حاتم) کی لڑکی قیدی بن کر آپ کے سامنے آئی۔

۲۷۔ ترجمہ۔ وہ پابہ زنجیر اور بے پردہ تھی۔ اس نے شرم کے مارے اپنی گردن جھکائی ہوئی تھی۔

۲۸۔ دخترک۔ میں ک تصغیر کا ہے۔ لڑکی

روئے او کشید۔ اس کے چہرے پر اوڑھادی۔

ترجمہ۔ جب نبی کریمؐ نے اس لڑکی کو بے پردہ دیکھا۔ تو اپنی چادر اس کے چہرے پر ڈال دی

تشریح۔ ۲۶ تا ۲۸۔ علامہ رسول کریمؐ کی فیاضی اور غریب نوازی کی مثال پیش کرنے کے لئے وہ واقعہ بیان کرتے ہیں۔ کہ ایک جنگ میں طے قبیلے کے مشہور اور سخی سردار حاتم کی لڑکی گرفتار ہوئی۔ اسے پابہ زنجیر حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس وقت اس لڑکی کے پاؤں میں زنجیریں پڑی تھیں۔ وہ بے پردہ تھی۔ اور شرم وحیا کے مارے اپنی گردن جھکائے ہوئے تھی۔ رسول کریمؐ نے جب اس لڑکی کو بے پردہ دیکھا تو آپؐ کی غیرت یہ برداشت نہ کر سکی چنانچہ آپ نے اپنی مبارک چادر اس قیدی لڑکی کو اوڑھادی۔

صفحہ نمبر (۱۹۷)

۲۹۔ عریاں۔ برہنہ۔

ترجمہ: (آج) ہم (یعنی مسلمان) طے قبیلہ کی لڑکی سے زیادہ عریاں ہیں۔ اور دنیا کی قوموں کے سامنے بے چادر ہیں۔

۳۰۔ قیامت کے دن آپ کی (ذات) پر ہمارا بھروسہ ہے (اور) دنیا میں وہی ہمارے پردہ دار ہیں۔

تشریح:۔ ۲۹۔ ۳۰۔ فرماتے ہیں۔ اس طے قبیلے کی لڑکی کی تو صرف چند آدمیوں کے سامنے ہی رسوائی ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی رسول کریمؐ نے

اس کی پردہ داری کی۔ لیکن آج مسلمان قوم تمام دنیا کی قوموں کے سامنے ذلیل و رسوا ہے۔ اگرچہ اس کی ذلت اور بے کسی حد سے بڑھ گئی ہے لیکن پھر بھی اس خیال سے تسکین پہنچ سکتی ہے۔ جس طرح رسول کریمؐ نے اس خاتون کو ذلت و رسوائی سے نجات دلائی۔ وہ دنیا میں بھی ہمیں ذلت و خواری سے بچائیں گے اور قیامت کے دن بھی آپ کی نگاہِ رحمت کے طفیل رسوائی سے نجات پائیں گے۔

۳۱۔ اعدا۔ عدو کی جمع۔ دشمن ۔ لطف۔ مہربانی۔

قہر۔ زبردستی کرنا۔ غالب آنا

ترجمہ:۔ آپ کی مہربانی اور قہر سراپا رحمت ہے۔ (آپ کی) یہ مہربانی دوستوں کے حق میں اور وہ قہر دشمنوں کے حق میں رحمت ہے۔

تشریح:۔ فرماتے ہیں کہ آپ کی مہربانی اور قہر دونوں سراپا رحمت ہیں۔ آپ دوستوں پر تو رحم و کرم فرمایا ہی کرتے تھے۔ اور وہ ان کے حق میں رحمت تھا۔ لیکن اگر آپ نے کفار کے خلاف جہاد کر کے قہر فرمایا۔ تو وہ بھی ان کے حق میں رحمت تھا۔ چونکہ آپؐ نے اللہ کے حکم سے کفار کے خلاف اس لیے جنگ کی کہ وہ دین اسلام کی راہ میں مزاحم ہوئے تھے۔ لیکن جب وہ شکست کھا کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے اور وہ کفر کی تاریکی سے نکل کر اسلام کی روشنی میں آئے تو آپ کا وہ قہر ان کے حق میں سراپا رحمت ہو گیا۔

۲۔ لاتثریب۔ یعنی لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمْ۔

(یعنی تمہارے لئے کوئی تعزیر نہیں) اگرچہ کفار عرب نے نبی کریمؐ کو بہت ایذا دی تھی۔ مگر فتح مکہ کے بعد فاتح کو انتقام کا حق اور قوت حاصل تھی۔ لیکن حضورؐ علیہ السلام نے لاتثریب علیکم فرما کر سب کو معاف کر دیا۔ شعر مذکور میں اسی آیۂ شریف کی طرف تلمیح ہے)

ترجمہ:- وہ (پاکیزہ شخصیت) جس نے دشمنوں پر رحمت کا دروازہ کھول دیا اور (مکہ والوں) کو لاتثریب (یعنی تمہارے لئے کوئی تثریب نہیں) کا پیغام سنایا

تشریح:- فرماتے ہیں۔ کہ جب رسول کریمؐ نے اہلِ عرب کو پیغام حق سنایا تو انہوں نے اس پیغام حق کو سن کر اس پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور خود رسول کریمؐ اور ان کے پیروؤں کے دشمن ہو گئے۔ انہوں نے دین اسلام کی اشاعت کے راستے میں ہر ممکن روکاوٹیں پیدا کیں رسول کریمؐ اور ان کے پیروؤں کو ہر قسم کی ایذا پہنچانے سے گریز نہیں کیا لیکن جب مسلمانوں نے کفار کے خلاف جنگ کی اور اس جنگ میں اسلام کو فتح حاصل ہوئی اور کفار کو شکست۔ اور اب کفار قیدیوں کی صورت میں رسول کریمؐ کے سامنے گردن جھکائے کھڑے تھے اور انہیں یہ یقین کامل تھا کہ رسول کریمؐ آج ان تمام ایذاؤں کا ان سے انتقام لیں گے جو وہ کئی سالوں سے مسلمانوں اور ان کی ذات کو پہنچاتے رہے ہیں۔ اگرچہ فاتح کو غالب ہونے کی حیثیت سے انتقام کا حق حاصل ہوتا ہے لیکن رسول کریمؐ تو دنیا میں رحمۃ اللعالمین بن کر تشریف لائے تھے۔ انہوں نے انتقام لینے کی بجائے انہیں لاتثریب علیکم الیوم (آج تمہارے لئے کوئی تعزیر نہیں) کا مژدہ سنا کر سب کو معاف کر دیا۔

۳۳۔ گل صد برگ:- سو پتیاں رکھنے والا گلاب کا پھول۔ گیندے کا پھول

ترجمہ:- سو پتیوں والے گلاب کے پھول کی مانند ہماری بھی ایک ہی خوشبو ہے وہ اس نظام کی روح ہے اور وہ ایک ہی ہے۔

تشریح:- فرماتے ہیں دین اسلام وہ مذہب ہے جس نے اہل دنیا کو اتحاد و ملت کا درس دیا۔ اس نے رنگ۔ نسل اور زبان کے اختلاف کو یکسر مٹا کر مسلمانوں کو مذہبی لحاظ سے متحد کر دیا جس طرح گیندا یا گلاب ہزار پتیوں کے باوجود ایک ہی پھول کہلاتا ہے۔ اسی طرح رنگ و نسل زبان وطن

کے اختلاف کے باوجود مسلمان ایک قوم ہیں چونکہ وہ ایک خدا ایک رسول
اور ایک قرآن پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور یہ توحید ہی ان میں قومی اتحاد
کا سبب ہے۔

۳۴۔ سر۔ راز۔ بھید۔ مخفی ۔ مکنون۔ پوشیدہ کیا گیا۔
خفیہ۔ سر مکنون۔ سربستہ راز
بدیم۔ بودیم۔ افشا شدیم۔ ہم ظاہر ہو گئے۔

ترجمہ۔ ہم اس (یعنی رسول کریم) کے دل کا سربستہ راز ہیں۔ اس کے نعرہ بیباکانہ
سے ہم ظاہر ہوئے۔

تشریح۔ فرماتے ہیں ملت اسلام حقیقت میں ایک سربستہ راز تھی
جو حضور انور کے قلب مبارک میں پوشیدہ تھا۔ جب آپ نے اپنی زبان
مبارک سے نعرہ بیباکانہ یعنی کلمہ توحید (لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ)
بلند کیا تو اس کے ساتھ ہی دنیا میں ایک نئی قوم وجود میں آگئی جو ملت اسلامیہ
کہلائی اس لحاظ سے ہماری قومیت کی بنیاد رنگ و نسل یا وطن و زبان
پر نہیں۔ بلکہ کلمہ توحید پر ہے۔

۳۵۔ نولا: - محبت۔ امید

ترجمہ: - (اے مسلمان) میں (تجھ سے) اس کی محبت (کے اثر) کے بارے میں کیا
بیان کروں کہ وہ کیا ہے۔ کیونکہ آپ کے فراق میں تو خشک لکڑی بھی (انسانوں
کی طرح) رونے لگی تھی۔

تشریح: - فرماتے ہیں اے مسلمان میں تجھ سے عشق رسول کا اثر کس
طرح بیان کروں اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے
کہ آپ کی محبت میں غیر ذی روح چیزیں بھی انسان کی طرح رونے لگتی ہیں
علامہ اس شعر میں " استن حنانہ " تلمیح کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ شروع
میں مسجد نبوی میں منبر نہ ہونے کے سبب آپ ایک ستون سے پشت مبارک

لگا کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے لیکن جب منبر بن گیا اور آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے تو اس ستون سے رونے کی آواز سنائی دی۔ صحابہ کرام رضہ رونے کی آواز سنکر بہت حیران ہوئے۔ رونے والا وہاں موجود نہ تھا۔ آخر رسول کریمؐ نے اس راز سے پردہ اٹھایا اور فرمایا کہ یہ ستون میری جدائی میں رو رہا ہے۔ علامہ مسلمانوں پر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ عشق رسول سے جب نباتات و جمادات تک بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ تو انسان کا دل اس کی محبت سے کیونکر متاثر نہ ہوگا

۳۶۔ تجلی گاہ۔ نور الٰہی کی جگہ۔ تجلی۔ نور الٰہی۔ روشنی۔ چمک
بالا۔ فخر کرتا ہے۔ روشن

ترجمہ:۔ مسلم کی ہستی اس کی تجلی گاہ ہے۔ طور بھی اس کے راستے کی گرد ہونے پر فخر کرتا ہے۔

تشریح:۔ فرماتے ہیں جس طرح سورج کے نور سے تمام موجودات منوّر ہو رہی ہے۔ اسی طرح رسول کریمؐ کے قلب مبارک پر جو نور الٰہی کی تجلیات کا نزول ہوا تھا۔ انھوں نے اس سے تمام مسلمانوں کو روحانی فیض پہنچایا۔ فرماتے ہیں کہ طور پر تو صرف ایک مرتبہ تجلی نمایاں ہوئی تھی لیکن حضور انور کا قلب مبارک تو وہ طور ہے۔ جس پر ہر لحظہ تجلیات ربانی کا نزول ہوتا رہتا تھا۔ اور آپ کو وہ قدرت حاصل ہے کہ آپ اپنی نگاہِ کرم سے ہر مسلمان کے دل کو کوہ طور بنا سکتے ہیں۔

۳۷۔ پیکر۔ جسم۔

ترجمہ۔ میرے پیکر (وجود) کو اس کے آئینے نے پیدا کیا۔ میری صبح اس کے سینے کے آفتاب سے (روشن) ہے۔

تشریح۔ اس شعر میں آئینہ سے مراد آپ کا قلب مبارک ہے حدیث قدسی ہے۔ لولاک لما خلقت الافلاک یعنی خدا فرماتا ہے

کہ اے محبوب اگر میں آپ کو پیدا نہ کرتا تو آسمان بھی پیدا نہ کرتا گویا اگر رسول کریمؐ دنیا میں تشریف نہ لاتے۔ تو یہ کائنات بھی وجود میں نہ آتی علامہ فرماتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کا وجود بھی آپؐ کی ذات بابرکات کی بدولت ہے۔ اگر آپؐ نہ ہوتے تو ہمارا وجود بھی نہ ہوتا۔ آپؐ کا سینہ مبارک ایک سورج کی مانند ہے۔ آپ کے سینے سے نور توحید کی شعاعیں نکل کر ملت اسلامیہ کے دلوں کو روشن کر رہی ہیں آپؐ کا روحانی فیض، کائنات کو ایمان کی روشنی سے شاد کام کر رہا ہے۔

۳۸۔ **ترجمہ:**۔ دم بدم تڑپ میرے لئے آرام و سکون بن گئی۔ میری شام صبح محشر سے بھی زیادہ گرم ہے۔

تشریح:۔ فرماتے ہیں کہ میرا دل بھی اس کے فیض روحانی سے مستفیض ہوا ہے۔ میرے دل میں عشق رسول نے وہ اثر کیا ہے کہ میں ہر وقت اسی کے عشق میں مضطرب رہتا ہوں۔ اسی اضطراب میں مجھے سکون حاصل ہوتا ہے۔ اور اس محبت نے میری زندگی میں قیامت کی ہنگامہ خیزی پیدا کر رکھی ہے۔

۳۹۔ **ابر آذار**۔ بہار کا بادل — **بستان**۔ بوستاں کا مخفف

تاک۔ انگور کی بیل — باغ۔ چمن

ترجمہ۔ آپ کی ذات ابر بہار کی طرح اور میں باغ کی مانند ہوں میری تاک (انگور کی بیل) اس کی بارش سے نمناک ہے۔

تشریح۔ فرماتے ہیں کہ جس طرح ابر بہار برس کر باغوں کو سرسبز و شاداب بناتا ہے۔ اور اس کو اپنی رحمت کی بارش کے قطروں سے شاد کام کرتا ہے۔ اسی طرح رسول کریم کی ذات مبارک بھی مجھے اپنے فیض روحانی سے مستفیض کر رہی ہے۔

۴۰۔ کشت۔ کھیتی۔ کاشتم میں میم کا تعلق کشت سے ہے۔ یعنی کشتِ من

حاصل - کھیتی - زراعت - فائدہ نتیجہ - پھل - زمین کی پیداوار -

ترجمہ - اس کی نظر نے میرے (وجود) کی کھیتی میں محبت بو دی اور اس کے نظارے سے میں نے پیداوار حاصل کی -

تشریح - فرماتے ہیں رسول کریمؐ کی نظر عنایت کے طفیل میرا دل عشق رسول کی نعمت سے مالا مال ہو گیا - آپ کی محبت نے مجھے وہ بصیرت عطا کی جس سے میں ضمیر کائنات کے رازوں سے واقف ہو گیا کائنات تخلیق کے جو راز میری نگاہوں سے اوجھل تھے - عشق رسول کی بدولت ان کی حقیقت مجھ پر واضح ہو گئی -

۴۱ - یثرب :- مدینہ منورہ کا قدیم نام - جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مزار مبارک ہے -

خنک - خوش (قسمت) مبارک

ترجمہ :- خاک یثرب (یعنی مدینہ منورہ کی سرزمین) دو عالم سے زیادہ دلکش ہے - اے کہ خوش نصیب ہے وہ شہر کہ جہاں دلبر ہے -

تشریح :- فرماتے ہیں کہ یثرب کی خاک یعنی مدینہ منورہ کی خاک دونوں جہاں کے مقابلے میں زیادہ دلکش - زیادہ قیمتی اور زیادہ عزیز ہے اس کی وجہ یہ ہے رسول کریم کا مزار مبارک اس سرزمین میں ہے جس مقام میں دلبر سکونت پذیر ہو اس کا مرتبہ عاشق کی نظر میں بہت بلند ہوتا ہے فرماتے ہیں میں بھی عاشق رسول ہوں - اور میری نظر میں خاک یثرب کا مقام دونوں جہان سے بلند ہے

۴۲ - ملا جامی - مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی جو فارسی زبان کے مشہور شاعر ہونے کے علاوہ عارف و عالم بھی تھے -

خامی - ناپختہ

کشتہ - قتل کیا ہوا - مار ڈالا ہوا - مجازاً عاشق

ترجمہ :- میں ملا جامی کے انداز کا عاشق ہوں - اس کی نظم و نثر مجھ جیسے خامی (نا پختہ) انسان کا علاج ہے ۔

تشریح :- فرماتے ہیں کہ مولانا جامی نے نظم و نثر میں عشق و معرفت کی باتیں بیان کی ہیں جن کے مطالعہ سے وہ شخص جن کے دل عشق رسولؐ سے خالی ہیں - عشق رسولؐ کی دولت سے مالا مال ہو سکتے ہیں -

۴۳ - کونین - دونوں جہان، دنیا و عقبیٰ   دیباچہ :- کتاب کا شروع اور آغاز
نسخہ - لکھا ہوا - نوشتہ شدہ   خواجہ - آقا - مالک
کتاب

ترجمہ :- آپؐ دو جہان کی کتاب کا دیباچہ یعنی (آغاز) ہیں - تمام دنیا غلام اور آپؐ آقا ہیں -

تشریح :- مذکورہ بالا شعر مولانا جامی کا ہے - جو انہوں نے رسول کریمؐ کی شان میں لکھا ہے - علامہ اقبال اس نعت کو اس شعر پر ختم کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر دونوں جہان یعنی اس دنیا اور عقبیٰ کو ایک کتاب فرض کر لیا جائے تو حضور اکرمؐ کی ذات با برکات اس کتاب میں دیباچہ کی مانند ہے جیسے کتاب کا آغاز دیباچہ سے ہوتا ہے - اسی طرح دو جہان کا آغاز بھی آپؐ کی ذات کی وجہ سے ہوا ہے - ارشاد خداوندی ہے - اگر میں آپؐ کو پیدا نہیں کرتا تو آسمانوں کو بھی پیدا نہ کرتا - گویا تمام کائنات آپ ہی کی وجہ سے تخلیق ہوئی - آپؐ کے بغیر یہ کائنات بے حقیقت ہے اس لیے آپؐ ساری کائنات کے آقا ہیں - اور سب کائنات آپؐ کی غلام ہے -

۴۴ - صہبا - شراب -   تقلید - پیروی - اتباع -

ترجمہ :- عشق کی شراب سے (مختلف) کیفیات پیدا ہوتی ہیں - عشق کے ناموں میں سے تقلید بھی ہے -

تشریح :۔ اس شعر میں تقلید سے مراد تقلید رسول یا اتباع رسول ہے فرماتے ہیں عشق کی شراب وہ شراب ہے جو انسان کی ذات میں مختلف کیفیات پیدا کرتی ہے ۔ اور ان تمام کیفیات میں سے ایک کیفیت کا نام تقلید ہے جسے دوسرے لفظوں میں عشق کہا جا سکتا ہے۔ یعنی عاشق اپنے آپ کو معشوق کے رنگ میں رنگ لیتا ہے ۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں کرتا جو اس کے معشوق کی نظر میں ناپسندیدہ ہو۔ فرماتے ہیں عشق رسول صرف تقلید رسول سے ہی پختہ ہو سکتا ہے ۔ اس لئے ہمیں اپنی زندگی کو سنت نبوی کے سانچے میں ڈھالنی چاہیئے ۔

۴۵ ۔ بسطام ۔ حضرت بایزید بسطامیؒ جنہوں نے خربوزہ کھانے سے اسی لئے پرہیز کیا کہ انہیں معلوم نہ تھا ۔ کہ آنحضرتؐ نے یہ پھل کس طرح کھایا ہے ۔

ترجمہ :۔ مرد کامل بسطام تقلید میں فرد یعنی بے مثال تھے ۔ انہوں نے خربوزہ کھانے سے پرہیز کیا ۔

تشریح :۔ اقبال اس شعر میں اتباع یا تقلید رسولؐ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔ کہ حضرت بایزید بسطامیؒ نے اپنی تمام زندگی خربوزہ کھانے سے پرہیز کیا ۔ کیونکہ انہیں یہ معلوم نہ تھا ۔ کہ حضرت رسول کریمؐ نے یہ پھل کس طرح کھایا تھا ۔ علامہ فرماتے ہیں کہ اتباعِ رسول یا تقلید رسول کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال مل سکتی ہے جب تقلید اس درجے کو پہنچ جاتی ہے ۔ تو یہی تقلید عشق کا نام اختیار کر لیتی ہے ۔

۴۶ محکم ۔ پختہ مضبوط

ترجمہ :۔ اگر تو عاشق ہے تقلید یار سے مستحکم ہو جا تاکہ تیری کمند میں خود خدا شکار ہو جائے

تشریح :۔ فرماتے ہیں ۔ کہ اے مسلمان اگر تو عاشق ہے تو اتباعِ رسول کے ذریعے اپنی خودی کو مستحکم کر ۔ چونکہ جب تقلید رسول کے ذریعے تیرے

دل میں عشق رسول پیدا ہوگا۔ تو اسی صورت میں خود اللہ تعالیٰ تیری محبت کی کمند میں گرفتار ہو جائے گا۔ یعنی عشق رسول کے ذریعے ہی انسان خدا کا محبوب بن سکتا ہے چونکہ خدا خود فرماتا ہے کہ اگر تم اللہ سے محبت کے خواہشمند ہو۔ تو اس کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ تم خود اس کے محبوب سے محبت کرو یعنی اللہ کی محبت صرف عشق رسول سے ہی پختگی حاصل کر سکتی ہے

۷۴۔ ترجمہ:- کچھ عرصے کیلئے اپنے دل کے حرا میں بیٹھ، ترک خودی کر اور حق کی طرف ہجرت اختیار کر۔

تشریح:- فرماتے ہیں اتباع رسول کا یہ تقاضا ہے۔ کہ مسلمان بھی اپنی زندگی کا کچھ عرصہ خلوت میں مراقبہ اور مجاہدہ میں بسر کرے تاکہ اس سے اسے ترک خودی کا مقام حاصل ہو سکے۔ ترک خودی سے مراد یہ ہے کہ جب مالک اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اسے اپنے مادی مقام کو ترک کرنا پڑتا ہے اور جس طرح رسول کریم نے اپنی محبوب اشیاء کو ترک کر کے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی اسی طرح مسلمان کو بھی چاہیئے کہ وہ دنیاوی تعلقات کو ترک کر کے خدا کی طرف رجوع کرے۔

۴۸ لات۔ ایک بت کا نام ہے جسے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پوجتی تھی عزیٰ۔ ایک اور بت کا نام جس کی کفار مکہ پرستش کرتے تھے۔

ترجمہ۔ حق کی طرف سے حکم ہو کر اپنی طرف گامزن ہو۔ ہوا و ہوس کے لات و عزیٰ کے سر کو توڑ ڈال۔

تشریح:- فرماتے ہیں کہ جس طرح رسول کریم نے کعبہ کو بتوں سے پاک کیا۔ اسی طرح انسان کے دل میں بھی ہوا و ہوس کے بہت بت موجود ہیں۔ انسان عشق کے ذریعے ہی ان بتوں کو توڑ کر دل کو کثافت سے پاک کر سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے نفس امارہ انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے اسے زیر کرنا آسان کام نہیں ہے بقول ذوق

نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفس امّارہ کو گر مارا۔

لیکن کسی مرشد کامل کی صحبت اختیار کر کے مجاہدہ بالنفس کے ذریعے وہ اس موذی کو مسخر کر سکتا ہے۔

۴۹۔ فاران۔ ایک پہاڑ کا نام جو مکہ کے قریب واقع ہے۔
ترجمہ:۔ تو سلطانِ عشق سے فوج پیدا کر۔ اور عشق کے فاران پر جلوہ گر ہو جا۔
تشریح:۔ فرماتے ہیں۔ نفس امارہ انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اور اس کو صرف عشق کی طاقت سے ہی زیر کیا جا سکتا ہے ہوا و ہوس کے بتوں کو کعبہ دل سے نکالنا آسان کام نہیں۔ مجاہدہ بالنفس کے لئے کسی مرشد کامل کی صحبت ضروری ہے۔

۵۰۔ ترجمہ:۔ تاکہ خدائے کعبہ تجھ پر نوازش کرے اور تجھے "اِنِّی جَاعِلٌ" کی شرح بنا دے۔
تشریح۔ فرماتے ہیں کہ اگر تو نے صحبت مرشد میں رہ کر ہوا و ہوس کے بتوں کو توڑ دیا اور نفس امارہ کو عشق کی قوت سے زیر کر لیا تو خدا بھی تجھ پر کرم کرے گا۔ اور تجھے خلافتِ الٰہیہ کے عظیم مرتبہ پر فائز کر دے گا۔

اقتباس از پیام مشرق

ساقی نامہ

صفحہ نمبر ۲۰۱

۱۔ **خوشا**۔ بہت خوش چہ خوش بہت خوب۔

نوبہار۔ نئی بہار۔ موسم بہار کا شروع

روزگار۔ زمانہ

نجوم۔ نجم کی جمع۔ ستارے

نجوم پرن:۔ سے مراد خوشہ پروین یعنی چھ ستاروں کا مجموعہ ہے

پرن:۔ پروین۔ ثریا۔

رست:۔ اُگے (ہیں)

مرغزار۔ سبزہ زار وہ زمین جہاں پر گھاس بہت اگی ہوئی ہو۔

ترجمہ:۔ اس زمانے کے کیا کہنے اس نئی بہار کی کیا بات ہے (ایسا معلوم ہوتا ہے) کہ سبزہ زار سے خوشہ پروین یعنی ستارے اُگے ہوئے ہیں۔

تشریح:- علامہ اس شعر میں موسم بہار کا دلفریب و دلکش منظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ بہار کی آمد آمد ہے۔ ہر طرف سبزہ اگا ہوا ہے اور پھول کھل رہے ہیں۔ سبزہ زار میں شگفتہ پھول ایسے نظر آ رہے ہیں جیسے ستارے اگ رہے ہیں۔

۲- بال - بازو | تذرو - ایک خوش رنگ اور خوبصورت جنگلی
الماس - ہیرا | پرندے کا نام جو ماژندران اور استرآباد کے جنگلوں میں ہوتا ہے۔ چکور

ترجمہ:- زمین بہاروں کی وجہ سے تذرو (چکور) کے بازو کی طرح (خوشنما) بن گئی ہے۔ فوارے سے نکلنے والا، آبشار (کا پانی) ہیرے کی مانند سفید ہے۔

تشریح:- فرماتے ہیں۔ جوش بہار کی وجہ سے زمین کا دامن رنگا رنگ پھولوں سے بھر گیا ہے۔ شگفتہ پھولوں کی وجہ سے زمین تذرو کے خوشرنگ اور خوشنما پروں کی طرح دلکش اور حسین دکھائی دے رہی ہے اور آبشاروں کا پانی جو فواروں سے نکل رہا ہے وہ اتنا سفید اور چمکدار ہے۔ کہ اس پر ہیرے کا گمان ہوتا ہے گویا فواروں سے پانی نہیں بلکہ ہیرے برس رہے ہیں۔

۳- ترجمہ:- نظر لالہ و گل کے سوا کسی چیز پر نہیں پڑتی۔ اور ہوا سبزہ زار کے سوا کسی (جگہ) نہیں پڑتی۔

تشریح:- مراد یہ ہے کہ چمن میں جس طرف بھی نظر پڑتی ہے لالہ و گلاب کے شگفتہ پھول جلوہ نمائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ۔

اگا ہوا ہے ۔ گویا زمین نے زمردیں لباس پہنا ہوا ہے ۔

۴ ۔ خود آرائی ۔ اپنے آپ کو آراستہ کرنا
آئینہ دار ۔ آئینہ دکھلانے والا پیش خدمت
زیبا ۔ حسین
لب جو ۔ ندی کے کنارے
نگار ۔ محبوب ۔ معشوق

ترجمہ :۔ کیا تو نے ندی کے کنارے غنچہ کی خود آرائی دیکھی ؟ کتنا حسین محبوب ہے ۔ جو آئینہ دیکھ رہا ہے ۔

تشریح :۔ ندی کے کنارے کلیاں کھلی ہوئی ہیں ۔ ان کا عکس پانی میں پڑ رہا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آئینہ کے پاس بیٹھی ہوئی حسینہ اپنا نظارۂ جمال کر رہی ہو ۔

۵ ۔ شاخسار ۔ وہ جگہ جہاں بہت سے شاخدار درخت ہوں ۔ بہت ٹہنیوں والا درخت ۔

ترجمہ : کتنی میٹھی آواز ہے ۔ اور کتنی دلکش صدا ہے جو درختوں کی شاخوں کی خلوت سے آرہی ہے ۔

تشریح ۔ فرماتے ہیں درختوں کی گھنی شاخوں میں پرندے نغمہ سرائی میں معروف ہیں ۔ ان کی دلکش اور سریلی آواز دلوں پر مسرت انگیز اثر کر رہی ہے ۔

۶ ۔ نوا :۔ آواز
سار ۔ ایک خوشنوا پرندے کا نام مینا
ہزار :۔ بلبل
بانگ ۔ آواز

ترجمہ :۔ سار (یعنی مینا) کی آواز اور بلبل کی نوا (سن کر) جسم میں روح اور روح میں (وصل کی) آرزو (پیدا ہوتی) ہے ۔

تشریح :۔ چمن میں ہر طرف پرندے چہک رہے ہیں ۔ ان کی خوشنوائی روح پر مسرت انگیز اثر کر رہی ہیں خاص طور پر مینا اور بلبل کے شیریں

نغمے سن کر مردہ جسم میں زندگی کا احساس روح میں وصل کی آرزو
پیدا ہونے لگتی ہے۔

۷۔ مرغ بلند آشیانی:۔ بلند آشیانے پر رہنے والا پرندہ۔
ترجمہ۔ بلند آشیانے میں رہنے والے پرندے کی نوائیں جوئبار (یعنی ندیوں) کے
نغمے میں مل گئی ہیں۔
تشریح۔ فرماتے ہیں درختوں کی بلندی پر آشیانہ بنانے والے پرندے
چہک رہے ہیں۔ ادھر نہر کے تموج سے دلکش ترنم پیدا ہوتا
ہے۔ اور پرندوں کے چہچہے ندی کی گنگناہٹ کیساتھ مل کر ایک
عجیب دلکشی کا عالم پیدا کر رہے ہیں۔

۸۔ یزدانی۔ خدا۔
ترجمہ:۔ تو کہے گا (یعنی گویا) خدا نے بہشت بریں پہاڑ (یعنی کوہسار) کے
دامن میں اتار کر رکھ دی ہے۔
تشریح:۔ فرماتے ہیں کشمیر میں سبزہ زار کی لہک۔ پھولوں کی شگفتگی۔
ندیوں کی روانی۔ آبشاروں کی گنگناہٹ۔ پرندوں کی خوشنوائی اور
ایسے دیگر دلکش مناظر دیکھ کر محسوس ہونے لگتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے
کشمیر کے کوہسار میں جنت اتار کر رکھدی ہے۔

صفحہ نمبر ۲۰۲

۹۔ ترجمہ۔ تاکہ اولادِ آدم کو انتظار کی تکلیف سے نجات دے دے۔
تشریح۔ فرماتے ہیں جو لوگ دنیا میں نیک عمل کرتے ہیں۔ مرنے کے
بعد خدا نے جنت دینے کا وعدہ کیا ہے ظاہر کہ یہ جنت جیتے جی میسر
نہیں آسکتی۔ گویا جنت کی روحانی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے
کے لئے انسان کو ایک طویل انتظار کی ضرورت ہے لیکن خدا اپنے
نیک بندوں کو اس طویل انتظار سے نجات دلانا چاہتا ہے۔

اس لئے اس نے خطۂ کشمیر میں جنت اتار دی ہے تاکہ وہ اپنی زندگی میں ہی جنت کی تصویر دیکھ سکیں۔

نسیمِ صبح

صفحہ نمبر ۲۰۲

۱- سرِ کوہسار۔ پہاڑ کی چوٹی　　　　روی بحر۔ سمندر کی سطح

ترجمہ:۔ میں سمندر کی سطح سے اور پہاڑ کی چوٹی سے آتی ہوں۔ لیکن میں نہیں جانتی کہ میں کہاں سے پیدا ہوتی ہوں۔

تشریح۔ نسیم صبح کہتی ہے۔ کہ میں کبھی سمندر کی سطح سے ہو کر اور کبھی پہاڑ کی چوٹی سے چل کر آتی ہوں۔ یعنی کبھی بلندی سے پستی کی طرف آتی ہوں اور کبھی پستی سے بلندی کی طرف جاتی ہوں۔ لیکن اس کے باوجود مجھے اپنی حقیقت کی خبر نہیں ہے کہ میں کون ہوں اور کس طرح پیدا ہوتی ہوں۔

۲- فصلِ بہار۔ موسمِ بہار۔　　　　غمزدہ طائر یعنی طائرِ غمزدہ: غمگین

تہ نشیمن۔ آشیانے کے نیچے　　　　پرندہ یعنی بلبل

سیم۔ چاندی　　　　یاسمین۔ چنبیلی کا پھول

ترجمہ: میں غمزدہ پرندے یعنی بلبل کو موسمِ بہار کی (آمد) کا پیغام دیتی ہوں اور اس کے آشیانے کے نیچے چنبیلی کے پھولوں کی چاندی بکھیرتی ہوں۔

تشریح:۔ نسیم صبح کہتی ہے کہ میں چمن میں جا کر بلبلِ زار کو فصلِ بہار کا پیغام سناتی ہوں۔ اور اس کے آشیانے کے نیچے یعنی زمین کی سطح پر چاندی جیسے سفید پھول چنبیلی کے بکھیرتی ہوں یعنی فصل بہار میں نسیم صبح کے چلنے سے چنبیلی کے پھول ڈالی سے ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر گرتے ہیں

۳- غلطم:۔ میں لوٹتی ہوں۔

می پیچم :- میں لپٹتی ہوں بغلگیر ہوتی ہوں   برانگیزم :- پیدا کرتی ہوں نکھارتی ہوں۔

ترجمہ :- میں (کبھی) سبزہ پر لوٹتی ہوں اور (کبھی) لالہ کی ٹہنی سے لپٹتی ہوں تاکہ اس کے مسامات سے رنگ و بو پیدا کر دوں۔

تشریح :- نسیم صبح بتاتی ہے کہ کبھی میں سبزہ زاروں میں جا کر سبزہ پر لوٹتی پھرتی ہوں۔ اور کبھی لالہ کے پھول کی ٹہنی سے بغلگیر ہوتی ہوں تاکہ اسکے رنگ و بو میں نکھار پیدا کر سکوں۔ ہوا کی گدگداہٹ سے لالہ کے پھول کھل جاتے ہیں اور ان کی خوشبو ہر طرف پھیلنے لگتی ہے۔

۴-۵ - برگ لالہ - لالہ کے پھول کی پتی -   نرمک - آہستہ -   آویزم :- الجھتی ہوں۔ پھرتی ہوں

ترجمہ :- میں نرم و نازک گلاب کے پھول اور لالہ کے پھول کی پتی پر آہستہ نرمی سے پھرتی ہوں۔ مبادا میری گردش سے اس کی شاخ خمیدہ نہ ہو جائے۔

تشریح :- ہوا کہتی ہے کہ جب میں چمن میں جاتی ہوں تو لالہ و گلاب کے پھول کی پتی پر نہایت نرمی سے قدم رکھتی ہوں میں ڈرتی ہوں کہ کہیں ان کی شاخیں جھک کر ٹوٹ نہ جائیں۔

۶ - نواھا - آوازیں   در خروش آید - چلاتا ہے -

ترجمہ :- جب کوئی شاعر غم عشق سے (مجبور ہو کر) چلاتا ہے تو میں اس کی آوازوں کے نفس نفس میں مل جاتی ہوں۔

تشریح :- نسیم سحر بتاتی ہے کہ جب کوئی شاعر عشق کے غم و اندوہ کی تاب نہ لا کر آہ و زاری کرنے لگتا ہے تو میں اس کی آہ و زاری میں شامل ہو جاتی ہوں تاکہ اس کی فریاد میں دلکشی کا رنگ پیدا کر سکوں۔

غزلیات

صفحہ ۲۰۲ تا ۲۰۳ غزل ۱

۱- افسر :- تاج

ترجمہ :- (اے محبوب) یہ سچ ہے کہ تیرے کوچے کے گدا کے سر پہ تاج دکھلائی نہیں دیتا لیکن اس کے باوجود بھی) وہ کسی بادشاہ سے کم نہیں۔

تشریح :- فرماتے ہیں کہ عاشقان خدا کے پاس اگر دنیاوی شان و شوکت کا سامان نہیں ہوتا۔ وہ سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا چکے ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ بے نوا درویش کی طرح ہیں لیکن روحانی دولت سے مالامال ہیں۔ بادشاہ جسموں پر حکومت کرتے ہیں۔ لیکن وہ انسانوں کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ مرتبے میں کسی بادشاہ سے کم نہیں ہیں۔

۲- ترجمہ - جوان سو رہے ہیں اور بوڑھے مردہ دل ہیں۔ (ان میں) کسی کے سینے کو بھی آہ صبحگاہی نصیب نہیں ہے

تشریح :- اس شعر میں آہِ صبحگاہی سے مراد اللہ کے حضور میں خشوع و خضوع سے آنسوؤں کے موتی لٹانا ہے۔

علامہ فرماتے ہیں۔ کہ اس مادی دور میں مسلمان قوم کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی ہے۔ نوجوان قوم کے ستون ہوتے ہیں لیکن وہ غفلت میں وقت گنوا رہے ہیں۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ اللہ کی محبت کے بغیر گذرتا ہے۔ یہی حال بوڑھوں کا ہے۔ ان کے دل میں اللہ کی محبت کی آگ سرد ہو چکی ہے۔ قوم کا ہر فرد خدا کی محبت سے غافل ہے۔ کوئی بھی ایسا شخص نہیں ملتا۔ جو صبح کے وقت بارگاہِ الٰہی میں خضوع و خشوع کے ساتھ آہ و زاری کرتا ہو۔ اور اپنی سعادت ابدی کے لیے دعا کرتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان

کا دل سوز عشق سے خالی ہے۔

صفحہ نمبر ۲۰۳

۲۔ دشت:۔ جنگل۔

ترجمہ:۔ (اے مسلمان) تو دشت طلب ہیں اس بہانہ سے پاؤں پر پلکوں دھر کر نہ بیٹھ کہ ہمارے زمانے میں کوئی آشنائے راہ نہیں تھا۔

تشریح:۔ علامہ فرماتے ہیں آہ صبحگاہی حقیقت میں سوز وگداز عشق کا حاصل ہے اور سوز وگداز عشق کسی مرشد کامل کی صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اس لئے مسلمانوں کو کسی مردِ حق آگاہ کی تلاش کرنی چاہیئے اس بہانے اپنی کوشش ترک نہیں کرنی چاہیئے کہ زمانے میں مردانِ حق آگاہ نایاب ہیں بسعی مسلسل سے اسے کوئی نہ کوئی ایسا مرشد کامل ضرور مل جائے گا۔ جو عشق کے راستے پر اس کی راہ نمائی کر کے اسے منزل مقصود کا راستہ دکھا دے۔

۳۔ دریاب۔ حاصل کر۔ فائدہ اٹھا۔

ترجمہ:۔ اے مخاطب۔ تو اپنے وقت یعنی (زمانہ زندگی سے) (اس قدر) غافل کیوں بیٹھتا ہے۔ اس زمانے کو حاصل کر (فائدہ اٹھا) جس کے حساب میں نہ سال ہے اور نہ مہینہ۔

تشریح:۔ فرماتے ہیں کہ انسان اپنی زندگی کی حقیقت سے بے خبر ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ وقت کی حقیقت سے ناواقف ہے۔ علامہ فرماتے ہیں۔ خودی کی تربیت کئے بغیر انسان اپنی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے۔ خودی کے ذریعے ہی وہ زمانے پر غالب آ سکتا ہے۔ اقبال کی نظر میں حقیقی زمان اس مسلسل زمان سے الگ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ہماری روح کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

۴ رباط۔ سرائے

رباط کہن۔ پرانی سرائے یعنی دنیا۔

چشم داری ۔ تو امید رکھتا ہے		عافیت ۔ آرام و سکون

ترجمہ :۔ تو اس پرانی سرائے یعنی دنیا میں آرام و سکون کی امید رکھتا ہے زندگی کی کشمکش پر تیری نظر نہیں ہے ۔

تشریح ۔ فرماتے ہیں ۔ دنیا تو ایک سرائے کی مانند ہے جہاں انسان عارضی قیام کیلئے آتا اور پھر چلا جاتا ہے ۔ یہاں آرام و راحت کی امید رکھنا عبث فعل ہے ۔ یہ دنیا تو آرام و راحت کی جگہ نہیں بلکہ کشمکش اور جدوجہد کا میدان ہے جہاں ہر طرف تنازع البقا کا قانون جاری ہے ۔ جہاں صرف وہی شخص زندہ رہ سکتا ہے جو اپنی زندگی کا ہر لمحہ کشمکش اور جدوجہد میں بسر کرتا ہے ۔ تاریخ شاہد ہے دنیا میں جن قوموں نے جدوجہد کو چھوڑ کر عیش کوشی کی زندگی اختیار کی ان کا نشان صفحۂ ہستی سے مٹ گیا ۔

۵ ۔ کاتبان عمل ۔ یعنی کرام الکاتبین ۔

ترجمہ :۔ یہ کاتبان عمل (یعنی فرشتے) ہمارے نامہ اعمال میں ہمارے گناہ کیا لکھیں گے تیری دنیا سے تو (تیری) ایک نظر کے سوا ہمیں کچھ نصیب نہیں ہے ۔

تشریح :۔ فرماتے ہیں کہ اے خدا اگر فرشتے ہمارے نامۂ اعمال میں ہمارے گناہوں کو نہیں لکھتے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم نے تیری طرف ایک نظر دیکھنے کے سوا پھر کسی چیز پر نظر نہیں ڈالی ۔ اور ہم تیرے ایک جلوے سے مدہوش ہو گئے ہیں اور وہ شخص جو تیری محبت میں کھو جائے ۔ وہ گناہ کب کر سکتا ہے ۔ یعنی صرف وہ لوگ گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں جو تیرے سوا دنیا کی چیزوں پر نظر رکھتے ہیں ۔

۶ ۔ خرقہ ۔ گودڑی ۔ فقیروں کا لباس ۔

خرقہ فروشان ۔ خرقہ بیچ دینے والے ۔

ترجمہ :۔ آ کر اقبال کا دامن تھام لیں کہ وہ کسی خانقاہ کے خرقہ فروشوں میں سے نہیں ہے ۔

تشریح:- اقبال فرماتے ہیں کہ عشق و محبت کا طریقہ اقبال سے سیکھنا چاہیئے۔ چونکہ اب وہ خانقاہیں نہیں ہیں جو عشق و معرفت کا سرچشمہ تھیں اب وہاں خرقہ فروش بستے ہیں۔ خرقہ فروش سے مراد وہ لوگ ہیں جو ظاہر تو اپنے آپ کو درویش ظاہر کرتے ہیں وہ دوسروں کی راہنمائی کیسے کر سکتے ہیں۔ اس لیے تم اقبال کے پیغام کو سن کر اور اس پر عمل کر کے ہی عشق و محبت کا طریقہ سیکھ سکتے ہیں۔

غزل نمبر ۲

صفحہ نمبر ۲۰۳-

۱- فرو شوئی:- دھو ڈال

ترجمہ:- اے مخاطب- آئینہ کی طرح دوسروں کے حسن و جمال میں محو مت ہو- تو اپنے دل اور آنکھ سے دوسروں کا خیال دھو ڈال۔

تشریح:- فرماتے ہیں انسان کو آئینہ کی طرح دوسروں کے حسن و جمال میں محو ہونے کی بجائے خود اپنے جمال کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ یعنی اپنی خودی کو پہچاننے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ انسان اگر اپنی خودی سے آگاہ ہو جائے تو اس کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ وہ کسی سے کم نہیں ہے۔ لیکن انسان اپنے دل سے دوسروں کا خیال اور اپنی آنکھوں سے دوسروں کے حسن و جمال کا جلوہ دور کر کے خودی یا خود شناسی پیدا کر سکتا ہے۔ اور اپنی ذاتی صلاحیتوں سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ مگر افسوس انسان نے اپنی ذات میں چھپے ہوئے خزانے کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں کی۔ اسی لئے وہ اپنے سے بے خبر ہو کر دوسروں میں کھویا ہوا ہے۔ جیساکہ آئینہ کو اپنی صلاحیتوں کی خبر نہیں ہوتی۔ وہ دوسروں کے نظارے میں مصروف

رہتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی دنیا کے چیزوں کے خیال میں کھویا ہوا ہے اور اپنی ذات سے غافل ہے۔ علامہ اقبال اسی شعر میں انسان کو خود شناسی کی تلقین کرتے ہیں۔

۲۔ ترجمہ۔ (اے مسلمان) تو نے آشیانہ دوسروں کے درخت پر (ہے) تو مرغانِ حرم کے نالہ سے آگ حاصل کر اور اس کو (اس آگ سے) جلا ڈال۔

تشریح:۔ اس شعر میں دوسروں کے درخت پر آشیانہ بنانے سے مراد غیر اسلامی تصورات کو اپنانا ہے۔ مرغانِ حرم سے مراد سچے مسلمان ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں۔ اے مسلمان تو نے اسلامی تصورات اور اسلامی طرزِ معاشرت کو ترک کر کے غیر اسلامی تصورات کو اپنا لیا ہے یہی وجہ ہے کہ تو اسلام سے دور ہے اس لئے تو سچے مسلمانوں کی صحبت اختیار کر تاکہ ان کی ہم نشینی تیرے دل میں قوتِ ایمانی پیدا کر سکے تو ان غیر اسلامی تصورات کو اپنے ذہن سے نکال سکے اور غیر اسلامی آئینِ زندگی سے تجھے جو وابستگی پیدا ہو گئی ہے تو اسے ترک کر کے سچا مسلمان بن سکے۔

۳۔ ترجمہ:۔ تو دنیا میں اپنے پر و بال کھولنا سیکھ۔ یعنی اپنے پر و بال سے اڑنا سیکھ کیونکہ دوسروں کے پر و بازو سے اڑا نہیں جا سکتا۔

تشریح:۔ یہاں پر و بال کھولنا سے مراد اڑنا یعنی ترقی کرنا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں۔ دنیا میں صرف وہی قومیں ترقی کر سکتی ہیں۔ جو ترقی کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہیں۔ دوسروں کا محتاج رہ کر کوئی قوم بھی ترقی کے میدان میں آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس لئے علامہ مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں۔ اگر وہ دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ غیروں کے تصورات اور تہذیب و تمدن کا سہارا لینا چھوڑ دیں۔ بلکہ خود اپنی ذات میں اتنی قوت اور بازوں میں اتنی طاقت پیدا کریں۔ تاکہ وہ دنیا میں ایک ترقی یافتہ قوم کہلا سکیں۔ جب کوئی پرندہ بھی دوسرے پرندوں کے بازوں سے پرواز نہیں کر سکتا

تو انسان دوسروں کے سہارے کب ترقی کر سکتا ہے۔

۴۔ غیور۔ باغیرت   جام زلال۔ ٹھنڈے پانی کا پیالہ

زلال۔ ٹھنڈا پانی

ترجمہ:۔ میں مرد آزاد ہوں اور اس لئے، ایسا غیور ہوں کہ مجھے دوسروں یعنی (اغیار کے) ٹھنڈے پانی کا ایک پیالہ (پلا کر) مارا جا سکتا ہے۔

تشریح:۔ علامہ فرماتے ہیں میں ایک غیرت مند مسلمان ہوں اور میری غیرت دوسروں کی محتاج ہونا کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کر سکتی میں ذہنی۔ روحانی طور پر دوسروں کا غلام ہونے کے مقابلے میں موت کو ترجیح دوں گا۔

۵۔ نگہ: یعنی نگاہ کا مخفف   ہجر۔ جدائی

ترجمہ:۔ اے (یعنی اے خدا) کہ تو میری جان سے زیادہ قریب ہے اور میری نظر سے پوشیدہ ہے۔ مجھے تیری جدائی دوسروں کے وصال کے مقابلے میں زیادہ اچھی لگتی ہے

تشریح:۔ علامہ فرماتے ہیں۔ کہ اے خدا تو میری رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہے۔ جیسا کہ تو نے خود فرمایا ہے۔ (نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ) اس کے باوجود تو میری آنکھوں سے اوجھل ہے میں تیری جستجو اور طلب میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ مجھے تیری جدائی میں تکلیف کی بجائے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے اس لئے مجھے تیری جدائی زیادہ گوارا ہے دنیا کے لوگوں کی صحبت اور اختلاط اکثر اوقات تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مگر تیری تلاش کا سلسلہ چونکہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا اس لئے وہ مجھے ایک دائمی روحانی مسرت سے مستفید کرتا ہے۔